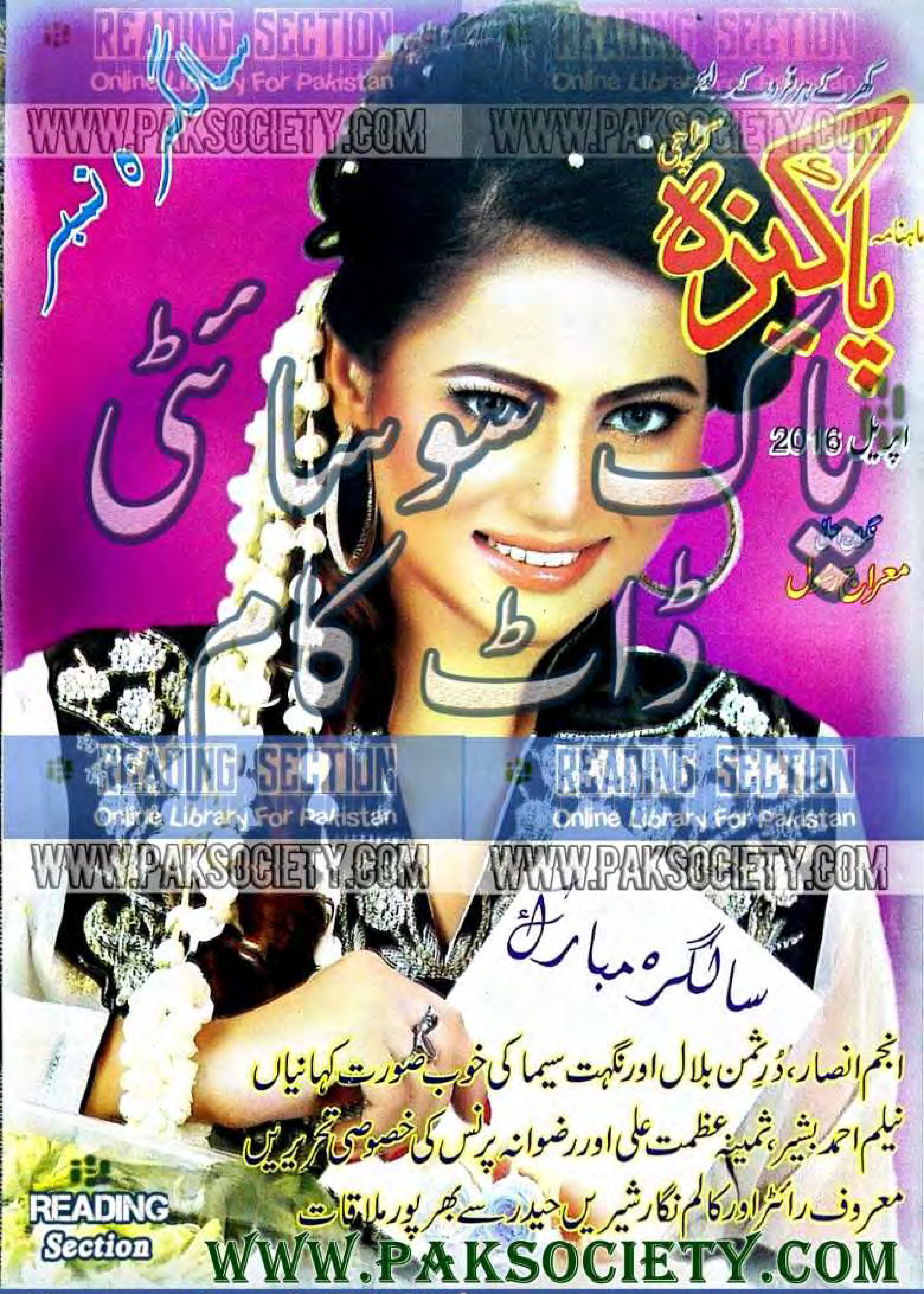
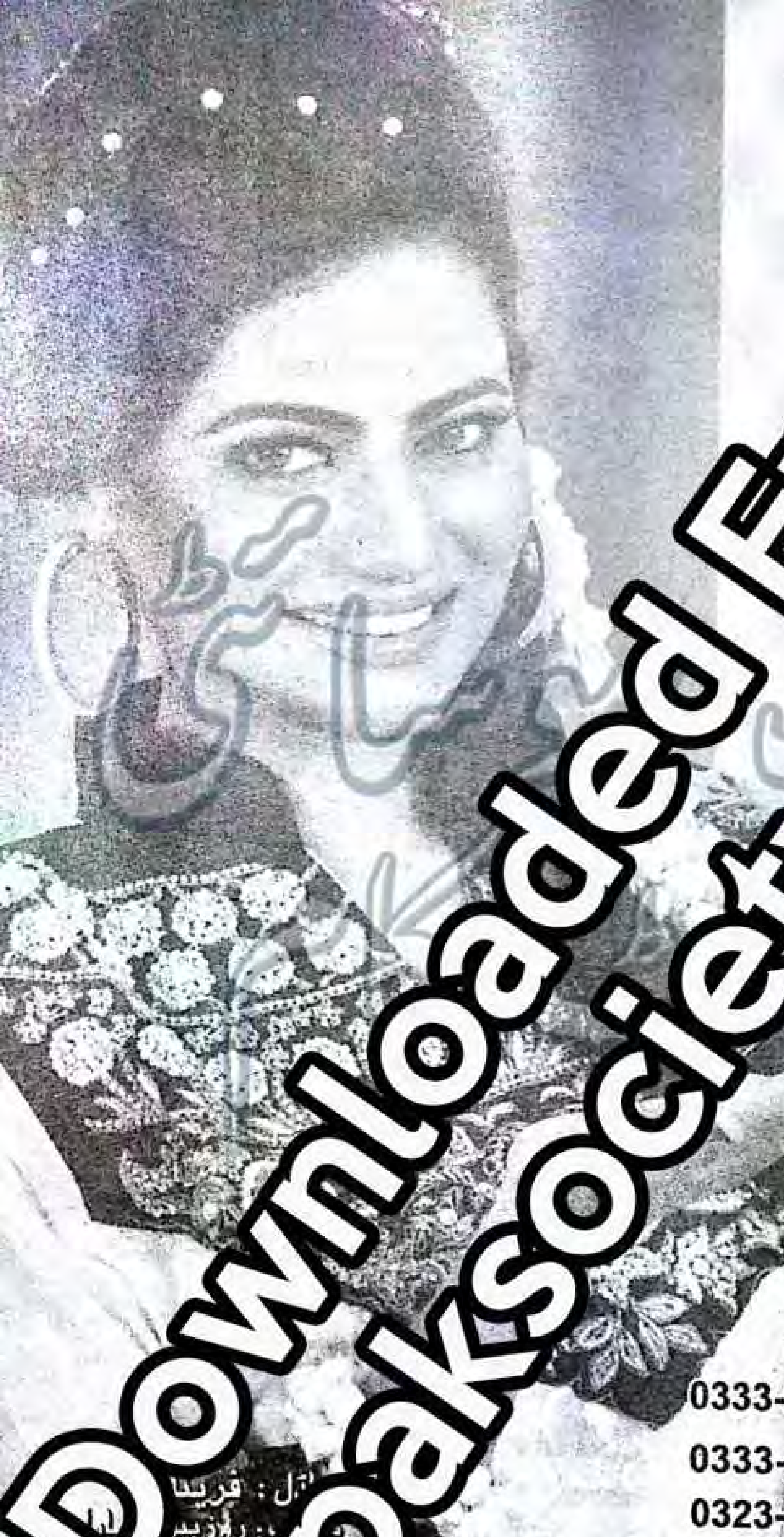

گھر کے ہر فرد کے لیے
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
سالگرہ نمبر
اپریل 2016
سالگرہ مبارک
انجم انصار، دُرِ ثمن بلال اور نگہت سیما کی خوب صورت کہانیاں
نیلم احمد بشیر، ثمینہ عظمت علی اور رضوانہ پرنس کی خصوصی تحریریں
معروف رائٹر اور کالم نگار شیریں حیدر سے بھرپور ملاقات
READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM



کراچی

مدیر اعلیٰ: ... رسول

مدیرہ اعلیٰ:

مدیرہ: انجم ...

معاون: آمنہ حماد ...

MEMBER APNS

CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

قیمت فی پرچا (پاکستان) 60 روپے

قیمت فی پرچا (سعودی عرب) 12 ریال یا مساوی متحدہ عرب امارات

زر سالانہ (بیرون ملک) 800 روپے...... جلد: 44 شمارہ: 01 اپریل 2016ء

سالگرہ مبارک

اداریہ

مجھے کچھ کہنا ہے — مدیرہ 15

سلسلے وار ناول

اعتبارِ وفا — نگہت سیما 24

گم شدہ محبت — انجم انصار 110

اے عشق ترے ہیں کھیل عجب — دُرِ ثمن بلال 148

منی ناول

دیارِ صبح کے اجالوں میں — نایاب جیلانی 178

مکمل ناول

بکھیرو — میمونہ صدف 200

ناولٹ

ادھورے کھوئے لمحے — تابندہ نعیم 70

افسانے

آنکھوں کے دیے — نیلم احمد بشیر 57

انعام — نگہت اعظمی 61

گھٹن — رضوانہ پرنس 95

لوہے کی روٹی — عقیلہ حق 107

حیثیت — ہاجرہ ریحان 135

چاند کم نہیں تھے — ہما بیگ 139

یہ آئینہ کوئی اور ہے — شیریں حیدر 141

یادگار — ثمینہ عظمت علی 167

شعور — ریحانہ زیدی 171

اگر ایسا ہو جائے — ہالہ احمد 195

خصوصی مضامین

یادوں کی مالا — ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی 18

شمعِ ہدایت — اختر شجاعت 225

سروے — شائستہ زریں 233

ذرا سا گھوم آؤں میں — عظمیٰ آفاق 238

وہ آئے بزم میں — نزہت اصغر 244

پبلشر و پرنٹر: ذیشان رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی



مستقل عنوانات

دین کی باتیں	ادارہ	16	خوش ذائقہ	پاکیزہ بہنیں	287
بہنوں کی محفل	مدیرہ	259	حسن ہمارے لیے	مہ جبیں	289
پاکیزہ ڈائری	عظمیٰ آفاق سعید	277	بزم پاکیزہ	پاکیزہ بہنیں	290
جلترنگ	انجم انصار	281	روحانی مشورے	ادارہ	292
میں اکثر گنگناتی ہوں	صغریٰ زیدی	285	ہومیو کلینک		294

Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
Postal Address: Box No. 662, G.P.O. , Karachi-74200
Phone: (021)35895313, Fax: 35802551, E-mail address: jdpgroup@hotmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجھے کچھ کہنا ہے......!

پریم چند نے کہا تھا۔ ''ادب زندگی کے آگے چراغ لے کر چلتا ہے۔'' اور ایک لکھاری ہونے کے ناتے میں اس کا مطلب یہ بھی سمجھتی ہوں کہ ادیب کی ذمّے داریاں سب سے زیادہ ہوا کرتی ہیں۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لکھنے کی ابتدا سچائی سے ہوئی اور پھر اس سچ سے ادب نے جنم لیا......اور اس ادب میں اگر جھوٹ بھی رچ بس جائے تو یہ ذمے داری لکھنے والوں کی ہی ہوتی ہے۔ جھوٹ ہمیشہ شر کا ساتھی ہوتا ہے......اور جو جھوٹ کا ساتھ دیتے ہیں وہ حقیقت میں برائی کا ساتھ دینے والوں میں سے ہوتے ہیں......اور آج پاکیزہ کی سالگرہ مناتے ہوئے ہمیں یہ کہنا ہے کہ جس طرح زندگی کی بہت سی اقدار ہوتی ہیں......کامیاب اخلاقی، سماجی اور معاشی زندگی وہی بسر کر سکتا ہے۔ جو ان اقدار کا پاس رکھے اور ان کے تقاضوں کا نمائندہ ہو، اس لیے یہ سب لکھنے والوں کی اہم ذمے داری ہوتی ہے کہ ان کی تحریریں نہ صرف قارئین کو آگاہی دیں بلکہ ان کی ذہنی تربیت بھی کریں۔ الحمدللہ پاکیزہ کی سینئر مصنفات ہوں یا نئی وہ اپنی تحریروں سے امید اور حوصلے کے چراغ جلاتی ہیں بلکہ فکری طور پر بھی ہمت اور استقامت کی شمعیں روشن کرتی ہیں۔

ہم اپنی مایہ ناز مصنفات، شاعرات، تبصرہ نگار بہنوں کے ساتھ، ساتھ اپنی قارئین بہنوں کے بھی مشکور ہیں، جن کی تحریریں، تجاویز اور مشورے ہمارے لیے بے حد اہم ہیں۔

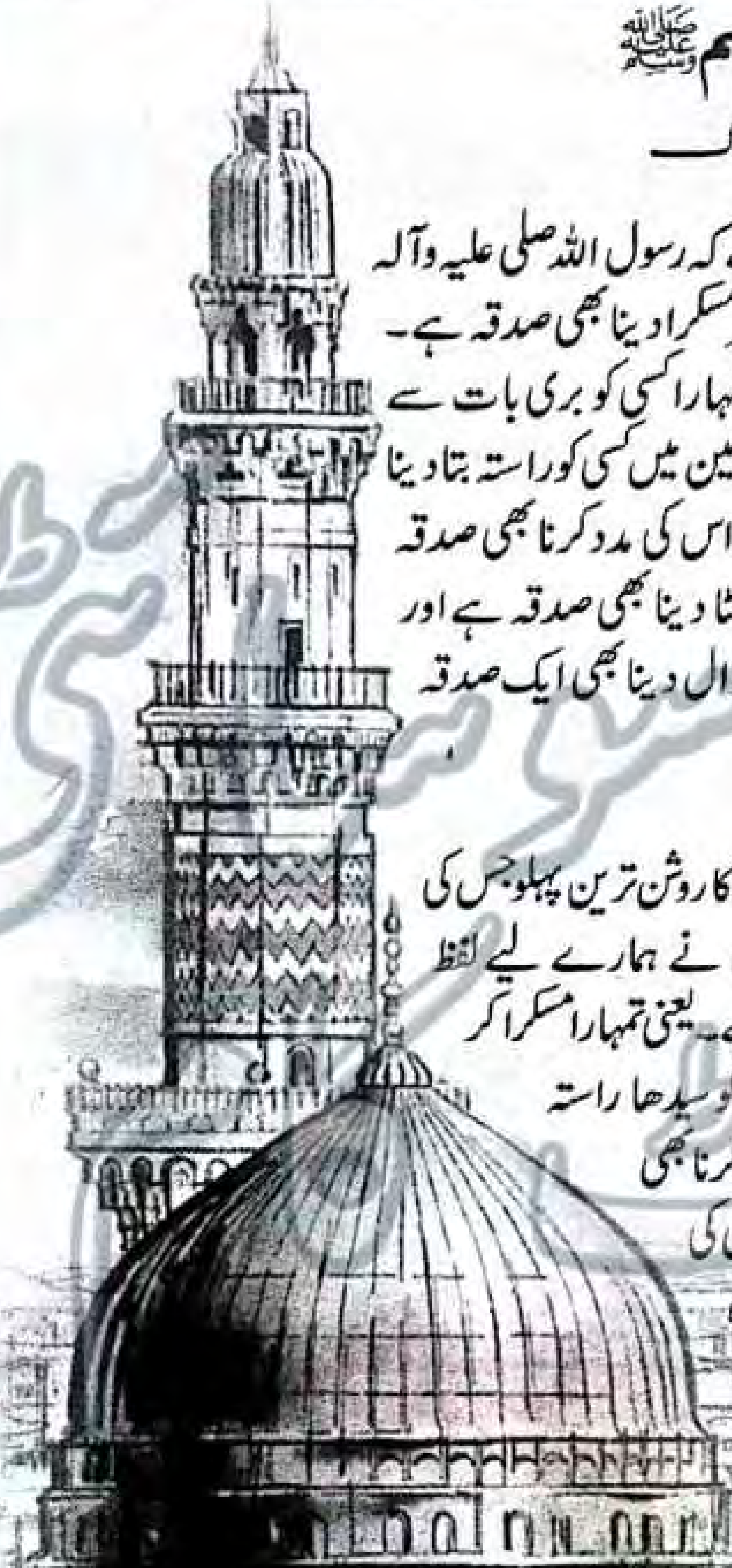
بے شک ادب زندگی ہے اور زندگی کا شعور عطا کرتا ہے اور زندگی جب مثبت رویّوں کو اپنا لیتی ہے تو وہ معیار کی دائمی قدر بن جاتی ہے......اور ہماری دعا ہے کہ ہم اپنے قول و عمل کا ایسا ثبوت دیں کہ دونوں جہاں میں خسارہ اٹھانے والوں میں شامل نہ ہوں......بے شک نیکی کی توفیق دینے والی ذات صرف اللہ ہی کی ہے۔

مدیرہ
انجم انصار

اور بے شک تم سے پہلے اور پیغمبر (بھی) جھٹلائے گئے ہیں اور انہوں نے اپنے جھٹلائے جانے پر اور تکلیف دیے جانے پر صبر کیا یہاں تک کہ ہماری مدد ان کے پاس آئی اور (کیوں نہ آتی) اللہ کے وعدوں کا کوئی بدلنے والا نہیں اور بے شک تمہارے پاس پیغمبروں کی خبر آچکی ہے (۳۴) اور (اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگر تم پر ان (کافروں) کا (ایمان سے) اعراض کرنا گراں گزرتا ہے تو اگر تم یہ کر سکتے ہو کہ کوئی سرنگ زمین میں لگاؤ یا کوئی سیڑھی آسمان میں لگاؤ اور انہیں کوئی معجزہ (بے ہماری مرضی کے) لادو (تو کرو) اور اگر اللہ چاہتا تو ان کو ہدایت پر جمع کر دیتا (مگر وہ نہیں چاہتا) پس تم ہرگز جاہلوں میں سے نہ ہو جانا (۳۵) (یہ لوگ تو مُردے ہیں تمہاری بات کیسے مانیں) بات وہی مانتے ہیں جو سنتے ہیں اور مُردوں کو اللہ اٹھائے گا پھر اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے (۳۶) اور کہتے ہیں کہ اس (نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر کوئی معجزہ اس کے پروردگار (کے ہاں) اسے کیوں نہ نازل کیا گیا کہہ دو کہ اللہ معجزے نازل کرنے پر قادر ہے ولیکن ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے (۳۷) اور زمین میں کوئی چلنے والا نہیں اور نہ کوئی ایسا پرندہ ہے جو اپنے دونوں بازوؤں سے اڑے مگر یہ کہ (وہ بھی) تمہاری طرح گروہ ہیں ہم نے کتاب (یعنی لوحِ محفوظ) میں کوئی بات فروگزاشت نہیں کی پھر اپنے پروردگار کی طرف (مرنے کے بعد) اٹھا لیے جائیں گے (۳۸) اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ (کمبخت) گونگے اور بہرے ہیں (کفر کی) تاریکیوں میں (پھنسے ہوئے) ہیں جس کو اللہ چاہے اسے گمراہ کرے اور جسے چاہے راہِ راست پر لے آئے (۳۹)



(سورۃ انعام آیت نمبر ۳۴ تا ۳۹)



سَیِّدُنا قاسِم ﷺ

صفاتی اسم مبارک

۷۔ حضرت ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اپنے بھائی کی خوشی کی خاطر مسکرا دینا بھی صدقہ ہے۔ کوئی نیک بات کہہ دینا بھی صدقہ ہے۔ تمہارا کسی کو بری بات سے روک دینا بھی صدقہ ہے۔ کسی بے نشان زمین میں کسی کو راستہ بتا دینا بھی صدقہ ہے۔ جس شخص کی نظر کمزور ہو اس کی مدد کرنا بھی صدقہ ہے۔ راستے سے پتھر، کانٹا اور ہڈی کا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے اور اپنے ڈول سے بھائی کے ڈول میں پانی ڈال دینا بھی ایک صدقہ ہے۔ (ترمذی)

۴۔ الرائے:

ا۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت کا روشن ترین پہلو جس کی اس سے زیادہ تعریف ممکن نہیں جو انہوں نے ہمارے لیے لفظ 'خیرات' کے مفہوم کو واضح کرنے میں کی ہے۔ یعنی تمہارا مسکرا کر اپنے بھائی کو دیکھنا، راستہ بھولے ہوئے کو سیدھا راستہ دکھانا، پیاسے کو پانی پلانا، صحیح کام کی نصیحت کرنا بھی بھلائی اور خیرات میں شامل ہے اور ایک آدمی کی آخرت میں اصل دولت وہ اچھائی ہے جو وہ اس دنیا میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ کر چکا ہے۔ جب وہ مرتا ہے تو لوگ پوچھتے ہیں اس نے اپنے پیچھے کیا چھوڑا ہے لیکن فرشتے پوچھتے ہیں کیا اچھے اعمال اس نے پہلے (آگے) بھیجے ہیں۔

(ایس۔ پی اسکاٹ)

قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسما النبی ﷺ سے اقتباس



یادوں کی مالا

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی

ساتواں باب



پُرعقیدت روحانی سفر کی حیرت انگیز روداد

یہ داستان جو میں رقم کررہی ہوں یہ کوئی عام داستان نہیں...... نہ ہی عام لوگوں کے لیے کشش کا باعث ہوگی۔ یہ داستانِ عشق ہے۔ اس عشق کی داستان جو اللہ کی کتاب سے کیا گیا۔

2005ء میرا بہت مصروف سال تھا۔ اس سال ہم نے خوب انجوائے کیا۔ ہمارے گھروں میں باری، باری ڈنر ہوتے رہے.... جس میں ڈاکٹر اخلاق احمد، ڈاکٹر صالحہ احمد، ڈاکٹر واحدی، پروفیسر ریحانہ واحدی، قمر خلیل، خلیل صاحب، انجم صاحبہ اور ان کے شوہر جلال صاحب اور میں...... یعنی ڈیفنس میں رہنے والے یہ پانچ گھر تھے۔ یہ سب باری، باری اپنے گھر میں ڈنر کرتے...... اس طرح اس سال کل آٹھ ڈنر ہوئے جس میں کچھ دوسرے لوگ بھی شرکت کرتے رہے۔ اس طرح بہت اچھا وقت گزرا...... بعد میں قمر خلیل اور انجم کی فیملی اس گیٹ ٹو گیدر سے نکل گئی۔ باقی لوگ اب بھی ڈنر کرتے ہیں اور کچھ دوسرے لوگوں کو بھی شامل کرلیتے ہیں۔

2006ء شروع ہوا تو میرے چھوٹے بیٹے جو کینیڈا میں ہیں ان کا نکاح دو جنوری کو ہوا، رخصتی ایک سال بعد ہوئی۔ سب کچھ جلدی میں طے ہوا تھا اس وجہ سے سب کچھ جلدی، جلدی ہی کیا گیا...... 13 جنوری کو کاشف واپس چلے گئے۔

اتنی مصروفیات کے باوجود اس قرآن حکیم کی کتابت 16 فروری 2006ء کو مکمل ہوگئی تھی۔ مجھے

بے حد خوشی تھی کیونکہ یہ نسخہ بہت خوب صورت تھا۔ میں چاہتی تھی کہ اسے انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد میں رکھا جائے...... سوچ رہی تھی کہ اس کام کا انتظام کیونکر ہو کہ اچانک مجھے حکیم سعید صاحب کی صاحبزادی سعدیہ راشد صاحبہ کا خیال آیا۔ میں نے انہیں ایک عدد خط لکھا اور اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

محترمہ نے اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوراً ہی انتظام کر دیا۔ میں نے اسلامک یونیورسٹی کے جناب ڈاکٹر منظور احمد سے فون پر بات کی...... بعد میں ان کے گھر جا کر ملی بھی تھی۔ وہ بے حد خوش ہوئے اور انہوں نے کہا کہ میں اسلام آباد آنے کا پروگرام بناؤں تا کہ وہ یونیورسٹی کے اندر کسی تقریب کا اہتمام کر سکیں۔ میں اسلام آباد جانے کا پروگرام نہ بنا سکی۔ یہ میرے لیے مشکل تھا۔ چنانچہ اپنے بیٹے آصف کے ذریعے قرآن حکیم اسلام آباد یونیورسٹی بھجوایا...... یہ 11 اگست 2006ء تھا جب قرآن حکیم اسلامک یونیورسٹی میں رکھا گیا۔

عجیب اتفاق ہے۔ ٹھیک 40 سال پہلے 1966ء میں 11 اگست کو میرے چچا ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی نے جو کہ اسلامک یونیورسٹی بہاول پور کے وائس چانسلر تھے... مجھے قرآن پاک تحفے میں دیا تھا۔

اس بات کا ذکر میں پیچھے کر چکی ہوں، ان دنوں میں ان کے گھر بہاول پور چھٹیاں گزارنے گئی تھی۔ شاید تاریخ اپنے آپ کو دُہراتی ہے۔ اس بار کچھ ایسا ہی ہوا۔ میں یہاں پر چچا جان کے بارے میں کچھ لکھنا چاہ رہی ہوں چونکہ اس قسم کی تحریریں ایک ڈاکومنٹس ہوتی ہیں اس وجہ سے میں درست بات لکھنا چاہ رہی ہوں۔ ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی میرے والد کے سگے پھوپی زاد بھائی تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی کا نام نور الحسن بلگرامی تھا۔ یہ دونوں بھائی بچپن ہی میں ماں باپ کی شفقت سے محروم ہو گئے تھے۔ انہوں نے ترکے میں بڑی جائداد پائی جس کی دیکھ بھال، ان دونوں بھائیوں کی پرورش، پڑھائی لکھائی سب میرے والد نے کی۔

ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی لاولد تھے۔ نورل چچا کے تین بچے ہیں، ایک بیٹا اور دو بیٹیاں، ان کا بیٹا سہیل حامد چچا نے گود لے لیا تھا اس لیے ان کا نام سہیل حامد ہے۔

چچا جان نے میرے والد کا ہمیشہ احترام کیا اور معترف بھی رہے کہ انہیں کبھی احساس نہ ہونے دیا کہ وہ یتیم ہیں۔

ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی 2 اگست 1908ء کو پیدا ہوئے اور ان کا انتقال 28 جنوری 2001ء میں ہوا۔ انہوں نے 93 سال کی عمر پائی۔ ابتدائی تعلیم سندیلہ، میٹرک ضلع ہردوئی، ہائر ایجوکیشن الہ آباد یونیورسٹی (ایم فل اور پی ایچ ڈی)

1937ء میں دہرہ دون پبلک اسکول سے سروس کا آغاز کیا۔ اس کے بعد لارنس کالج مری میں ملازمت کی پھر لندن میں College for Oriental studies میں لیکچرر مقرر ہوئے...... 1953ء میں پاکستان آئے تو ڈپٹی چیف پلاننگ بورڈ آف ایجوکیشن مقرر ہوئے۔ 1961ء میں بہاول پور اسلامک یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے اس یونیورسٹی میں وہ دس سال وائس چانسلر رہے۔ بعد ازاں حیدر آباد پبلک اسکول کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ 1977ء میں کراچی میں اسلامک سینٹر میں خدمات انجام دیں اور آخری ملازمت ان کی تمنا کے مطابق ان کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدموں میں ملی تھی۔ یعنی کنگ عبد العزیز یونیورسٹی میں کام کیا۔

انہوں نے قرآن حکیم کا ترجمہ کیا اور تفسیر لکھی جو فیوض القرآن کے نام سے 1968ء میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ آپ کی دوسری تصانیف بھی ہیں جس میں

1۔ Iqbal the poet and his message

2۔ نظریۂ تعلیم

3۔ نورِ مبین

4۔ محبِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

5۔ ندائے حرم
6۔ زادِ راہ
7۔ خزینۂ رحمت
8۔ تنویرِ سحر
9۔ حرفِ آخر

چچا جان کی دعاؤں میں بے حد اثر تھا۔ وہ بزرگ تھے، ان سے بے شمار لوگ فیض یاب ہوتے تھے، ان کے ساتھ بیٹھتے تھے، ان کی گفتگو میں شریک ہوتے تھے۔ میرے اپنے کئی اساتذہ ان کے معتقدین میں شامل تھے اور پابندی سے ان کے پاس جایا کرتے تھے۔

میرے حقیقی چچا صرف ایک تھے۔ ریحان احمد بلگرامی ایم اے (نفسیات) بی۔ایڈ، ایل ایل بی، سرائے عالمگیر جہلم کے ملٹری کالج میں پروفیسر تھے۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے ان کی نسل ختم ہوگئی۔

نویں قرآن حکیم کے بارے میں، میں ایک بات لکھنا بھول گئی۔ یہ قرآن حکیم میں نے اپنے پورے خاندان کی بخشش کی نیت سے لکھا۔ جس میں ماں، باپ، چچا، ماموں اور سب کی آل اولاد اور ان سب کے بچے وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے بعد میں نے اپنے ان تمام دوستوں کو بھی اس قافلے میں شامل کرلیا جو مجھ سے محبت کرتے ہیں یا جن کے دل میں میرا تھوڑا سا بھی خیال ہے۔ ان سب کے لیے بخشش کی دعا کی۔ اللہ تعالیٰ دعاؤں کو قبول کرنے والا ہے۔ وہ بہت زیادہ عطا کرنے والا ہے، اس کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں۔

بقول علامہ اقبال:

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے رہ روِ منزل ہی نہیں
کوئی قابل ہوتو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والے کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

یوں تو میرے انٹرویوز 1978ء ہی سے ہونے شروع ہوگئے تھے لیکن 2006ء بطور خاص میرے لیے بہت سارے انٹرویوز کا سال تھا جس میں قومی اخبار، روحانی ڈائجسٹ، نوائے وقت، دلکش ڈائجسٹ کے علاوہ ٹیلی ویژن کے متعدد چینلز پر انٹرویو نشر ہوئے۔

لبیک چینل، پی ٹی وی ون، رنگ ٹی وی، ٹی وی ٹو ڈے۔ اس کے علاوہ علی گڑھ یونیورسٹی کا صد سالہ نمبر 2006ء میں شائع ہوا۔ جس میں ''ذکیہ بلگرامی کی شخصیت اور فن''، مضمون شامل ہے۔ 2007ء میں بھی انٹرویوز کا سلسلہ جاری رہا..... سن ٹی وی اور پی ٹی وی کی صبح کی نشریات میں لائیو انٹرویو، اس کے علاوہ ماہنامہ محفل، لاہور۔ ہفت روزہ میگزین (نوائے وقت) لاہور، ماہنامہ نور، لاہور۔ آخری انٹرویو پی ٹی وی سے 11 دسمبر 2007ء کو نشر ہوا۔

2006ء میں مجھے city talent award بھی ملا۔ (Culture and art forum) کی طرف سے اس سال النسا کلب میں ریسپشن دیا گیا۔ جس میں حاجی حنیف طیب، شاہ تراب الحق، کراچی یونیورسٹی شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے کئی پروفیسرز اور بہت لوگ شامل تھے۔ ریسپشن تنظیم فلاح خواتین کی طرف سے دیا گیا تھا۔ جس کی چیئر پرسن بیگم قمر النسا قمر......(exmna) تھیں۔ النسا کلب میں دیا جانے والا ریسپشن بہت کامیاب تھا۔ اس میں سیکڑوں لوگوں نے شرکت کی۔

اس کے علاوہ بھی میرے ساتھ بہت پروگرام ہوئے جن کا ذکر کہیں نہ کہیں آیا ہوگا یا آگے آجائے گا۔

1988ء میں جناب پروفیسر خالد بزمی (مرحوم) نے مجھ پر ایک مقالہ لکھا تھا۔ (اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند کرے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے، آمین)

میرے اب تک شائع اور نشر ہونے والے انٹرویوز کی تعداد 34 ہے۔ میں نے ایک فائل بنائی ہوئی ہے، جس میں یہ تمام انٹرویوز جمع ہیں۔ میں ایک بار پھر یہ بات دُہراؤں گی کہ مجھ جیسی ایک عام سی قلم کار

کو جس قدر پزیرائی ملی وہ عام طور پر دیکھنے میں نہیں آتی۔ یہ سب کچھ قرآن حکیم کی برکت اور اللہ کی رحمت سے ممکن ہوا۔

پچھلے سال یعنی 2007ء ہی میں International library of poetry کی طرف سے امریکا میں شائع ہونے والی کتاب میں میری poem شائع ہوئی جس کا عنوان ہے۔ I cant forget the day of love (قارئین خیال رہے ذکیہ آپا کی یہ داستان 2008ء میں کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکی ہے) اس کتاب کو editors choice award بھی ملا ہے۔ اس کے علاوہ دنیا کے 45 ملکوں سے موصول ہونے والی نظموں میں سے 30 کو گیت بنانے کے لیے سلیکٹ کیا گیا جس میں یہ نظم بھی شامل ہے۔

اب میں ایک ایسی عزت افزائی اور خوش نصیبی کا ذکر کروں گی جو مجھے قرآن حکیم کی بدولت ملی۔ ہو سکتا ہے دوسروں کی نظروں میں یہ کوئی خاص بات نہ ہو مگر میرے لیے بہت ہی خاص ہے۔

پچھلے سال میں قومی عجائب گھر گئی۔ دراصل میرا وہ قرآن حکیم جو 1995ء میں وہاں رکھا گیا تھا۔ اس کی فوٹو گراف لینا چاہتی تھی۔ دوسرے میرے علم میں یہ بات آئی تھی کہ اسی میوزیم میں جناب حضرت عثمان غنیؓ کے ہاتھ کا لکھا ہوا وہ قرآن حکیم موجود ہے جس پر آپؓ کا خون گرا ہوا ہے۔ کیونکہ شہادت کے وقت آپؓ اسے پڑھ رہے تھے۔ اصل قرآن حکیم تاشقند میں ہے لیکن 1986ء میں جنرل ضیا الحق تاشقند گئے تو وہاں کے مفتی اعظم نے اس کی فوٹو کاپی بنوا کر جنرل ضیا الحق کو دی جو کراچی میوزیم کی زینت بنی۔ اس قرآن حکیم کی چار ضخیم جلدیں ہیں۔ ہر ایک کا وزن تین یا چار کلو گرام ہے..... اس کا سائز 20x16 انچ ہے۔ بہت صاف ستھرا موٹی لکھائی، خطِ کوفی میں لکھا ہوا ہے۔

مجھے انتہائی شوق پیدا ہوا کہ نہ صرف یہ قرآن حکیم دیکھوں بلکہ اس کی فوٹو گراف بھی لوں۔ جب میں میوزیم گئی اور میں نے اپنا تعارف کروایا تو قرآن سیکشن کے انچارج محمد شاہ بخاری صاحب نے میری پزیرائی کی۔ اس روز وہاں صفائی کا کام ہو رہا تھا۔ چنانچہ اگلے ہفتے میں گئی۔ تب بخاری صاحب حضرت عثمان غنیؓ کا قرآن حکیم اور میرا بھی قرآن حکیم ایک ساتھ پکڑے کمرے میں داخل ہوئے۔ میرے سامنے دونوں میز پر رکھ دیے۔

میں نے نہ صرف اپنے قرآن پاک کی تصویریں لیں بلکہ حضرت عثمان غنیؓ کے قرآن پاک کی تصویریں اتاریں اور اپنے ساتھ بھی ان کے کلام پاک کی تصویر کھنچوائی۔ جس صفحے پر آپؓ کا خون گرا ہوا ہے اس صفحے کی بھی اور اندر سے دوسری جگہ سے بھی فوٹو اتارے۔

کیا یہ مجھ ناچیز کی عزت افزائی نہیں کہ میرا اور حضرت عثمان غنیؓ کا قرآن حکیم یوں ساتھ، ساتھ لا کر میرے سامنے رکھ دیا گیا۔ بہت سی باتیں ایسی ہیں کہ جب میں سوچتی ہوں تو میری آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔ الٰہی میں اس قابل کہاں تھی کہ تو مجھے اس طرح نوازتا...... بے شمار باتیں ذہن میں آ رہی ہیں۔ میری زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں جب قرآن حکیم نے میری رہنمائی نہ کی ہو..... مجھے دلاسا دیا ہو۔ میرا سہارا نہ بنا ہو۔

مجھے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہ قول بے حد پسند ہے کہ جب میرا دل چاہتا ہے کہ میں اللہ سے باتیں کروں تو میں نماز پڑھتا ہوں اور جب میرا دل چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے باتیں کرے تو میں قرآن پڑھتا ہوں۔ واقعی قرآن پاک پڑھو تو یہی محسوس ہوتا ہے اللہ باتیں کر رہا ہے اگر کوئی انسان دل سے یہ سمجھ لے کہ یہ جو کچھ لکھا ہے دراصل اللہ کہہ رہا ہے تو پھر وہ کبھی غلط راستے پر جانے کی جرأت نہیں کرے گا۔

میں جب، جب تنہا ہوتی ہوں اللہ سے باتیں کرتی ہوں۔ اللہ کی باتیں لکھتی ہوں، تھکتی نہیں ہوں،

مجھے اللہ سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے۔ نیند لانے کا مجرّب نسخہ بھی یہی ہے۔ کثرت سے تلاوت کیجیے نیند آجائے گی۔

ایک شخص نے کسی عالم سے پوچھا۔ یہ کیا بات ہے گانا بجانا سنو تو نیند غائب ہو جاتی ہے اور قرآن حکیم پڑھنے بیٹھو فوراً نیند آنے لگتی ہے۔ عالم نے جواب دیا اگر کسی کو کانٹوں بھرے بستر پر لٹاؤ تو نیند اڑ جائے گی اور پھولوں بھرے بستر پر سلاؤ تو فوراً نیند آجائے گی۔ گانا بجانا کانٹوں بھرا بستر ہے اور تلاوت کلام پاک پھولوں کی سیج ہے۔ (سبحان اللہ)

اب میں اس شاہکار کی بات کروں گی جس کے بارے میں میں نے مہینوں سوچا...... ذہن میں طرح، طرح کے خاکے بنائے، تصورات کی دنیا میں بارہا اس کو سجایا، سنوارا اور تمنا کی کہ میرا خواب ایک دن حقیقت کا روپ دھار لے۔ اب میں ایک منفرد کلام پاک لکھنا چاہتی تھی۔

اس بار میں نے انگریزی ترجمے کے ساتھ قرآن پاک لکھنے کا پروگرام بنایا۔ انگریزی ترجمے کے لیے میں نے Marmaduke pickthali کا ترجمہ چنا۔

ایک ماہ تک میں نے بہت غور و خوض سے ترجمہ پڑھا۔ ایک سیپارے کا ترجمہ روز پڑھتی۔ یہ پرانے زمانے کی انگریزی ہے لیکن چند دنوں میں سمجھ آنے لگی۔ موجودہ گرائمر اور اس گرامر میں تھوڑا سا فرق ہے۔ میں نے ہر سیپارے کے مختصر نوٹس بھی تیار کیے۔ ہر اس آیت کو بھی کاپی کیا جو میرے ذہن کو کلک کرتی تھی۔

میں نے محسوس کیا کئی مقامات پر انگریزی ترجمہ پڑھنے سے معنی زیادہ اچھی طرح سمجھ آتے ہیں۔ اسی طرح پڑھائی کے دوران میں نے کچھ ریسرچ ورک بھی کیا۔ خاص موضوعات پر آیات چن، چن کر جمع کیں تاکہ مضامین لکھے جاسکیں۔ (کئی مضامین روزنامہ نوائے وقت میں شائع کروا چکی ہوں) اس کلام پاک کو لکھنے کے لیے آرٹ پیپر پر انتہائی خوب صورت حاشیہ ڈیزائن کروایا۔

نواں قرآن حکیم مکمل ہوئے صرف تین ماہ ہوئے تھے کہ میں نے ایک تمنا کی تکمیل کے لیے دسواں قرآن حکیم لکھنا شروع کیا۔ 19 مئی 2006ء بروز جمعہ یہ کام شروع ہوا۔ اس کو لکھنے کے لیے بہت وقت درکار تھا۔ یہ وہ قرآن حکیم ہے جس کو لکھنے کے لیے کسی خاص وقت کا تعین نہیں کیا گیا بلکہ یہ ہر وقت لکھا گیا۔ صبح، دوپہر شام ہو یا رات، تہجد کا وقت ہو یا فجر کا......آدھی رات کو آنکھ کھل جاتی تو وضو کر کے لکھنے بیٹھ جاتی۔ اچانک بجلی چلی جاتی اور کچھ لائنیں لکھنے کے لیے باقی ہوتیں تو ٹارچ کی روشنی میں پوری کرتی۔ ان دنوں میرے دل و دماغ پر صرف اور صرف قرآن حکیم کی سوچ، اسی کا خیال اور اسی کا خواب حاوی تھا۔ میں تصور کی آنکھ سے دیکھا کرتی کہ جب یہ نسخہ مکمل ہوگا اور اس کی جلد بندی ہوگی تو یہ کیسا لگے گا۔

اور آخر کار صرف 10 ماہ 21 دن کی مدت میں 10 اپریل 2007ء منگل، بہ مطابق 21 ربیع الاول 1428ھ مکمل ہوا۔

عجب اتفاق ہے کہ حضورؐ...... کی پیدائش کا انگریزی مہینہ اپریل ہے اور ہجری کے لحاظ سے ربیع الاول ... ہے تو یہ دونوں مہینے اس میں شامل ہیں، اس قرآن حکیم کو لکھنے میں 700 گھنٹے خرچ ہوئے۔

قابل غور بات یہ ہے کہ جس دوران یہ قرآن حکیم لکھا گیا وہ دنیاوی لحاظ سے میرا مصروف ترین دور تھا کیونکہ اسی دوران میرے بیٹے کاشف کی شادی ہوئی۔ وہ کینیڈا سے آئے۔ ان کا قیام تین ہفتے کا تھا اور یہ تین ہفتے جتنے مصروف ہوں گے اس کا اندازہ ہر کوئی کر سکتا ہے۔ میرے ایک بھائی جو سُرے (انگلینڈ) میں رہتے ہیں، ان کا قیام بھی ہمارے گھر تھا جو کاشف کے جانے کے بعد بھی رہے۔ لوگوں کی آمد و رفت، سب سے ملنا ملانا یہ روزانہ کا معمول تھا۔ اس

کے علاوہ میں ان دنوں روزنامہ نوائے وقت میں کالم بھی پابندی سے لکھ رہی تھی۔ ایک چیریٹی اسکول میں پڑھانے جاتی تھی۔ وہ بھی ناغہ نہیں کیا مگر جس کام کا انسان تہیہ کر لے تو پھر وہ ہو ہی جاتا ہے۔ راتیں اپنی تھیں۔ جب سب تھک کے سو جاتے تو میں قرآن حکیم لکھنے بیٹھ جاتی۔ میری تھکن اسی طرح اترتی تھی۔ اب سوچتی ہوں اتنی ضخیم کتاب اتنی کم مدت میں لکھ ڈالی میرے بس میں کہاں تھا۔ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل، اس کی رحمت میرے ساتھ شامل نہ ہوتی، اس نے تو نور عطا کیا جس کی روشنی میں، میں دوڑتی چلی گئی۔

اس قرآن حکیم کی ایک خاص بات اور بھی ہے۔ اسے میں نے اللہ تعالیٰ کے نام کیا۔ یوں تو ہمارا ہر کام اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہوتا ہے۔ سب کچھ اسی کے لیے، ہمارا جینا، مرنا، عبادت، قربانی سب اس کے لیے مگر میں نے بطور خاص اس نسخے کو اللہ تعالیٰ کے نام کیا اور اس پر جو الفاظ لکھے وہ میں یہاں نقل کر رہی ہوں۔

For

"HIM"

Who is the Lord of world, the Holy one, Peace, the Keeper of faith, the Guardian, the Majestic, the Compeller, the Superb Creater of all things, the Beneficient, the Merciful, Responsive, Clement, the Mighty, the Wise, Forgiving, the Knower, the Hear, the Seer, the Absolute, Able to do all things, Helper and the best protecting friend. I remember Him and He remembers me.

My worship and my sacrifice and my living and my dying are for Allah ,Lord of the worlds.

from: Dr.Zakia Bilgrami

جس روز یہ قرآن پاک جلد بند ہو کر آیا۔ میری خوشی دیدنی تھی۔ مجھے اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی تھی۔ یہ میرا شاہکار ہے، اس کا وزن 16 کلوگرام ہے۔ صفحات 1600 سے زائد ہیں، اس کو جس نے بھی دیکھا بے حد پسند کیا۔

2 نومبر 2007ء کو ہونے والی ایک ہمارے گھر کی گیٹ ٹوگیدر میں کافی لوگ تھے۔ جس میں ڈاکٹر وہاب جو کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہ چکے ہیں اور IBA کے ڈائریکٹر بھی، ان کی اہلیہ رضیہ وہاب جو شاعرہ بھی ہیں موجود تھیں۔ کراچی یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر ڈاکٹر اخلاق احمد، ڈاکٹر صالحہ اخلاق، ڈاکٹر احسن احمد واحدی، پروفیسر ریحانہ واحدی، ڈاکٹر فہیم صاحب (گورنر کے ایڈوائزر) ان کی بیگم پروفیسر رشیدہ فہیم (کراچی یونیورسٹی میتھس ڈیپارٹمنٹ) ڈاکٹر ہاشمی اور ان کی اہلیہ موجود تھیں۔ ڈاکٹر ہاشمی میرے سمدھی بھی ہیں، ان کی بیٹی بسمہ میری بہو ہے۔

اگرچہ ڈنر اس قرآن حکیم کے سلسلے کا نہیں تھا مگر یہ سلسلہ نکل آیا۔ قرآن حکیم کا تذکرہ ڈاکٹر اخلاق نے کیا پھر سب نے دیکھا اور بے حد پسند کیا۔ مووی بھی بنائی گئی اور تصاویر بھی لی گئیں۔ میں چاہتی ہوں اس نسخے کو پاکستان سے باہر بھیجا جائے۔ ترکی کے عجائب گھر میں یا مصر میں...... دیکھیں میری قسمت کہاں جاگتی ہے۔ اللہ تعالیٰ خود ہی کوئی نہ کوئی انتظام کر دے گا۔ اس روز ڈاکٹر وہاب کی بیگم رضیہ وہاب سے ان کا کلام سنا گیا۔ میں نے بھی اپنی دو نظمیں سنائیں۔ بہت اچھی نشست رہی۔

(باقی آئندہ)

قسط 20

اعتبارِ وفا

نگہت سیما

یہ سچ ہے کہ محبت میں وقت کا وزن نہیں ہوتا... گفتگو کا وزن نہیں ہوتا، ہر طرف تو کیا دل و دماغ تک پر ایک بے وزن سی کیفیت محسوس ہوا کرتی ہے... کہ دل و دماغ کو کوئی دوسری بات سجھائی تک نہیں دیتی۔

ایسے حالات میں کسی بھی انسان کے پاؤں جمے نہیں رہتے اور وہ ہر وقت لڑھکتا رہتا ہے۔

مگر خود کو سنبھال کر متوازن رکھنا ہی محبت کا اصل پلیٹ فارم ہے... لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس بے وزنی کے اصول کو بھی محسوس کر لیا جائے... اور مان لیا جائے... کہ محبت کا اوّلین قانون اعتبار ہے... اور وفا کے غنچے وہیں کھلتے ہیں... جس گلشن میں اعتبار کا بیج بویا جاتا ہے۔

گلاب چہروں پہ دھول کتنی مسافتوں کی جمی ہوئی ہے
چراغ آنکھوں میں جانے کتنے سفر کے جالے تنے ہوئے ہیں
نہ چھاؤں جیسی کوئی کہانی نہ جلتی دھوپوں کا کوئی حصّہ
کہاں کا ذکرِ سفر کہ پہلے قدم پہ ہم تو رُکے ہوئے ہیں





''بابر بیٹا، رکو تو، بات تو سنو...... بابی میری جان اس طرح ناراض ہوکر مت جاؤ...... دیکھو میں تمہیں سمجھاتی ہوں۔'' ممی نے اسے پھر آواز دی تھی لیکن وہ رکا نہیں تھا۔ وہ تاسف سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی تھیں۔

انہیں بابر سے محبت تھی۔ وہ لے پالک بیٹا ہی نہیں بھانجا بھی تھا۔ وہ چھوٹا سا تھا جب وہ اسے گھر لے کر آئی تھیں۔ گھر لانے سے پہلے بھی وہ انہیں دوسرے بھانجوں کے مقابلے میں زیادہ پیارا لگتا...... وہ جب بھی بہن کے گھر جاتیں تو وہ اُن کے پاس ہی جڑ کر بیٹھا رہتا۔ تب ایک روز انہوں نے اسے مانگ ہی لیا۔ گوکہ وہ کافی سمجھدار تھا جب وہ اسے گھر لائی تھیں۔ وہ رشتوں کو کسی حد تک سمجھتا اور پہچانتا تھا لیکن اس نے انہیں ممی کہنا شروع کر دیا تھا۔ اگرچہ انہوں نے اسے نہیں کہا تھا لیکن انہیں اس کا ممی کہنا بہت اچھا لگا تھا۔ جیسے بابر سچ مچ اُن کا ہی بیٹا ہو اور جب پہلی بار اس نے انہیں ممی کہا تھا اور ایمل کے ساتھ پارک میں جا کر کھیلنے کی اجازت مانگی تھی۔ تب سے ہی دل میں ایک خواہش نے جنم لیا تھا۔ بابر اور ایمل کی شادی کی خواہش...... وہ دونوں ساتھ، ساتھ کھڑے بہت پیارے لگ رہے تھے...... ''اگر وہ بابر کے ساتھ ایمل کی شادی کر دیں تو ایمل ہمیشہ ان کے ساتھ رہے گی۔ ان کی نظروں کے سامنے۔'' بابر کو پارک میں جا کر کھیلنے کی اجازت دیتے ہوئے انہوں نے سوچا تھا اور پھر وقت کے ساتھ، ساتھ یہ خواہش پنپتی رہی۔ گو کرنل حامد نے اس کی اس خواہش کی کبھی پزیرائی نہیں کی...... اور وہ یہ کہہ کر انہیں ٹال دیتے تھے۔

''یہ سب قبل از وقت ہے۔ وقت آنے پر دیکھا جائے گا، کون جانے بڑا ہو کر بابر کیا کرے گا۔ اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلے گا یا......؟''

انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی لیکن انہیں یقین تھا کہ ان کی تربیت اور ان کے گھر کا ماحول بابر کو اپنے باپ سے قطعی مختلف شخصیت میں ڈھالے گا اور ایسا ہی ہوا تھا۔ بابر نے شاندار نمبروں میں ایم بی اے کیا تھا اور تجربہ حاصل کرنے کے لیے ایک کمپنی میں جاب بھی کر لی تھی گو ان کی خواہش تھی کہ وہ کرنل حامد کے ساتھ کام کرے اور کرنل حامد نے بھی اعتراض نہیں کیا تھا۔ وہ بابر کی ایجوکیشن سے بہت مطمئن تھے اور خود وہ تو بہت ہی خوش تھیں۔ بابر کے بھائیوں میں سے کوئی بھی بی اے سے آگے نہیں جا سکا تھا۔ بابر جاب کر رہا تھا اور اب ان کے دل میں بار، بار ایمل اور بابر کی شادی کی خواہش ابھرتی تھی۔ کم از کم وہ اس رشتے کا اعلان کرنا چاہتی تھیں اور اب کے کرنل حامد نے بھی اعتراض نہیں کیا تھا سو ایک دن انہوں نے ایمل سے سرسری ساذکر کیا کہ وہ اور اس کے ڈیڈی اس کی شادی بابر سے کرنا چاہتے ہیں تو ایمل نے صاف انکار کر دیا تھا۔

''نہیں...... ہرگز نہیں، مجھے بابر بھائی سے شادی نہیں کرنی۔ اور نہ ہی میں نے کبھی ان کے متعلق اس طرح سوچا ہے۔''

''تو اب سوچ لو میری جان۔'' انہوں نے اس کی بات کو اہمیت نہیں دی تھی لیکن سوچا ضرور تھا کہ کیوں......؟ اور اس کیوں کا جواب بھی انہیں جلد مل گیا تھا جب انہوں نے باقاعدہ اس کی منگنی کے فنکشن کا پلان بنایا...... وہ اپنے کسی کلاس فیلو کو پسند کرتی تھی۔

''نہیں......''

انہیں ایمل کی بات پر یقین نہیں آیا تھا اور وہ ایک شدید صدمے سے دوچار ہو گئی تھیں۔ انہوں نے تو بابر اور ایمل کے حوالے سے بہت سارے خواب دیکھ ڈالے تھے۔ ایمل ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ یک بعد دیگرے کم عمری میں ہی فوت ہو جانے والے دو بیٹوں کی وجہ سے وہ ایمل کے لیے بہت حساس تھیں اور بابر سے شادی کی صورت میں وہ ہمیشہ اُن کی نظروں کے سامنے رہتی۔

''کیا تمہیں ہماری پسند پر اعتبار نہیں ہے۔ یقین کرو، بابر کے ساتھ تم بہت خوش رہو گی۔ وہ بہت اچھا ہے۔''

''یقیناً بابر بھائی بہت اچھے ہیں لیکن میں مدثر حسن سے محبت کرتی ہوں۔'' اس نے اعتراف کیا تھا۔ ''اور میں اس کے علاوہ کسی اور شخص کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی۔'' اس کی آنکھیں محبت کے جذبے سے دمک رہی تھیں اور لبوں پر کھلی مسکراہٹ دل میں چھپے جذبوں کو عیاں کرتی تھی۔

انہیں لگا جیسے یہ منظر پہلے بھی ان کی آنکھوں نے دیکھا اور پھر یہ الفاظ پہلے بھی ان کے کانوں نے سنے تھے۔

''بھائی پلیز آپ پاپا سے اور مما سے بات کریں ناں کہ میں ثمر حیات سے محبت کرتی ہوں اور میں اس کے علاوہ کسی کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی۔''

یہ فرح تھی فرحی...... ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھے ان کی طرف دیکھتی ہوئی اور اس کی آنکھیں یوں ہی دمک رہی تھیں...... اور رخسار کسی اندرونی جذبے کی حدت سے دہک رہے تھے۔ انہوں نے ایک جھرجھری سی لے کر ایمل کی طرف دیکھا تھا جس کی آنکھیں اب بھی جگر، جگر کر رہی تھیں اور لبوں پر وہی مسکراہٹ سجی تھی۔

''ممی پلیز......!'' انہیں اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دی تھیں۔

''آپ بابر بھائی کی فکر نہ کریں۔ ان کی شادی کسی اچھی لڑکی سے ہو جائے گی پر کوئی اور لڑکی کیوں...... مونا بھی تو ہے ناں میری فرینڈ...... کتنی پیاری اور کتنی اچھی ہے...... بس آپ ڈیڈی سے کہیں وہ ایک بار مدثر سے مل لیں...... وہ بہت اچھا ہے ممی بہت ہینڈسم بہت......'' لیکن وہ ایمل کی بات نہیں سن رہی تھیں۔ ان کے سامنے تو فرحی بیٹھی تھی ملتجی نظروں سے انہیں دیکھتی...... التجا کرتی۔

''بھائی پلیز آپ پاپا سے کہیں وہ ایک بار تو ثمر سے مل لیں۔ مجھے یقین ہے وہ اسے ریجیکٹ نہیں کر سکتے۔ وہ اتنا ذہین، اتنا اچھا ہے کہ پپا ایک بار اس سے مل لیے ناں......'' اس کی آنکھوں میں امید کے وہی دیے روشن تھے جنہوں نے اس وقت ایمل کی آنکھوں کو جگمگا رکھا تھا۔

''میں صرف ثمر کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں پھر بھی اگر وہ پپا کو پسند نہیں آیا تو......'' اس کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔

''اور کیا تاریخ اپنے آپ کو دُہرائے گی؟'' انہوں نے خوفزدہ ہو کر اپنی بیٹی ایمل کی طرف دیکھا تھا جو تقریباً وہی باتیں دہرا رہی تھیں جو اُن کی سماعتوں نے پہلے بھی سنی تھیں۔

اور پھر انہوں نے کرنل حامد کو قائل کر لیا کہ وہ ایک بار مدثر حسن سے مل لیں۔ ''کیا خبر وہ ہماری بیٹی کو ڈیزرو کرتا ہو۔'' اور کرنل حامد، مدثر حسن سے ملے تھے اور اس کے بابا جان سے بھی...... انہیں مدثر حسن پسند آیا تھا۔ ایک ویل ایجوکیٹڈ شریف خاندان کا لڑکا بظاہر اس میں رد کرنے والی کوئی بات نہیں تھی لیکن پھر بھی انہوں نے انکار کر دیا تھا۔ وہ ان کے اسٹیٹس سے میل نہیں کھاتا تھا۔ ایمل ان کی اکلوتی، لاڈلی بیٹی تھی وہ کیسے اس کی شادی کسی ایسے شخص سے کر دیتے جس کے پاس اپنا ذاتی گھر تک نہیں تھا۔ وہ کرائے کے گھر میں رہتے تھے۔ وہ ایمل کو وہ تمام سہولتیں اور آسائشیں نہیں دے سکتا تھا جن کی وہ عادی تھی۔ اس نے تو کبھی کسی کمتر چیز پر کمپرومائز نہیں کیا تھا۔ اس کی چوائس تو ہمیشہ اعلیٰ رہی تھی۔ وہ بھلا کیسے ایک متوسط گھرانے میں زندگی گزار سکتی تھی یہ کرنل حامد کا خیال تھا لیکن ایمل ایسا نہیں سمجھتی تھی...... اس کے نزدیک محبت میں ان ساری باتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اس کی بھیگی پلکیں سوجی آنکھیں......

''کیا تاریخ اپنے آپ کو دُہرا رہی ہے؟'' انہوں نے خوفزدہ ہو کر ایک بار پھر سوچا تھا او۔ کیا ایمل بھی فرحی کی طرح......

اور انہوں نے کرنل حامد سے ایک بار پھر مدثر کے متعلق بات کی تھی وہ ایمل کی وکالت کر رہی تھیں۔ کیونکہ وہ ایمل تھی، ان کی اکلوتی بیٹی اور فرحی...... وہ ان کی بیٹی نہیں تھی وہ صرف فرحی تھی۔ کرنل حامد کی بہن اور یہ ایمل

تھی..... ان کی اپنی بیٹی..... پوزیشن ایک ہی تھی مگر رشتوں کے فرق سے کتنی بدل گئی تھی۔

''ایمل، مدثر کو پسند کرتی ہے حامد صاحب۔'' دبے لہجے اور دھیمی آواز میں انہوں نے بات شروع کی تھی۔

''ہاں جانتا ہوں..... لیکن ایمل ابھی نا سمجھ ہے، میں مدثر کو ایمل کے لیے موزوں نہیں سمجھتا..... اس کے پاس تو اپنا ذاتی گھر تک نہیں ہے پھر.....''

''اس کے بابا جان نے بتایا تو تھا کہ انہوں نے پلاٹ خریدا ہوا ہے گھر بھی بن جائے گا۔ سوائے اس کے کہ وہ ہمارے جتنے دولت مند نہیں ہیں اس میں اور کوئی برائی تو نہیں ہے۔'' انہوں نے وکالت کی۔

''پھر بھی میں ایمل کے لیے اسے پسند نہیں کرتا اور میں نے مبشر حسن صاحب سے معذرت کرلی ہے۔'' ان کا لہجہ حتمی تھا۔ اور کسی خوف نے جیسے ان کے دل کو کسی فولادی پنجے میں جکڑ لیا تھا۔

''نہیں، میں تاریخ کو دُہرانے نہیں دوں گی۔'' انہوں نے دل ہی دل میں کہا تھا۔ ان چند دنوں میں انہوں نے جان لیا تھا کہ ایمل، مدثر کو کتنی شدت سے چاہتی ہے۔ ایمل نہ صرف شکل صورت میں ان کی نند فرحی سے مشابہ تھی بلکہ اس کی بے حد لاڈلی بھی تھی دونوں کی عمروں میں صرف تیرہ سال کا فرق تھا لیکن وہ ہر بات میں فرحی کی تقلید کرتی تھی۔ ان کی کئی عادات بھی ایک جیسی تھیں۔''

''تو کیا ایمل بھی فرحی کی طرح.....؟''

''نہیں۔'' کرنل حامد جیسے ان کے دل پر ابھرتی تحریر پڑھ رہے تھے۔

''ایمل کو میرا ہر فیصلہ قبول ہے۔ اس نے یہی کہا ہے مجھ سے وہ فرحی نہیں ہے کہ.....'' بات ادھوری چھوڑ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئے تھے اور وہ ساکت بیٹھی رہ گئی تھیں۔ وہ نام جو وہ زبان پر لاتے ہوئے ڈر رہی تھیں، کرنل حامد کے لبوں سے بے اختیار نکل گیا تھا اور کتنے سالوں بعد اس گھر کے در و دیوار نے فرحی کا نام سنا تھا۔

فرح..... کرنل حامد کی چھوٹی اور بے حد لاڈلی بہن جو اُن سے اور آپی سے پورے پندرہ سال چھوٹی تھی۔ آپی اور کرنل حامد جڑواں تھے اور اپنے سے پندرہ سال چھوٹی بہن کے بہت لاڈ اٹھاتے تھے۔ اور صرف وہی نہیں مما، پپا کی بھی وہ بے حد لاڈلی تھی اور آپی کی شادی کے بعد تو وہ کرنل حامد کے اور بھی قریب ہوگئی تھی ذرا، ذرا سی بات پر اس کے آنسو نکل آتے تھے اور کرنل حامد نے اسے ہتھیلی کا پھپھولا بنا رکھا تھا۔ وہ (ایمل کی ممی) جب بیاہ کر آئی تھیں تو انہیں کرنل حامد کا فرحی کو اتنی زیادہ، اہمیت دینا کھلا تو تھا لیکن انہوں نے اپنے کسی طرزِ عمل سے اس کا اظہار نہیں کیا تھا بلکہ فرحی کے ساتھ ان کا رویہ بہت اچھا تھا سو فرحی ان کے گرد دیوانہ وار گھومتی تھی اور اپنے دل کی ہر بات ان سے ہی کہتی تھی اسے بقول حامد صاحب کے ان کی شکل میں آپی کا نعم البدل مل گیا تھا۔ ایمل کی آمد کے بعد انہیں خیال گزرا تھا کہ شاید اب فرحی کی اہمیت کچھ کم ہوجائے لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ کرنل حامد اب بھی ہر ایک پر اسے ترجیح دیتے تھے اور شاید تب ہی ان کے اندر کہیں گہرائی میں فرحی کے لیے ایک گانٹھ پڑگئی تھی لیکن وہ خود اس گانٹھ سے بے خبر تھیں۔

فرحی تیرہ سال کی تھی جب ایمل پیدا ہوئی تھی۔ وہ ایمل کا نام اپنی فلسطینی دوست کے نام پر رکھنا چاہتی تھیں جو لندن میں ان کی پڑوسی ہونے کے ساتھ، ساتھ ان کی کلاس فیلو بھی تھی لیکن فرحی کو ایمل نام پسند تھا اور کرنل حامد نے فرحی کی پسند کو ترجیح دی تھی تب انہیں بہت برا لگا تھا اس لیے انہوں نے اسے چندا کے نک نیم سے بلانا شروع کردیا تھا پھر گھر میں، باہر سب ہی اسے چندا کہہ کر بلانے لگے تھے۔ انہیں تو کبھی پتا ہی نہیں چلا تھا کہ معمولی، معمولی باتوں نے ان کے دل میں فرحی کے لیے کتنا بغض بھر دیا ہے۔ اور اس کا اندازہ انہیں تب ہوا تھا جب پپا اور کرنل حامد نے ثمر حیات کے پروپوزل کو ریجیکٹ کردیا تھا ان کے اندر ایک عجیب کمینی سی خوشی رقص کرنے لگی تھی۔ اپنی شادی کے گیارہ سالوں بعد انہوں نے پہلی بار فرحی کی کسی خواہش کو رد ہوتے دیکھا تھا۔ کرنل حامد نے کئی بار اس کی بات ٹال دی تھی

لیکن انہوں نے فرحی کی کبھی کوئی بات نہیں ٹالی تھی اور وہ اس کمینی سی خوشی کو دل میں چھپائے بظاہر اس کے آنسو پونچھتی رہی تھیں۔ اسے گلے لگا کر تسلی دیتی رہی تھیں اور وہ رو، رو کر کہہ رہی تھی۔

''میں ثمر کے سوا کسی دوسرے شخص کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی۔ پپا نے مجھے جس کسی شخص کے ساتھ بھی بیاہا وہ کتنا بھی اچھا کیوں نہ ہو لیکن میں اس کے ساتھ زندگی نہیں گزار پاؤں گی۔ دیکھ لیجیے گا، میں زیادہ دن جی نہیں پاؤں گی، مر جاؤں گی اور پھر سب روتے رہنا مجھے۔''

اور وہ سب روئے تو تھے اسے لیکن وہ مری نہیں تھی۔ ان سے دل کی ہر بات کرنے والی فرحی نے انہیں اپنے دل کا یہ بھید نہیں دیا تھا کہ وہ دل میں کیا ٹھانے بیٹھی ہے۔ اس نے کہا تھا وہ مر جائے گی لیکن مرنے کے بجائے اس نے رات کے اندھیرے میں گھر چھوڑ دیا تھا اور مما، پپا، کرنل حامد سب کو جیسے زندہ درگور کر دیا تھا...... لیکن وہ بے حد مطمئن تھیں انہوں نے فرحی سے کبھی نفرت نہیں کی تھی لیکن اندر کہیں کوئی جیلسی تو تھی ہی۔ جب کرنل حامد فرحی کی موجودگی میں اسے اور ایمل کو نظر انداز کرتے تھے تو شاید اندر کہیں کوئی کانٹا سا چبھ جاتا تھا۔ اور شاید یہی چبھن تھی کہ انہوں نے اسے اسپتال کے گیٹ سے ہی بھگا دیا تھا۔ پپا کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور فرحی پشیمان سی لوٹ آئی تھی۔ اپنی غلطی پر شرمندہ تھی۔ پپا سے معافی مانگنا چاہتی تھی۔ انہیں بتانا چاہتی تھی کچھ...... لیکن انہوں نے اسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا...... بلکہ انہوں نے اس معزز شخص کی بات بھی سن کر نظر انداز کر دی تھی جو بتا رہا تھا کہ فرحی کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا تھا اور وہ تو راستے سے ہی پلٹ آئی تھی اور بعد میں فرحی نے کتنے فون کیے تھے۔ روئی تھی، گڑگڑائی تھی لیکن انہوں نے اسے واپس نہیں آنے دیا۔ مما، پپا اور کرنل حامد سے بات نہیں کرنے دی۔

''تم ہمارے لیے مر چکی ہو فرحی۔'' وہ اس لمحے کتنی سفاک ہو چکی تھیں ورنہ اگر وہ مما، پپا سے بات کرتی تو کیا وہ اس کی ساری بات سن کر اسے معاف نہ کر دیتے...... لیکن وہ نہیں چاہتی تھیں کہ وہ واپس آئے...... ہاں ان کے اندر یہی خواہش چھپی ہوئی تھی لیکن بظاہر انہوں نے اس سے کہا تھا۔

''تم کیا چاہتی ہو فرحی کہ تم یہاں آؤ اور حامد تمہیں قتل کر کے جیل چلے جائیں۔ پھانسی ہو جائے انہیں، خدا کے لیے ہم پر رحم کرو۔'' اور اس گھر کے در و دیوار تک فرحی کو بھول گئے...... پھر کسی نے اس گھر میں اس کا ذکر نہیں کیا تھا...... ہاں جب تک مما زندہ رہیں وہ کبھی کبھار پپا سے کہتی تھیں۔

''ہماری بیٹی ایسی تو نہیں تھی ملک صاحب، کیا تھا اگر ہم ہی اس کی بات مان لیتے ثمر برا لڑکا تو نہیں تھا...... بس ہمارے طبقے سے نہیں تھا۔'' اور ایسے میں لمحہ بھر کے لیے ان کے دل میں ندامت کا احساس جاگتا اور معدوم ہو جاتا...... پھر جب آپی بیوہ ہو کر واپس حامد ولا میں آئیں تو کتنی ہی بار انہوں نے پوچھا تھا۔

''کیا فرحی نے یہاں سے جانے کے بعد کبھی فون نہیں کیا بھابی...... کبھی مما اور پپا سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی...... کبھی معافی مانگنے کے لیے ہی سہی فون کیا ہو؟''

''نہیں......'' وہ نظریں چرا لیتی تھیں۔

''وہ اتنی کٹھور تو نہیں تھی اتنی سنگدل...... وہ تو سب سے بہت محبت کرتی تھی...... پھر کیسے اس نے ہم سب کا دل دکھایا۔'' ان کی پلکیں بھیگ جاتیں آواز بھرا جاتی...... پھر ہولے، ہولے انہوں نے بھی فرحی کا ذکر کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اب ایمل ان کی لاڈلی تھی...... انہوں نے آپی سے کہا تھا کہ وہ کرنل حامد کو راضی کر لیں...... مدثر اتنا دولت مند نہیں تو کیا ہوا...... ہمارا سب کچھ ایمل ہی کا تو ہے۔ ہم ایمل کو وہ سب دے دیں گے جس کی ایمل کو ضرورت ہو گی۔ لیکن آپی بھی بھائی کو قائل نہیں کر سکی تھیں اور وہ اپنے خوف کو دل میں چھپائے بولائی، بولائی سی کبھی آپی کے پاس اور کبھی ایمل کے پاس آ کر بیٹھ جاتی تھیں۔ ایمل کی بھیگی پلکیں سرخ آنکھیں دیکھ کر انہیں فرحی بہت یاد آتی۔

وہ اگر چاہتیں تو یہ گھر فرحی کے لیے شجرِ ممنوعہ نہ رہتا۔ فرحی لوٹ آتی تو سب کو اس کی بات کا یقین آ ہی جاتا۔ ''یا اللہ میری غلطی کی سزا میری بچی کو نہ دینا۔'' ہمہ وقت ان کے لبوں سے دعا نکلتی رہتی اور پھر جیسے انہونی ہوگئی۔ اللہ نے ان کی دعا سن لی تھی۔ کرنل حامد نے مدثر کا پرپوزل قبول کرلیا تھا۔

''میں نے مدثر کا پرپوزل اس لیے قبول نہیں کیا کہ مجھے ایمل پر اعتبار نہیں ہے اور مجھے ڈر ہے کہ وہ بھی فرحی کی طرح گھر چھوڑ کر چلی نہ جائے...... نہیں بالکل نہیں۔'' انہوں نے انہیں بتایا تھا۔ ''مجھے اس پر اعتبار ہے، یقین ہے کہ میں جہاں اس کی شادی کروں گا وہ سر جھکا دے گی لیکن بس وہ خوش نہیں رہ سکے گی۔ شاید پھر وہ کبھی کھل کر ہنس نہ سکے گی اور میں اپنی بیٹی کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری بیٹی اپنی پوری زندگی سمجھوتے کی نذر کردے۔'' کرنل حامد نے ایکسٹینشن پر سنی جانے والی ایمل اور مدثر کی گفتگو بھی انہیں بتائی تھی اور پھر ایمل، مدثر کے سنگ رخصت ہوگئی تھی، وہ مدثر کے ساتھ بہت خوش تھی۔ اس کے گالوں پر گلاب چٹکتے تھے اور آنکھوں میں جگنو دمکتے تھے۔ کرنل حامد اور وہ ایمل کو خوش دیکھ کر مطمئن تھے...... مسرور تھے۔ مدثر واقعی ایمل کو ڈیزرو کرتا تھا لیکن پھر کیا ہوا، ان کی خوشیوں کو نظر لگ گئی تھی۔ اور کرنل حامد ایک بار پھر ایمل کی خوشی اور رضا کے لیے مجبور ہوگئے تھے حالانکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ایمل اس طرح جلدی میں کوئی فیصلہ کرے...... ان دنوں انہیں پھر فرحی بہت یاد آنے لگی تھی۔ انہوں نے فرحی کے ساتھ جو کچھ کیا تھا ایمل کو اس کی سزا ملی تھی۔ ان دنوں وہ فرحی کو بہت سوچنے لگی تھیں۔ تب ہی تو وہ انہیں خواب میں دکھائی دی تھی۔ مما، پپا کے درمیان بے حد خوش، خوش کھڑی انہیں شکوہ بھری نظروں سے دیکھتی، گلہ کرتی ہوئی......

''آپ نے میرے لیے میرے گھر کے دروازے بند کردیے تھے۔ آپ دروازہ کھولتیں تو مما اور پپا مجھے معاف کردیتے۔ دیکھیے انہوں نے مجھے معاف کردیا ہے۔''

ایک اذیت دیتا احساسِ جرم دل کو بھینچتا رہتا تھا کیا خبر مما، پپا اور کرنل حامد بھی اس کی بات نہ سنتے لیکن یہ احساس کہ انہوں نے لاشعوری طور پر اسے مما، پپا سے ملنے نہیں دیا تھا۔ انہیں ہر وقت اپ سیٹ رکھتا تھا اور کرنل حامد نے اسے ایمل کے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی سمجھتے ہوئے فوراً ہی بابر کا پرپوزل قبول کرلیا تھا۔ حالانکہ وہ ایمل کے ساتھ جلدی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اس حادثے سے سنبھل جائے تو تب وہ اس کی شادی کے متعلق سوچیں گے لیکن پھر سب کچھ جلدی، جلدی ہوگیا۔ بابر شادی کے فوراً بعد ہی ایمل کے ساتھ کراچی چلا گیا تھا اور کرنل حامد نے اسے کراچی میں کاروبار سیٹ کرنے کے لیے ہر طرح کی مدد کی تھی۔ خود انہوں نے اپنے اکاؤنٹ سے بہت سارا پیسہ نکال کر اس کے حوالے کیا تھا تاکہ اسے نئے کاروبار کو جمانے میں کوئی پریشانی نہ ہو۔ اگرچہ ان کی خواہش تھی کہ بابر یہاں لاہور میں ہی رہ کر ان کے ساتھ کام کرے لیکن پھر خود انہوں نے ہی اسے سمجھایا تھا کہ اگر وہ اپنے طور پر کچھ کرکے خود کو آزمانا چاہتا ہے تو یہ اچھی بات ہے...... بابر اور ایمل ایک خوشگوار اور مطمئن زندگی گزار رہے تھے۔ ممی نے جب بھی ایمل سے پوچھا کہ وہ بابر کے ساتھ خوش ہے تو ایمل نے ہر بار انہیں یقین دلایا کہ وہ بہت خوش اور مطمئن ہے اور ان سے شرمندہ ہے کہ اس نے ایک غلط شخص کا انتخاب کرکے ان کا دل دکھایا، انہیں تکلیف پہنچائی۔ وہ مطمئن تھیں لیکن انہیں کبھی اس کے چہرے پر وہ خوشی نظر نہیں آئی تھی جو مدثر کی ہمراہی میں اس کے وجود سے چھلکتی تھی۔ وہ بہت سنجیدہ اور کم گو ہوگئی تھی۔ انہوں نے کبھی اسے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں کی جگمگاہٹیں ماند پڑ گئی تھیں پھر بھی وہ مطمئن تھیں۔ ہاں انہیں اس بات کا ضرور گلہ تھا کہ بابر ان کی بیٹی کو ان سے دور لے گیا ہے۔

''سب کی بیٹیاں شادی کے بعد اپنے والدین سے دور چلی جاتی ہیں۔'' کرنل حامد انہیں تسلی دیتے تھے۔

''لیکن میں نے ایسا نہیں سوچا تھا کہ بابر کے ساتھ شادی کے بعد ایمل دور چلی جائے گی۔''

''تو اب سوچ لو۔'' کرنل حامد مسکراتے، وہ اپنی بیٹی کی پُر سکون اور مطمئن زندگی سے خوش تھے خاص طور پر ارتفاع کے ساتھ بابر کی محبت نے انہیں بے حد مطمئن کر دیا تھا۔ وہ اکثر ان سے بابر کی تعریف بھی کرتے تھے لیکن پھر ایکا ایکی ایسا کیا ہوگیا تھا کہ وہ بابر سے متنفر ہو گئے تھے اور اس کا اکثر اظہار کرنے لگے تھے کہ انہوں نے بابر کے ساتھ ایمل کی شادی کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے...... کل شام سے پہلے تک وہ اس کا سبب نہیں جانتی تھیں لیکن کل رات ان کے وارڈ روب سے ان کے کپڑے نکالتے ہوئے ان کے کوٹ کی جیب سے ایک خط نکلا تھا۔ یہ کوٹ ان کے استعمال میں رہتا تھا۔ اور غالباً اس روز بھی انہوں نے یہی کوٹ پہنا ہوا تھا جس صبح انہیں اسپتال ایڈمٹ کروانا پڑا تھا۔ انہوں نے یہ کپڑے یتیم خانے میں بھجوانے کے لیے نکالے تھے اور پاکٹ وغیرہ چیک کر رہی تھیں کہ یہ خط جو اُن کے ہی نام تھا انہیں ملا...... کل رات سے اب تک نہ جانے کتنی بار وہ یہ خط پڑھ چکی تھیں اور ہر بار یہی خط پڑھ کر انہیں دھچکا لگتا تھا...... انہوں نے قریب ہی پڑا ہوا اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور ایک بار پھر وہ خط نکال کر پڑھنے لگیں۔

''یہ خط تمہیں میری موت کے بعد ملے گا...... میں نہیں جانتا تھا میرے پاس کتنا وقت ہے۔ میرا دل بہت کمزور ہو چکا ہے۔ مجھے لگتا ہے یہ دل اب کوئی صدمہ برداشت نہیں کر سکتا۔ ہوسکتا ہے زندگی مجھے اتنی مہلت دے، دے کہ میں یہ سب کچھ تم سے زبانی کہہ سکوں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مجھے تم سے کچھ کہنے کی مہلت نہ ملے اس لیے احتیاطاً یہ خط لکھ رہا ہوں۔ ابھی خود تم سے یہ سب اس لیے نہیں کہنا چاہتا کہ میں خود بہت سی باتوں کی متعلق کنفرم نہیں ہوں اس لیے تمہیں دکھی نہیں کرنا چاہتا، ہوسکتا ہے سب غلط ہو لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کچھ غلط نہیں ہے...... بابر کے متعلق مجھے کچھ ایسی اطلاعات ملی تھیں کہ میں خود جا کر اُن کی تصدیق کرنا چاہتا تھا لیکن پھر دل دھوکا دے گیا ہے، یہ اسی روز کی بات ہے جب مجھے پہلا اٹیک ہوا تھا اُس صبح مجھے بابر کی دوسری شادی کا پتا چلا تھا۔ وہ جو یہاں بزنس کے بہانے آتا تھا دراصل اپنی بیوی کے پاس...... یہ اطلاع صحیح تھی یا غلط میں ابھی تک اس کی تصدیق نہیں کر سکا ہوں...... میں ایما کی شادی بابر کے ساتھ کبھی بھی کرنے کا کبھی خواہاں نہیں تھا شاید ناصر نوید کی وجہ سے لیکن پھر تمہاری خواہش تھی اور بعد میں بابر کے رویے نے مجھے بھی مطمئن کر دیا...... بابر کے متعلق مجھے کس نے بتایا اور کیسے......؟ اس کی تفصیل زندہ رہا تو پھر کبھی مختصراً ناصر نے نشے میں کہیں بک دیا تھا کہ بابر نے ایمل سے شادی صرف اس کی دولت حاصل کرنے کے لیے کی ہے اور یہ کہ اس کی ایک اور بیوی بھی ہے۔ ایک مخلص نے ہی مجھے بتایا۔ مجھے یہ سمجھ میں نہیں آرہی کہ اگر یہ سب کنفرم ہوگیا تو میں کیا کروں گا...... ایمل کو کیا بتاؤں گا اب جبکہ اس کے بچے جوان ہو گئے ہیں...... وہ ایک مطمئن زندگی گزار رہی ہے۔ ایسے میں میرا رویہ اور ردِّعمل کیا ہونا چاہیے، مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی ہے۔ اس کشمکش نے مجھے گھبراہٹ میں مبتلا کر دیا ہے۔ سینے کے اندر ایک ہلچل مچی ہے، میں نے کچھ اقدامات کیے ہیں جن کے متعلق ہمدانی صاحب اور وکیل صاحب سے تمہیں پتا چل جائے گا...... میں جانتا ہوں یہ انکشاف تمہارے لیے بھی تکلیف دہ ہوگا...... ایسے میں تمہیں تنہا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا لیکن موت پر کسی کا اختیار نہیں ہے۔ ایک اور خیال بار، بار میرے ذہن میں آتا ہے کہ مدثر کے خلاف سازش کی گئی تھی۔ وہ سچا تھا اور یہ سازش بابر نے کی تھی ایمل سے شادی کرنے کے لیے۔ خدا کرے کہ میرا یہ خیال غلط ہو۔

تمہارے ذمے ایک اور کام بھی سونپ رہا ہوں۔ بہت دنوں سے یہ خیال میرے دل میں تھا کہ میں فرحی کو تلاش کر کے اس کا شرعی حق اسے دے دوں...... لیکن اس سے پہلے کہ میں اسے تلاش کرتا بابر کی شادی کی اطلاع نے مجھے ڈھا دیا۔ پاپا کی جائداد میں فرحی کا جتنا بھی حصہ بنتا تھا میں نے اس کے پیپرز فرحی کے نام سے تیار کروا دیے ہیں۔ تم نے اسے تلاش کرنا ہے۔ وہ اگر اس دنیا میں نہیں بھی رہی تو اس کی اولاد میں سے تو ضرور کوئی ہوگا۔ تمہیں یہ

کام ضرور کرنا ہے۔ کل رات میں نے اسے خواب میں دیکھا، وہ میرے پاس بیٹھی تھی، بالکل اپنے بچپن کی طرح اپنا ایک ہاتھ میرے بازو پر رکھے ہولے، ہولے کچھ کہتی ہوئی...... میرا دل کہتا ہے میری رفیق کہ میں نہیں بچوں گا۔ تمہیں سب کچھ سنبھالنا ہے اور سارے معاملات کو ہینڈل کرنا ہے، یہ خط میں ہمدانی صاحب کو دے جاؤں گا تم ہر معاملے میں ان پر ٹرسٹ کر سکتی ہو۔ اور آخر میں مجھ سے تمہارے حقوق کی ادائیگی میں کبھی کوئی غفلت ہوئی ہو یا کبھی میں نے تم سے کوئی زیادتی کی ہو تو مجھے معاف کر دینا۔''

انہوں نے خط پڑھ کر پھر بیگ میں رکھ دیا تھا۔

''کیسے...... میں کیسے ہینڈل کروں گی سب اگر بابر کے متعلق ہر بات سچ نکلی تو......؟ ایمل سے کیا کہوں گی اور پھر فری کو کہاں ڈھونڈوں گی؟'' وہ سوچتے، سوچتے تھک گئی تھیں۔ اُن کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

بابر بالکل غیر متوقع طور پر آیا تھا لیکن انہوں نے بابر کو کچھ نہیں جتایا تھا۔ خط کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی تھی تاہم وہ ہمیشہ کی طرح گرم جوشی سے نہیں ملی تھیں...... بابر کا لہجہ اور اس کا مطالبہ ظاہر کر رہے تھے کہ کرنل حامد کو جو اطلاعات ملی تھیں ان میں کہیں نہ کہیں کوئی سچ ضرور تھا لیکن وہ بابر سے کوئی بھی بات کرنے سے پہلے ہمدانی صاحب سے بات کرنا چاہتی تھیں۔ یقیناً انہیں بہت ساری ایسی باتوں کا بھی علم ہوگا جن کا ذکر کرنل حامد نے اپنے خط میں نہیں کیا تھا۔ کرنل حامد کو ہمدانی صاحب پر بہت بھروسا تھا اور انہیں ان سے ہی مشورہ کرنا تھا اور وہ ان سے ملنے کے ارادے سے ہی تیار ہو کر لاؤنج میں آئی تھیں کہ بابر آ گیا تھا۔ بابر کے رویے سے وہ بہت ہرٹ ہوئی تھیں انہوں نے ہاتھوں کی پشت سے اپنی نم آنکھیں پونچھیں اور ہینڈ بیگ اٹھا کر کھڑی ہو گئیں...... انہیں ہمدانی صاحب کی طرف جانا تھا، وہ ملازمہ کو اپنے جانے کا بتا کر لاؤنج سے باہر نکل آئیں۔

☆☆☆

رواحہ آنکھیں موندے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ انہوں نے فریج سے جوس کا ڈبا نکالا، گلاس میں جوس ڈالا اور گلاس ٹیبل پر رکھ کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھا...... رواحہ نے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا۔

''رواحہ میری جان جوس پی لو۔''

''ابھی کچھ دیر پہلے تو آپ نے مجھے سیب کھلایا تھا۔'' وہ مسکرایا۔

''تو اتنا خون بھی تو ضائع ہوا ہے ناں میرے بچے کا۔'' انہوں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور اس کے پیچھے تکیے درست کر کے رکھے اور جوس کا گلاس اٹھا کر اسے دیا تب ہی عظام نے اندر قدم رکھا۔

''بڑی خاطریں کروا رہے ہو بابا سے۔''

''ہاں تو میرے بابا ہیں ناں۔''

اس نے بہت فخر، محبت اور مان سے ان کی طرف دیکھا تو وہ بھی مسکرا دیے اور عظام کے ہاتھ میں پکڑے شاپرز دیکھ کر ناراضی سے بولے۔

''یار یہ تم پھر اتنا کچھ اٹھا لائے ابھی تو فریج بھرا پڑا ہے۔''

''تو کیا ہوا بابا۔'' اس نے مڑ کر اپنے پیچھے آتے خدا بخش کی طرف دیکھا اور شاپرز اسے پکڑائے۔

''چاچا انہیں فریج میں رکھ دیں اگر بہت زیادہ سامان ہے تو وارڈ میں مریضوں کو تقسیم کر دیں۔''

خدا بخش نے اس کے ہاتھ سے شاپرز پکڑ لیے۔

''تو اور کیا، جاتے ہوئے سب بانٹ جائیں گے۔ مریض دعائیں دیں گے صاحب، ابھی تو رکھ رہا ہوں۔ کیا خبر کب تک ادھر رہنا ہے۔''

''زیادہ نہیں چاچا...... ابھی کچھ دیر پہلے ڈاکٹر صاحب راؤنڈ پر آئے تھے انہوں نے کہا ہے کہ کل تک ڈسچارج کر دیں گے۔''

''اللہ کا شکر ہے صاحب آپ کے بغیر تو گھر ویران، بیاباں لگتا ہے۔'' خدا بخش سامان فریج میں رکھ کر مڑا اور محبت پاش نظروں سے رواحہ کی طرف دیکھنے لگا۔

''سچ کہتا ہوں گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے...... میں تو کل سارا دن گیٹ پر ہی بیٹھا رہا، اندر دل گھبراتا تھا۔''

''دل گھبراتا تھا یا ڈر لگتا تھا؟'' عظام نے شرارت سے اسے دیکھا اور رواحہ کے بیڈ پر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''ڈر کس بات کا بیٹا......؟ بس خالی گھر میں دل گھبراتا تھا۔''

خدا بخش سادگی سے کہتا ہوا دیوار کے ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھ گیا اور ان کی طرف دیکھا۔

''اللہ جانے کون ہمارے بچے کے دشمن ہو گئے ہیں۔ پہلے گھر پر دھاوا بول دیا اور اب...... میں تو کہتا ہوں صاحب واپس لاہور چلیں...... بہت رہ لیا یہاں۔''

''ٹھیک کہتے ہو خدا بخش، میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' عظام اور رواحہ دونوں نے ایک ساتھ چونک کر انہیں دیکھا۔ وہ کسی سوچ میں گم صوفے پر بیٹھے تھے۔

''کیا واقعی بابا آپ لاہور جانے کا سوچ رہے ہیں؟'' رواحہ نے حیرت سے پوچھا تو انہوں نے سر ہلا دیا۔

''موت تو اپنے وقت پر ہی آنی ہے بابا...... پھر ہم ڈر کر اپنا گھر اپنا شہر کیوں چھوڑ دیں...... اور ظفری سے تو میں خود بات کر لوں گا بابا۔''

''ارے ہاں ظفری آیا تھا یہاں تمہاری عیادت کو۔'' عظام کو یک دم یاد آیا۔

''کون ظفری......؟'' رواحہ چونکا۔

''کب آیا تھا؟''

''جب تم آئی سی یو میں تھے، بکے لے کر آیا تھا۔''

''لیکن کیوں......؟'' اسے حیرت ہوئی۔ ''اسے بھلا کیا ضرورت تھی آنے کی وہ تو خود ہی......''

''شاید وہ تمہاری کنڈیشن معلوم کرنا چاہتا ہو یا پھر شو کرنا چاہتا ہو کہ وہ اس سارے معاملے سے بے خبر ہے۔'' عظام کو بابا کی موجودگی کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔

''ربش......'' رواحہ کے ماتھے پر شکنیں سی پڑیں۔

''کون ظفری...... وہی ناں جو کسی ایم این اے کا بیٹا ہے اور خواہ مخواہ ہی رواحہ کا دشمن بن گیا ہے۔'' انہوں نے متوحش نظروں سے عظام کی طرف دیکھا تو عظام دل ہی دل میں نادم ہوا اسے بابا کے سامنے ظفری کا ذکر نہیں کرنا چاہیے تھا۔

''تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں عظام...... میں اس سے پوچھتا تو کہ میرے بچے نے اس کا کیا بگاڑا ہے۔ وہ کیوں اس کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ اتنے سارے لڑکے آئے تھے۔ ان میں ظفری کون سا تھا۔''

''بابا پلیز ریلیکس......'' عظام بیڈ سے اٹھ کر ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔''

''کیسے پریشان نہ ہوں عظمی بیٹا! کیا وہ پھر کبھی رواحہ کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔ اتنے سارے یونیورسٹی فیلوز سے تم نے ملوایا مجھے...... ان میں سے آخر کون تھا وہ تم نے مجھے کیوں نہیں ملوایا؟'' انہوں نے بے چینی سے پوچھا تو عظام نے کسی قدر جھجکتے ہوئے بتایا۔

''آپ ملے تو تھے اس سے بابا...... وہ ظفر سومرو تھا۔ سب اسے ظفری کہتے ہیں۔''
''تمہارا مطلب ہے ظفر سومرو ہی وہ ظفری ہے جو...'' ان کے لبوں پر آنے والی مسکراہٹ بے اختیار تھی۔ وہ اس روز سمجھ نہیں پائے تھے کہ ظفری نے جاتے ہوئے کس بات پر سوری کیا تھا اور اس کی آنکھوں میں اتنی شرمندگی کیوں تھی لیکن اب انہیں جو اور اک ہو رہا تھا اس نے اُن کے پورے وجود میں سکون واطمینان کی لہریں دوڑا دی تھیں۔ یکا یک وہ بے حد مطمئن نظر آنے لگے تھے۔ کتنے دنوں سے وہ بے سکون اور بے چین تھے کبھی سوچتے یہاں سے گھر بار فروخت کر کے لاہور چلے جائیں۔ کبھی سوچتے پولیس میں رپورٹ درج کروائیں کہ ان کے بیٹے کی جان کو خطرہ ہے کبھی خود جا کر ظفری سے بات کرنے کا پروگرام بناتے کبھی خیال آتا رواحہ کو سمجھائیں کہ وہ ارتفاع کا خیال چھوڑ دے۔ دنیا بھری پڑی ہے اچھی لڑکیوں سے ضروری نہیں کہ صرف ارتفاع ہی...... پھر خود ہی ہر خیال کو رد کرتے چلے جاتے۔ انہیں لگتا کہ ان کے پاس صرف ایک ہی آپشن ہے کہ وہ یہاں سے کہیں اور چلے جائیں کسی چھوٹے سے شہر یا قصبے میں۔

''بابا آپ پریشان نہ ہوں۔'' عظام نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ ''پاپا آئیں گے شام کو تو پھر سوچتے ہیں کیا کرنا ہے۔''

''نہیں، میں بالکل بھی پریشان نہیں ہوں۔'' وہ کھل کر مسکرائے تھے۔ ''اور تم لوگوں کو بھی پریشان ہونے اور ظفری سے الجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اب رواحہ کو پریشان نہیں کرے گا۔ کبھی اس کے راستے میں نہیں آئے گا۔'' انہوں نے بے حد یقین سے کہا۔ جبکہ رواحہ اور عظام نے انہیں بے حد حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

''آپ اتنے یقین سے ایسا کیسے کہہ رہے ہیں بابا؟'' رواحہ نے خالی گلاس جسے وہ بہت دیر سے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھا ذرا سا جھک کر بیڈ کے ساتھ پڑی چھوٹی ٹیبل پر رکھا اور اس کے لبوں سے کراہ نکلی...... عظام اور وہ ایک ساتھ اٹھے تھے۔

''کیا کرتے ہو بیٹا...... ابھی تمہارے زخم کچے ہیں۔'' وہ ہولے، ہولے اس کا بازو سہلانے لگے۔

''میں ٹھیک ہوں بابا لیکن آپ کی بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی ہے۔ آپ ظفری کو نہیں جانتے، وہ بہت شیطان صفت ہے۔''

''تھوڑا بہت تو میں اسے جانتا ہی ہوں میری جان، وہ میرا اسٹوڈنٹ رہا ہے کچھ عرصہ۔''

''تو کیا آپ اس کے پاس جا کر منت کریں گے چونکہ آپ اس کے ٹیچر رہے ہیں لہٰذا وہ آپ کے بیٹے کو کچھ نہ کہے۔ نہیں بابا پلیز مجھے یہ پسند نہیں ہے۔ میں خود دیکھ لوں گا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔''

''نہیں میری جان، مجھے اس کے پاس جانے اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے جان لیا ہے کہ تم میرے بیٹے ہو تو یہ بہت کافی ہے۔'' ان کے لہجے میں بلا کی طمانیت تھی...... رواحہ نے کندھے اچکائے اسے ان کے یقین پر اب بھی حیرت تھی۔ تب عظام ہولے، ہولے اسے بتانے لگا کہ کیسے بابا نے ایک بار اس کی زندگی بچائی تھی۔ بات مکمل کر کے وہ اس کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔

''تو یہ بات ہے بابا لیکن......'' رواحہ اب بھی متذبذب تھا۔

''ہوں۔'' انہوں نے مسکرا کر اس کا بازو تھپتھپایا۔

''اس نے جاتے ہوئے مجھے سوری کہا تھا۔ وہ فطرتاً اچھا لڑکا ہے لیکن اس کے ماحول نے اسے کچھ اس طرح کا بنا دیا ہے۔''

وہ ایسے ہی تھے بالکل ماں، باپ کی طرح جو اولاد کی غلطیوں کے باوجود انہیں سینے سے لگاتے ہیں اور ہمیشہ

ان سے اچھی توقع رکھتے ہیں۔ انہیں بھی ہمیشہ اپنے شاگردوں سے اچھی توقع رہتی ہے وہ ہمیشہ پُرامید رہتے تھے۔
رواحہ اور عظام نے ان کی بات پر تبصرہ نہیں کیا۔ دل مطمئن ہوا تو تھکن بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ رتجگوں سے بوجھل آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

''روی بیٹا میں کچھ دیر کے لیے گھر جا رہا ہوں فریش ہو کر آتا ہوں۔ عظام اور خدا بخش ہیں ناں یہاں۔''

''بالکل یہی بات میں آپ سے کہنے والا تھا بابا۔'' عظام مسکرایا۔

''آپ گھر جا کر آرام کریں۔ باتھ لے کر سو جایئے گا۔ رات کو بھی مت آیئے گا۔ میں رات کو اِدھر ہی رہوں گا۔ جواد بھی آجائے گا۔ خدا بخش چاچا کو بھی ساتھ لے جائیں، ان کی ضرورت نہیں ہے یہاں۔''

انہوں نے سر ہلایا اور جھک کر رواحہ کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

''او کے میری جان۔''

تب ہی دروازے پر دستک ہوئی اور انہوں نے مڑ کر دیکھا۔

''آجائیں......''

دروازہ کھول کر اندر آتی ارتقاع کو دیکھ کر اُن کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''آؤ، آؤ بیٹا آجاؤ......

''السلام علیکم......'' ارتقاع نے مشترکہ طور پر سب کو سلام کیا اور ہاتھ میں پکڑے پھول رواحہ کے سرہانے رکھے۔

''کیسے ہو؟''

''بہت بہتر......!'' رواحہ کی آنکھیں یک دم جگمگا اٹھی تھیں۔

''اور تھینک یو رتی!'' اس نے پھولوں کی طرف اشارہ کیا۔ اور پھر اس کی نظروں نے ارتقاع کے چہرے کا طواف کیا۔ ارتقاع کے رخساروں پر سرخی سی جھلکی۔ وہ ذرا سا پیچھے ہٹی۔

''بیٹھ جاؤ بیٹا۔'' انہوں نے خدا بخش کی خالی کی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کیا اور پھر پہلے رواحہ کو اور پھر اسے دلچسپی سے دیکھا، وہ آج اسے تیسری بار دیکھ رہے تھے۔

رواحہ کے حادثے والے دن روتی ہوئی، زیرِ لب دعائیں مانگتی، انہوں نے چند بار اسے سرسری سا دیکھا تھا۔ اور اس کے لیے اپنائیت بھی محسوس کی تھی کیونکہ اس کی آنکھوں میں جو آنسو تھے اور لبوں پر جو دعائیں تھیں وہ ان کے رواحہ کے لیے تھیں...... لیکن وہ خود اتنے پریشان تھے کہ انہوں نے اس وقت اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ دوسری بار وہ کل اپنی کچھ کلاس فیلوز لڑکیوں کے ساتھ آئی تھی اور وہ انہیں رواحہ کے کمرے میں چھوڑ کر خود ثمر حیات کے ساتھ وزیٹرز روم میں آکر بیٹھ گئے تھے اور ثمر حیات نے انہیں کھل کر مٹھا سائیں کے متعلق بتایا تھا کہ وہ کتنے... بارسوخ لوگ ہیں اور انہوں نے کیوں رواحہ کو ان کا نام لینے سے منع کیا ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ وہ ظفیری کی اس حرکت کو فراموش کر دیں گے، وہ ضرور کچھ ایسا کریں گے کہ آئندہ ایسا کچھ بھی نہ ہو۔ ثمر حیات نے انہیں تسلی دی تھی لیکن وہ پھر بھی بہت بے چین تھے اور انہوں نے رواحہ کی کلاس فیلوز کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی اور جب جاتے ہوئے ارتقاع نے انہیں خدا حافظ کہا تھا تب بھی انہوں نے اس پر ایک سرسری سی نظر ڈالی تھی لیکن اس وقت وہ بہت اطمینان اور سکون سے اسے دیکھ رہے تھے۔ انہیں وہ بہت اپنی، اپنی سی لگی تھی اور انہوں نے دل ہی دل میں رواحہ کی پسند کو سراہا تھا۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے یکا یک ان کی نظریں اس کی بائیں ابرو کے اوپر چھوٹے سے سیاہ تل پر پڑی تھیں۔ اور غیر ارادی طور پر ان کا بایاں ہاتھ اوپر اٹھا اور انہوں نے شہادت کی انگلی سے اپنے بائیں ابرو کے

اوپر پیشانی پر موجود تل کو چھوا اور اس...... اس کی پیشانی پر بھی تو یونہی بائیں ابرو کے اوپر ایسا ہی سیاہ تل تھا، ان کا دل ان کے سینے کے اندر تیزی سے دھڑکا یوں جیسے ابھی سینے کی چار دیواری توڑ کر باہر آ جائے گا...... تل کو سہلاتا ان کا ہاتھ بے اختیار نیچے گرا اور دل پر ٹھہر گیا۔

''اور کیا وہ...... پتا نہیں وہ کہاں ہوگی، کیسی ہوگی...... اور پتا نہیں وہ میرے متعلق جانتی ہوگی یا نہیں...... اور پتا نہیں اس کا نام کیا ہوگا؟'' انہوں نے کبھی پوچھا ہی نہیں۔ جتنی بار بھی وہ اس سے ملنے گئے اسے گود میں لیتے ہی سب کچھ بھول جاتے تھے۔ بس اسے دیکھتے تھے، چومتے تھے...... اور بے خود سے ہو جاتے تھے...... اور وہ ان کی گڑیا تھی۔ چاندنی تھی، روشنی تھی۔ دل ہی دل میں انہوں نے اسے کتنے نام دے رکھے تھے۔ لیکن چندا اسے کس نام سے پکارتی تھی۔ اس نے اس کا کیا نام رکھا تھا، وہ نہیں جانتے تھے۔ بچوں کی پیدائش سے پہلے چندا نے کتنے ہی نام سوچ رکھے تھے۔ لڑکے ہوئے تو یہ نام رکھیں گے لڑکیاں ہوئیں تو یہ نام......

انہوں نے دل ہی دل میں ان سارے ناموں کو یاد کرنے کی کوشش کی جو اکثر چندا ان کے سامنے دہراتی رہتی تھی لیکن ان یاد آنے والے ناموں میں ارتقاع نام تو کہیں نہیں تھا...... اور پھر یہ لڑکی جس کے بائیں ابرو کے اوپر پر پیشانی پر ننھا سا سیاہ تل تھا اور جس نے ان کے دل کو مٹھی میں لے لیا تھا۔ پتا نہیں کون تھی...... یہ وہ تو نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ تو...... جب وہ رواحہ کو لے کر کراچی آ رہے تھے تو آخری بار دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر انہوں نے حامد ولا میں فون کیا تھا۔ وہ اس سے ملنا نہیں چاہتے تھے...... وہ صرف اس کی خیریت جاننا چاہتے تھے۔ اس کے بارے میں معلوم کرنا چاہتے تھے کہ وہ کیسی ہے اور وہ صرف ممی سے یا کرنل حامد سے بات کرنا چاہتے تھے، کسی اور سے بات کرنے کے تصور سے ہی وہ خوفزدہ ہو جاتے تھے اور ممی نے نہ صرف ان کی بات سنی تھی بلکہ ان سے بات بھی کی تھی۔

''ہم نے اس کی شادی کر دی ہے اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ باہر چلی گئی ہے۔ اور اس کا شوہر اس کی بیٹی کو بے تحاشا چاہتا ہے۔ بالکل اپنی بیٹی کی طرح اس سے محبت کرتا ہے۔ اس لیے تم مطمئن رہو...... جہاں تک اپنی بچی سے ملنے کی بات ہے تو چندا نے وہاں ہی سیٹلڈ ہونے کا فیصلہ کیا ہے اگر کبھی وہ ہم سے ملنے پاکستان آئی بھی تو میں تمہیں یہی مشورہ دوں گی کہ تم اس سے مت ملنا، وہ بابی کو ہی اپنا باپ سمجھتی ہے، وہ ڈسٹرب ہو جائے گی۔ تم باپ ہو اس کے یقیناً اس کی بہتری ہی چاہو گے۔'' ممی نے دھمکی نہیں دی تھی۔ خوفزدہ نہیں کیا تھا لیکن مشورہ انہوں نے بھی یہی دیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی بھلائی کے لیے اس سے دور ہی رہے۔ ایک گہری سانس لے کر انہوں نے پھر ارتقاع کی طرف دیکھا تھا جو ہاتھ گود میں دھرے بیٹھی تھی اور گاہے گاہے نگاہ اٹھا کر رواحہ کی طرف دیکھتی تھی۔ اور جب وہ رواحہ کی طرف دیکھتی تو اس کا چہرہ چمک اٹھتا تھا اور اس لڑکی کے ماتھے پر بائیں ابرو کے اوپر چھوٹا سا سیاہ تل بار، بار انہیں ماضی کی طرف دھکیلتا تھا۔

''بیٹا آپ شروع سے ہی پاکستان میں ہیں یا کچھ عرصہ ملک سے باہر بھی رہی ہیں؟'' وہ بے اختیار پوچھ بیٹھے۔

''نہیں، انکل میں کبھی ملک سے باہر نہیں گئی۔ ہم لوگ یہاں کراچی میں ہی رہتے ہیں بلکہ میری پیدائش سے پہلے بھی پاپا یہاں ہی رہتے تھے۔ اپنے بزنس کے سلسلے میں، میرے دادا، دادی گوجرانوالہ میں رہتے ہیں اب بھی۔''

ارتقاع نے بتایا تو انہوں نے سر ہلا دیا۔

''تو یہ...... وہ نہیں ہوسکتی۔'' دل کے اندر مایوسی نے پر پھیلائے تاہم اس سے انہوں نے اپنے دل میں اس

کے لیے بے حد محبت محسوس کی...... یہ جو کوئی بھی تھی ان کے رواحہ کی پسند تھی۔
''بیٹا آپ مجھے انکل کے بجائے بابا کہو گی تو مجھے خوشی ہو گی۔ یہ رواحہ کے دوست عظام اور جواد وغیرہ سب ہی مجھے بابا کہتے ہیں اور آپ تو......'' انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔
''جی۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔ ''مجھے بھی آپ کو بابا کہنا اچھا لگے گا۔''
''رئیلی......!'' انہوں نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔
لانبی پلکیں، صاف رنگت، دلکش نقوش انہوں نے بے حد دلچسپی اور اپنائیت سے اسے دیکھا۔ ان کا جی چاہا وہ کچھ دیر اور رک جائیں، باتیں کریں، اس سے اس کے خاندان، والدین سب کے متعلق پوچھیں۔ آخر انہیں رواحہ کے لیے اس کے گھر جانا تو ہو گا تو انہیں پہلے سے کچھ تو علم ہو اس کی فیملی کے متعلق......
''کس کے ساتھ آئی ہو؟'' عظام کو اچانک خیال آیا تھا۔
''اپنے ساتھ......'' وہ ہولے سے ہنسی۔ ''یعنی میری گاڑی ورکشاپ سے آگئی ہے۔''
''لیکن تمہارے پاپا تو تمہیں نئی گاڑی لے کر دے رہے تھے۔'' عظام کو یاد آیا تھا۔
''ہاں لے کر تو دے رہے تھے لیکن ماما نے منع کر دیا۔'' اس نے برا سا منہ بنایا۔
''اوہ ویری سیڈ......'' عظام نے شرارت سے اسے دیکھا۔
''افسوس کی ضرورت نہیں ہے، پاپا نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اگلے مہینے مجھے میری پسند کی گاڑی لے دیں گے۔''
''یعنی تم پاپا کی جیب خالی کرنے کا پکا ارادہ کیے ہوئے ہو۔'' عظام کی آنکھوں میں اب بھی شرارت تھی۔
''پاپا کو فرق نہیں پڑتا پچیس تیس لاکھ سے یہ تو ماما نے خواہ مخواہ ہی منع کر دیا انہیں لیکن پاپا پروا نہیں کرتے ان کی باتوں کی۔''
انہیں لگا جیسے اچانک کوئی بھاری وزنی چیز ان کے دل پر آ گری ہو۔ ان کا دل جیسے ڈوب کر ابھرا تھا۔ ایک مانوس سی دکھن سارے وجود میں پھیلتی ہوئی سی محسوس ہوئی تھی۔ تو کیا رواحہ نارسا رہے گا۔ یہ اتنے امیر آدمی کی بیٹی ہے، شاید کوئی بڑا بزنس مین جس کے لیے پچیس تیس لاکھ کوئی اہمیت نہیں رکھتے اور رواحہ ایک ڈیڑھ لاکھ ماہوار تنخواہ پانے والے پروفیسر کا بیٹا...... رواحہ جس کی بچپن سے لے کر اب تک ہر خواہش پوری کی تھی۔ تو کیا اب یہاں آ کر نارسائی اس کا مقدر بننے والی ہے۔
خدا بخش نے انہیں جوس کا گلاس پکڑایا تو وہ دل پر بھاری بوجھ لیے بیڈ پر بیٹھ گئے۔ ضروری تو نہیں رواحہ کے ساتھ ایسا ہو۔ پچیس سالوں میں بہت سی اقدار اور روایات بدل گئی تھیں۔ لوگ بچوں کی پسند کو اہمیت دینے لگے تھے۔ ایسے، ایسے گھرانے جہاں خاندان سے باہر شادی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، وہ خاندان اور برادری سے باہر رشتے کر رہے تھے۔ ہو سکتا ہے ارتفاع کے والدین بھی ارتفاع کی پسند کو اولیت دیتے ہوئے رواحہ پر کوئی اعتراض نہیں کریں۔ انہوں نے خود کو تسلی دی اور گھونٹ، گھونٹ جوس پینے لگے۔ خدا بخش اب پھل کاٹ رہا تھا اور وہ منع کر رہی تھی اُن کی نظریں بھٹک، بھٹک کر اس کی بائیں ابرو کے اوپر پیشانی پر موجود تل پر پڑتیں تو وہ کھو سے جاتے اور پھر اس کی طرف دیکھتے، دیکھتے وہ بہت پیچھے ماضی میں چلے گئے تھے۔ جب دن بے چینی سے اور راتیں تڑپتے گزرتی تھیں۔ وہ انہیں بے حد یاد آتی تھی۔ وہ سرخ و سپید قلقاریاں مارتی بار، بار ان کے تصور میں آتی تو وہ...... بے چین ہو جاتے۔ پتا نہیں کیسے انہوں نے خود کو روک رکھا تھا لیکن کبھی، کبھی لگا میں ہاتھوں سے چھوٹ جاتیں تو وہ حامد ولا پہنچ جاتے اور گھنٹوں باہر منڈلاتے رہتے کہ شاید کہیں وہ کسی ملازمہ کی گود میں نظر میں آ جائے۔ کبھی پارک میں جا کر بیٹھ جاتے۔ کیا خبر کوئی ملازمہ اسے پارک میں لائے تو وہ بس ایک نظر اسے دیکھ لیں لیکن پھر گھبرا کر واپس

آ جاتے اگر چندا کے کزن نے انہیں وہاں دیکھ لیا تو کہیں وہ ان کی بچی کو نقصان نہ پہنچا دے۔ اور ان کی اس ذہنی کیفیت سے بے خبر اُن کے بابا جان ان دنوں بے حد خوش تھے۔ وہ اکثر خدا بخش کے ساتھ اس کی شادی کی باتیں کرتے رہتے تھے اور وہ اپنی بے چینیاں بابا جان سے چھپاتے، کتنے عرصے بعد وہ ذرا سے پُرسکون ہوئے تھے اور ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ فوراً جا کر مونا کی والدہ سے ثنا کے لیے بات کریں۔ لیکن مونا کی والدہ مونا کے بیٹے کی پیدائش کی وجہ سے مونا کے پاس ملتان گئی ہوئی تھیں اور بابا جان ہر دوسرے تیسرے دن حنا یا ثنا سے ان کی واپسی کے متعلق پوچھتے تھے۔ اس شام وہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے بظاہر ٹی وی دیکھ رہے تھے لیکن ان کا سارا دھیان اپنی بیٹی کی طرف تھا کہ وہ اب تو تھوڑی اور بڑی ہو گئی ہوگی...... اب تو شاید بات بھی کرتی ہو...... ماما، پاپا بلاتی ہوئی، لڑکھڑا کر چلتی ہو اور گرنے سے پہلے ہی چندا اسے تھام لیتی ہو...... وہ اپنے آپ میں اتنے گم تھے کہ انہیں بالکل بھی خبر نہیں تھی کہ پاس بیٹھے بابا جان اور خدا بخش کیا بات کر رہے ہیں۔

''تمہارا کیا خیال ہے بیٹا؟''

بابا جان نے ایک دم انہیں مخاطب کیا تو وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔

''کیسا خیال بابا جان!''

''میں خدا بخش سے کہہ رہا تھا کہ کیوں نہ گاؤں سے تمہاری پھپو کو بلوا لیں میں نے اُدھر فون کیا تھا ثنا بتا رہی تھی کہ ایک دو روز میں اس کی امی آ جائیں گی تو میں نے سوچا تمہاری پھپو ہوں گی تو مونا کی والدہ سے ذرا سلیقے، قرینے سے بات کر لیں گی۔''

''جی بابا جان جو آپ مناسب سمجھیں، میں جا کر پھپو کو لے آتا ہوں۔'' انہوں نے آہستگی سے جواب دیا تھا۔

''تم راضی تو ہو ناں بیٹا...... دل سے راضی ہو، ایسا نہ ہو کہ مجھے شرمندہ ہونا پڑے۔ وہ بچی جو تمہارے حوالے سے اس گھر میں آئے گی اس کے بھی بہت سے خواب ہوں گے۔'' بابا جان بغور انہیں دیکھ رہے تھے۔

''بابا جان!'' انہوں نے بے بسی سے ان کی طرف دیکھا تھا۔

''میں پوری کوشش کروں گا کہ اسے مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو اور اس کی کسی قسم کی کوئی حق تلفی ہو اور آپ کو شرمندہ ہونا پڑے لیکن بابا جان مجھے تھوڑا وقت اور دے دیں۔ بے شک بات ابھی کر لیں لیکن رخصتی کے لیے کچھ وقت زیادہ نہیں تھوڑا بس چند ماہ......''

''ارے میری جان، وہ کون سا رخصتی کے لیے تیار بیٹھے ہوں گے۔ ابھی تو سال پہلے ایک بیٹی کو رخصت کیا ہے یوں تو میں نے سوچ رکھا ہے انہیں کہہ دوں گا ہمیں کچھ نہیں چاہیے سوائے ثنا بیٹی کے لیکن لڑکی والے ہیں کچھ تو وقت چاہیے ہوگا انہیں بھی۔ پھر مونا کے والد ملک سے باہر ہیں۔ ابھی تو مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ اقرار کرتے ہیں یا انکار، ہو سکتا ہے انہوں نے کہیں بات طے کر رکھی ہو۔ جب سے ہم اس گھر میں آئے ہیں زیادہ رابطہ بھی تو نہیں ہے۔'' بابا جان نے لمبی بات کی تھی۔

''تو بابا جان پلیز آپ رہنے دیں ناں......'' انہوں نے بے حد زخمی نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

''مونا چندا کی دوست تھی اور چندا نے وہ ساری باتیں مونا کو بھی تو بتائی ہوں گی اور پتا نہیں وہ میرے متعلق کیا سوچتے ہوں گے کہ میں ایسا ہوں...... بدکردار...... عیاش۔''

''نہیں......'' بابا جان بے حد طمانیت سے مسکرائے تھے۔ ''بے شک مونا سے چندا نے یہ سب کہا ہوگا لیکن وہ کانوں کی کچی نہیں ہے۔ تمہاری علیحدگی کے بعد دو تین بار ان سے بات ہوئی۔ گھر پر بھی آئیں۔ انہیں چندا کی عقل پر افسوس تھا اور انہوں نے کسی بات پر یقین نہیں کیا تھا۔''

اور وہ خاموش ہوگئے تھے۔ ان کا دل اب کسی بھی لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کو نہیں چاہتا تھا۔ انہیں رفاقتوں، محبتوں اور وفاؤں پر اعتبار نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن بابا جان کی خاطر...... صرف ان کے دل کے اطمینان کے لیے وہ یہ زہر پینے کو تیار ہوئے تھے۔

"ربّا مجھے ہمت اور حوصلہ دینا کہ میں ایمانداری کے ساتھ اس تعلق کو نبھا سکوں جو بابا جان جوڑنا چاہتے ہیں۔" انہوں نے دل ہی دل میں دعا کی تھی۔ تب ہی بابا جان نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"جانِ پدر چلو آج اپنی بیٹی سے ملنے چلتے ہیں۔"

"نہیں......" ان کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ ان کا رنگ یک دم زرد پڑ گیا تھا اور آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا تھا۔

"نہیں......" انہوں نے جھرجھری سی لی تھی، آنکھوں کے سامنے اپنی گڑیا کی خون میں لت پت لاش آ گئی تھی۔

بابا جان پریشان سا ہو کر انہیں دیکھنے لگے تھے اور ان کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گئے تھے اور ان کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے بہت شفقت اور محبت سے پوچھا بھی تھا۔

"کیا بات ہے جانم، کون سی بات تمہیں پریشان کر رہی ہے...... کیا اپنے بابا جان سے شیئر نہیں کرو گے۔"

"کچھ نہیں بابا جان...... کوئی بات نہیں۔" انہوں نے نظریں چرائی تھیں۔

"تو پھر تم اپنی ہی بیٹی سے ملنے سے کیوں کترانے لگے ہو۔ جب بھی ملنے کی بات کرتا ہوں ٹال دیتے ہو۔" بابا جان نے وہ بات پوچھ لی تھی جس کا وہ جواب نہیں دینا چاہتے تھے۔

"ایسے ہی بابا جان شاید وہ لوگ پسند نہیں کرتے کہ میں اس سے ملنے جاؤں۔" انہوں نے بابا جان کی طرف نہیں دیکھا۔

"پسند نہیں کرتے تو نہ کریں پسند۔" غیر ارادی طور پر بابا جان کی آواز بلند ہوئی تھی۔ "وہ ہماری بچی ہے، ہمارا خون ہے، ہمارا حق ہے کہ ہم اس سے ملیں۔ میری خود کرنل صاحب سے بات ہوئی تھی انہیں اس بات پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ ہم ہفتہ دس دن بعد اپنی بچی سے ملنے جائیں بلکہ میں تو یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ وہ ذرا بڑی ہو جائے تو ہم اسے گھر لایا کریں گے۔ اس کا جی چاہا تو وہ یہاں رک بھی جایا کرے گی۔ چلو بیٹا اٹھو ابھی چلتے ہیں۔ میں نے تو اسے بہت چھوٹا سا دیکھا تھا۔ تم ان کی پسند ناپسند کا سوچ کر خود پر جبر مت کرو...... چلتے ہیں بلکہ مغرب کی اذان ہو رہی ہے۔ پڑھ کر نکلتے ہیں۔"

"بابا جان......!" وہ ضبط کرتے، کرتے تھک چکے تھے۔ اُن کی آنکھیں خون رنگ ہوئیں اور پھر چھلک پڑیں۔

"بابا جان......" وہ بے دردی سے لب کچل رہے تھے۔

"میری جان۔" بابا جان نے انہیں اپنے ساتھ لگا لیا تھا اور ان کے کندھے پر سر رکھے، رکھے وہ رو پڑے تھے۔ اور پھر وہ سب کچھ انہوں نے بابا جان سے کہہ دیا تھا جو چندا کے کزن نے ان سے کہا تھا۔

بابا جان ساری بات سن کر لمحہ بھر کے لیے تو ساکت رہ گئے تھے اور پھر اپنے ہاتھوں سے ان کے آنسو پونچھے تھے۔

"اتنے دنوں سے دل پہ یہ بوجھ لیے پھر رہے ہو اور مجھ سے ذکر تک نہیں کیا۔ میں کرنل صاحب سے خود جا کر بات کرتا...... ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ کس طرح کر سکتا ہے وہ ہماری بچی کے ساتھ ایسا اور کیوں؟"

''اور کرنل صاحب آپ کی بات کا یقین کر لیتے بابا جان...... ہرگز نہیں......کبھی نہیں...... وہ سمجھتے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ اور وہ شخص میری بیٹی کو غصے اور ضد میں آ کر مار دیتا پھر......؟ نہیں بابا جان مجھے اپنی بیٹی کی زندگی چاہیے۔ وہ جیتی رہے، زندہ رہے، ہم ملیں یا نہ ملیں۔'' ان کے اعصاب کمزور پڑ چکے تھے۔ وہ ہولے، ہولے لرزنے لگے تو بابا جان نے انہیں اپنے ساتھ لگا کر کھینچ لیا اور انہیں ہولے، ہولے تھپکتے رہے تھے دلاسا دیتے رہے تھے کہ وہ کچھ نہ کچھ کر لیں گے۔ کسی دوست سے مشورہ کریں گے وکیل سے بات کریں گے۔ کرنل صاحب سے بہت سوچ سمجھ کر بات کریں گے۔

''لیکن بابا جان اگر وقتی طور پر سب ٹھیک بھی ہو جائے تو اسے رہنا تو چندا کے پاس ہی ہے ناں...... اور وہ شخص بعد میں بھی...... نہیں بابا جان پلیز آپ کچھ نہیں کریں گے۔ ہم جی لیں گے۔ ہم اس کے بغیر بھی جی لیں گے۔ بس وہ جیتی رہے، زندہ رہے، خوش رہے۔''

''وہ انشاء اللہ جیتی رہے گی۔''

بابا جان کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ مغرب کا وقت کب کا گزر چکا تھا۔ خدا بخش نے دوبار آ کر کھانے کے لیے پوچھا تھا لیکن دونوں نے ہی منع کر دیا تھا...... کتنی ہی دیر وہ لاؤنج میں بیٹھے رہے تھے...... گاہے، گاہے بابا جان سر اٹھا کر سوچتی نظروں سے انہیں دیکھتے۔ آہستگی سے ان کا بازو تھپتھپا کر خاموشی کی زبان میں تسلی دیتے اور پھر کسی سوچ میں ڈوب جاتے۔

''بابا جان آپ جا کر آرام کریں اور پریشان مت ہوں...... میں ٹھیک ہوں، آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ وقت ہر زخم کا مرہم ہوتا ہے...... تو یہ زخم بھی ایک دن بھر جائے گا اور پھر جب آپ کی بہو آ جائے گی، بچے ہوں گے تو......'' وہ شعوری کوشش سے مسکرایا تھا۔

''ہاں......'' وہ چونک کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے...... لیکن وہ اس کی بات پر مسکرائے نہیں تھے۔

''تم بھی آرام کرو...... اور دودھ پی لینا کھانا بھی نہیں کھایا تم نے۔''

''جی بابا جان......'' انہوں نے ساتھ ہی خدا بخش کو آواز دی تھی۔

''خدا بخش بابا جان کے لیے بھی دودھ گرم کر کے لے جانا۔'' اور بابا جان نے جاتے، جاتے مڑ کر انہیں دیکھا تھا۔ ان کی پیشانی پر تفکر سے لکیریں سی پڑی تھیں اور آنکھوں سے کرب جھانکتا تھا۔ ایسا کرب جو دل کو ریزہ، ریزہ کرتا تھا...... بے اختیار ان کا جی چاہا تھا وہ انہیں روک لیں، ان سے کہیں بابا جان پلیز ابھی اپنے بیڈروم میں مت جائیں یہاں ہی بیٹھیں میرے پاس۔ آپ پاس ہوں تو دل کو تقویت ملتی ہے۔ لیکن انہوں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ بابا جان اپنے بیڈروم میں چلے گئے تھے اور ان کا دل جیسے ڈوب کر ابھرا تھا۔ بابا جان کے کندھے جھکے ہوئے تھے ان کی چال میں تھکن تھی۔ ان کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک وہ وہاں ہی بیٹھے بابا جان کے متعلق سوچتے رہے تھے۔ بیس سال کی عمر میں باپ بن جانے والے ان کے بابا جان نے اپنی پوری زندگی اپنے بیٹے کے لیے وقف کر دی تھی اور اب ان کی وجہ سے ان کے کندھے چوالیس، پینتالیس سال کی عمر میں ہی جھک گئے تھے۔ ان کی وجہ سے بابا جان نے دکھ اٹھایا تھا اور اب ایک بار پھر انہوں نے انہیں پریشان کر دیا تھا...... دکھی کر دیا تھا۔ انہیں پچھتاوا ہونے لگا۔ کاش وہ صبر کر لیتے، ضبط سے کام لیتے اور بابا جان کو کچھ نہ بتاتے۔ کچھ دیر پہلے خدا بخش سے باتیں کرتے ہوئے وہ کتنے خوش نظر آ رہے تھے...... اور اب کتنے نڈھال اور تھکے، تھکے سے تھے۔ ان کا کتنی ہی بار جی چاہا کہ وہ اٹھ کر بابا جان کے پاس جائیں اُن کے پاس ہی ان کے بیڈ پر لیٹ جائیں اور انہیں یقین دلائیں کہ انہیں اس بات کا کوئی دکھ نہیں ہے کہ وہ اپنی بیٹی سے مل نہیں سکتے۔ لیکن وہ اٹھ ہی نہیں سکے...... بس یونہی خالی دل اور خالی ذہن

کے ساتھ بیٹھے رہے تھے۔ کاش انہیں علم ہوتا کہ وہ اس شفیق چہرے کو پھر نہیں دیکھ سکیں گے۔ یہ محبت سے گندھا وجود ان سے بچھڑنے والا ہے تو وہ کبھی انہیں جانے نہ دیتے یا پھر خود اُن کے ساتھ چلے جاتے۔ انہیں کیا خبر تھی کہ یہ شفیق چہرہ منوں مٹی تلے چھپ جائے گا۔ یہ محبت بھری آواز پھر کبھی ان کے کانوں میں نہیں آئے گی۔ کاش وہ یہ جانتے ہوتے۔ خدا بخش دودھ رکھ گیا تھا جو پڑے، پڑے ٹھنڈا ہو گیا تھا لیکن وہ یونہی بیٹھے رہے تھے۔ پتا نہیں رات کا کون سا پہر تھا جب وہ اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھے تھے۔ ایک لمحے کے لیے ان کا جی چاہا تھا وہ اپنے بیڈ روم میں جانے کے بجائے بابا جان کے کمرے میں چلے جائیں لیکن پھر ان کی بے آرامی کے خیال سے وہ اپنے کمرے میں آ گئے تھے۔ رات بہت دیر سے ان کی آنکھ لگی تھی اور صبح ان کی آنکھ خدا بخش کی چیخوں سے کھلی تھی۔ وہ رو رہا تھا۔ انہیں بلا رہا تھا۔ وہ ننگے پاؤں بھاگتے ہوئے بابا جان کے بیڈ روم میں آئے تھے۔ وہ آنکھیں بند کیے ابدی نیند سو رہے تھے...... وہ پھٹی، پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگے تھے۔

''نہیں......'' انہوں نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

''نہیں بابا جان اس طرح تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ یہ خدا بخش اس طرح کیوں پاگلوں کی طرح چلا، چلا کر رو رہا ہے۔'' ''خدا بخش......'' وہ اتنی زور سے چیخے تھے کہ ان کی آواز پھٹ گئی تھی۔

''اس طرح کیوں چلا رہے ہو؟ بابا جان جاگ جائیں گے۔''

اور خدا بخش کی چیخیں اور بلند ہو گئی تھیں۔

وہ بیڈ کی پٹی سے سر پٹخ، پٹخ کر رو رہا تھا۔ اور پھر زمین ان کے پاؤں سے نیچے سے سرک گئی تھی...... وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گئے تھے۔ اور یہ خدا بخش ہی تھا جس نے بابا جان کے دوستوں کو فون کیے تھے۔ گاؤں خبر بھجوائی تھی

اور ان کے دوستوں کی مدد سے انہیں گاؤں لے جانے کے انتظامات کیے تھے۔ وہ تو ہوش میں آنے کے بعد بھی ساکت بیٹھے بابا جان کے بے جان وجود کو تکتے تھے۔ اندر سیلاب اُمڈ رہے تھے اور آنکھوں میں دھول اڑتی تھی۔ یہ خدا بخش ہی تھا جو بار، بار آ کر ان کے گلے لگتا، انہیں رُلانے کی کوشش کرتا تھا اور پھر مصروف ہو جاتا۔ بابا جان کو گاؤں لے جا کر قبرستان میں اس چھوٹی سی چار دیواری کے اندر اماں کی قبر کے پاس چھوڑی جانے والی جگہ پر دفن کر دیا گیا تھا اور وہ جیسے قبر کے مجاور ہی بن گئے تھے۔ ماں انہیں یاد نہیں تھی اُن کے لیے سب کچھ بابا جان ہی تھے۔ انہیں کچھ یاد نہیں تھا سوائے اس ٹھنڈی یخ پیشانی کے جس کو انہوں نے آخری بار چوما تھا' ان سرد ہاتھوں کو جنہیں وہ بار، بار ہاتھوں میں لیتے تھے۔ یہ آخری تصویر جیسے ان کی آنکھوں میں منجمد ہو گئی تھی۔ خدا بخش زبردستی انہیں وہاں سے اٹھا کر لاتا، پھپھو ان کی حالت پر کڑھتیں، روتیں اور بابا جان کی طرح ان کا سر سینے سے لگا کر ان کے بالوں کو چومتیں' دلاسا دیتیں۔ لیکن انہیں تو لگتا تھا جیسے بابا جان کے بعد زندگی ان کے لیے ختم ہو گئی ہے۔ چندا چلی گئی تھی تو بابا جان تھے لیکن اب بابا جان نہیں تھے تو وہ اکیلے ہو گئے تھے۔ انہیں لگتا تھا جیسے ان کے پاس زندہ رہنے کا کوئی جواز نہیں رہا...... پھر بھی پتا نہیں، وہ کیوں زندہ ہیں...... پتا نہیں اسی حالت میں کتنے مہینے گزر گئے۔ تین ماہ یا شاید چار ماہ...... لاہور سے ایک کولیگ نے انہیں اطلاع دی تھی کہ ان کی جاب بھی ختم ہو گئی ہے۔ خدا بخش اور پھپھو سمجھاتیں تو وہ بے بسی سے انہیں دیکھ کر رہ جاتے۔

''بیٹا تمہارے باپ کی روح بے چین ہو گی۔ سنبھالو اپنے آپ کو۔''

اس روز وہ خدا بخش کے ساتھ دوپہر ڈھلنے کے بعد قبرستان سے گھر آئے تھے اور پھپھو اُن کے انتظار میں برآمدے میں ہی بیٹھی تھیں۔ وہ ان کے پاس ہی تھکے ہارے نڈھال سے تخت پر بیٹھ گئے تھے۔

''تم کوئی ننھے بچے نہیں ہو مدثر، زندگی اور موت کی حقیقت سمجھتے ہو، نہ اللہ سے تمہارا جھگڑا ہے، اس کی چیز تھی اس نے واپس لے لی۔''

وہ جانتے تھے وہ کوئی نوعمر لڑکے نہیں ہیں۔ شادی شدہ اور ایک بچی کے باپ ہیں۔ پھر بھی پتا نہیں کیوں دل ٹھہرتا ہی نہیں تھا سکون نہیں ملتا تھا۔

''دیکھو میرے بچے' میری بات دھیان سے سنو...... زندگی یوں نہیں گزرتی۔'' پھپھو خلافِ معمول بہت سنجیدہ تھیں۔ ''ہر ایک نے اُدھر ہی جانا ہے۔ یوں تمہارے جوگ لے لینے سے وہ واپس نہیں آئے گا...... میرا بھائی تھا مجھ سے چھوٹا تھا' بچوں کی طرح پیارا تھا مجھے...... ہزار بار کہا تھا اسے تیری ماں کے بعد کہ شادی کر لے...... کر لیتا تو آج تمہارے بہن، بھائی ہوتے، تمہارا دکھ بٹانے کو...... یوں اکیلے نہ ہوتے، تمہارے لیے بھی میں یہ چاہتی ہوں کہ تم شادی کر لو گھر بساؤ اور بیوی بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزارو۔ تمہارے باپ کی روح کو بھی سکون ملے گا۔ میں نے خدا بخش کی شادی ایک غریب ہاری کی بیٹی سے طے کر دی ہے۔ تین روز تک نکاح کر کے لڑکی گھر لے آئیں گے۔ تمہارے بابا جان نے ہی اپنی زندگی میں مجھے خدا بخش کی شادی کے لیے کہہ رکھا تھا۔ بلکہ بات ان کی زندگی میں ہی طے کر دی تھی۔ تم بھی اب سوچو جو فیصلہ کرو...... اگر کہو تو یہاں کوئی لڑکی دیکھوں...... ویسے تمہارے بابا جان نے لاہور میں بھی کوئی لڑکی دیکھ رکھی تھی۔ خدا بخش نے مجھے بتایا ہے۔ وہاں پہلے پتا کر لیتے ہیں۔''

''جی......'' انہوں نے سر جھکا لیا تھا۔ ''سوچوں گا پھپھو......'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

یہاں اس گھر میں پھپھو کے دو بیٹے تھے۔ دو بہوئیں تھیں...... سب اچھے اور محبت کرنے والے تھے۔ اتنے مہینوں سے وہ یہاں رہ رہے تھے۔ کبھی کسی نے کچھ نہیں کہا تھا بلکہ اپنی طرف سے سب ہی ان کا دل بہلانے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن آخر کب تک وہ یہاں رہ سکتے تھے۔ اس رات وہ اپنے بستر پر لیٹے تو انہوں نے فیصلہ کیا

کہ وہ خدا بخش کے نکاح کے بعد واپس لاہور چلے جائیں گے۔ اور جب وہ لاہور جانے کے لیے تیار ہوئے تو پھپو افسردہ ہوگئی تھیں۔

''میں نے تمہیں وہ سب اس لیے نہیں کہا تھا کہ تم چلے جاؤ۔ ساری زندگی یہاں رہتے رہو تو ہم پر بوجھ نہیں لیکن بیٹا میں تو تمہارا گھر بسا دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''جانتا ہوں پھپو، آپ کے سوا اور میرا ہے ہی کون۔ جانا تو تھا ہی پھپو...... بس ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ وہاں بابا جان کے بغیر اس گھر میں کیسے رہوں گا۔ اس خیال سے ہی دم گھٹنے لگتا ہے۔''

اور پھپو سے بہت ساری دعائیں لے کر وہ لاہور آ گئے تھے...... گھر میں جیسے دھول اڑتی تھی اور اداسی بین کرتی تھی...... ان کے کانوں میں بابا جان کی آوازیں گونجتیں۔

''جانم...... جانِ پدر۔'' تو وہ چونک، چونک کر اِدھر اُدھر دیکھتے تھے۔ لیکن وہ شفیق چہرہ کہیں نظر نہیں آتا تھا۔

ان کے آنے کا سن کر بابا جان کے کئی کولیگز ان سے ملنے آئے تھے۔ انہوں نے ہی بابا جان کے واجبات لینے میں ان کی مدد کی تھی۔ وہ سب بابا جان کے دوست تھے۔ ہمدرد تھے اور چاہتے تھے کہ وہ جاب کر لیں۔ ایک دو احباب نے جاب کی تلاش کے سلسلے میں تعاون کا یقین بھی دلایا تھا...... لیکن ان کا دل تو جیسے ہر شے سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ خدا بخش تھا جو بابا جان کے بعد ان کا سایہ بن چکا تھا۔

''صاحب میں کل بیگم صاحبہ کی طرف گیا تھا۔ باتوں، باتوں میں پوچھ لیا ابھی ثنا بیٹی کی کہیں بات طے نہیں ہوئی۔ مونا باجی کسی دوسرے ملک چلی گئی ہیں۔ آپ اجازت دیں تو بی بی جی کو فون کر دوں، وہ آ کر بات کر لیں؟''

اس روز خدا بخش ان کے کمرے میں دودھ دینے آیا تھا۔

''نہیں......'' انہوں نے سختی سے منع کر دیا۔

''تب میں نے بابا جان کی خاطر اقرار کیا تھا لیکن اب جب بابا جان نہیں رہے تو میں کسی لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کر کے اس کے ساتھ بے انصافی نہیں کرنا چاہتا۔ آج کے بعد اس موضوع پر بات نہ کرنا۔''

اور خدا بخش انہیں شاید ان سے زیادہ جانتا تھا اس نے پھر کبھی اس موضوع پر بات نہیں کی۔ وقت دھیرے، دھیرے گزر رہا تھا۔ وہ بھی ہولے، ہولے سنبھل گئے تھے۔ خدا بخش اور اس کی بیوی نے گھر سنبھال رکھا تھا اور وہ بے فکر تھے۔ یونہی ڈیڑھ برس بیت گیا۔ اس دوران صرف پھپو کا ہی انتقال نہیں ہوا...... خدا بخش کی بیوی بھی چل بسی...... انہوں نے ایک دو پرائیویٹ کالجز میں جاب کی اور پھر بیزار ہو کر چھوڑ دی...... زندگی گزارنے کے لیے کچھ تو مصروفیت چاہیے تھی...... سو ایک اکیڈمی جوائن کر لی...... معاشی پرابلم فی الحال تو نہیں تھی لیکن خالی وقت گزرتا ہی نہیں تھا۔ اکیڈمی میں دو شفٹیں ہوتی تھیں۔ مصروفیت کے لیے انہوں نے دونوں شفٹوں میں کام شروع کر دیا تھا...... خدا بخش کڑھتا۔

''اتنی محنت مت کریں صاحب، صبح کے نکلے شام کو آتے ہیں۔''

''وقت تو کاٹنا ہی ہے ناں خدا بخش۔''

''تو شادی کر لیں۔'' خدا بخش چپکے سے کہہ کر چوری، چوری ان کی طرف تکتا تو وہ نظر چرا لیتے۔

''اس شہر نے ہمیں بہت دکھ دیے ہیں آؤ خدا بخش کہیں اور کسی اور شہر میں جا بسیں۔''

اس روز اکیڈمی میں چھٹی تھی اور وہ اندر کی گھٹن سے گھبرا کر لان میں نکل آئے تھے اور خدا بخش بھی لان میں اداس سا بیٹھا تھا۔

''شہر چھوڑ دینے سے کیا ہوگا صاحب، اپنا آپ تو ہر جگہ ساتھ ہی ہوگا ناں۔''

خدا بخش نے کہا تھا لیکن ان کے دل میں یہ خیال پختہ ہوتا گیا کہ وہ یہ شہر چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں شاید وہاں کی فضاؤں میں اتنی اداسی نہ ہو...... اتنی گھٹن نہ ہو...... لیکن کہاں جائیں اور یہ گھر...... بابا جان نے ان کی شادی سے پہلے کتنے شوق سے خریدا تھا...... بالکل نیا تعمیر شدہ یہ گھر مالک مکان نے اس لیے فروخت کر دیا تھا کہ وہ ملک سے باہر جا رہا تھا۔ وہ اس گھر کا کیا کریں، فروخت کر دیں یا کرائے پر دے دیں۔ وہ فارغ ہوتے تو سوچتے رہتے تھے۔ اس روز وہ اکیڈمی سے نکل کر پارکنگ کی طرف جا رہے تھے کہ اچانک ان کی نظر سڑک کے دوسری طرف ایک پراپرٹی ڈیلر کے بورڈ پر پڑی تو وہ بے ارادہ ہی سڑک کراس کر کے اس پراپرٹی ڈیلر کے دفتر کی طرف بڑھے تھے اور دفتر سے باہر آتے بیگ صاحب کو دیکھ کر وہ ٹھٹک کر رک گئے۔ بیگ صاحب ان کے پرانے کولیگ تھے جو اُن کی کالج میں تقرری کے فوراً بعد ہی جاب چھوڑ کر انگلینڈ چلے گئے تھے۔ صرف تین چار ماہ کا ساتھ رہا تھا لیکن بیگ صاحب نے نہ صرف پہچان لیا تھا بلکہ بہت گرم جوشی سے ملے تھے۔

''آپ تو غالباً انگلینڈ چلے گئے تھے؟'' انہوں نے کہا تو بیگ صاحب نے گہری سانس لی تھی۔

''ہاں گیا تو تھا لیکن سیٹ نہیں ہو سکا۔ جتنا کماتا تھا سب خرچ ہو جاتا تھا۔ بچت بالکل ہی نہیں ہوتی تھی تو سوچا پھر پردیس میں رہنے کا فائدہ۔ یہاں سے چچازاد بھائیوں کے رویے سے دل برداشتہ ہو گیا تھا۔ سو لاہور آنے کے بجائے کراچی سیٹل ہو گیا۔ والد اور بہن بھی ساتھ ہی ہیں، والد کے کہنے پر ان دنوں آبائی مکان کی فروخت کے سلسلے میں آیا ہوا ہوں۔ گو میں ابھی فروخت نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن چچازاد بھائی حصہ مانگ رہے ہیں سو رزاق صاحب سے ملنے آیا تھا۔ آپ کس سلسلے میں؟''

''وہ دراصل میں بھی اسی سلسلے میں کچھ معلومات لینے آیا تھا۔ کیا رزاق صاحب آپ کے جاننے والے ہیں۔'' انہوں نے رزاق پراپرٹی ڈیلر کے دفتر کے دروازے پر ایک نظر ڈالی تھی۔

''ہاں، کافی جان پہچان ہے۔ آپ کو کس سلسلے میں معلومات چاہیے تھیں۔''

''وہ دراصل میں بھی اپنا گھر فروخت کرنا چاہتا ہوں۔'' ان کے لبوں سے غیر ارادی طور پر نکلا تھا۔

''کیوں خیریت...... آپ کیوں گھر فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ آپ نے چند سال پہلے ہی وہ گھر خریدا تھا۔ کیا کہیں اور گھر لے لیا ہے۔''

تب انہوں نے بیگ صاحب کو اپنی شادی ٹوٹنے اور بابا جان کی وفات کا بتایا تھا کہ ان کا دل اس شہر سے اچاٹ ہو چکا ہے اور وہ کہیں کسی اور شہر میں جا کر رہنا چاہتے ہیں۔ تب بیگ صاحب نے انہیں کراچی آنے کا مشورہ دیا تھا...... اور انہیں بھی بیگ صاحب کی بات پسند آئی تھی اور پھر بیگ صاحب سے ان کی تین چار اور ملاقاتیں بھی ہوئی تھیں۔ کراچی واپس جانے سے پہلے بھی بیگ صاحب ان سے ملے تھے اور انہیں تاکید کی تھی وہ کہیں اور جانے کے بجائے کراچی آئیں۔

''کراچی بڑا بادشاہ شہر ہے مدثر صاحب، آپ کو محسوس بھی نہیں ہوگا کہ آپ کسی اجنبی شہر میں ہیں۔'' انہوں نے اپنا فون نمبر دیا اور ان کا لے لیا تھا...... بیگ صاحب سے ان کی کوئی خاص دوستی نہیں تھی۔ چند ماہ کے ساتھ میں صرف دعا سلام ہی تھی لیکن ان کے خلوص سے متاثر ہوئے تھے۔ وہ جتنی بار بھی ملے بہت محبت اور خلوص سے ملے اور ان کی بے حد دلجوئی کی بلکہ کراچی میں ایک پرائیویٹ کالج میں ان کے لیے جاب کا بندوبست بھی کر دیا۔

''فی الحال یہ جاب کر لیں جب گورنمنٹ کی جابز نکلیں تو اپلائی کرتے رہیے گا۔''

انہوں نے کہا تھا اور پھر فوراً ہی مکان کا گاہک بھی مل گیا۔ انہوں نے فرنشڈ گھر کا سودا کیا تھا۔ اس روز خدا بخش بلک بلک کر رویا تھا۔ وہ ایک، ایک چیز کو دیکھتا اور روتا تھا۔ انہوں نے اسے ضروری چیزیں پیک کرنے

کے لیے کہا تھا لیکن خدا بخش کا جی چاہتا تھا وہ ہر وہ چیز ساتھ لے جائے جسے بابا جان نے بہت شوق سے خریدا تھا۔ کبھی وہ بابا جان کے کمرے کے سامنے کھڑا ہو جاتا اور ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھنے لگتا۔ کبھی لاؤنج میں آ کھڑا ہوتا، کبھی لان کو حسرت سے دیکھتا...... وہ خدا بخش کی دلی کیفیات کو سمجھ رہے تھے۔ خود ان کے دل کی حالت بھی خدا بخش سے کچھ مختلف نہ تھی۔ تب ہی گھبرا کر انہوں نے خدا بخش سے کہا تھا۔

''آؤ خدا بخش جانے سے پہلے بابا جان کی قبر سے ہو آئیں پھر جانے کب آنا ہو۔''

ان کا ارادہ چند دن گاؤں رہنے کا تھا۔ یوں بھی انہیں دو ہفتے تک گھر خالی کر کے چابی مالک مکان کو دینی تھی...... سو وہ خدا بخش کے ساتھ گاؤں آ گئے تھے...... ابھی انہیں گاؤں آئے دو دن ہی ہوئے تھے کہ پھوپھو زاد بھائی کے سسر وفات پا گئے پھوپی زاد بھائی کا سسرال خانیوال میں تھا...... اب جبکہ وہ گاؤں میں ہی تھے تو انہیں مناسب نہ لگا کہ وہ گاؤں میں رکے رہیں اور جنازے میں شامل نہ ہوں۔ چنانچہ وہ خدا بخش کو لے کر پھوپی زاد بھائیوں کے ساتھ خانیوال چلے گئے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ جنازہ پڑھ کر وہاں سے ہی لاہور چلے جائیں گے سو ان لوگوں کے روکنے کے باوجود وہ نہیں رکے تھے اور عشا کے بعد ہی لاہور کے لیے چل پڑے تھے گو خدا بخش نے بھی کہا تھا کہ اب رات کو سفر کرنا کیا ضروری ہے۔ لیکن ان کا دل سخت گھبرا رہا تھا۔

''نہیں یار چلتے ہیں۔ رات اپنے گھر میں ہی جا کر آرام کریں گے۔''

''اپنا گھر کہاں رہا صاحب، وہ تو اب دوسروں کا ہے۔'' خدا بخش بہت دلگرفتہ ہو رہا تھا۔ انہوں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ خود بھی افسردہ ہو گئے تھے سو خاموشی سے ڈرائیو کرتے رہے تھے۔ انہیں ڈرائیو کرتے ہوئے پتا نہیں کتنی دیر ہو گئی تھی۔ دو گھنٹے یا کچھ زیادہ...... اچانک انہوں نے بریک پر پاؤں رکھا۔

''یا اللہ خیر!'' خدا بخش بڑبڑا رہا تھا۔ ''کیا ہوا ہے؟''

''کچھ نہیں شاید انجن گرم ہو گیا ہے۔''

وہ دروازہ کھول کر باہر نکلے تھے۔ یہ ایک ویران سی روڈ تھی۔ آس پاس اِدھر اُدھر کہیں کوئی آبادی کے آثار نہیں تھے۔ انہوں نے ڈگی سے پانی کی بوتل نکالی۔ خدا بخش بھی باہر نکل آیا تھا۔ اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔ انہوں نے بونٹ اٹھایا۔

اتنی دیر میں صرف ایک ٹرک اور ایک چھکڑا سی بس وہاں سے گزری تھی اور نہ تو ٹرک اور نہ ہی بس رکی تھی۔

''انسانیت تو نام کو باقی نہیں رہی کیا مجال کہ سواری روک کر پوچھ لیں کہ مدد کی ضرورت تو نہیں۔'' خدا بخش... بڑبڑا رہا تھا۔

''لوگ ڈرتے ہیں خدا بخش......'' انہوں نے خدا بخش کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تھی۔

''ہاں ایک ہم بہت بہادر ہیں ناں جو آدھی رات کو اٹھ کر چل پڑے ہیں۔ اس وقت تو ان ویران جگہوں پر شرار بھی ہوتے ہیں۔ جلدی کریں صاحب۔'' وہ سڑک کے دائیں طرف اندھیرے میں گھور رہا تھا پھر یکایک اس نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔

''صاحب...... وہ...... وہ اُدھر......'' اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ اور وہ انگلی سے ایک طرف اشارہ کر رہا تھا۔

''بابا......'' رواحہ نے انہیں پکارا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگے لیکن ان کا ذہن ابھی تک پیچھے کہیں اور بھٹک رہا تھا۔

''بابا......'' رواحہ نے پھر بلایا۔

''آپ کس سوچ میں گم ہیں۔ ٹھیک تو ہیں ناں......''

''ہاں......'' انہوں نے ہولے سے سر جھٹک کر خالی گلاس خدا بخش کی طرف بڑھایا۔

''ٹھیک ہوں، بس کچھ تھکن سی محسوس کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے چلتا ہوں رات کو آؤں گا۔'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

''بابا میں نے آپ سے کہا تو ہے ناں کہ رات کو مت آیئے گا۔ بے فکر ہو کر آرام کریں میں اور جواد ہوں گے ناں اِدھر......'' عظام نے کہا۔

انہوں نے سر ہلایا اور خدا بخش کو چلنے کا اشارہ کر کے ارتفاع کی طرف بڑھے اور اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''اللہ حافظ بٹی، انشاء اللہ جلد ہی آپ کے گھر حاضر ہوں گے۔''

ارتفاع کی پلکیں جھک گئیں اور چہرے پر سرخی سی بکھر گئی۔ انہوں نے دلچسپی سے اس کے رخساروں پر پھیلتی شفق کو دیکھا اور پھر رواحہ کو مخاطب کیا۔

''اچھا اللہ حافظ بیٹا۔''

''اللہ حافظ......'' رواحہ نے جواب دیا۔ ''پریشان مت ہوئیے گا بابا اور سکون سے سو جایئے گا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''ہاں وہ کیا کہتے ہیں کہ ان کے آنے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق......'' عظام نے جھک کر اس کے کانوں میں سرگوشی کی تو رواحہ نے اسے گھورا تو وہ جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

''چلیں بابا میں آپ کو پارکنگ تک چھوڑ آتا ہوں۔''

''ارے نہیں بیٹا بیٹھو تم۔'' انہوں نے ہاتھ اٹھا کر عظام کو روکا اور ساتھ ہی اُن کی نظر اس پر پڑی، اس کے لبوں پر بڑی دلفریب سی مسکراہٹ تھی اور وہ مسکراتی نظروں سے رواحہ کو دیکھ رہا تھا اور رواحہ کے لبوں پر بھی مبہم سی مسکراہٹ تھی تب انہوں نے اپنی مسکراہٹ چھپالی تھی۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ عظام کیوں انہیں پارکنگ تک چھوڑنے جانا چاہتا تھا۔

''تم کہہ رہے تھے کہ تمہارے پاپا شام کو آئیں گے؟'' عظام کے ساتھ، ساتھ چلتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

''ہاں پاپا نے کہا تو تھا آنے کو۔''

''تو تم انہیں ظفری کے متعلق بتا دینا۔ پریشان ہو رہے تھے وہ تم دونوں کو باہر بھیجنے پر تلے ہوئے ہیں۔''

''ہاں پاپا بھی آپ کی طرح پریشان ہو جاتے ہیں۔ وہ ظفری وغیرہ سے پنگا لینے کے حق میں نہیں تھے۔''

''حالانکہ دیکھنے میں اور بات چیت سے وہ بہت جی دار آدمی لگتے ہیں۔''

''ہاں ہیں تو......لیکن اولاد کے معاملے شاید سب ہی کمزور پڑ جاتے ہیں۔'' عظام نے خیال ظاہر کیا تب ہی خدا بخش کو اچانک یاد آیا۔

''ارے صاحب وہ جو لڑکی گھر نہیں آئی تھی کیک لے کر اپنی والدہ کے ساتھ کیا نام تھا وہ ملکہ نور جہاں......''

''نور جہاں نہیں شاہجہان بیگم۔'' عظام کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

''ہاں، ہاں وہی۔''

''کیا ہوا اس لڑکی کو؟'' عظام کی بے چینی کو انہوں نے کسی قدر حیرت سے دیکھا۔

''ہونا کیا ہے صاحب......وہ لڑکی اور اس کی بہن آئی تھیں رواحہ صاحب کی خیریت معلوم کرنے۔''

''انہیں کیسے پتا چلا؟'' انہیں حیرت ہوئی۔

''پتا نہیں صاحب، میں گیٹ کے باہر بیٹھا تھا تو مجھ سے رواحہ صاحب کا پوچھا تھا۔ شاید کہیں سے سن لیا

ہو۔ آس پاس سب گھروں کو تو پتا ہی ہے رواحہ صاحب کے حادثے کا بس گولیاں لگنے کی بات کسی سے نہیں کی میں نے۔''

اور وہ خدا بخش سے کچھ کہتے، کہتے خاموش ہو گئے

''کہہ رہی تھیں کہ ان کی والدہ لاہور سے آجائیں تو وہ رواحہ صاحب کی مزاج پرسی کے لیے اسپتال جائیں گی۔''

''تو ابھی تک وہ لاہور سے نہیں آئیں؟'' عظام کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔

انہیں عظام کی بے ساختگی پر جیسے کوئی ادراک ہوا تھا...... وہ عظام اور خدا بخش سے چند قدم آگے ہو گئے تھے جبکہ عظام آہستہ، آہستہ چلتے ہوئے خدا بخش سے کچھ پوچھ رہا تھا۔

☆☆☆

شاہجہان بیگم لاؤنج میں صوفہ کم بیڈ پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھی تھیں اور نیچے کارپٹ پر بیٹھی موراں اس کی ٹانگیں دبا رہی تھی۔ جب ظہورے نے لاؤنج میں قدم رکھا۔

''کیا آفت آگئی ہے شاہجہان بیگم جو کچی نیند سے جگا کر بلو بھیجا۔'' ظہورے کا موڈ خراب ہو رہا تھا، آنکھوں میں کچی نیند سے جاگنے کی سرخی نمایاں تھی۔

''انگارے کیوں چبا رہا ہے، جگایا ہی ہے ناں لام پر تو نہیں بھجوا رہی۔'' وہ بھی شاہجہان بیگم تھیں انہیں ظہورے کا لہجہ اور بات تیر کی طرح لگی تھی۔

''تجھے پتا تو ہے ناں ٹرین میں کیسی بے آرامی رہی اور اب یہاں آئے بھی چار گھنٹے ہو گئے کروٹیں بدل، بدل کر جسم دکھنے لگا تب کہیں جا کر ذرا آنکھ لگی تھی کہ تیرا حکم نامہ پہنچ گیا۔'' شاہجہان کے غصے اور ناراضی کے خیال سے ظہورے کا لہجہ نرم ہو گیا تھا۔

''تو جا دفعان ہو، جا کر نیند پوری کر، شیدا کمبخت پتا نہیں کہاں مر گیا آئے تو بھیج دینا۔'' شاہجہان بیگم کے لہجے پر ظہورا چونکنا ہوا۔

''ارے موراں بھیج اسے۔ کہیں باؤلا ہو کر کاٹنے ہی نہ لگ جائے۔'' شاہجہان بیگم نے موراں سے کہا تو ظہورے کو لگا کہ شاہجہان بیگم کہیں سچ مچ ناراض نہ ہو جائے۔

''توبہ ہے شاہجہان بیگم غصہ تو تمہاری ناک پر دھرا رہتا ہے۔ اب کس کمبخت کو نیند آئے گی، بول کیوں بلوایا تھا۔ لاہور سے کراچی تک تو منہ میں گھنگنیاں ڈال کر بیٹھی رہیں اور اب کام یاد آگیا۔'' ظہورے کی زبان میں پھر کھجلی ہوئی تھی۔ شاہجہان بیگم نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے موراں کو ڈپٹا۔

''کیا ہاتھوں میں جان نہیں رہی کمبخت ٹھیک طرح سے دبا۔ چل، چل کر ٹانگوں میں گلٹ پڑ گئے۔''

ظہورے نے دلچسپی سے شاہجہان بیگم کی طرف دیکھا اس کی آنکھیں پوری طرح کھل چکی تھیں اور وہ اپنے مخصوص انداز میں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''اب کھڑا منہ کیا تک رہا ہے، دفعہ ہو جا کر سو مر۔'' شاہجہان کا غصہ ابھی کم نہیں ہوا تھا۔

''ایمان سے شاہجہان بیگم جب تو ناراض ہوتی ہے ناں تو مت پوچھ دل پر کیا گزرتی ہے۔ جانتی تو ہے نیند کا کچا ہوں، اب بول بھی کیوں بلایا تھا۔'' اس نے جان لٹاتی نظروں سے شاہجہان بیگم کو دیکھا۔ تو شاہجہان بیگم نے بھی مزید غصہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

''سن کوئی آئے تو باہر سے ہی ٹال دینا، کہہ دینا لاہور میں ہی ہوں اور صاحبزادہ صاحب کو تو بھنک بھی نہیں

ملنی چاہیے میرے آنے کی۔ شیدے کو اور دوسروں کو بھی سمجھا دے۔''

''کب تک؟'' ظہورے نے ذرا سی آنکھیں میچ کر اسے دیکھا۔

''جب تک ممکن ہو کم از کم ہفتہ بھر تو صاحبزادہ صاحب کو میرے آنے کی خبر نہیں ہونے پائے۔''

''آخر مسئلہ کیا ہے؟ منہ سے کچھ پھوٹ تو۔''

''تجھے کیا مسئلے سے......بس جتنا کہا ہے اتنا کر۔''

''میں تو اتنا ہی کروں گا پر تم نہ بھید دینا کبھی اپنے من کا۔'' ظہورا بڑبڑایا۔

''ارے کون سا بھید چھپا رکھا ہے میں نے۔'' شاہجہان بیگم نے اسے گھورا۔

''یہ تو تم جانو کیا بھید ہے، بھاگم بھاگ لاہور پہنچیں... وہاں کی سڑکیں ناپ کر لشتم پشتم واپس......آخر کچھ تو ہے ناں......اس آنے جانے میں۔''

''ایسے ہی گئی تھی گھر بار دیکھنے......عمر گزری اس شہر میں......گلی میں......دل چاہا دیکھ آؤں۔''

''یہ بات کسی اور سے کہنا، ظہورا تمہیں اچھی طرح جانتا ہے اس آنے جانے میں کچھ تو بھید چھپا ہے۔'' ظہورے کو بھی شاہجہان سے تکرار کر کے مزہ آتا تھا حالانکہ جانتا تھا کہ شاہجہان بیگم کچھ نہ بتانا چاہے تو کوئی اس کی زبان نہیں کھلوا سکتا۔

''ہاں چھپا ہے تو پھر، تجھے کیوں اتنی کرید لگی ہے۔'' شاہجہان نے تیز نظروں سے اسے دیکھا۔

''سچ بتا حاتی دادا کو ڈھونڈنے گئی تھی ناں؟'' ظہورے نے اس کا سوال نظر انداز کر دیا تھا......اور آنکھیں کچھ جان لینے کے انداز میں گھما رہا تھا۔

''یہ ظہورا کمبخت بھی بڑا کائیاں ہے۔'' شاہجہان نے دل ہی دل میں سوچتے ہوئے اسے گھُر کا۔

''یہ دیدے کیوں مٹکا رہا ہے، بتا تو دیا تجھے۔''

''سچ نہیں بتایا......اور کبھی بتاؤ گی بھی نہیں، جانتا ہوں دل میں تیرے کون بستا ہے۔'' یہ تو وہ ہی جانتی تھی کہ اس کے دل میں تو بس ایک ہی نقش کھدا تھا۔ ایسا گہرا اتنا پائیدار کہ زمانے گزرنے کے بعد بھی ایسا ہی تھا۔ وہ پہلی نظر کی گھائل تو نہیں تھی لیکن دوسری نظر نے اسے گھائل کر دیا تھا۔ وہ طیفے بدمعاش کے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ اور چھت پر لٹکے فانوس کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ یہ کوئی پہلا مرد نہیں تھا، وہ سولہ سال کی عمر میں اس چوبارے پر آئی تھی اور سیکڑوں مردوں کو اس نے دیکھا تھا۔ لیکن یہ مرد جو طیفے کے کندھے پر ہاتھ رکھے دھیمے لہجے میں کچھ کہہ رہا تھا اس میں ایسا کیا خاص تھا کہ شاہجہان بیگم کو اپنا دل ہاتھوں سے نکلتا محسوس ہوا تھا۔ اس روز کے بعد اس نے کبھی حاتی دادا کو نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا لیکن دیکھنے کی ضرورت بھی کیا تھی اس کی تصویر تو دل پر نقش ہو گئی تھی۔

''کب تک انتظار کرے گی اس کا......اب نہیں آنے والا وہ......'' ظہورے کا موڈ بدلا تھا اور لہجے میں شوخی در آئی تھی۔ ''نکاح کے دو بول پڑھا لے مجھ سے۔''

''زیادہ بک بک نہ کر۔'' شاہجہان بیگم نے چونکتے ہوئے اسے گھُر کا۔

''ہاں، کام کی بات تو ہمیشہ بک بک ہی لگتی ہے تجھے۔'' اس نے برا سا منہ بنایا۔

موراں سر نیچا کیے مسکرا رہی تھی۔ سالوں سے وہ ظہورے کی چہلیں اور شاہجہان بیگم کی نوک جھوک دیکھتی آ رہی تھی۔ نہ شاہجہان بیگم اسے دھتکارتی تھی نہ سر کا تاج بناتی تھی۔ اب پتا نہیں ظہورا سچ مچ شاہجہان کا طلب گار تھا یا چھیڑتا تھا اسے۔

''اب زبان کو لگام دے گا یا جوتا نکالوں پاؤں سے۔'' شاہجہان بیگم نے پاس پڑا پاندان اٹھا کر گود میں رکھا

اور کھٹاک سے کھولا۔

''شاہجہان بیگم!'' ظہورا ایک دم سنجیدہ ہوا۔ ''قسم رب سوہنے کی ظہورا قول کا کچا نہیں ہے۔ اپنی پریشانی بول تیری پریشانی دور کر کے ہی تجھے منہ دکھاؤں گا۔''

''جانتی ہوں۔'' شاہجہان کی آنکھوں میں نرم سا تاثر ابھرا۔ ''جب ایسی ضرورت پڑی تو تجھے ہی بتاؤں گی اور کون ہے اپنا۔''

''سب کچھ کہنا پر حاتی دادا کو ڈھونڈنے کا نہ کہنا۔ قسم سے سینے پر سانپ لوٹنے لگتے ہیں۔'' اس نے بائیں آنکھ کا کونا دبایا۔

''پھر شروع ہوگئی تیری بک، بک......'' شاہجہان نے غصے سے کہا لیکن آنکھوں کا تاثر نرم ہی تھا۔

''تم ایسی پریشان تو کبھی نہیں ہوئی تھیں شاہجہان۔'' ظہورا دیوار سے ہٹ کر اس کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔

''میں تو سمجھا تھا تو ریکھا اور زرینہ کی شان بان دیکھنے گئی ہے پر تو دو گھڑی جا کر اُدھر بیٹھی تک نہیں...... دال میں کچھ تو کالا ہے۔''

''دفع دور......'' شاہجہان نے بائیں ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ''مجھے کیا ان کی تام جھام سے۔''

''اچھا تو کیا صاحبزادہ صاحب مکر گئے خرچہ دینے سے اور تم واپس جانے کا سوچ رہی ہو؟'' ظہورا ابھی اڑتی چڑیا کے پر گنتا تھا۔

''بس کردے ظہورے اندازے لگانا...... اور میرا دماغ نہ کھا...... جو کہا ہے باہر جا کر سب کو سمجھا دے کچھ بتانے جوگا (لائق) ہوا تو تجھے بتا دوں گی۔'' شاہجہان یک دم ہی ظہورے کی گفتگو سے بیزار ہو کر پہلے سے کٹی ہوئی چھالیا سروتے سے پھر کاٹنے لگی اور ساتھ ہی ٹانگیں پیچھے کرلیں۔

''بس کر موراں جا کر ایک کپ چائے بنا لا۔ دماغ پولا (پلپلا) کر دیا ہے اس کی بک، بک نے۔''

ظہورا کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا، مزاج آشنا تھا...... جانتا تھا اب شاہجہان کچھ نہیں بولنے والی۔ سو خاموشی سے لاؤنج سے نکل گیا۔ شاہجہان نے اسے باہر جاتے دیکھا...... لبوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہوگئی۔ اسے ظہورے کی وفاداری پر شک نہیں تھا لیکن وہ اسے کیا بتاتی کہ وہ کس الجھن میں پھنسی ہوئی ہے اور ظہورا ابھی بھلا کیا کر سکتا تھا۔ جو کچھ کرنا تھا اسے خود ہی کرنا تھا۔ ظہورا تو الٹا اس کی بات سن کر ہنسی اڑاتا کہ کیسا عہد، کہاں کا عہد لیکن وہ تو خود کو کسی کے ساتھ کیے عہد کا پابند پاتی تھی...... تھی تو وہ کوٹھے والی...... معاشرے کی نظر میں ناقابلِ اعتبار...... اگر جو عہد کی پاسداری نہ کرتی تو کون پوچھتا اور پھر جو پوچھ سکتا تھا اسے خبر بھی کیا تھی لیکن وہ تو جیسے اس وعدے کی نادیدہ زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ کبھی جو خیال آتا بھی کہ وہ تو اس کے وجود سے ہی بے خبر ہے تو اگر میں وعدہ توڑ دوں تو...... اور کانوں میں وہ بھاری گمبھیر آواز گونجنے لگتی۔

''سنو شاہجہان بیگم آج نشے میں جو غلطی ہوگئی اس کا اگر کوئی نتیجہ نکلا تو وعدہ کر مجھے خبر کردے گی۔''

''خبر کردی تو بھلا تو کیا کرے گا؟''

''قسم ہے اپنے پیدا کرنے والے رب کی اسی وقت تجھ سے نکاح پڑھا لوں گا اپنی اولاد کو کوٹھے پر پروان نہیں چڑھنے دوں گا۔''

اور وہ لمحہ بھر کو چپ سی ہوگئی تھی۔

''اور اگر میں مر کھپ گیا تو وعدہ کر میری اولاد کو کوٹھے سے دور رکھے گی۔ لڑکی ہوئی تو جوان ہوتے ہی کسی شریف آدمی سے شادی کر دینا، لڑکا ہوا تو کسی یتیم خانے میں چھوڑ آنا پل جائے لیکن یہاں رکھ کر

(گالی) مت بنانا اسے۔''

''اور اگر آج میں وعدہ کر بھی لوں اور کل مکر بھی جاؤں تو تمہیں کیسے پتا چلے گا...... میں تمہیں خبر ہی نہیں کروں کہ میں تمہاری اولاد کو جنم دینے والی ہوں تو؟'' وہ ہنسی تھی۔

''مجھے تم پر یقین ہے، شاہجہان بیگم کہ تم میرا یقین نہیں توڑو گی۔''

''ارے ہم جیسوں پر یقین نہیں کرتے دادا۔'' وہ پھر ہنسی تھی۔

''کیا خبر میں بیٹی کی ماں بن جاؤں تو بیٹیاں تو ہمارے چوباروں کی رونق ہوتی ہیں۔''

اور وہ لحہ بھر اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا تھا۔

''تم میری بیٹی کو اپنے چوبارے کی رونق نہیں بناؤ گی، شاہجہان بیگم مجھے یقین ہے تم پر۔'' اس نے ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔

''وعدہ کرو۔''

''وعدہ!'' اس نے اپنا ہاتھ اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا تھا اور اس نے اس کا ہاتھ دبا کر چھوڑ دیا۔

''میں ہر ایک پر یقین نہیں کرتا شاہجہان بیگم لیکن تمہارے وعدے پر یقین ہے مجھے۔''

اور اس کے اس یقین نے اس لمحے کچھ ایسا اس کے دل کو اپنے شکنجے میں کسا تھا کہ وہ آج تک اس یقین کو توڑنے کی ہمت نہیں کر سکی تھی حالانکہ کب، کب دل نے اکسایا نہیں تھا۔

جب دائی نے تصدیق کر دی تھی کہ وہ دوسرے جی سے ہے تو اس نے اسے بتایا نہیں تھا...... اس نے کہا تھا کہ خبر ملی تو اسی وقت نکاح پڑھا لوں گا اور اس نے اپنے دل کو ٹٹولا تھا، اپنے چوبارے کو دیکھا تھا۔ موتیا تھی، سنہری تھی اس کی اپنی بیٹیاں اور دوسری لڑکیاں تھیں بھرا چوبارا کیسے چھوڑ دیتی۔ یہ تو بہت دنوں بعد اسے خیال آیا تھا کہ اگر نکاح نہ کرنا چاہوں تو کوئی زبردستی تو نہیں ہے...... بس کہوں گی اپنی اولاد کا خرچہ دے ڈاکٹر، اسپتال کا اور پھر لے جا اپنے ساتھ...... تب وہ اس کے گھر پہنچی تو یہ بڑا سا تالا دروازے پر لگا تھا پتا چلا چند دن پہلے کہیں گئے ہیں۔ تین چار بار شیدے کو بھی پتا کرنے بھیجا اور پھر خاموش ہو کر بیٹھ گئی تھی کہ اب ہواؤں کو تو خبر نہ کر سکتی تھی کہ اسے جا کر بتا دیں۔ اور جب وہ اس کی گود میں آئی تھی تو اس کی موہنی صورت دیکھ کر دل کھل اٹھا تھا۔ یہ چاند جب میرے چوبارے میں چمکے گا تو دھومیں مچ جائیں گی اور کئی دن تک وہ ساری گلی والیوں کی مبارک بادیاں وصول کرتی رہی تھی۔

''ارے یہ تو موتیا، سنہری سب کو مات کر جائے گی، تیری تو لاٹری نکل آئی ہے۔'' گلی والیاں کہتیں تو وہ اندر ہی اندر فخر سے پھول جاتی لیکن پھر ایک رات وہ بستر پر لیٹی تو جیسے سماعتوں میں ایک ہی آواز گونجنے لگی۔ بھاری گمبھیر آواز......

''مجھے تم پر یقین ہے شاہجہان تم میری اولاد کو......'' اور وہ اس آواز سے گھبرا کر اٹھ بیٹھی...... پہلے کانوں پر ہاتھ رکھے پھر انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں لیکن یہ آواز تو اس کی سماعتوں پر ہتھوڑوں کی طرح لگ رہی تھی...... اور پھر جیسے اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

''ہاں، میں اس کا یقین نہیں توڑ سکتی۔''

اس نے پاس لیٹی بجل کو دیکھا...... اور اس کا دل بجھ گیا۔ یہ چاند اس کے چوبارے پر چمکنے کے لیے تو اس کی گود میں نہیں اتارا گیا تھا۔ وہ تو محض اس کی امین تھی، اسے امانت اس کے مالک تک پہنچانی تھی سو صبح ہوتے ہی اس نے شیدے کو دوڑایا لیکن بے سود...... شیدے نے آ کر یہی بتایا کہ اُدھر بدستور تالا لگا ہوا ہے۔ تب وہ خود ہی ایک ماہ کی بجل

کو اٹھائے پتا کرتے اکیلی ہی اس کے محلے میں پہنچ گئی تھی۔ آس پاس والوں سے پوچھا کہ یہ لوگ کہاں گئے کسی کو علم نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ لوگ گھر فروخت کر کے چلے گئے ہیں۔ سب کو ہی ان کے جانے کا افسوس تھا اور سب ہی ان کی تعریف کرتے تھے۔ سب نے اسے بھی کوئی مصیبت زدہ سمجھا تھا جو مدد مانگنے آئی تھی...... اور وہ یونہی بجل کو اٹھائے ناکام واپس آ گئی تھی۔ بس ذرا سی چوک ہو گئی تھی اس سے اگر وہ اس روز اسے خبر کر دیتی جب اسے پتا چلا تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے تو یہ وعدہ اس کے دل کو اب تک نہ جکڑے ہوتا، بس وہ جو اس وقت اس کے دل میں ذرا سی بے ایمانی آئی تھی اس پر وہ ہمیشہ پچھتاتی رہی اور بجل کو کوٹھے کی سرگرمیوں سے دور رکھ کر وعدہ نبھایا۔ جب چوبارہ یک دم خالی ہو گیا گلابو ہیضے سے مرگئی۔ مینو نے کسی تانگے والے سے شادی کر لی...... فارا کوٹی بی ہو گئی تو سب نے کتنا کہا بجل کو بھی سنہری کے ساتھ ابھی سے سیکھنے پر لگا دو تا کہ بڑھاپے کا آسرا ہو جائے...... ایک بار تو اس نے استاد جی سے کہہ بھی دیا کہ جب سنہری کو تعلیم دیتے ہیں تو بجو بھی ساتھ بٹھا لیا کریں۔ تھوڑا بہت سُروں کی پہچان ہو جائے گی لیکن پھر خود ہی منع کر دیا وہ کبھی خود کو یقین کی ان زنجیروں سے آزاد ہی نہیں کر سکی جو اس نے ایک کوٹھے والی پر کیا تھا۔ اور اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ بجل کے پاؤں میں گھنگرو نہیں باندھے گی۔

’’تو کیا پڑھا لکھا کر استانی بنائے گی؟‘‘ ظہورا منہ چڑھا تھا جو دل میں آتا کہہ دیتا تھا۔

’’نہیں کوئی شریف آدمی دیکھ کر شادی کروں گی اس سے۔‘‘ اور اس کی بات پر ظہورے کو اس زور سے ہنسی آئی تھی کہ اس کے حلق میں پھندا لگ گیا تھا۔

’’شاجہان بیگم لگتا ہے تیرا دماغ چل گیا ہے، کیا کوئی شریف آدمی تیری اس گلی میں تیرے چوبارے پر بیاہنے آئے گا تیری لاڈلی کو؟‘‘

ظہورا غلط تو نہیں کہہ رہا تھا لیکن وعدہ لینے والا شاید یہ نہیں جانتا تھا کہ کوٹھے پر پلنے والی کے ساتھ کوئی شریف آدمی شادی نہیں کرے گا بھلے وہ کتنی بھی پاکباز کیوں نہ ہو۔ تو تب ہی اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ بجل کو ایکٹریس بنائے گی، عزت بھی ملے گی پیسہ بھی...... وہاں کسی نے نہیں پوچھنا کہ کہاں سے تعلق ہے اور کیا خبر کوئی اچھا آدمی اس سے شادی کر لے اور وہ اس کے سامنے سرخرو ہو جائے کہ اس نے اس کا یقین نہیں توڑا...... آخر اس کی گلی سے شوبز میں جانے والی دو لڑکیوں کی شادی ہو ہی گئی تھی شریف خاندانی لڑکوں سے...... تو اسی لیے اس نے لاہور چھوڑا تھا۔ حالانکہ کسی کا دل نہیں چاہ رہا تھا کراچی جانے کو لیکن صاحبزادہ صاحب نے کہا تھا اب لاہور میں فلمیں نہیں بنتیں البتہ کراچی میں ڈرامے بہت بنتے ہیں، پہلے ڈراموں میں کام کر لے پھر کبھی کوئی فلم بنی تو فلم میں کام کر لے گی تمہاری بیٹی...... اور صاحبزادہ صاحب سے بجو کا ذکر کر کے بڑی غلطی ہو گئی تھی اس سے وہ بجو کو کام تو کیا دلواتے اسے دیکھتے ہی خود لٹو ہو گئے تھے۔

’’تم ایک سال کے لیے بجل کو میرے ساتھ بھیج دو۔ ہم ملک سے باہر رہیں گے۔ واپس آ کر پھر فلم شلم کرتی رہے گی۔‘‘

’’لیکن صاحبزادہ صاحب آپ نے تو دس سال تک موتیا کا خرچ اٹھانے کا وعدہ کیا تھا۔‘‘

’’تو موتیا کا خرچ اٹھاتا رہوں گا میں...... اس سے کب انکار ہے مجھے...... گھر کا کرایہ، ماہانہ خرچ سب پہلے کی طرح تمہیں ملتا رہے گا۔ کیا کروں تیری بجل پر دل آ گیا ہے۔‘‘

’’تو صاحبزادہ صاحب اپنی بجو سے شادی کر کے ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھ لیں۔‘‘

صاحبزادہ صاحب بھی تو شریف اور خاندانی ہی کہلاتے تھے۔ بجل سے شادی کر لیتے تو وہ اس وعدے کے بوجھ سے بھی آزاد ہو جاتی۔

''کیا کہا تم نے شاہجہان بیگم؟ سجو سے شادی کرلوں؟'' صاحبزادہ صاحب کی پیشانی پر ناگواری سے شکنیں پڑ گئی تھیں اور لبوں پر ایک تمسخر اڑاتی ہوئی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

''ہم خاندانی لوگ ہیں اور شادیاں، نکاح ہم خاندانوں میں ہی کرتے ہیں۔ پندرہ بیس دنوں کے لیے اپنے علاقے میں جا رہا ہوں واپس آ کر سارے معاملات طے کرلیں گے۔''

صاحبزادہ صاحب تو فیصلہ سنا کر چلے گئے تھے اور اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ سجل پر نظر پڑی تو کانوں میں وہی بھاری گمبھیر آواز گونجنے لگی۔

''وعدہ کر شاہجہان میری اولاد کو اپنے کوٹھے کی زینت نہیں بنائے گی۔'' اور وہ بھاگم بھاگ لاہور آئی شاید تب دل لگا کر نہیں ڈھونڈا تھا۔ اندر کہیں کوئی چور تھا لیکن اب اس نے محلے کا ایک ایک دروازہ کھٹکھٹایا، شاید کسی سے کوئی گہرا تعلق ہو، کسی سے ملنے آیا ہو، کسی کو خبر ہو کچھ...... لیکن کسی کو کچھ خبر نہیں تھی کچھ تو نام تک نہیں جانتے تھے۔ کچھ پرانے باسی تھے تو لیکن بے خبر تھے۔ وہ تو وحدت روڈ والے مکان تک بھی ہو آئی تھی۔ آس پاس سے بھی پوچھ لیا...... تو مایوس ہو کر گھڑی دو گھڑی کے لیے ریکھا کے پاس آ بیٹھی تھی اور ریکھا نے اسے بتایا کہ وسوا سے ڈھونڈتا پھر رہا تھا...... وسوا اسی گلی کی پیداوار تو تھا لیکن جوانی میں قدم رکھتے ہی چلا گیا تھا۔

''تیرا پتا پوچھا تھا مجھ سے...... میں نے تو انکار کردیا تھا پر تیری پکی سہیلی نے دے دیا۔''

''یہ وسو کمبخت کو مجھ سے کیا کام آ پڑا۔ کمبخت کہیں کا، زمانے بھر کا جھوٹا، دغاباز......''

''کسی امانت کی بات کر رہا تھا۔'' ریکھا نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''ارے میں اس کی کون سی امانت دبائے بیٹھی ہوں۔''

وہ بھڑکی تھی لیکن پھر یکایک چونکی تھی اور ریکھا کے اصرار کے باوجود رکی نہیں تھی اور اگلے دن ہی واپس کراچی آنے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ ظہورا بہت جز بز ہوا تھا۔

''اب آئے ہیں تو چار دن ٹک جا...... قسم سے ان رونقوں کے لیے ترس گیا تھا۔ نہ ایسے پان وہاں اور نہ...... ویسے سنا ہے ایک ٹھیکدار اکثر مال لے کر آتا ہے بنگالی اور روسی بھی...... شاید تیرا کام بن جائے۔''

''تو رہ جا تو یہیں...... کسی نہ کسی در سے روٹی تو مل ہی جائے گی۔'' شاہجہان بیگم کا لہجہ بظاہر بے حد سادہ اور عام سا تھا لیکن آگے بھی ظہورا تھا۔

''ارے شاہجہان بیگم ہم تو جس در پر بیٹھ گئے، بیٹھ گئے۔ اب تو مر کر ہی وہ در چھوڑے گا۔''

موراں نے آ کر چائے اس کے سامنے تپائی پر رکھی اور اس کی طرف دیکھا۔

''جب سے آئی ہو بیٹھی ہو، چائے پی کر دو گھڑی آرام کرلو۔''

''ہاں......'' وہ چونکی اور چائے کا کپ اٹھا لیا۔

''موراں......'' وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ لاؤنج کا دروازہ کھلا اور رشیدا ہانپتا کانپتا اندر داخل ہوا۔

''ارے کیا ہوا شیدے...... کیا کتے پیچھے لگے ہیں۔'' شاہجہان نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

''نہیں شاہجہان بیگم وہ...... وہ حاتی دادا......''

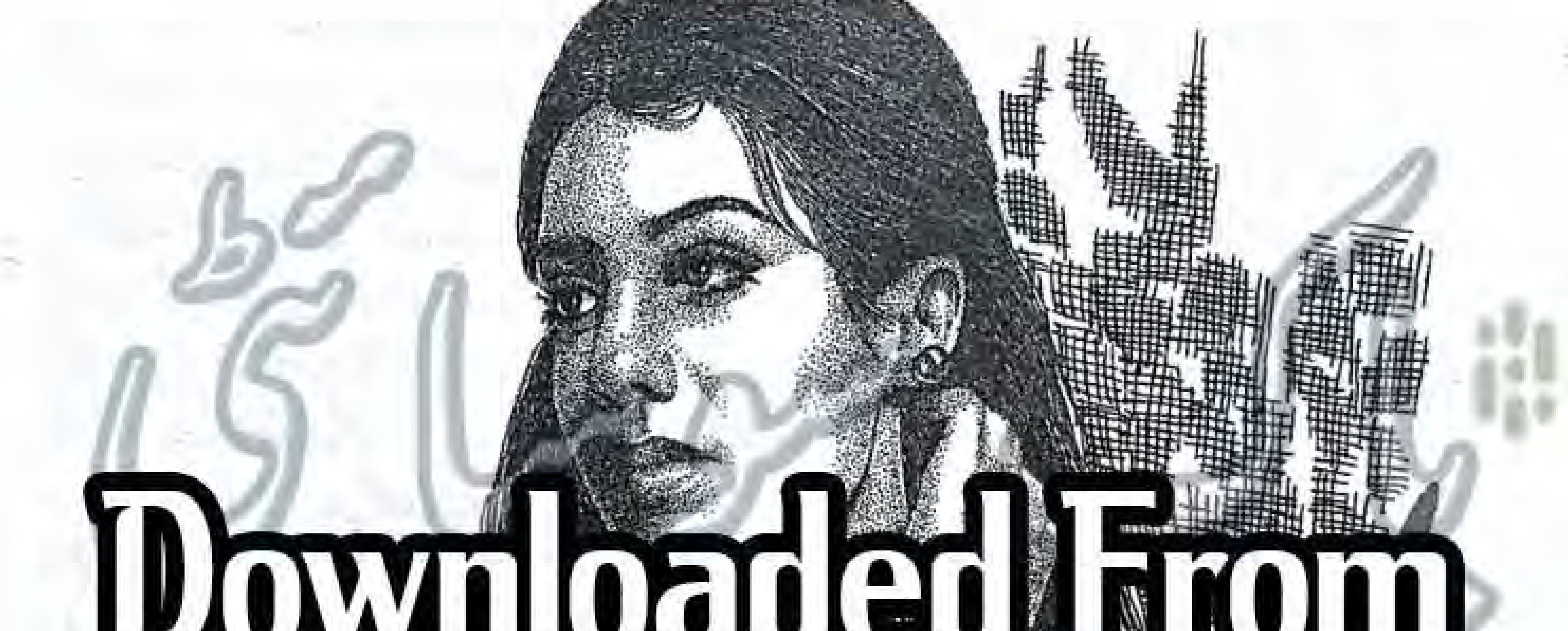
''کیا......؟''

چائے شاہجہان بیگم کے ہاتھوں میں چھلک گئی اور وہ حیران سی شیدے کو دیکھنے لگی۔

(جاری ہے)

آنکھوں کے دیے

نیلم احمد بشیر



لوگ پوچھتے ہیں آپ کو کہانیاں کہاں سے ملتی ہیں؟ انہیں کیا بتاؤں کہ مجھے تو کہانیاں ہر جگہ، ہر وقت، ہر صورت میں مل جاتی ہیں۔ بلا کوشش۔ اور بلا محنت کے...... کبھی گری پڑی، کبھی ٹکڑوں میں بکھری ہوئی اور کبھی فضا میں تیرتی ہوئی۔ مجھے تو انہیں ڈھونڈنے کی بھی ضرورت ہی پیش نہیں آئی کہ وہ لاتعداد کبوتریوں کی طرح میرے آس پاس اڑتی پھڑپھڑاتی اور گھمن... گھیریاں کھاتی رہتی ہیں۔ میں دانہ ڈالتی ہوں تو وہ چگنے کے

لیے ہتھیلی پر آبیٹھتی ہیں اور یہیں سے میرا اور اُن کا دوستانہ شروع ہو جاتا ہے۔

ابھی کل ہی کی بات ہے...... ایک بڑھتی ہوئی عمر کے حساب سے اپنی صحت کا خیال کرنے والی ''کہانی'' شام کو سڑک پر واک کرتی چلی جا رہی تھی کہ یک دم پورے علاقے کی بجلی چلی گئی۔

''اوہو اتنا اندھیرا ہو گیا ہے۔ سڑک پر چلنے والے اوباش مرد خواہ مخواہ میرے گرد ہو جائیں گے۔ یہ سوچے بنا کہ میں بزرگی کی حدوں کو چھو رہی ہوں۔ اکثر کی نانیاں، دادیاں اب میرے برابر کی ہوں گی۔'' کہانی نے ناگواری سے سوچا اور تیز، تیز قدموں سے گھر کی جانب چلنے لگی۔ ملگجے سے اندھیرے میں بھی اسے سائڈ پر لگے بینچ پر بیٹھی ایک اور تنہا کہانی نظر آگئی۔ کٹے ہوئے بالوں اور نسبتاً ماڈرن کپڑے پہنے وہ زارو قطار روئے چلی جا رہی تھی۔

بوڑھی کہانی سے اگلا قدم اٹھایا نہیں گیا اور وہ وہیں بینچ پہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ چند لمحوں بعد اس نے پیار سے سوال کیا۔

''کیا بات ہے بیٹا، کیوں رو رہی ہو! کیا میں تمہاری کوئی مدد کر سکتی ہوں؟'' ہمدردی کے دو بول سن کر نوجوان کہانی نے زور، زور سے رونا شروع کر دیا اور دوپٹے سے اپنے آنسوؤں کی آبشار روکنے کی کوشش کرنے لگی۔ بڑی خاموش ہو کر کتنی ہی دیر اس کی کمر سہلاتی رہی، اس کے جواب کا انتظار کرتی رہی..... آخرکار وہ بولنے لگی۔

''مجھے میرے میاں نے مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا ہے، وہ پہلے بھی ایسا کئی بار کر چکا ہے۔''

''مگر یہاں کیوں بیٹھی ہو اور جا کہاں رہی ہو؟'' بڑی نے اس کے ماتھے پر آئے ہوئے بال ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

''ڈیفنس سے آئی ہوں..... وہیں میرا گھر ہے اور اب امی، ابو کے گھر شادمان جانا ہے رکشے میں۔ بس تھک کر یہاں بیٹھ گئی۔''

''کیا مطلب؟ تم ڈیفنس سے یہاں تک؟''

''جی، پیدل آئی ہوں۔'' اس نے ہچکیوں کے درمیان کہا اور سر جھکا لیا۔ بڑی سوچنے لگی۔ کتنی پاگل ہے یہ، اتنا فاصلہ پیدل چل کر طے کیا ہے اس نے...... شاید کبھی، کبھی انسان پر ایسا وقت بھی آجاتا ہے کہ دوری اور فاصلوں کی صعوبتیں بے معنی ہو جاتی ہیں اور اس پر اپنی بے خودی طاری ہو جاتی ہے کہ مشکل چیز بھی اسے آسان لگنے لگتی ہے۔

''آخر میں نے کیا گناہ کیا ہے جو اللہ میاں مجھے یہ سزا دے رہے ہیں؟'' چھوٹی بولتی چلی گئی۔ ''تین سال ہونے کو آئے، ایک دن بھی سکھ نصیب نہیں ہوا۔ اس نے مجھ سے دھوکے سے شادی کی، اس کے پہلے سے ہی بیوی بچے موجود تھے مگر اس نے میرے گھر والوں سے یہ بات چھپائی اور اب پہلی بیوی کے کہنے پر مجھے رکھنا نہیں چاہتا اور گھر سے نکال دیتا ہے۔''

''تمہارے والدین.....؟'' بڑی نے پوچھا۔

''وہ تو خود بھائی بھابی کے در پر پڑے ہیں، میں اُن کے گھر جاتی ہوں تو دو تین دن بعد رکشے میں سوار کروا کے روانہ کر دیتے ہیں۔'' وہ پھر ہچکیاں لے، لے کر رونے لگی۔

''اچھا سنو...... میری طرف دیکھو...... تمہیں شاید یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میرے میاں نے بھی پندرہ سال پہلے مجھے گھر سے نکال دیا تھا، ایک نئی عورت کے چکر میں۔'' بڑی نے چھوٹی کو اپنی کہانی سنائی تو وہ حیرت زدہ ہو کر ٹکر، ٹکر اسے دیکھنے لگی۔ بڑی عمر کی اجنبی کہانی کبھی کیا اس جیسے امتحانوں سے گزر چکی ہے؟

''پھر آپ نے کیا کیا؟''

''کرنا کیا تھا...... میں نے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سیکھا۔ ملازمت کی، بچے پالے، میں جانتی ہوں یہ سب کہنا آسان اور کرنا بہت مشکل ہے مگر ایک بات تمہیں بتاؤں، دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ بس انسان کو مضبوط ہونا چاہیے۔'' چھوٹی نے بوڑھی ہوتی اسی راہ سے گزری ہوئی کہانی کی طرف دیکھا اور پھر

سسکنے لگی۔
''میں ہی کیوں...... آخر میرے ہی ساتھ...یہ سب کیوں......؟''
''پگلی یہ نہیں ہوتا...... زندگی میں جو ہونا ہوتا ہے بس ہو جاتا ہے۔ اچھا چلو آؤ، میں تمہیں اپنی ایک دوست کے گھر سے پانی پلواؤں، تم پیاسی ہوگی اتنا چل کر آئی ہو...... یہ بالکل ساتھ ہی ہے اس کا گھر......''
بڑی کو اپنی ایک فرنیچر ڈیزائنر دوست کہانی کا خیال آ گیا جس کا گھر وہاں سے قریب ہی تھا...... نوجوان کہانی روبوٹ کے مانند بڑی کی انگلی تھامے اٹھی اور اس کے ساتھ، ساتھ چلنے لگی۔ چند ہی لمحوں میں وہ ایک گھر کے آگے کھڑی تھیں۔
دوست کہانی نے''آؤ آؤ ویلکم......'' کہہ کر دونوں کو اندر بلا لیا اور روتی ہوئی آنکھ والی کو استفہامیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ بڑی نے مختصراً اس کی رام کہانی سنائی اور دوست سے پوچھنے لگی۔
''ہم لوگ اس کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟ کچھ تو کرنا ہوگا۔'' پینتیس، چالیس سالہ فرنیچر ڈیزائنر کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ اس کے چہرے پر حیرت اور دکھ کا کوئی بھی تاثر نہیں تھا۔
''رشیدہ شربت لا کر دو باجیوں کو۔'' اس کے آواز دینے پر ایک ملازمہ اندر آئی جس نے ٹھنڈے، ٹھنڈے صندل کے شربت بھرے دو گلاس سامنے رکھ دیے اور حیرت واستعجاب سے انہیں دیکھنے لگی۔ مہمان پیاسی تھیں غٹاغٹ پی گئیں اور گلاس خالی ہو گئے۔
فرنیچر ڈیزائنر کہانی نے بڑی کو اپنے نئے ڈیزائن کیے ہوئے فرنیچر پیس دکھانے شروع کر دیے اور خوش گپیوں میں مصروف ہو گئی...... بڑی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا کہ اس خاموش اداس بت کا کیا کرنا ہے، اب اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ان دونوں ہی کی ذمے داری بن گئی ہے۔
''دیکھو، گھبراؤ نہیں اور اپنے آپ کو سنبھالو، تم سیدھی اپنے والدین کے پاس جاؤ اور انہیں کہو کہ تمہیں

زندگی جینے کا اصول

زندگی جینے کے دو ہی راستے ہیں...
بھول جاؤ انہیں جنہیں معاف نہیں کر سکتے۔
اور
معاف کر دو انہیں جنہیں بھلا نہیں سکتے۔
از: ہما یاسمین، امریکا

وضع دار

اہلِ عشق بڑے وضع دار ہوتے ہیں
دل روتا ہے مگر آنکھ میں نمی نہیں ہوتی
سچے عشاق کی یہ بڑی نشانی ہے
کج ادائی جتنی بھی ہو، پیار میں کمی نہیں ہوتی
شاعرہ: حمیرا نوشین، منڈی بہاؤ الدین

سہارا دیں کیونکہ بالآخر تم ان ہی کی ذمے داری ہو...... اس کے علاوہ تمہارا کچھ نہیں ہو سکتا......'' دوست نے بڑے میٹر آف فیکٹ انداز میں بات کی اور بڑی سے اِدھر اُدھر کی ہانکنے لگی۔
خاموش بت شربت پیتا رہا سنتا رہا۔
''لیکن وہ مجھے نہیں رکھیں گے...... پھر اسی کے پاس بھیج دیں گے......'' یک دم بت جی اٹھا۔
''دیکھو یہ کوئی انوکھی بات نہیں، گھر گھر کی کہانی ہے۔'' دوست نے خشک لہجے میں کہا۔
''کیوں رشیدہ......؟'' اس نے اپنی ملازمہ کہانی کو مخاطب کیا۔
''ہاں جی بی بی جی۔''
''تو یہاں کیوں کام کرتی ہے، گھر کیوں نہیں بیٹھتی آرام سے؟'' دوست نے اپنی نوکرانی سے سوال کیا۔
''باجی! آپ کو پتا ہے ناں وہ کھسماں نوں کھاناں نشہ کر کے پیٹتا ہے اور خرچہ بھی نہیں دیتا۔ بس جی ہمارے تو نصیب ہی خراب ہیں۔'' رشیدہ نے اپنے جیون ساتھی کو مغلظات سے نوازنا شروع کر دیا۔ ''میرا

تو جی چاہتا ہے اپنے آپ کو آگ لگالوں مگر پھر بچوں کا خیال آجاتا ہے جی بس محنت کر کے ان کا پیٹ پالتی ہوں...... کیا کروں کام نہ کروں تو کھائیں گے کیسے؟''

فرنیچر والی کی ننھی چھ سالہ بیٹی بھاگتی ہوئی آئی اور ماں کا پلو کھینچنے لگی۔

''مما رشیدہ سے کہیں مجھے آئس کریم دے۔'' اس نے ضد کرنا شروع کردی۔

''جا رشیدہ فریزر میں سے اسے آئس کریم نکال دے۔''

''جاؤ بیٹا۔'' ننھی اچھلتی کودتی رشیدہ کے ساتھ کچن کو چل دی۔

''اسے دارالامان میں بھجوادیں......'' بڑی کہانی ابھی تک تو جوان کہانی کی مدد کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

''نہیں، میں نے سنا ہے اس ٹائپ کے اداروں سے لڑکیاں سپلائی کردی جاتی ہیں۔'' مصیبت زدہ کہانی خوفزدہ ہو کر بولی۔

''بھئی نہیں، یہ سب بکواس ہے، آخر عورتوں کی مدد کا ادارہ ہے، ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟'' بڑی کو بڑی مشکل سے ہی کبھی کسی پہ شک ہوتا تھا۔ وہ ہر ایک پر اور ہر بات پر بڑی جلدی اعتماد کرلیتی تھی۔

''یہ میڈ طبقے میں تو ایسی باتیں ہوتی ہی ہیں مگر......'' مصیبت کی ماری نے بات ادھوری چھوڑ دی...... اب اس نے رونا بند کردیا تھا۔

''منی! اِدھر آؤ......'' فرنیچر والی کہانی نے اپنی ننھی بیٹا کو آواز دی...... وہ آئس کریم کو زبان سے چاٹ، چاٹ کر گرنے سے بچاتی ہوئی ماں کے پاس آکر صوفے پر بیٹھ گئی۔

''جی مما......''

''بیٹا ان آنٹی کو بتاؤ تمہارے پاپا مجھے کیسے مارتے ہیں؟'' فرنیچر ڈیزائنر نے بٹیا سے سوال کیا...... بڑی اور چھوٹی کہانی چونکیں اور خوب صورت انٹیریئرز والے گھر کی مالدار مالکہ کی طرف حیرت سے دیکھنے لگیں۔

''پاپا آپ کو ڈنڈے سے مارتے ہیں۔'' ننھی کہانی نے آئس کریم چاٹتے ہوئے جواب دیا۔

''اور اس روز کچن میں کیسے مارا تھا؟'' ماں نے پھر سوال کیا اور بیٹی کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

''اس روز انہوں نے بال نوچے تھے آپ کے...... دھکا دیا تھا اور پھر گرایا بھی تھا۔'' ننھی کہانی آرام سے بولتی چلی گئی اور آئس کریم چاٹتی گئی۔

''مگر کیوں، تم تو خیر سے اچھی طرح گھر میں آباد ہو......؟'' بڑی نے حیرت سے سوال کیا۔ ''کماتی بھی ہو؟''

''شہزادہ ہے میرا میاں...... پالتی ہوں ناں اس کو...... دراصل اسے گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے کا بہت شوق ہے۔ بس اسی لیے ہماری لڑائی ہوجاتی ہے۔'' نیویارک اسکول آف فیشن کی پڑھی ہوئی انٹیریئر ڈیزائنر نے بڑے تحمل سے بتایا اور پھر خود قہقہہ لگا کر ہنسنے لگی۔

''اب آپ جائیں...... رکشا لیں، اندھیرا بڑھتا جارہا ہے۔'' اس نے دکھیاری کو مسکرا کر کہا جس کے آنسو خشک ہو کر گالوں پر جم چکے تھے۔

''میں بھی چلوں...... کافی دیر سے گھر سے نکلی ہوئی ہوں...... بیٹی سوچ رہی ہوگی ماں کہاں رہ گئی...... اور اب تو بجلی بھی آگئی ہے۔'' سب سے سینئر کہانی نے اٹھنے کا قصد کیا۔

''آپ بھی بس...... ایسے ہی ہر کسی کے آنسوؤں سے گھبرا جایا کرتی ہیں...... آپ ہم، سب یہ وہ کہانیاں ہیں اور کہانیاں تو چلتی رہتی ہیں......'' فرنیچر ڈیزائنر کہانی نے اپنے سے کئی برس بڑی کہانی کو پیار سے لپٹا کر سرزنش کی اور مسکرانے لگی۔

''مگر مما میں آپ کو ابھی سے بتادیتی ہوں جب میرا میاں مجھے مارے گا ناں تو میں اس کا ہاتھ پکڑ لوں گی...... اسے اپنے آپ کو مارنے نہیں دوں گی۔ مار سے تو بہت درد ہوتا ہے ناں......'' ننھی منی کہانی نے اِک نیا موڑ لینے کے ارادے کا اظہار کر کے سب کو چونکا دیا...... کمرے میں موجود ہر کہانی کی آنکھ میں یکدم سیکڑوں دیے جھلملانے لگے۔

اعظم دو دن سے آئی سی یو میں تھا۔ سارا خاندان اسپتال میں جمع تھا۔ ہر شخص کے لبوں پر اس کی زندگی کے لیے دعائیں تھیں۔ اس کی بیوی رابعہ کی حالت حد سے زیادہ غیر تھی۔ دو دن میں وہ برسوں کی بیمار نظر آنے لگی تھی۔

اتنا اچھا، زندگی سے بھرپور محبت کرنے والا شوہر جس نے ساری زندگی اسے کانٹا بھی چبھنے نہیں دیا۔ وہ اس کا ساتھ چھوڑے جا رہا تھا اور اس کے پاس اسے روکنے کے لیے دعاؤں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ ڈاکٹروں نے جواب

انعام

نگہت اعظمی



دے دیا تھا۔ اعظم کے دماغ پر چوٹ آئی تھی اور چوٹ بہت شدید تھی۔ آفس سے گھر آتے ہوئے اس کی گاڑی رانگ وے سے آتی ہوئی ویگن سے ٹکرا گئی تھی جس کے نتیجے میں سامنے کا حصہ چکنا چور ہو گیا تھا۔ اسے بڑی مشکل سے گاڑی سے نکالا گیا تھا۔

ایکسیڈنٹ سے چند لمحوں پہلے ہی رابعہ نے اسے فون کیا تھا۔

''آپ کتنی دیر میں آئیں گے؟''

''خیریت...... کوئی خاص بات ہے کیا......؟''

''آپ جلدی آجائیں، آپ کے لیے سرپرائز ہے۔''

''اوہو، اتنی عمر ہوگئی آپ کے سرپرائز دینے کی عادت نہ گئی......'' وہ مسکرا کر بولا۔

''بھول گئے، یہ عادت میں نے آپ ہی سے سیکھی ہے۔'' وہ بھی دھیمے سے مسکرائی۔

''خواہ مخواہ ہی مجھے اس قسم کی فضولیات کا کوئی شوق نہیں......''

''اس کا مطلب ہے اب آپ کو بھی بھولنے کی عادت ہوتی جا رہی ہے...... ویسے کوئی بات نہیں یہ عمر کا تقاضا ہے۔ اس عمر میں ایسا ہی ہوتا ہے۔'' اس نے خلاف عادت شوخی سے کہا۔

''کوئی خاص بات ہے کیا......؟ آج آپ کے لہجے سے خوشیوں کی کھنک سنائی دے رہی ہے۔'' وہ زور سے ہنسا۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں...... میں تو ہمیشہ ہی خوش رہتی ہوں...... جسے آپ جیسا شوہر ملے وہ خوش رہنے کے سوا اور کر بھی کیا سکتا ہے۔''

''یہ شکایت ہے یا کمپلیمنٹ......'' وہ خوش دلی سے بولا۔

''جو چاہے سمجھ لیں۔''

''اچھا چلیں یہ تو بتائیں کہ سرپرائز کیا ہے؟''

''یہ تو ابھی نہیں بتاؤں گی...... آپ گھر آئیں گے تو خود ہی پتا چل جائے گا۔''

''مجھے یقین ہے آپ کے میکے سے کوئی مہمان آیا ہے جبھی آپ اتنی خوش لگ رہی ہیں۔'' اعظم نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔

''یہ سراسر غلط بیانی ہے، آپ جانتے ہیں میں سسرال والوں کے آنے پر بھی اتنا ہی خوش ہوتی ہوں جتنی میکے والوں کی آمد پر......'' وہ قدرے ناراضی سے بولی۔

''اوہو...... آپ نے تو اتنی سی بات کو دل پر ہی لے لیا...... اور یہ تو آپ مجھ سے بہتر جانتی ہیں کہ اس عمر میں دل بہت کمزور ہو جاتا ہے۔ اس قسم کی ٹینشن دل کے لیے مضر ہو سکتی ہیں۔'' اعظم نے شرارت سے چھیڑا۔

''لگتا ہے آفس میں کوئی کام نہیں ہے جبھی آپ نے......'' ''میں میٹنگ میں ہوں......'' کہہ کر فون بند نہیں کر دیا......'' وہ ہنس کر بولی۔

''اوہ...... اچھا یاد دلایا...... پورے پانچ منٹ بعد میری میٹنگ ہے، اس کے کچھ پوائنٹ ڈسکس کرنے ہیں...... خدا حافظ......'' اعظم نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا...... اور ان کے دل پر عجیب سا وہم طاری ہو گیا۔ اعظم عام طور پر خدا حافظ تو نہیں کہتے تھے۔ ''آج خدا حافظ کیوں کہا......؟'' دل پر ان کہا سا بوجھ لیے اس نے صوفے کی پشت سے سر ٹکا دیا۔ ان دونوں کی شادی کو پچیس سال گزر چکے تھے۔ دو بچے تھے ان کی مثالی زندگی تھی۔ دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ حالانکہ جب اعظم کی رابعہ سے منگنی ہوئی تھی پورے خاندان میں تہلکہ مچ گیا تھا۔ کسی کو یقین نہیں آرہا تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ بھلا کبھی مخمل میں بھی ٹاٹ کا پیوند لگا ہے۔ منگنی کے بعد شادی تک لوگوں کو یہی امید رہی کہ شاید یہ شادی نہ ہو سکے۔ اور شادی کے بعد بھی بہت عرصے تک لوگ اس خبر کے منتظر رہے کہ کب یہ شادی اختتام کو پہنچے...... لیکن ہر گزرتے دن کے ساتھ ان کی امیدوں پر اوس پڑتی گئی۔

☆☆☆

اعظم کے والدین خاندان میں سب سے زیادہ خوب صورت اور مالدار تھے۔ اعظم بچپن سے بہت لائق رہا تھا۔ ہر کلاس میں فرسٹ پوزیشن لینا اس کا

معمول تھا۔ اس نے ایک بہت ہی اعلیٰ یونیورسٹی سے الیکٹرانکس میں بی ای کیا پھر شارٹ کورس کر کے فوج جوائن کرلی...... اور بہت جلد اسے میجر کا رینک بھی لگ گیا۔ خاندان میں جتنی بھی لڑکیاں تھیں وہ بیشتر کا آئیڈیل تھا لیکن اس نے رابعہ کا انتخاب کیا جو اس کے دوست آزر کی بہن تھی۔ آذر اس کا کورس میٹ تھا۔ وہ اس کی منگنی میں شرکت کے لیے خاص طور سے چھٹی لے کر پنڈی آیا تھا۔ منگنی سے دو دن پہلے اس نے رافعہ کو دیکھا تھا۔ اسے علم تھا کہ وہ طلاق یافتہ ہے، نکاح کے ایک ماہ بعد رخصتی سے پہلے ہی اس کے شوہر نے اسے طلاق دے دی تھی۔ وہ کسی موذی مرض کا شکار ہوگیا تھا اور اس کی زندگی کو تباہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سچ کہا تھا کیونکہ طلاق کے چند ماہ بعد ہی وہ دنیا سے رخصت ہوگیا...... اعظم نے جب پہلی مرتبہ رافعہ کو دیکھا تو اسے اس میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی لیکن دو دن جب وہ ان کے گھر میں رہا...... اس سے بات کی تو اسے اس کا رکھ رکھاؤ، نظریں جھکا کر بات کرنا، لیے دیے رہنا اور خاص طور پر اس کا حجاب لینا اتنا پسند آیا کہ اس نے آذر کی منگنی سے ایک دن پہلے اپنے والدین کو پنڈی بلوالیا اور آذر کی منگنی کے دن صبح ہی صبح اس کے والدین نے اس کا رشتہ دے دیا...... رابعہ کے والدین حیران بھی ہوئے اور خوش بھی...... ابھی تو وہ اس کے ساتھ ہونے والے حادثے پر افسردہ تھے۔ انہیں شدید دکھ تھا کہ ان کی معصوم اور پارسا بیٹی پر طلاق کا ٹھپا لگ گیا تھا۔ وہ تو یہی سوچ، سوچ کر پریشان ہوتے تھے کہ اب کیا ہوگا؟ کیا ان کی طلاق یافتہ بیٹی کو کوئی غیر شادی شدہ لڑکا پسند کرے گا......؟ اور اگر کوئی لڑکا پسند بھی کرے تو اس کا خاندان اور اس کے والدین اسے قبول کرلیں گے۔ یہاں تو بچے والے بابوں کے لیے مائیں کنواری لڑکیاں تلاش کرتی ہیں...... ان حالات میں اعظم جیسے خوب صورت، لائق فائق اور اعلیٰ خاندان کے لڑکے کا رشتہ آنا ایسا ہی تھا جیسے سوکھے دھانوں پر پانی پڑ جائے۔

اعظم کے والدین نے صبح رشتہ دیا اور شام کو آذر کے ساتھ ہی اس کی منگنی کی رسم بھی ہوگئی۔ منگنی کے بعد پہلی دفعہ رابعہ نے غور سے اسے دیکھا اور جب دیکھا تو گھبرا کر نظریں جھکالیں۔

''ایسے نہ مجھے تم دیکھو......'' اس نے شرارت سے ادھورا مصرعہ گنگنایا......اور وہ اس کے اس ادھورے مصرعے پر بری طرح بلش ہوگئی۔

''آپ اتنے اچھے ہیں آپ کو مجھ سے کہیں زیادہ اچھی لڑکی مل سکتی تھی پھر آپ......'' اس نے اپنے آپ پر قابو پا کر بڑی مشکل سے اپنے خدشے کا اظہار کیا جو صبح سے اسے پریشان کر رہا تھا۔

''مجھے بہت زیادہ اچھی نہیں...... بس تمہارے جیسی لڑکی چاہیے تھی۔ باحیا، باپردہ اپنے خاندان سے محبت کرنے والی۔''

''شریف خاندانوں کی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔'' وہ اب بھی مطمئن نہیں تھی۔

''یقیناً ہوتی ہوں گی لیکن میں کہاں تلاش کرتا......''

''میرے بارے میں آپ کو پتا ہوگا کہ پہلے میرا نکاح......'' اس نے پورا جملہ ہی ادا نہ کیا تھا کہ اعظم نے درمیان سے ہی اس کی بات کاٹ دی۔

''مجھے معلوم ہے اور میرے نزدیک یہ اتنی اہم بات نہیں کہ جس پر ہم اپنا قیمتی وقت ضائع کریں...... جو ہو چکا اسے بھول جاؤ اس پر مٹی ڈالو آگے کی طرف دیکھو......زندگی بے حد خوب صورت ہے اور ہم دونوں مل کر اسے اور زیادہ خوب صورت اور گل رنگ بنائیں گے۔'' اعظم نے چند جملوں میں اس کے سارے خدشات مٹادیے۔ منگنی کے اگلے دن ہی اعظم اسے اپنے عشق میں مبتلا کر کے اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا......اور وہ پور، پور اس کی محبت میں ڈوب گئی۔

اور جب عشق ہوجائے تو زندگی کا چلن ہی بدل جاتا ہے۔ ہر شے خوشیوں کی قوسِ قزح سے جھلملانے لگتی ہے۔ صبح نور کے پیکر میں ڈھل کر مسرتوں کے راگ گنگناتی ہوئی نمودار ہوتی ہے تو رات سیاہ تاروں بھرے لباس میں ملبوس ہو کر شادمانی کی لے پر رقص کرتی ہے۔ لمحوں کی تتلیاں، خوشیوں کی پازیب پہنے نو عمر بچیوں کی طرح اٹھلاتی پھرتی ہیں۔ عشق کے ساز پر دھڑکتا ہوا دل زمانوں کا سفر طے کرنے لگتا ہے۔

اس کی صبح اعظم کے نام سے ہوتی اور رات اس کے نام کا ورد کرتے ہوئے گزرتی یہی حال اعظم کا تھا اور پھر وہ دن بھی آ ہی گیا کہ جب وہ رخصت ہو کر اعظم کے گھر میں آئی تو اسے لگا جیسے خدا نے اسے اسی گھر کے لیے بنایا تھا۔ ان دونوں نے ایک بے حد مکمل اور بھرپور زندگی گزاری تھی۔ اعظم کرنل کے عہدے پر پہنچ کر ریٹائر ہوا تھا پھر اس نے اپنا بزنس شروع کیا۔ خدا نے اس میں بڑی برکت عطا کی۔ شاید اس لیے بھی کہ وہ بہت سخی تھا۔ ضرورت مندوں پر دل کھول کر خرچ کرتا تھا اب اس کا بیٹا میڈیکل کے فائنل ائیر میں تھا اور بیٹی ایم بی اے کر چکی تھی۔ دونوں بچے بے حد قابل، خوب صورت اور مہذب تھے۔ اس نے ڈیفنس میں ہزار گز پر اپنا گھر بنوایا تھا۔ جسے رابعہ نے اپنے ہنر اور سلیقہ مندی سے ایسا سجا کر رکھا تھا کہ جو دیکھتا تعریف کیے بغیر نہ رہتا...... ان دونوں نے حقیقت میں زمین کے اس ٹکڑے پر اپنے لیے جنت بنالی تھی جہاں ہر وقت محبت و پیار اور احترام کے پھول مہکتے رہتے......اعظم کے والدین اس کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ رابعہ اپنے والدین کی طرح ان کا خیال رکھتی......ساس پر پانچ سال پہلے فالج کا اٹیک ہوا تھا۔ ان کا دایاں حصہ بالکل بیکار ہو چکا تھا۔ ان کو اٹھانا بٹھانا، کھانا، کھلانا، نہلانا، دھلانا رافعہ نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ اعظم کبھی نرس کے لیے کہتا تھا تو وہ راضی نہیں ہوتی اور ہمیشہ یہی کہتی۔

''آپ کی امی نے مجھے جس محبت سے قبول کیا اور ساری زندگی جتنی عزت دی میں اس کا بدلہ نہیں اتار سکتی۔ یہ جو کچھ میں کر رہی ہوں اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں......میرا تو رواں، رواں ان کا احسان مند ہے۔'' رافعہ کے اس جملے پر اعظم شوخی سے

مسکرا کر کہتا۔

’’ان کی محبت اور پیار تو آپ کو ہر وقت یاد رہتا ہے اور میں جو ہر وقت آپ پر محبت کے خزانے لٹاتا رہتا ہوں اس کا آپ کو ذرا بھی احساس نہیں......‘‘ اعظم کے ان جملوں پر وہ ہمیشہ کی طرح نظریں جھکا لیتی۔

’’آپ مجھ سے کتنی ہی محبت کریں آپ اس انتہا پر نہیں جا سکتے جہاں پر آپ نے مجھے پہنچا دیا ہے۔‘‘ وہ چاہتے ہوئے بھی اعظم سے یہ نہیں کہہ سکتی تھی اور اعظم کو اس سے یہی شکایت تھی کہ وہ جذبوں کے اظہار میں بہت کفایت سے کام لیتی ہے۔

’’میں مانتا ہوں کفایت شعاری عورت کی خوبی ہے لیکن آپ نے تو ہر معاملے میں کفایت شعاری اختیار کر رکھی ہے۔ کم از کم محبت کے اظہار میں تو اتنی کفایت شعاری سے کام نہ لیا کیجیے......‘‘

’’آپ کیا چاہتے ہیں؟‘‘

’’میں تو بس آپ کو چاہتا ہوں۔‘‘ وہ اس عمر میں بھی کھل کر اظہار کر دیتا تھا اور وہ اس عمر میں بھی لیے دیے رہتی...... وہ ہمیشہ سے ہی بہت کم گو تھی...... جبکہ وہ بہت صاف گو اور کسی حد تک منہ پھٹ بھی تھا اور خاص طور پر محبت کے معاملے میں تو ایسا لگتا تھا جیسے خدا نے اس کا خمیر ہی محبت سے گوندھا ہے۔ وہ ہر کسی پر جان چھڑکتا تھا۔ ہر کسی سے بے لوث محبت کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بہنوں کا سب سے چہیتا بھائی تھا۔ بھانجے بھانجیوں کا سب سے پسندیدہ ماموں تھا۔ بھتیجے بھتیجوں پر جان چھڑکنے والا چاچو تھا اور دوستوں کا ایسا دوست کہ اگر آدھی رات کو بھی کسی کو اس کی ضرورت ہو تو وہ گہری نیند سے اٹھ کر اس کے ساتھ چل دیتا۔

رابعہ کو اس کی انہی باتوں سے شکایت تھی۔ ایک بے دریغ پیسے خرچ کرنا اور دوسروں کے لیے اپنی جان کی پروانہ کرنا۔

’’آپ کو لوگ بے وقوف بناتے ہیں، کیسے کیسے بہانوں سے پیسے اینٹھتے ہیں پھر واپس بھی نہیں کرتے۔‘‘

’’چلو اچھا ہے کوئی مجھے بے وقوف بنا کر خوش ہوتا ہے تو اسے خوش ہو لینے دو۔‘‘

’’آپ لوگوں کے لیے اتنا کرتے ہیں اگر خدانہ کرے آپ کسی مشکل میں پھنس گئے تو یہ لوگ آپ کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھیں گے۔‘‘

’’کوئی دیکھے نہ دیکھے، میرا رب تو دیکھے گا......‘‘

اور اس کے اس جملے پر وہ آگے کچھ کہہ بھی نہ پاتی۔

☆☆☆

وہ اعظم کی امی کی دوست کی بیٹی تھی۔ وہ لوگ خیر پور میں رہتے تھے۔ اعظم کی بڑی بہن کی شادی میں وہ اپنی ماں کے ساتھ شرکت کے لیے آئی تھی۔ گہرے سانولے رنگ اور چھوٹے قد نے اس کی بے شمار خوبیوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ وہ بہت سلیقہ مند تھی۔ بہت جامہ زیب تھی، بہت ذہین تھی، وہ اس زمانے میں ایف ایس سی کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھی۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ کراچی کے اسٹیشن پر پہنچی تو اعظم انہیں لینے کے لیے آیا تھا۔ اعظم اس وقت بی ای کے فائنل ائیر میں تھا۔ وہ دونوں اسٹیشن پر حیران پریشان کھڑی تھیں تو ایک بے حد خوبرو اور اسمارٹ جوان اُن کے قریب آیا۔

’’آپ غالباً رافیہ خالہ ہیں۔‘‘ اس نے انہیں پہچان کر کہا۔

’’ہاں، ہاں میں ہی رافیہ ہوں اور یہ میری بیٹی فروا ہے...... تم شہناز کے بیٹے لگ رہے ہو۔‘‘ انہوں نے ایک ہی جملے میں کئی باتیں کہہ دیں۔

’’میں حقیقت میں شہناز کا ہی بیٹا ہوں۔‘‘ اس نے مسکرا کر شگفتہ لہجے میں کہا۔

’’آئیں مما بہت شدت سے آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔‘‘ اس نے قلی کو بلا کر ان کا سامان اس کے حوالے کیا اور ان کے ساتھ، ساتھ چلنے لگا۔

’’تم تو بالکل شہناز کی شکل ہو...... وہ بھی جوانی میں اتنی ہی خوب صورت تھی۔‘‘ رافیہ نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

’’وہ اب بھی بہت خوب صورت ہیں......‘‘ وہ ہنس کر بولا اور ہنستے ہوئے اس کے موتیوں جیسے چمکتے ہوئے

دانتوں نے اس کے چہرے کو اور زیادہ خوب صورت بنا دیا تھا۔ وہ کن انکھیوں سے اسے ہی دیکھے جا رہی تھی۔ اسے بھی احساس ہو گیا وہ باتیں کرتے، کرتے مسکرا کر سرسری سی نظر اس پر ڈال لیتا تو وہ گھبرا جاتی۔

پھر اعظم کی بہن کی شادی نے اس کی زندگی ہی بدل ڈالی۔ ابھی تک کسی نے اس کی خوبیوں کو اس طرح نہیں سراہا تھا جیسے اعظم اور اس کے گھر والوں نے سراہا۔ یہاں کسی نے اس کے سانولے رنگ اور چھوٹے قد کو تنقید کا نشانہ نہیں بنایا۔ وہ جو بھی کرتی وہ سب دل کھول کر اس کی تعریف کرتے...... وہ صبح سویرے ہی اٹھ جاتی اور اعظم کی امی کے ساتھ کچن میں مصروف ہو جاتی۔ وہ پراٹھے بناتیں تو وہ آملیٹ تیار کر لیتی۔ چائے دم دیتی...... توس سینک لیتی ٹیبل سیٹ کر لیتی جبکہ سب لڑکیاں آرام سے سوتی رہتیں۔ اعظم بھی سویرے اٹھنے کا عادی تھا۔ وہ اسے صبح، صبح اپنی امی کے ساتھ کام میں مصروف دیکھ کر حیران رہ جاتا۔

''تم کیوں اتنے سویرے اٹھ جاتی ہو؟''

''مجھے عادت ہے، میں دیر تک نہیں سوسکتی۔''

''بڑی اچھی عادت ہے۔''

وہ ناشتا بنا کر لاتی' وہ دل کھول کر تعریف کرتا۔

''تو تم تو بہت مزے کا آملیٹ بناتی ہو...... اتنا مزیدار تو مما بھی نہیں بناتیں۔'' وہ اس کی تعریف پر خوشی سے کھل اٹھتی اور مزید کاموں میں جت جاتی......

اس نے ایک ہفتے میں ہی کچن پر مکمل قبضہ کر لیا۔ وہ خوب مزے، مزے کے کھانے پکاتی اور سب کی تعریفیں سمیٹتی۔

''بھئی رافیہ تم نے تو اپنی بیٹی کی بڑی اچھی تربیت کی ہے۔ اتنی کم عمری میں ہر کام سکھا دیا۔ آج کل ایسی لڑکیاں نظر ہی نہیں آتیں۔'' اعظم کی امی اٹھتے بیٹھتے رافیہ سے اس کی تعریفیں کرتی رہتیں اور وہ ہواؤں میں اڑتی رہتی۔ مہندی کی تقریب کے لیے اس نے فان اور سی گرین رنگ کا سوٹ سلوایا تھا اس دن وہ پہلی دفعہ بہت دل لگا کر تیار ہوئی تھی۔ اپنے سیاہ بالوں کو گجرا لگا کر کھلا چھوڑ دیا تھا۔ اور اپنی بے حد خوب صورت آنکھوں کا بہت سلیقے سے میک اپ کیا تھا۔ وہ تیار ہو کر لاؤنج میں آئی تو اعظم نے جو اسی وقت مٹھائی اور گجرے لے کر آیا تھا۔ بے ساختہ اس کی تعریف کی۔

''فروا...... یہ تم ہو...... بائی گاڈ، مجھے یقین نہیں آ رہا۔ تم تو بالکل ہی پہچانی نہیں جا رہیں......''

''واقعی آج تو میری فروا بہت ہی پیاری لگ رہی ہے۔'' اعظم کی امی نے اسے گلے لگا کر اس کی پیشانی چومی اور اس نے آنکھوں میں بے شمار خواب سجا لیے اور ویسے بھی یہ عمر ہی خواب دیکھنے کی ہوتی ہے۔ اس نے دیکھ لیے تو کیا غلط کیا تھا۔ اس دن کے بعد وہ بے حد سادہ رہنے والی لڑکی سولہ سنگار کرنے لگی۔ سب اس کی تعریفیں کرتے اور وہ ان تعریفوں کو آسمانی صحیفوں کے الفاظ سمجھ کر دل میں نقش کرتی رہی۔

شادی کے ایک ہفتے بعد وہ دونوں خیر پور واپس آ گئیں۔ کئی برس پہلے فروا کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ گھر اپنا تھا وہ بے گھری سے بچ گئیں۔ وہ گھر تو واپس آ گئی تھی لیکن اس کا سب کچھ وہیں رہ گیا تھا۔ محبت کی جڑیں اس کے دل کی زمین میں اتنی مضبوطی سے پیوست ہو گئیں کہ انہیں اکھاڑنا تو دور کی بات انہیں ہلانا بھی اس کے بس سے باہر ہو گیا۔ وہ سارا دن اور ساری رات سوتی جاگتی کیفیت میں گزار دیتی۔ اس کے پاس شادی کی کچھ تصاویر تھیں جو اعظم نے اسے ڈیولیپ کروا کر دی تھیں۔ ان میں دو تصویروں میں اس کے ساتھ اعظم بھی تھا اور وہ دو تصویریں اس کی زندگی کا حاصل تھیں پھر جیسے، جیسے وقت گزرا اس آگ کی تپش میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ وہ کراچی آنے کے بہانے ڈھونڈنے لگی۔ کراچی آنا پھر اعظم سے ملنا، اس سے باتیں کرنا اسے دیکھنا...... اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی تھی۔ اس دوران اعظم بھی کئی دفعہ خیر پور آیا۔ دونوں ہر موضوع پر بات کرتے سوائے ایک موضوع کے...... جس پر تنہائی میں وہ گھنٹوں اعظم سے بات کرتی رہتی تھی لیکن جب وہ سامنے آتا تو اس کے سارے الفاظ گونگے

ہو جاتے...... پھر اسے پتا چلا اعظم فوج میں چلا گیا۔ وہ اس کی کامیابیوں کے لیے دعائیں کرتی رہی۔ اس نے بھی ایم ایس سی کرلیا تھا اور کالج میں پڑھانے لگی تھی۔ اس کے قد کی وجہ سے اس کا کوئی ڈھنگ کا رشتہ ہی نہیں آیا۔ اس کے گھر بسانے کی حسرت دل میں لیے رافیہ بھی دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ وہ بالکل اکیلی رہ گئی۔ اسے اعظم کی شادی کا کارڈ ملا تھا۔ اس نے اسے مبارک باد کا کارڈ بھیجا...... وہ کالج کے ہاسٹل میں شفٹ ہوگئی تھی۔ کبھی کبھار جب دل بہت گھبراتا تو وہ اپنے چھوٹے سے بریف کیس سے شاپر نکالتی...... جس میں بہت پرانی دو بوسیدہ تصویریں بڑی احتیاط سے پلاسٹک کوٹنگ کی ہوئی رکھی تھیں ان تصویروں کو دیکھتی اور رنگوں اور خوشبوؤں کی دنیا میں نو عمر الھڑ لڑکیوں کی طرح گھومتی پھرتی۔

اس دن اس کا دل بہت اداس ہو رہا تھا۔ اس نے سامان اٹھایا اور کراچی جانے کے لیے بس میں سوار ہوگئی۔ چند گھنٹوں میں وہ کراچی میں تھی۔ وہ سیدھی اعظم کے گھر جا پہنچی۔ اعظم کی بیوی اس سے بہت اچھی طرح واقف تھی۔ وہ اس سے بہت گرم جوشی سے ملی۔

”اعظم تمہارا بہت ذکر کرتے ہیں۔ وہ تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گے...... تم فریش ہو جاؤ...... وہ اب آنے والے ہی ہوں گے۔“

☆☆☆

وہاں کا ٹرانسمیشن سسٹم اتنا بہتر اور پاور فل تھا کہ ہر، ہر پل کی درخواستیں فون پر پہنچ رہی تھیں اور ہر درخواست میں اس کی زندگی کے لیے التجائیں تھیں۔ منتیں تھیں، آہ وزاریاں تھیں۔ بیشتر درخواستیں آنسوؤں کے لفافوں میں بند تھیں۔ درخواستوں پر غور ہو رہا تھا۔ بھیجنے والے کا نام دیکھ جا رہا تھا۔ اس کے خلوص کو رشتے کی میزان میں رکھ کر جانچا جا رہا تھا۔ اس دعا کی بے غرضی اور بے لوثی کو پرکھا جا رہا تھا۔

یہ بیٹی کی درخواست تھی۔ اسے باپ کی ضرورت

خوشحالی کی ضمانت

☆ قرآن پاک کی روزانہ تلاوت۔

☆ پنجگانہ نماز کی پابندی۔

☆ ہر حال میں شکرِ خدا ادا کرنا۔

☆ مجبوروں، بیکسوں، مسافروں کی حق المقدور مدد گناہوں سے سچی توبہ......

☆ عزیزوں، رشتے داروں، پڑوسیوں سے اچھا سلوک۔

از: انجم طاہر، کراچی

قابل غور

انسانیت محبت کا مرکز اور محبت انسانیت کی معراج ہے۔ اگر میرا علم مجھے انسان سے محبت کرنا نہیں سکھاتا تو ایک جاہل مجھ سے ہزار ہا درجے بہتر ہے۔

قول: مولانا رومی

دو چیزیں بڑی اہم ہیں

اللہ کا ڈر...... اور......

اللہ کا در......

جس شخص کو یہ دو نعمتیں نصیب ہوگئیں سمجھو اسے دنیا کی تمام سعادتیں نصیب ہوگئیں۔ ڈر نصیب ہوگا...... تو......

گناہوں سے بچے گا۔

در نصیب ہوگا...... تو......

عبادت میں لذت ملے گی۔

مرسلہ: فرح طاہر، لاہور

عشق

یونہی تو نہیں عشق میں سرمست ہوا تو
اِک روح تری روح میں تحلیل ہوئی ہے

شاعر: سائیں سچل سرمست

پسند: سدرۃ المنتہیٰ، ٹھٹھہ

تھی۔ ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ یہ بیٹے کی درخواست تھی۔ ابھی اس نے دنیا کو مکمل طور پر دیکھا نہیں تھا۔ اسے قدم، قدم پر باپ کے سہارے کی ضرورت تھی۔

یہ بیوی کی درخواست تھی۔ پچیس سال اس نے اپنے شوہر کے ساتھ گزارے تھے اور اس کے شوہر نے کبھی تلخ لہجے میں اس سے بات تک نہیں کی تھی۔ اسے ہمیشہ پھولوں کی طرح رکھا تھا۔

یہ بہن کی درخواست تھی وہ اپنی بہنوں کا مان تھا...... وہ اس کے آسرے پر سر اٹھا کر چلتی پھرتی...... سسرال میں بھائی کے دم سے ان کا بھرم قائم تھا۔

یہ دوست کی درخواست تھی۔ اس نے ہر موقع پر اس کا ساتھ دیا تھا۔ بڑی سخت مشکلات میں وہ اس کے ساتھ رہا تھا۔

لیکن ایک درخواست ایسی بھی تھی جس میں کوئی غرض نہیں تھی۔ جس کا اس سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ جس سے اس نے کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا تھا۔ لیکن یہی ایک درخواست قابلِ غور ٹھہری کہ جس میں اس کی زندگی کے لیے اس شدت سے التجا کی گئی کہ جس نے سارے عرش کو ہلا کر رکھ دیا۔ کائنات پر سناٹا چھا گیا...... وقت کی نبض رک سی گئی۔ عرش کانپ رہا تھا۔ فرشتے سر جھکائے حکم کے منتظر تھے اور پھر حکم جاری ہوگیا۔ درخواست منظور کرلی گئی۔ خوشیوں کے شادیانے بجنے لگے۔ رنگ و نور کی بارش ہونے لگی اور چاندی کی رتھ پر سوار ہوکر فرشتے اس کی زندگی کی نوید لے کر اترنے لگے۔

☆☆☆

اس نے جائے نماز لپیٹ کر رکھ دی۔ فجر کی اذان ہورہی تھی۔ وہ فجر کی نماز پڑھ کر اسپتال کے کمرے سے آئی سی یو کی طرف آئی اور دروازے میں لگے شیشے سے سر ٹکا کر اندر دیکھنے لگی۔ ڈاکٹرز اس کے بیڈ کے قریب آرہے تھے...... اس کی پلکوں میں جنبش ہورہی تھی...... ڈاکٹر کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔

☆☆☆

وہ سب بہت خوش تھے۔ اعظم کو وارڈ میں شفٹ کردیا گیا تھا۔ رابعہ اسے سوپ پلا رہی تھی۔ اس نے بڑی محبت سے رابعہ کو دیکھا۔

''یہ سب تمہاری دعاؤں کا اثر ہے۔''

''صرف میری نہیں، ان سب لوگوں کی جو آپ پر جان چھڑکتے ہیں۔''

''مثلاً......؟'' وہ دھیمے سے مسکرایا۔

''کیا آپ کو نہیں معلوم...... آپ کی بہنیں، آپ کے بھائی...... آپ کی بیٹی...... آپ کا بیٹا...... آپ کے دوست احباب......''

''اور...... کون...... ان کے علاوہ......؟'' وہ شوخی سے مسکرایا۔

''اور کوئی نہیں......'' ان کے ذہن میں بار، بار ایک اور نام بھی آرہا تھا۔ وہ جو سارا وقت مصلے پر بیٹھی رہتی تھی اور ہر چیز سے بے نیاز ہوکر دعائیں مانگتی رہتی تھی۔ پتا نہیں اعظم کا نام لیتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ایسا کیا نظر آتا کہ وہ گھبرا جاتی تھی اور جس دن ڈاکٹروں نے اعظم کی حالت خطرے سے باہر ہونے کا مژدہ سنایا تو اس نے اسی دن اپنا سامان سمیٹا اور خاموشی سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اسے نہ روک سکی۔

''ایک بات بتاؤں؟'' اعظم نے سوپ کا پیالہ خالی کرنے کے بعد ہینڈ ٹاول سے اپنا منہ صاف کیا۔

''ضرور بتائیں......'' وہ مسکرائی۔

''مجھے جب ہوش آیا تو غور کرو...... میرے ذہن میں سب سے پہلے کس کا خیال آیا۔''

''ظاہر ہے میرا آیا ہوگا یا امی کا......'' اس نے بڑے مان سے کہا۔

''یہی تو حیرت کی بات ہے نہ تمہارا خیال آیا اور نہ ہی امی کا......''

''پھر......؟'' اس نے حیران ہوکر اعظم کو دیکھا۔

''بڑی عجیب بات ہے ہوش میں آنے کے بعد جو نام

سب سے پہلے میرے ذہن میں آیا وہ فروا کا تھا۔"

"دھڑ.....دھڑ.....دھڑام....." رابعہ کا سارا وجود جیسے زلزلے کی زد میں آ گیا۔

"کون.....فروا.....؟" وہ یکسر انجان بن گئی۔

"وہی فروا..... رافیہ خالہ کی بیٹی جو خیر پور میں رہتی ہے..... بلکہ مجھے تو ایسا لگا جیسے وہ میرے سامنے کھڑی ہے۔" اعظم کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

"ہوسکتا ہے آپ کا وہم ہو....."

"میں تو اس بات پر حیران ہوں کہ ایسا کیوں ہوا، میرا تو اس سے کوئی رشتہ ہی نہیں ہے۔ میں نے تو ساری زندگی کبھی اس کے بارے میں سوچا تک نہیں..... پھر ایسا کیوں ہوا.....؟" وہ پریشان سا نظر آ رہا تھا۔

"آپ اپنے ذہن پر زیادہ زور نہ ڈالیں، یہ کوئی اتنی اہم بات نہیں جس کے لیے آپ اپنی انرجی ضائع کر رہے ہیں۔" رابعہ نے مسکرا کر مصنوعی خفگی سے کہا اور اعظم دل پر ان کہا سا بوجھ لیے خاموش ہو گیا۔

☆☆☆

وہ چاندی کی رتھ پر سوار تھی۔ اس کے چاروں طرف نور کی برسات ہو رہی تھی۔ ہر طرف مسرتوں کے چراغ جھلملا رہے تھے۔ اسے کسی بھی منزل پر ٹھہرنا نہیں پڑا، ہر دروازہ اس کے لیے کھلا تھا۔ وہ جس دروازے سے اندر داخل ہوتی بے شمار خوشیوں سے چمکتے ہوئے چہرے اس کے استقبال کے لیے موجود ہوتے۔ اس کی سواری آگے بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ اس کی سواری ایک بے حد پُرشکوہ اور عالیشان محل کے سامنے لا کر روک دی گئی۔ اس نے خوشی اور حیرت سے چاروں طرف دیکھا۔ "اندر جاؤ یہ تمہارا گھر ہے....."

"میرا.....میرا.....ایسا گھر.....؟"

"ہاں تمہارا....."

"مگر میرا تو کوئی گھر نہیں ہے....."

"اسی لیے تو تمہیں یہ گھر دیا گیا ہے۔"

"مجھ پر یہ کرم کیوں.....؟" اس کے دل کی گہرائیوں میں یہ سوال اٹھا۔

"یہ تمہاری اس دعا کا حاصل ہے جو تم نے بغیر کسی غرض کے کی تھی؟"

"لیکن میری..... وہ .....دعا تو قبول ہو گئی تھی..... اعظم کو نئی زندگی مل گئی۔" دل کسی صورت مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔

"وہ دعا ہم نے سنبھال کر رکھ لی تھی۔"

"کیوں.....؟" اس کے اندر یہ سوال کرنے کی ہمت نہیں تھی کہ لیکن اس کے ہر سوال کا جواب دیا جا رہا تھا۔

"ہم بے غرضی سے مانگی ہوئی دعاؤں کو ضرور قبول کرتے ہیں اور مانگنے والوں کو اپنے انعام سے بھی نوازتے ہیں..... یہ تمہارا انعام ہے....."

"ایسا انعام....." حیرت سے پورے وجود پر سکوت طاری ہو گیا۔

"انسان خسارے میں ہے، وہ نہیں جانتا کہ ایک بے غرض اور بے ریا عمل کا ہمارے پاس کتنا بڑا انعام ہے....."

"شکر ہے میں خسارہ اٹھانے والوں میں شامل نہیں ہوئی۔" اس نے گہرے اطمینان کی سانس لی اور بہاروں کے قافلے کے ساتھ قدم اٹھاتی ہوئی اس محل میں داخل ہو گئی۔

☆☆☆

"میڈم فروا کے چہرے پر کتنا اطمینان اور سکون تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے چین کی نیند سو رہی ہوں۔"

اس کی ساری شاگرد اور کولیگز اس کا آخری دیدار کرتے ہوئے یہ جملہ کہہ رہی تھیں اور رات کے پچھلے پہر اپنے بستر پر لیٹا ہوا وہ سوچ رہا تھا۔

"یہ فروا مجھے کیوں اتنی یاد آنے لگی ہے؟" اسے رابعہ نے یہ بتایا ہی نہیں تھا کہ جس دن اسے ہوش آیا تھا اسی دن فروا کراچی سے خیر پور جاتے ہوئے ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں دنیا سے رخصت ہو گئی تھی۔

AA

ناولٹ

پانچواں اور آخری حصہ

کھوئے کھوئے لمحے

تابندہ نعیم

پاکستان کی انتہائی معتبر، انتہائی خوب صورت اور انتہائی گہرے جملے لکھنے والی مصنفہ رفعت ناہید سجاد کے انداز تحریر سے متاثر ہو کر شروع کی جانے والی یہ کہانی گزشتہ کئی سالوں سے ٹکڑوں کی شکل میں لکھی جاتی رہی۔ اس عرصے میں پاکستانی معاشرہ تبدیل ہوچکا ہے۔ اب پاکستان کے پبلک پارکس میں شاید ہی کوئی غیر ملکی خاتون پاکستانی طالبات کو شام کی تفریح کرانے نکلتی ہو۔۔۔ مگر ہمارے آپ کے اسی پاکستان میں کبھی ایسا ہوا کرتا تھا۔ کہانی فرضی ہے۔ اس کے واقعات سن انیس سو ستاسی سے انیس سو بچانوے تک کے حالات اور کرداروں پر مبنی ہیں، تاہم ان کی کسی حقیقی کردار یا واقعے سے مماثلت محض اتفاقیہ ہو سکتی ہے۔

موضع محمد خان کے اس اینٹ پتھر کے زندان میں میگی جیسی کئی کہانیاں سایوں کی طرح منڈلا رہی تھیں۔ سائے جن میں روح نہیں ہوتی، رنگ نہیں ہوتے۔ جن کی کوئی تاریخ، ماضی اور مستقبل نہیں ہوتے۔ جو روشنی ہونے پر غائب ہوجاتے ہیں اور اندھیرا ہونے پر دالانوں اور منڈیروں پر چکرانے لگتے ہیں۔

وہ ایک عرصے تک اپنا احتساب کرتی رہی۔ ہر روز، ہر گھڑی، اس سنہری شہزادے کو تلاش کرتی رہی۔ جس کی چمک نے اس کی آنکھیں خیرہ کردی تھیں۔ جس کی بناوٹی خوش ذوقی نے میگی کو اس سنہری سورج کے دیس میں اس کی پسند کے وہ رنگ دکھانے کا وعدہ کیا تھا جسے دیکھنے کے خواب اس کے باپ نے خود اپنی میگی کی آنکھوں میں بھرے





تھے۔ وہ اپنی ماں کی طرح ایک عرصے تک اپنے باپ کو الزام دیتے نہیں تھکی تھی۔

یہاں آکر اسے پتا چلا تھا کہ وہ شہزادے کا بھیس بھرے، دیوزادے کی مٹھی میں آگئی ہے۔ اس کی حیثیت ایک خوش نما تتلی سے زیادہ نہیں...... جس سے دیوزادوں کو بیش قیمت خزانوں کے وہ قفل کھلوانے ہیں جن کی کنجیاں عرصہ ہوا سمندر برد ہو چکی ہیں...... خزانے جن کے پہرے پر ہزاروں سانپ اور بچھو مامور ہیں...... خوش رنگ تتلی کا فرض ہے کہ دیوزادے کو خزانے تک پہنچانے کے لیے اپنے رنگوں سے سانپ اور بچھوؤں کی آنکھیں خیرہ کرے اور خزانے کے قفل کھولنے کا کام اپنے نازک پروں سے انجام دے۔

وہ اپنے باپ کے خواب کی تکمیل ہوتی دیکھ رہی تھی۔

اسی سنہری دیس میں جہاں سانولی سلونی ہندوستانی اپسرائیں حسین ساڑیوں اور رنگین غراروں میں ملبوس، برٹش کلچر میں اپنے قریبی رشتوں کے ساتھ بہار کے رنگ بن کر اترتی تھیں...... جہاں اپنے باپ کی کہانی سناتی آواز وہ اب تک اپنے آس پاس محسوس کر سکتی تھی۔ اب وہ خود اس کہانی کا کردار جو تھی۔ اپنے ساحر کی خوشنودی کے لیے سانولے سلونے چہروں والے کچھ پڑھے لکھے، کچھ ان پڑھ، محفل کے آداب سے واقف اس ملک کے طبقۂ اشرافیہ کی رات گئے برپا ہونے والی محفلوں کا حصہ...... جہاں اس کی ایک مسکراہٹ پر لاکھوں کے سودے کھڑے، کھڑے محمد فیروز معظم خان کے حق میں ہو جاتے تھے۔ اس کا ساحر اپنی مٹھی کھول کر تتلی کو آزاد کرنا بھول گیا تھا۔ میگی نے بعد میں کئی بار سوچا...... شاید تتلی کے رنگ اب بھی اس کی سخت ہتھیلیوں میں کہیں موجود ہوں۔

''کبھی نہ کبھی اس بات کی کھوج بھی کرنی چاہیے......'' اس کے باپ کے خوابوں کے چلچلاتی دھوپ والے اس دیس کا نام ہندوستان نہیں تھا۔

سیاست سے اسے دلچسپی نہیں ہوتی تو بھی اسے جاننے میں زیادہ وقت نہیں لگا کہ دنیا کے اس حصے میں جہاں وہ اپنے دیوزاد کے کاروباری رازوں کی شریک تھی اور جہاں ہر دم سرکاری کنٹریکٹ بڑے، بڑے سرکاری ٹھیکے، تحفے میں لی اور دی جانے والی زمینوں اور نفع بخش سودوں کی باتیں، اس کی زندگی کے خاموش ساز کا پس منظر بن گئی تھیں۔ انسانوں کی ترقی اور اچھے مستقبل کے منصوبے، جنرل، کرنل اور سول بیوروکریسی کے بڑے افسران بناتے تھے۔ غریب اور ان پڑھ عوام کو ایسی باتوں کی سمجھ بوجھ کہاں...... جمہوریت نامی گستاخ چڑیا نے اس اٹھارہ سالہ نوخیز ملک پر ابھی اپنے پر پھیلائے نہیں تھے۔

جس دن شہر لاہور کے باسی ہندوستانی جہازوں کو پتنگوں کی طرح گرتے دیکھنے کے لیے اپنے مکانوں کی چھتوں پر چڑھے ''اللہ اکبر'' کے نعرے لگا رہے تھے۔ اور اس کا شوہر کسی بھی ہنگامی صورتِ حال میں راتوں رات لاہور سے نکلنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے لاہور جم خانہ کے لان میں.......... گر جانے والے فوجی افسر کو کسی کو پکارتے سنا تھا۔ کوئی مدد کے لیے دوڑا تھا۔

''جنرل آغا...... آر یو آل رائٹ سر؟'' بعد میں اس نے مکار دشمن کے دانت کھٹے ہونے کی خبر فیروز معظم خان کے آبائی گاؤں، موضع محمد خان کی رہائش گاہ پر سنی تھی۔ چند مہینوں بعد ایک بہت بڑی شخصیت جنوبی پنجاب کے دورے پر آئی۔ یہ سنہری موقع تھا اور فیروز معظم خان کی صوبائی سیاست میں بھرپور شرکت کا ٹکٹ بن سکتا تھا۔ فیروز نے اس بار جان نثاری کی حدیں بالکل ہی پھلانگ دیں...... اس رات وہ بڑی شخصیت...... فیروز معظم خان کی مہمان داری اور اس کی حسین مسکراہٹ والی انگریز بیوی کی سنہری زلفوں کی اسیر بن گئی۔

بعد میں وہ جان گئی کہ وہ شخصیت کون تھی مگر اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ اس کا صیاد، اس کا قاتل، اس کا دلدار، اس کا محبوب...... اسے اس کے بعد کتنی بار اسلام آباد لے کر گیا تھا۔ وہ انگلیوں پر گننے سے قاصر تھی۔

رنگین ساڑیوں اور ریشمی غراروں میں خود کو کسی بلوریں جام کی طرح ہر دم تشنہ رہنے والے نفرت انگیز لبوں کی آسودگی کا بندوبست کرتی اور کسی معمولی حکم عدولی پر دیوزادے کی آنکھ میں لہریں لیتے جلال کو اپنی پیٹھ پر سہتی...... وہ نازک اندام، سروقد، دودھ اور شہد میں گندھی کچھ نہ کچھ پڑھی لکھی،

غیر ملکی عورت...... فیروز معظم خان کے حرم میں داخل اس کی دو خاندانی اور دو غیر خاندانی بیویوں میں سے ایک اس کی جائز اور نکاحی بیوی تھی۔ میگی یعنی مریم فیروز معظم خان......

جوانی کی چاندنی، چودھویں کی رات کی طرح ڈھل گئی......اس کی کوئی اولاد نہیں ہوئی کیوں؟ اس نے کبھی خدا سے شکوہ نہیں کیا...... اسے طلب بھی نہیں تھی۔ بہت سال اسے لگتا رہا کہ خدا نے اسے اولاد نہ دے کر اس کے حصے کی ایک آزمائش کم کر دی ہے۔ عمر بڑھنے کے ساتھ محفلوں میں جان ڈالنے کے لیے اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اتنے سال فرار کی کوشش نہ کرنے کے انعام میں اسے سنگ مرمر کے اس محل میں اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا تھا۔

تتلی کے پر ٹوٹ چکے تھے...... ہوا کتنی خوشگوار ہے، پرندے کیسے گنگناتے ہیں، رس بھرے پھول کتنی شوخی سے جھوم رہے ہیں...... مری ہوئی تتلی کو اس سے کیا غرض......؟

فیروز معظم خان کی عمر بڑھی تھی مگر وہ بوڑھا نہیں ہوا تھا۔ ہاں اب اس کے بیٹے جوان تھے...... اب ان کا وقت تھا...... اس نے اپنے خوبرو شہزادوں جیسے چار کڑیل بیٹوں کی جوانیوں سے اب وہی کھیل کھیلنا تھا۔ جس کی منصوبہ بندی کبھی اس کے دانا باپ نے اپنے بیٹے کے لیے کی تھی۔ اس کے خاندان کے اثر رسوخ، ترقی اور سربلندی کی ایسی اونچی پرواز کرنی تھی کہ آسمان کی حدیں اس کے لیے تنگ پڑ جائیں۔

''اب تو وقت گزر گیا ہے۔'' اس نے دم بخود بیٹھی سبرینہ کی طرف دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی تھی۔ کھانسی کے ایک شدید دورے سے اس کی سانس اکھڑنے لگی تھی۔

اسے اپنی زندگی سے کوئی خاص شکایت بھی نہیں رہی تھی۔ وہ کہاں سے آئی تھی، اسے کہاں جانا تھا۔ اب یہ سوچنے اور سوچتے رہنے سے کیا حاصل......زیادہ گزر گئی تھی......تھوڑی رہ گئی تھی...... ویسے بھی زندگی میں پچھلے چند سال سے عجیب سا ٹھہراؤ آ گیا تھا......وہ بیمار رہنے لگی تھی۔ لمبی، لمبی سنسان گرم دوپہریں جن میں بڑھاپا، جنگلی گھاس کی طرح چڑھتا ہوا چلا آرہا تھا۔

سبرینہ ایک ٹک کھانسی کے زبردست دورے سے سنبھلتی ایک چرمرائی ہوئی عورت کے جھریوں بھرے اٹھتے، گرتے پپوٹوں کے پیچھے ماند پڑتی نیلی آنکھوں کے ڈھیلوں ......، پر اترنے والے سفید موتیا کی باریک تہ کے پیچھے ان تیس سالوں کی وہ کہانی پڑھ رہی تھی۔ جسے سنانے والی نے چند جملوں میں سمیٹ لیا تھا مگر جو تین دہائیوں تک، اس کی آتی جاتی سانسوں سے ہو کر گزرتی رہی تھی۔

''افسوس...... مگر کہانی ختم نہیں ہوئی۔'' اس نے صدمے سے سن بیٹھی لڑکی کو تاسف سے دیکھا تھا۔ وہ مسکرائی بھی تھی۔

''میں سمجھتی تھی لڑکیاں اب سمجھدار ہوتی ہوں گی۔ تم نے مجھے بہت غلط ثابت کر دیا۔'' وہ آہستہ سے ہنسی...... ایسی ہنسی جس کا آنکھوں سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔

''تم اتنے اہم لوگوں سے ملتی رہیں اسلام آباد جا، جا کر تم نے کسی کو ان کی حقیقت نہیں بتائی میگی کسی نے تمہاری مدد نہیں کی......؟ ایسے کیسے؟'' سبرینہ نے پوچھا تھا۔ اور میگی قناعت سے کہہ رہی تھی۔

''میں کسی کو کیا بتاتی؟ وہ میرے کون تھے؟ میرا کون ایسا تھا جس کے پاس میں واپس جانا چاہتی۔ اب تو میں خواب میں بھی اپنے آپ کو اس جگہ کے سوا کہیں اور نہیں دیکھتی۔''

میگی...... میگنا کارٹا یعنی مریم فیروز معظم خان...... ان سب حسین ناموں کی بیک وقت مالک...... وہ خالی ہاتھ اور خالی دل عورت کب کی اس کے کمرے سے اٹھ کر جا چکی تھی۔

''کون کہتا ہے، تاریخ اپنے آپ کو نہیں دُہراتی۔'' کمرے کے کونے میں رکھی، ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر سبرینہ کو جھرجھری آگئی۔

دو نام...... دو چہرے...... ایک کہانی۔

ایک فریم میں لگی دو مختلف تصویریں...... جس کے رنگ وقت کے ساتھ ایک جیسے بوسیدہ اور پھیکے لگنے لگے ہیں۔

☆☆☆

میگی بیمار تھی...... مگر کتنی بیمار کہ اس دن کے بعد دوبارہ اس کے کمرے تک نہیں آسکی۔

''مریم بی بی کی طبیعت ٹھیک نہیں...... اسے علاج کروانے شہر لے گئے ہیں۔'' اچھی نے اسے بتایا تھا۔

اس سنسان محل کے راز میں سبرینہ کو 'اچھی' ہی آدم زاد لگتی تھی۔ یقیناً وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھی۔

''لیکن کیا وہ لوگ جنہوں نے تیس سال میکی کو ایذائیں ..... دی تھیں، اتنے مہربان ہو گئے کہ علاج کروانے اسے شہر لے گئے تھے؟''

سبرینہ کے یہاں لاکر قید کیے جانے پر میکی یعنی مریم کو..... صرف ایک بات سے منع کیا گیا تھا۔ اسے سبرینہ سے دور رہنا ہے۔ میکی کی بغاوت کا سر کچلے انہیں عرصہ ہو گیا تھا۔ مگر سبرینہ کے عزائم اس کی آنکھوں سے جھلکتے تھے۔ وہ بہت پڑھی لکھی تھی۔ اسے جھکانے میں فاروق کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ کچھ دنوں سے اسے خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ان کے لیے کوئی بڑا مسئلہ پیدا کر سکتی ہے۔ سبرینہ کو بہت شروع سے معلوم تھا کہ اس کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ رات کو اس کے کمرے کی کھڑکی کے نیچے کوئی ہوتا ہے جو مسلسل کمرے کی روشنی جلنے بجھنے کا حساب رکھتا ہے۔ کتنی دفعہ اسے سگریٹ کی بدبو اتنی واضح محسوس ہوئی جیسے کوئی اس کے کمرے کے بالکل نیچے کھڑا ہو کر سگریٹ پیتا ہو۔

اس نے لائٹ بند کر کے کھڑکی سے باہر جھانکنے کی بھی کوشش کی تھی..... گھپ اندھیرے میں جہاں دن کے وقت خوب گھنے مالٹوں کے درخت تھے۔ ایک نہیں سگریٹ کے دو شعلے ابھر کر معدوم ہوئے تھے..... جل کر بجھنے والا شعلہ یہ واضح کرنے کے لیے کافی تھا کہ کون سے اور کتنے پہرے دار صرف اس کی ڈیوٹی پر تھے۔

گرمی کی اس مختصر رات میں، اپنے گھروں کا آرام چھوڑ کر وہ اس مالک کی وفاداری کا دم بھر رہے تھے۔ جس کی زمین سے ان کے ادھ کچے مکانوں میں سال بھر کا گندم اترتا تھا۔

''کیا ان کے کوئی گھر، کوئی گھر والے نہیں ہیں۔''

''کیا ایک عورت پر پہرہ بٹھانے کے لیے اتنے سارے مضبوط ڈیل ڈول والے مرد درکار ہوتے ہیں؟''

''کیا وہ ان میں سے کسی ایک کا بھی کچھ بگاڑ کر کہیں جا سکتی ہے؟''

''کیا وہ کبھی یہاں سے بھاگ سکتی ہے؟''

آج تک سبرینہ اپنے ساتھ ہوئی زیادتی کو اپنے باپ کی نافرمانی کی سزا سمجھتی آئی تھی لیکن اب نہیں..... میکی سے ملاقات نے اسے جتنا ششدر کیا تھا اتنا ہی اس کی پُراسرار گمشدگی اسے خوفزدہ کر رہی تھی۔ اس نے حساب لگایا، میکی کو دیکھے اسے دو ہفتے ہونے والے تھے۔ وہ اس کی کہانی کے ہر حصے پر، ہر پہلو پر غور نہ کر رہی ہوتی تو بھی اس سے ایک بار تو اور ضرور ملنا چاہتی تھی۔

سنسان دوپہر میں چلچلاتی دھوپ سمیٹتے آم کے درختوں کے نیچے گھاس لمبی ہو رہی تھی۔ بلیڈ جیسی نوکیلی گھاس سے بھاپ کی طرح بلند ہوتی حبس اور خاموشی کی آواز کان کے پردے پھاڑنے کے لیے کافی تھی۔ اس کی کھلی کھڑکی سے نظر آتا گہرا نیلا آسمان دور تک بادلوں سے مایوس تھا۔

وہ میکی کا رستہ دیکھتے، دیکھتے تھکنے لگی تھی کہ 'اچھی' کی لائی ہوئی خبر نے اسے بالکل ہی دل برداشتہ کر دیا۔

''مریم بی بی اتنی بیمار تھی کہ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔''

''وہ کس اسپتال میں داخل ہے؟ وہ کس شہر میں موجود ہے؟''

'اچھی' کے پاس ایسے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔

اس رات وہ سو نہیں سکی۔

وہ میکی کے لیے کیا کر سکتی تھی؟ وہ اپنے لیے کیا کر سکتی تھی؟ تو کیا وہ مان لے کہ وہ ہار گئی ہے؟

تو کیا وہ اپنی موت سے پہلے ہو جانے والی اس موت کو خدا کا حکم سمجھ لے؟ موت جو ہر سانس لینے والے وجود کو تب آتی ہے جب دنیا میں اس کا کام ختم ہو گیا ہو۔ تو کیا اس محل میں رہنے والے، اس کے پیدا کرنے والے سے پہلے اس کی زندگی ختم کر سکتے ہیں؟ شاید ہاں..... شاید نہیں.....

☆☆☆

اگلے دن بہت ہی غیر متوقع طور پر فاروق آ گیا..... نہ صرف گھر آیا بلکہ کمرے میں بھی آیا۔

وہ لنگڑا کر چل رہا تھا..... ریس کلب میں گھڑ دوڑ جیتنے کے بعد اس کی سب سے اعلیٰ نسل کی عربی گھوڑی نے اسے اپنی پیٹھ سے پٹخ دیا تھا۔ فاروق منہ کے بل گرا تھا۔ اس کے گھٹنے اور کہنیاں بری طرح چھل گئی تھیں۔ سبرینہ کو حیرت اس پر نہیں ہوئی کہ گھوڑی سے گرنے والا فاروق تھا۔ اسے حیرت

اس پر ہوئی کہ فاروق نے اسے ساری کہانی سنا کیسے دی۔ شاید چوٹیں انسان کو انسان کے ساتھ انسانوں کی طرح پیش آنا سکھا دیتی ہیں۔ عارضی طور پر ہی سہی......اب وہ اس کہانی کے بدلے اس سے نہ جانے کس چیز کی توقع کر رہا تھا۔

فاروق بہت دنوں بعد اس دن اس کمرے میں جس سبرینہ سے ملا وہ وہی لڑکی تھی، جس کے گرد اس نے پاکستان آنے سے پہلے پروانوں کی طرح طواف کیا تھا۔

ہمدرد اور دل کو چھو لینے والی مسکراہٹ سے دمکتی سبرینہ گیبرئیل کی آنکھوں میں ستارے تھے، وہی ستارے وہی نرمی، وہی مہربان آنکھیں......جنھوں نے کبھی ایڈنبرا میں اسے ایک اچانک فیصلہ کرنے پر مجبور کیا تھا......جب اسے لگا تھا کہ اس وننگ ٹرافی کو جیتے بغیر وہاں سے چلا آیا تو ساری زندگی نقصان میں رہے گا۔

آج وہ اپنی مہکتی لٹیں، کانوں کے پیچھے اڑسے...فکرمندی سے مسکراتی اے سی کی ٹھنڈی گدگداتی ہوا کے نیچے اس کے بازو پر جھکی تھی۔ اس کی زخمی کہنی پر چڑھی موٹی پٹی کی تہ پر محبت سے اپنا ہاتھ پھیر رہی تھی۔ فاروق کو ایڈنبرا کے کرکٹ گراؤنڈ کا وہ منظر یاد آگیا۔ جب وہ اسے پہلی بار ملی تھی...... اور ڈراپ ہوجانے والے کیچ کے پیچھے گھٹنا چھلوانے والے فیلڈر سے پوچھ رہی تھی۔

”تمہیں کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟“ اس رات سونے سے پہلے فاروق نے عرصے بعد سبرینہ کے لیے اپنے دل میں پشیمانی کی ایک زبردست لہر اٹھتی ہوئی محسوس کی۔ کیا کر دیا تھا اس نے اس زبردست لڑکی کے ساتھ۔ وہ اس کی زندگی میں، اس کی مرضی سے شامل ہوئی تھی اور اتنا ساحق تو رکھتی تھی کہ اسے انسان سمجھ کر پیش آیا جاتا شاید اس طرح اس سے کبھی، کبھی اپنی بات منوانا آسان ہو......اور بات بھی کون سی......؟ یہی ناں کہ اس کے باپ کے ملتان اور اسلام آباد والے محل کی دعوتوں میں بڑے ناموں اور بڑی پارٹی کی سیاست کرنے والی اہم شخصیات سے اچھی میزبان کی طرح پیش آنے کے ’ضروری آداب‘ بجالاتا۔

اس نے اپنے سینے [illegible] کے گہرے براؤن بالوں والے ریشمی مہکتے سر کو چھو کر ایک طمانیت بھرے سکھ کی سانس لی......اس کے باپ نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ وہ اتھری گھوڑی جیسی لڑکی اس کے خاندان کے کسی کام نہیں آسکے گی لیکن گہری نیند میں جاتے اس کے دماغ میں ایک خیال سما چکا تھا۔ وہ سبرینہ کو اپنے ساتھ اسلام آباد لے جائے گا۔

خواب میں اس نے خود کو سبرینہ کے ساتھ ایک پھولوں بھرے راستے پر، ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے چلتے ہوئے پایا۔ جہاں درختوں کے پتے ڈوبتے سورج کی گہری لال روشنی میں سرخ رو نظر آرہے تھے۔ سبرینہ ہنس رہی تھی۔ پھولوں بھرا جنگل اس کی نقرئی ہنسی سے مسکرا رہا تھا۔

اگلی صبح اس کے تمام نیک ارادوں کو ملیامیٹ کرتی ہوئی آئی تھی......وہ غصے سے پاگل ہوا تھا تھا......سبرینہ گیبرئیل اس کے محل کی آسمان تک بلند دیوار کے بیچ کہیں معدوم ہوگئی تھی۔

اس کے ہرکارے شکاری کتوں کی طرح علاقے سے باہر جانے والے راستے پر ملتان، خانیوال، لاہور، جی ٹی روڈ پر علاقے کے چھوٹے سے ٹرین اسٹیشن پر اس کی بیوی کی بو سونگھتے پھر رہے تھے جو اُن کے مالک کی غفلت کا فائدہ اٹھا کر جیسے صفحۂ ہستی سے غائب ہوگئی تھی۔ ایسا غضب اس محل کی تاریخ میں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ اس گھٹیا عورت کو اپنے بھوکے کتوں کے آگے ڈلوا سکتا تھا......اس کو تیزاب میں نہلا سکتا تھا۔ اس کے ٹکڑے، ٹکڑے کر سکتا تھا۔ وہ چوٹ کھایا ہوا سانپ تھا......جو صبح کی خوشگوار ہوا میں بدمست ہو گیا تھا۔

میگی کے غائب ہونے کے بعد سبرینہ نے جب اپنا انتہائی ضروری سامان اکٹھا کرنا شروع کیا تھا......تو وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ جو کرنے کا موہوم ارادہ کر رہی ہے اسے پورا کرنا کیونکر ممکن ہوگا......کبھی، کبھی انسان اپنے آپ کو بھی حیران کر دیتا ہے ناں......

کس زبردست قوتِ ارادی کے ساتھ اس نے اپنے چہرے پر اس پرانی سبرینہ کا ماسک چڑھایا تھا۔ کوئی اس سے پوچھتا تو وہ کوئی جواب نہیں دے پاتی۔

مگر کہانی ختم نہیں ہوئی تھی۔ کم از کم اس کی کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

☆☆☆

اس شام جب فاروق آیا تو وہ فیصلہ کر چکی تھی۔ اس کے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ ساری عمر یہیں مرتے رہنے کا...... یا آزادی کی ایک آخری کوشش کے ساتھ مرنے کا راستہ...... اس نے دوسرا راستہ پسند کیا تھا...... مگر جس میں آزادی کی ایک موہوم سی امید بھی تھی۔

فاروق گہری نیند میں تھا...... سبرینہ اپنے نیند میں جاتے دماغ کو شدید قوتِ ارادی سے جگائے رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے ڈر بھی لگ رہا تھا کہ وہ کیا کرنے جارہی ہے۔ کتنے دنوں بعد وہ یوں ایک ساتھ تھے۔ جھوٹ ہی سہی مگر کیا ہوا جو اس خواب کی عمر لمبی ہو جائے۔

مگر اس کے اندر کوئی اسے لمحوں کے طلسم سے بچنے اور جاگتے رہنے پر اصرار کر رہا تھا۔ وہ بے آواز اتری، ڈریسنگ روم کے کھلے دروازے سے ایک چھوٹا سا بیگ اٹھایا اور کمرے کا دروازہ بے آواز دھکیلتے پیچھے مڑ کر دیکھا، اسے اپنے دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔

اس نے فرار کے لیے وقت کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر نہیں کیا تھا پھر بھی جب وہ کچن کے پچھلے دروازے کی چٹخنی کسی مشکل کے بغیر بے آواز کھولنے میں کامیاب ہوئی تو پہرے پر مامور محل کے ملازم فجر کی نماز ادا کرنے رہائشی عمارت ...... کے پیچھے کچھ فاصلے پر الگ تھلگ احاطے میں بنائی گئی ایک کمرے کی چھوٹی سی مسجد کا رخ کر چکے تھے۔

مسجد نے کبھی لاؤڈ اسپیکر کا منہ نہیں دیکھا تھا مگر موذن کی اذان اسے تب بھی بغیر اسپیکر کے سنائی دیتی تھی۔ جب وہ پوری رات سو نہیں پاتی تھی۔ جب اس قید سے نکلنے کا منصوبہ بنانے کی جرأت کبھی بھولے سے بھی اس کے قریب نہیں پھٹکی تھی۔ ہاں اپنا بچہ کھونے کے بعد کی رات اس نے مسجد سے اٹھتی اذان کی ضعیف آواز پر گڑگڑا کر اپنے لیے آزادی کی دعا ضرور مانگی تھی۔

وہ بڑی سی سیاہ چادر میں سر سے پاؤں تک چھپی، درختوں اور پودوں کی آڑ میں چھپتی چھپاتی گارڈز کے کمرے تک پہنچ گئی تھی۔ اور یہ دیکھ کر اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا تھا کہ آسمان تک بلند گیٹ میں پیدل آنے جانے والوں کے لیے بنا لوہے کا چھوٹا دروازہ قدرے کھلا ہوا تھا۔ بندوق بردار گارڈز کی کوٹھڑی کی کھڑکی سے روشنی باہر آرہی تھی مگر اندر کوئی نہیں تھا۔ وہ پودوں کی آڑ لیتی، قدرے جھکی جھکی آگے بڑھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر ایک دفعہ گارڈز کے کمرے کے دروازے کو پھر دیکھا وہ کھلا ہوا تھا۔ مگر کمرے کے اندر کسی کے موجود نہ ہونے کا یقین ہونے پر اس نے بجلی کی سی تیزی سے گیٹ کی جھری کشادہ کر کے باہر پاؤں نکالا تھا۔

اتنی ہی تیزی سے اس کا دل اچھلا تھا جب اس نے اپنے پیچھے ایک محافظ کتے کو زور، زور سے بھونکتے سنا...... اسے لگا اس نے کچھ بھاگتے قدموں کی آواز سنی ہے۔ کوئی باہر کی طرف آرہا تھا...... وہ بھاگنا نہیں چاہتی تھی مگر اس کے پاس سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا...... وہ سامنے کے رخ بھاگنے کے بجائے اس رخ دوڑنے لگی جہاں گھنے درختوں کی باعث ابھی مکمل اندھیرا تھا۔ بغیر سمت کا تعین کیے وہ اندھا دھند بھاگ رہی تھی، کتنی دور جا کر اسے احساس ہوا اس کے پیچھے کسی تعاقب کا نشان نہیں ہے۔ رات کا سینہ چیر کر صبح کا اجالا ہلکے، ہلکے پھیل رہا تھا۔ روشنی پھیلتے دیکھ کر اسے شدید گھبراہٹ نے آلیا۔

وہ قدرے آرام سے چلنا چاہتی تھی مگر جلد از جلد کسی ایسی جگہ پہنچنے کا خیال جو اسے فاروق کے کارندوں سے بچالے...... اسے اپنی رفتار آہستہ نہیں کرنے دے رہا تھا...... وہ صرف اندازے کے بل پر اس سمت میں چل رہی تھی جہاں اس کے خیال میں بڑی سڑک نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے پاؤں میں خوب گھسے ہوئے پرانے کھسے تھے جو اس نے صفائی کرتی 'موچھی' کی نظر بچا کر غائب کیے تھے۔ ایک جو گرز کا جوڑا، اس کے مختصر سے بیگ میں تھا تو سہی مگر اسے پہن کر شاید کوئی اسے ایک پردہ دار، ضرورت مند، مقامی عورت نہ سمجھتا...... وہ کھیتوں کی پگڈنڈیوں سے گزرتی، نماز پڑھ کر آتے، پانی کی باری کھولتے کسی نامعلوم منزل کا رخ کرتے کسانوں کی نظروں سے بچتی بچاتی تیز قدموں سے چلتی رہی...... چلتی رہی...... اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ پسینہ سر سے پاؤں تک بہہ رہا تھا۔

ستمبر کا مہینہ ختم ہو رہا تھا۔ کھیتوں میں طلوع ہوتی صبح کی نرم ہوا خوشگوار تھی۔ ایک درخت کی اوٹ میں رک کر اس

نے سانس ہموار کرنے کی کوشش میں دیکھا...... وہ ایک تنگ سی مٹی کی سڑک کے قریب تھی۔ دور کہیں سے سنائی دینے والی مقامی موسیقی کی آواز قریب آتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا پہلا ردِعمل چھپتے رہنے کا تھا مگر وہ جانتی تھی وہ سارا دن بھی چلتی رہے تو کسی ایسی آبادی تک نہیں پہنچ سکتی جہاں فاروق کے کتے اس کی بُو نہ سونگھ سکیں۔

تیز آواز میں ٹیپ ریکارڈ سے بجائی جانے والی وہ کوئی مقامی موسیقی تھی جو ایک بڑی سی لدی پھندی ٹریکٹر ٹرالی سے بلند ہو رہی تھی۔ ٹرالی قریب آ رہی تھی اس نے حسرت سے اس شاہانہ سواری کو دیکھا۔ جس کے شاندار جثے کو چار نہیں آٹھ پہیے لگے تھے۔ گھریلو استعمال کا سامان، چند رنگین، نئی اور پرانی چارپائیاں، زنگ آلود ٹرنک، کچھ برتن، کچھ بستر بند، چند عورتیں بہت سے بچے...... انہیں سامنے سے گزرتے دیکھ کر اسے اپنے شدید خطرے میں گھرے ہوتے کا احساس ہوا...... اس دھول اڑاتی طویل انجان سڑک پر وہ کس قدر غیر محفوظ تھی...... شاید اس کی عقل کبھی اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہ لگا سکتی...... اگر آج اس سڑک پر فاروق کے کارندے اس کی لاش گرا دیں تو ایسی ٹرالیوں کے نیچے روندنے میں انہیں ایک لمحے کا تامل نہیں ہوگا۔ وہ اسے ٹریکٹر کے پہیوں میں لپیٹ کر شہر بھر میں گھسیٹتے پھریں گے۔ ویسے ہی جیسے فاروق نے اس کی آنکھوں کے سامنے کسی اور کے ساتھ کیا تھا۔

اسے پتا نہیں لگا مگر بے اختیار۔ ہی وہ درخت کی اوٹ سے نکل کر سڑک کے کنارے آ گئی۔ ٹرالی کے لدے پھندے چھن چھن کرتے، ایکسلریٹر کے پیچھے سے نظر آتے کچھ شرارت پر آمادہ ننگے بچوں کو دیکھ کر اس نے ہاتھ اٹھایا تھا...... رکنے کا اشارہ کیا تھا۔

اسے احساس ہوا کہ ٹریکٹر ٹرالی کچھ فاصلے پر جا کے رک گئی تھی۔ ٹریکٹر سے بلند ہونے والا مقامی میوزک بدستور جاری تھا...... ٹرالی کے بیچوں بیچ کھڑے بچے، شور مچا کر اور ہاتھوں کے اشاروں سے اسے ٹرالی پر سوار ہونے کی پیشکش کر رہے تھے۔ حلیے سے مزدور لگنے والا ایک مرد ٹریکٹر سے نیچے اترا...... غالباً بچوں کا باپ اس نے کسی تجسس کے بغیر سڑک کے کنارے لفٹ مانگنے والی پردہ دار زنانی کو جس نے اپنا سارا چہرہ چادر کے نقاب میں چھپا رکھا تھا اپنی شرائط بتانا مناسب سمجھیں۔ وہ 'اچھی' کے جیسی مقامی زبان ہی بول رہا تھا۔ پھر بھی وہ صرف اتنا ہی اندازہ لگا سکی کہ وہ اسے زیادہ دور تک نہیں چھوڑ سکتے۔ انہیں قریب ہی کسی گاؤں پہنچنا تھا۔

وہ ٹریکٹر کے پچھلے پہیے پر پاؤں رکھ کر ٹرالی کے اندر کودی تھی تو اس میں اتنی ہی جگہ تھی کہ ایک مختصر سا وجود سکڑ سمٹ کر بیٹھ سکے۔ ٹریکٹر اس کے بیٹھنے سے پہلے حرکت میں آ چکا تھا۔ اس نے چادر کا پلو مزید چہرے پر کھینچتے ہوئے بھی ایک نظر اٹھا کر اپنے پیچھے رہ جانے والی دھول اڑاتی سڑک کو دور تک دیکھا تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ فاروق...... نہ اس کے کارندے...... صبح کا سورج پیلی ٹکڑیوں جیسی دھوپ ترتیب سے بنے ہوئے کھیتوں کے سبزے پر بکھیر رہا تھا۔

اس نے ٹرالی میں بیٹھی دو مقامی عورتوں سے آنکھ ملانے کی کوشش نہیں کی۔ ٹریکٹر کے بڈے سے اب کسی علاقائی گلوکارہ کا شوخ سا نغمہ بلند ہو رہا تھا۔ وہ ٹرالی کے پیچھے جوش دلاتی دھن پر حرکت کرتے، ناچتے اور ادھ ننگے بچوں سے آنکھ ملاتے بھی ہچکچا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کا رنگ ان کی آنکھوں جیسا نہیں تھا۔ وہ ان میں سے نہیں ہے، یہ راز کھولنے میں کوئی عقلمندی نہیں تھی۔ وہ سر نیہواڑے کتنی دیر ٹریکٹر کی ٹیک سے لگی دھول مٹی سے اٹی سڑک کے ہچکولے کھاتی رہی تھی۔ معلوم نہیں کیا ہوا...... ٹریکٹر رک گیا تھا...... ٹرالی کی بیرونی دیوار پر کسی چیز کی ضرب لگا کر اجنبی زنانہ سواری کو اترنے کے لیے کہا جا رہا تھا۔ انہوں نے اسے اس کی منزل تک پہنچانے کا وعدہ تو کیا بھی نہیں تھا۔ اس نے مٹھی میں دبا ایک نوٹ ٹرالی کے فرش پر بے تکلفی سے بکھری، بچوں کی کم عمر ماں کی طرف کھسکایا اور اتر گئی۔

اس کے اترتے ہی ٹریکٹر دوبارہ چل پڑا تھا اور اس سے وہی مقامی دھن بلند ہو رہی تھی جو یہاں تک آتے، آتے پتا نہیں کتنی بار بجائی گئی تھی۔ وہ زبان اور الفاظ سمجھنے سے قاصر تھی مگر خوش کن موسیقی کی مانوسیت کا لطف تو لے سکتی تھی۔ زندگی کو اگرچہ اس کا ایسے مانوس راستوں پر چلنا پسند نہیں آیا مگر کتنی حیرت کی بات تھی کہ اس نے نامعلوم کے

خوف سے اپنے اندر اسی زندان میں واپسی کی خواہش سر اٹھاتی محسوس کی۔ جس سے فرار کا راستہ اس نے آج اپنی جان پر کھیل کر تلاش کیا تھا۔

☆☆☆

وہ کسی چھوٹے سے قصبے کا بس اڈہ تھا۔

کالی کھجوروں اور جاتے موسم کے پیلے آموں کی بہار دکھاتی اکا دکا ریڑھیوں پر مکھیوں کی دعوتِ عام جاری تھی۔ اخبار رسالے بیچنے والے راستے میں ستانے کو رکتی بسوں کے شیشوں کے پاس آواز لگا رہے تھے۔ غالباً آج کوئی بڑا واقعہ ہوا تھا اور اگر نہیں بھی ہوا تو آج ایک کمزور لڑکی اپنے دیوزادے کے منہ پر تھوک کر آزادی کی خواہش میں اندھا دھند گھر سے بھاگی تھی۔

ابھی صبح کے دس نہیں بجے تھے لیکن تیز سورج کی روشنی اس کی آنکھوں کو خیرہ کیے دے رہی تھی۔ اسے یاد نہیں تھا اس نے آخری بار کب اتنی دیر اتنی روشنی کو قریب سے دیکھا تھا۔

بس اڈے کے کنارے بنے چھوٹے سے ہوٹل پر چائے دم ہونے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ہوٹل کے باہر دو بچے اپنے سے بڑے سائز کے دیگچے لیے ان کے پیندے مانجھ رہے تھے۔ ہوٹل کے باہر گاہکوں کے لیے بچھی بینچوں کے پاس پانی کا تازہ چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔ ایک نظر میں اردگرد کا جائزہ لینے پر اسے یہ اندازہ لگانے میں وقت نہیں ہوئی کہ دنیا کے اس حصے میں کسی اکیلی عورت کا کسی بس اڈے پر کسی بھی وقت تنہا موجود ہونا، کوئی معمول کی بات نہیں ہے۔

اسے لگا اڈے پر موجود ہر ذی روح جانتا ہے کہ وہ فاروق کی گھر سے بھاگ نکلنے والی وہی بیوی ہے جسے پکڑ کر کتوں کے آگے ڈالنا انسانیت کو اپنا فرضِ عین سمجھنا چاہیے...... وہ بھوک پیاس سے بے نیاز کسی بھی آتی جاتی بس میں سوار ہو سکتی تھی مگر بسوں کی ونڈ اسکرین پر اردو میں لکھی منزل کی تختیاں پڑھنا ابھی اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ پھر بھی وہ جس مسافر خاندان کی دو برقع پوش عورتوں کے پیچھے اڈے سے نکلنے والی اگلی بس میں سوار ہوئی تھی اسے لاہور جانا تھا۔ یہ سبرینہ نے اس خاندان کے واحد مرد کے منہ سے تین بار لاہور سن کر اندازہ لگایا۔

اس کی منزل اسلام آباد ہونی چاہیے تھی۔ اسے برطانوی ہائی کمیشن سے مدد طلب کرنی تھی لیکن اتنا اندازہ لگانا فاروق کے لیے ذرا مشکل نہ ہوتا کہ وہ نکل بھاگنے میں کامیاب ہوئی تو سب سے پہلے کہاں کا رخ کرے گی...

فی الحال اس کا فاروق کے شہر سے دور جانا ضروری تھا۔ اس کے پاس رقم محدود تھی۔ اور کتنی عجیب بات ہے کہ وہ جب سے اس ملک میں آئی تھی، اس نے یہاں کی کرنسی کبھی ہاتھ میں پکڑ کر نہیں دیکھی تھی۔ پھر بھی فرار کا موہوم خاکہ اپنے ذہن میں واضح ہوتا دیکھ کر اس نے اپنی الماری میں لٹکے فاروق کے کپڑوں کی تلاشی لی تھی۔ اس کے کوٹ کی جیب سے کچھ نوٹ نکالے تھے جو بہت زیادہ نہیں تھے اور کتنی عجیب بات ہے کہ پیسہ اہم نہ ہوتب بھی پیسے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

بس کے کرائے کے پیسے دے کر چند ہی نوٹ باقی بچے تھے۔ اس نے دیکھا اس کی مٹھی میں دبے چرمرائے نوٹ پر ایک کا ہندسہ اور دو زیرو لگے تھے۔ درمیان میں شفیق صورت، سنجیدہ آنکھوں والے بزرگ قائداعظم کی تصویر تھی جن کے بارے میں فاروق نے اسے شروع دنوں میں ایک بار بتایا تھا کہ وہ بس پاکستان بنانے کے سزاوار تھے...... ملک تو اس جیسے بیرون ملک سے تعلیم یافتہ، ایلیٹ اور دولت مند خاندانوں نے بعد میں بنایا...... اس نے اپنے ساتھ تقریباً جڑ کر بیٹھی، بار بار سیدھے ہاتھ کو بلند کرتی، چہرہ اوپر کر کے دونوں آنکھوں کی پتلیوں میں کوئی آئی ڈراپس ٹپکاتی پسینے میں تر بتر بزرگ خاتون کے دونوں ہاتھوں کی اوٹ سے نظر آتے ہرے بھرے پاکستان کو دیکھا۔ جس کے کس حصے میں اسے جان کی امان ملے گی...... یہ ابھی طے ہونا باقی تھا۔

☆☆☆

وہ لاہور اتر تو گئی تھی لیکن انسانوں کے ہجوم اور فراٹے بھرتی ویگنوں سے اٹے بادامی باغ کے بس اڈے سے ادھر تیزی سے نیچے جاتا سورج اس کے سامنے خوف سے بھرے کئی سوال پیدا کر رہا تھا۔ وہ یہاں تک پہنچ سکے گی یا نہیں...... آج صبح منہ اندھیرے فاروق کو سوتا پا کر فرار کی راہ اختیار کرتے اس نے ایک بار بھی نہیں سوچا تھا لیکن اب تیز رفتار ویگنوں اور بسوں کی چھتوں پر بیٹھی ملازمت پیشہ

سواریوں کو اپنے، اپنے نواحی شہروں کی طرف روانہ ہوتے دیکھ کر اسے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ دن کی روشنی کو رات میں بدلنے میں وقت نہیں لگے گا۔
''کیا وہ سڑک کے کنارے، کھڑے، کھڑے ساری رات گزار سکتی ہے؟'' اسے یاد نہیں...... اس نے آخری بار کھانا کب کھایا تھا۔ کل رات یا شاید کل صبح...... انسان آخر کتنے گھنٹے بھوکا رہ سکتا ہے؟ کیا جان کا خوف انسان کو کئی دن بھوکا رہنے اور زندہ رہنے کی طاقت دے دیتا ہے؟
گرمی اور حبس سے بھرا لاہور جس میں چہرے پر کھینچی سیاہ چادر پسیج کر منہ کے ساتھ چپکی جا رہی تھی۔ شاید وہ ابھی مزید سوچنے میں کچھ وقت ضائع کرتی اگر اس کے سامنے سواریاں اتارتا رکشے والا کالی چادر والی زنانہ سواری کی طرف منہ کر کے چلایا نہ ہوتا۔
''فاطمہ جناح ......ٹیمپل روڈ......مزنگ روڈ...... برٹش کونسل......'' جتنی دیر میں رکشا والا کسی اور زنانہ سواری کو گھیر کر منزل پر پہنچانے کا لالچ دیتا، وہ رکشے میں بیٹھ چکی تھی۔ اس شہر میں کوئی برٹش کونسل بھی ہوگا...... وہ بالکل آگاہ نہیں تھی۔ لیکن اگر ایسا کوئی ادارہ ہے تو اسے وہاں مدد ضرور مل سکتی ہے۔ مگر بادامی باغ سے برٹش کونسل پہنچنے کے راستے میں اس نے جتنے بھی ارادے کیے تھے ان پر رکشے والے کو اس کی منہ مانگی ادائیگی کرنے کے ساتھ ہی اوس پڑ گئی۔
سرخ اینٹوں اور سرمئی سیمنٹ سے بنی عمارت کے مین گیٹ کو ایک چوکس اسلحہ بردار گارڈ نے باہر سے تالا لگا رکھا تھا۔ وہ پیدل آنے جانے والوں کے لیے بنے چھوٹے گیٹ کو بھی اپنے آہنی ارادوں سے روکے کھڑا تھا۔
سبرینہ کی محنت سے بولی گئی اردو، زبردست انگلش اور خستہ حالت بھی سیکیورٹی گارڈ کو قائل کرنے کے لیے کافی نہیں تھی کہ اس کا کونسل کی کسی ذمے دار شخصیت سے ملنا کتنا ضروری ہے۔ وہ دفتر کا ٹائم ختم ہونے کے بعد کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا اسے یہی حکم تھا۔
اسے بھوک، پیاس اور گرمی سے چکر آ رہے تھے۔ برٹش کونسل کی مین لائبریری بند ہو چکی تھی۔ وہاں کام کرنے والے معلوم نہیں کہاں تھے۔ مگر وہ آہستہ، آہستہ قدموں سے پیدل چل کر باہر نکلتی سیدھی مانگ، گہری رنگت اور سوتی شلوار قمیص والی خاتون تھیں۔ جنہوں نے سبرینہ اور گارڈ کے مابین جاری بے نتیجہ بحث کا نوٹس لیا تھا۔ انہوں نے سبرینہ کے قریب آ کر انگلش میں مشورہ دیا تھا۔
''بی بی تم اب پیر کو آنا...... برٹش کونسل اتوار کو بند رہتی ہے۔'' سبرینہ کا دل ڈوب گیا۔ اس کے فرشتوں کو بھی یاد نہیں تھا کہ کام کی جگہوں کے اوقات کار اور آرام کے دن مخصوص ہوتے ہیں۔ اگر ایک بار بھی اس نے مہذب دنیا کے کام کے دنوں پر غور کیا ہوتا تو ایسی فاش غلطی کیا کبھی ہوتی؟
اور اب کیا کرے وہ؟ خاتون نے ماتھے تک کھینچی چادر کو ایک ہاتھ سے مضبوطی سے دبوچے کھڑی، چہرے کا مکمل پردہ کیے لڑکی کی بے تحاشا تھکی ہوئی، سنہری اور سبز آنکھوں کو شدید مایوسی سے دوچار ہوتے دیکھا۔
کیا اس کی پلکوں کے پیچھے نظر آنے والی پتلیاں اتنی ہی خوفزدہ تھیں جتنی مس وکٹوریہ ڈیوڈ کو اس روز محسوس ہوئیں؟
شاید انہوں نے اس پر بعد میں کبھی غور کیا ہو لیکن اس روز کا سب سے ناقابلِ فراموش واقعہ یہ تھا کہ گرے بالوں کے ننھے سے جوڑے والی مس وکٹوریہ نے اس شام سبرینہ گیبرئیل فاروق فیروز خان کو سخت مصیبت کی ماری انسان جان کر اپنی چھت کے نیچے پناہ دینے کی پیش کش کر دی تھی۔

☆☆☆

13 دسمبر 1990ء

''کبھی کبھی ہم اپنے خدا سے کتنے مایوس ہو جاتے ہیں ناں......'' سبرینہ نے کوئی اٹھائیس کروڑ مرتبہ کی سوچی ہوئی بات ایک بار پھر دھیان سے سوچنے کی کوشش کی۔
''سردی کتنی بڑھ گئی ہے، تم اتنے ہلکے سوئٹر میں بیٹھی ہو سبرینہ......'' انہوں نے قدیم آتش دان کی طرف رخ کیے بیٹھی خود سے الجھتی لڑکی سے کہا جو نہایت توجہ سے اونچی چھت والے قدیم ہاسٹل کے ٹھنڈے یخ کمرے کو گرم رکھنے میں ناکام ہیٹر کی سرخی پر غور کر رہی تھی۔
اس نے ان کی سرزنش سنی اور رخ موڑ لیا۔
''بس یہ مہینہ ہی ہے سخت سردی کا۔'' انہوں نے اسے متوجہ دیکھ کر تیزی سے اون سلائیاں چلاتے کہا۔

''اتنی سخت دھند پہلے کبھی ہوتی تو نہیں یہاں۔''
سبرینہ نے کھڑکی کے شیشوں کے باہر نظر ڈالی...... لاہور سفید دھند کی بکل مارے، خاموشی کی دبیز تہ میں لپٹا، کھڑکی کے شیشوں کے باہر بکھرا ہوا تھا۔
''اچھا؟'' وہ مسکرا دی...... پتا نہیں ایسی کتنی طویل کہرے بھری اداس چھٹیاں انہوں نے اسی آتش دان کے سامنے سوئٹر بُن، بُن کر گزاری تھیں۔
وہ کس کے لیے بُنتی تھیں...... اور کیوں؟ ان کا کوئی رشتے دار تو یہاں تھا نہیں یا شاید ہو بھی...... وہ کالج میس کی انچارج تھیں۔ تعلیمی اداروں کے ہاسٹلز کی ذمے داری زندگی بھر نبھاتے رہنے سے شخصیت میں جو سخت سا ڈسپلن آجاتا ہے، اس نے انہیں ہاسٹل میں رہنے والی اسٹوڈنٹس کے لیے خاصا ناپسندیدہ بنا رکھا تھا۔ اسٹوڈنٹس سے کچھ بات چیت بڑھی...... تو سبرینہ کو پتا چلا وہ انہیں سنڈریلا کہا کرتی تھیں۔
''ارے......؟'' اس نے دھیان سے انہیں دیکھا۔
گہری رنگت، چھوٹا سا قد، مختصر سا گرے بالوں کا جوڑا، جسے وہ اکثر کسی خفیہ کارروائی سے سیاہ بنالیا کرتی تھیں۔ سوتی شلوار دوپٹا اور کبھی کبھی ہلکے رنگوں کی کلف لگی ہوئی ساڑیاں جو وہ کالج فنکشنز میں پہنا کرتی تھیں۔
ان میں اور سنڈریلا میں کیا قدر مشترک تھی بھلا۔ سنڈریلا تو شاید وہ تھی جو بارہ کا گجر بجنے سے پہلے اپنا مصنوعی پرستان چھوڑ کر دیوزادے کی قید سے فرار ہونے میں کامیاب ہوئی تھی...... اسے کہاں، کہاں اور کیسے نہیں تلاش کیا گیا ہوگا...... سبرینہ کے لیے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔

☆☆☆

دو دن لاہور کے ایک اچھی شہرت والے معروف کالج کے ہاسٹل میں گزار کر وہ پیر کی شام مس وکٹوریہ کے ساتھ دوبارہ برٹش کونسل پہنچی تھی مگر عمارت کے گیٹ کے قریب اترنے سے پہلے ہی اس نے ایک دشمن چہرہ پہچان لیا تھا۔ جو فاروق کے گھر کی قید کاٹتے رات کو اس کی کھڑکی کھلنے اور بند ہونے کے حساب رکھا کرتا تھا۔ علم دار حسین......
وہ جس رکشے پر بیٹھ کر یہاں تک آئی تھی اس کی سیٹ سے پاؤں اتارے بغیر اس نے وکٹوریہ سے رکشا واپس موڑنے کی درخواست کی تھی۔ وکٹوریہ نے پچھلے دو دنوں میں اس سے زیادہ کچھ نہیں پوچھا تھا۔ مگر وہ چونک، چونک کر پلٹتی، پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی لڑکی کی آنکھوں میں پھیلے اس بے تحاشا خوف کو خوب پڑھ سکتی تھیں۔ جس نے پچھلے دو دنوں میں اسے بستر پر لیٹ کر بھی آنکھیں جھپکنے نہیں دی تھیں۔ وہ ایک لفظ کہے بغیر مان گئیں مگر کالج ہاسٹل کے سوا کہاں لے جاتیں۔
اس کی قسمت اچھی تھی...... کہ مس وکٹوریہ کی مہمان بننے کے چند ہی دنوں بعد اسے کالج میں انگریزی کی ایک جونیئر لیکچرر کی میٹرنٹی لیو پر جانے اور کسی متبادل ٹیچر کی تلاش کے بارے میں علم ہوا...... یہ بھی اس کی قسمت ہی تھی کہ تھرڈ ائیر کی کلاس کو انگریزی پڑھانے کے لیے اس کی قابلیت کو کسی مقامی چیلنج کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔
زندگی کو گزارنے کے لیے انسانوں کی مہربانی کی ضرورت ہوتی ہے مگر شاید اس سے بھی زیادہ ایک جائز روزگار کی...... اس کے پاس نہ اپنا پاسپورٹ تھا نہ پاکستان میں قیام کا اجازت نامہ...... پھر بھی وہ اپنا ضروری سامان لے کر فاروق کے گھر سے نکلی تھی۔ اس میں اس کی بیچلرز کی ڈگری کا ایک کاغذی ثبوت موجود تھا۔
وہ اس نیک دل سنڈریلا کی سخت احسان مند تھی جو اگر اس روز برٹش کونسل کے گیٹ پر مدد کا فرشتہ بن کر نہ پہنچتیں تو وہ پتا نہیں آج کہاں ہوتی...... ہوتی بھی کہ نہیں...... اس نے عارضی بنیادوں پر ملنے والے روزگار کی خوشی میں ایما سے رابطے کی کوشش کی تھی مگر وہ دنیا کے کسی کونے میں کیا کر رہی ہوگی...... ؟ سبرینہ اس کا صرف اندازہ ہی لگا سکتی تھی...... اس کے اپنے باپ کے پتے پر لکھے جانے والے کسی خط کا جواب نہیں آیا تھا پھر بھی ہر ویک اینڈ پر ایما کو خط لکھنا ایک دلچسپ مشغلہ بن گیا تھا۔ شروع کے چند خطوط کے سوا اس نے اب ایما کو لکھے خط پوسٹ کرنے بھی چھوڑ دیے تھے۔
کالج پرنسپل کا اعتماد حاصل کرنے میں اسے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔
''مجھے انسانوں کی پہچان ہے۔'' وہ دھیمے انداز میں مسکرا کر کہتیں۔

زیادہ عرصہ نہیں لگا تھا...... کچھ مہینے صرف انگلش کی لیکچرر چھٹی سے واپس آ گئی تھی مگر اب وہ تھرڈ اور فورتھ ائیر کی کلاسز کو میکرو اور مائیکرو اکنامکس کے کورسز پڑھا رہی تھی۔ اپنی اصل دلچسپی کا شعبہ اسے کالج کے فرسٹ ائیر ہاسٹل کی معاون انچارج بھی بنا دیا گیا تھا۔

''اسے اپنی دنیا میں واپس جانا ہے۔'' اس ارادے میں ایما کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر زیادہ شدت باقی نہیں رہی تھی لیکن وہ اس شہر میں کسی بھی وقت تلاش کی جا سکتی ہے۔ یہ خطرہ بہر حال موجود تھا۔ اس نے فلموں کے بہروپ بدلنے والے کرداروں کی طرح اپنا ہیئر اسٹائل تبدیل کر لیا تھا۔ اب اس کے گہرے براؤن بال لڑکوں کی طرح ترشے ہوئے اور چھوٹے، چھوٹے تھے وہ اگر لڑکا ہوتی تو داڑھی مونچھ بھی رکھ لیتی۔ لڑکی ہونا اس کے کسی کام کا نہیں تھا۔ وہ ہلکے رنگوں کے شلوار کرتے میں کلاس پر کلاس بدلتی رہتی۔ لڑکیاں اسے پسند کرنے لگی تھیں۔

☆☆☆

''زندگی کتنی عجیب سی ہے ناں......''

اس نے ہاسٹل کے لمبے کھلے برآمدے کے بیچ دیوار پر نصب قد آدم آئینے میں جھانکا...... جہاں اکثر صبح فرسٹ ائیر کی طالبات کلاس کے لیے نکلتے وقت اپنے بالوں پر آخری نظر ڈالتی تھیں۔ کچھ کو ٹوئیزر سے اپنی بھویں کھینچنے کے لیے یہ جگہ پسند تھی۔

''کبھی ہم سوچتے ہیں یہ ہوگا تو ہم یوں کریں گے، وہ ہوگا تو ہم یوں نہیں کریں گے۔ دراصل ہم بس وہی کرنے کے قابل ہیں جو ہم سے خود بخود ہو جاتا ہے۔ ارادے کرنے سے کام نہیں ہونے لگیں تو شاید دنیا کے کسی کام کو کبھی کوئی رکاوٹ نہ دیکھنی پڑے۔''

''ہائے میم سبرینہ......'' کالج سے واپس ہاسٹل آنے والی لڑکی اس کو شیشے میں اپنے عکس سے الجھتے دیکھ کر کھلکھلائی تھی اور اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

''تم تمام زندگی یہاں چھپ کر نہیں بیٹھ سکتیں...... تمہیں اس کا سامنا کرنا ہوگا......'' وہ جس دن سے فہد مرتضیٰ سے مل کر آئی تھی۔ ایک زبردست الجھن میں تھی۔ وہ جانتی تھی وہ

کیا کیا دیکھا

جانے والے تیری یادوں کو بھلا کر دیکھا
لوحِ دل سے تیرا ہر نقش مٹا کر دیکھا
ساری دنیا کو نظر آنے لگے تیرے نقوش
جب بھی آنکھوں میں کبھی تجھ کو چھپا کر دیکھا
تیرے جاتے ہی خفا ہو گئی دنیا ساری
بڑا ہم نے یہ احساس مٹا کر دیکھا
سنگدل میری وفاؤں کا تو قائل نہ ہوا
زخم ہر بار نیا تُو نے لگا کر دیکھا
راس کیوں دوستی آئی نہ کسی کی ہم کو
ہم نے ہر طور سے پیمان نبھا کر دیکھا

از: صبا نور، لیہ

ساری زندگی یہاں چھپ کر نہیں بیٹھ سکتی لیکن ایسا کہنا اور بات ہے اور ایسا کرنا اور......

وہ اس شخص کا سامنا کر ہی نہیں سکتی تھی جس نے اس کی زندگی کی سب سے بڑی ناکامی کا باب اس مہارت سے لکھا تھا کہ وہ خود اپنی نظر میں شرمندہ اپنے سائے سے بھی خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اسے اپنے اردگرد کسی انسان پر بھروسا نہیں رہا تھا۔ اس انسان پر بھی نہیں جو روز ایک نئے مشورے کے ساتھ اس کی محنت سے بنائی تاش کی جنت ملیا میٹ کرنے کے درپے ہو گیا تھا۔

''چلو اسے کورٹ لے جاتے ہیں، تین مہینے میں عدالت تمہارے حق میں فیصلہ دے، دے گی تم آزاد ہو جاؤ گی۔''

اسپتال والی ملاقات کے بعد وہ اس سے ملنے سے بھی مسلسل انکار کر رہی تھی۔

''تم اسے بالکل نہیں جانتے۔''

فہد نے فون کے ائیر پیس سے ایک اجنبی سی آواز کو کہتے سنا۔

''وہ تمہاری کورٹس خرید سکتا ہے۔ وہ تمہارے جج، تمہاری عدالتیں غائب کروا سکتا ہے۔ وہ ایسا ہی کرے گا۔''

''اوہ جانے دو، مجھے کیوں کبھی شبہ نہیں ہوا کہ تم اتنی بزدل ہو۔ یعنی کہ اتنی بزدل...... حد ہے۔''

اس کی کمزوری پر سخت تلملانے کے باوجود اس کے لیے یہ اندازہ لگانا قطعاً مشکل نہیں تھا کہ وہ انتہائی ذہانت کی حامل رہ چکنے والی بلند و بالا لڑکی اس کی سوچ سے کہیں بڑھ کر خوفزدہ ہے۔ خوف جو انسان سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھین سکتا ہے۔

فہد مرتضیٰ تجسس میں مبتلا نہیں تھا۔ لیکن یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس پر کس نوعیت کا تشدد کیا جاتا رہا ہے۔

لیکن وہ اس دن...... پہلے دن جو کھلی تھی، اس کے بعد دوبارہ نہیں کھلی۔ اس نے فہد کی مدد کو ایک معالج کا مشورہ سمجھ کر بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا...... سبرینہ سے دوبارہ ملنے کی ہر کوشش ناکام ہو گئی تو فہد نے فاروق سے ملنے کا فیصلہ کیا لیکن اس سے پہلے وہ سبرینہ کو کسی محفوظ مقام پر پہنچانا چاہتا تھا۔

☆☆☆

وہ اس سے ملنے کو تیار نہیں تھی۔ لیکن اسلام آباد کے ڈپلومیٹک اینکلیو سے کالج کے مرکزی دفتر میں ملایا جانے والا فون سبرینہ ہی کے لیے تھا۔ برطانوی ہائی کمیشن کو اس کے بارے میں، ان تمام ضروری تفصیلات سے آگاہ کر دیا گیا تھا جو فہد مرتضیٰ کے علم میں تھیں اور جن کا جاننا اس کے ملک کے سفارتی عملے کے لیے ضروری تھا تاکہ وہ اس کے لازمی تحفظ کے اقدامات اٹھا سکیں۔

اسے فوری طور پر اسلام آباد پہنچنے کے لیے تیار رہنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ اس کے پاس نہ اپنا پاسپورٹ تھا نہ پاکستان میں قیام کا کوئی قانونی اجازت نامہ...... نہ ہی ایسا کوئی ثبوت جس سے وہ اپنے آپ کو کسی معتبر یا غیر معتبر پاکستانی شہری کی بیوی ثابت کر سکتی۔ اس کے پاس اپنی شناخت کا واحد ثبوت صرف اور صرف ایک عدد تعلیمی سند تھی۔ جو معلوم نہیں اس کام کے لیے کافی تھی یا نہیں...... ہائی کمیشن کے عملے کا فون پر بات کرنے والا رکن حیران تھا کہ اس لڑکی نے جو برطانوی شہری تھی کیوں اتنا لمبا عرصہ انتظار کیا؟ کیوں اس نے کسی سے مدد طلب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی؟ اس کے پاس اپنے عظیم نقصانات اور شاندار بے وقوفیوں کی حیران کُن کہانی سنانے کے علاوہ بھی کچھ بہانے تھے۔

ہاں...... وہ وہی تھی سبرینہ گیبرئیل جس نے اب بھی خود پر سے اختیار نہیں کھویا۔ مگر جسے ایک بیکار انسان نے اپنی نقلی چمک، سطحی ذہانت اور جھوٹی محبت کے مکار جال میں اس آسانی سے جکڑے رکھا تھا کہ مزاحمت اور آزادی کی تتلی کہیں چپکے سے مر گئی تھی۔ اسے واقعی لگنے لگا تھا وہ ساری زندگی اس کالج کی چار دیواری میں خوش رہ سکتی ہے۔ اسے اب کسی کو کھونے کا ڈر نہیں...... اسے اب کسی کے ملنے کی آس نہیں...... اور شاید اس کے دل میں کہیں ایسی ہر خواہش بھی مر چکی ہے۔

''لیکن ایسا کیسے ہوتا ہے کہ اس زمین پر چلتے پھرتے زندہ انسان اپنے جیسے کسی دوسرے انسان سے سانس لینے کی خواہش بھی چھین لیں۔''

''کیوں نہیں، ایسا بھی ہو سکتا ہے اور سبرینہ کے ساتھ ہوا بھی تھا۔''

اس نے اپنے چھوٹے سے سفری سوٹ کیس کی زپ بند کر کے اسے دیوار سے لگا دیا۔ ''لیکن اگر ایسا ہو چکا تھا تو پھر اس نے فاروق کے جہنم سے فرار کا راستہ کیوں اختیار کیا......؟ اپنا ہینڈ بیگ کھولے، اپنی شناخت کے اکلوتے ثبوت کی موجودگی کا یقین کرتی وہ ایک بار پھر اپنا احتساب کر رہی تھی۔ بے شک وہ ایک نئے سفر پر نکلنے کو تیار تھی۔

پرنسپل کو خدا حافظ کہتے...... اینڈریا اور ہاسٹل کی دیگر وارڈنز سے رخصت لیتے، مس وکٹوریہ اور تزئین اظہر کے گلے لگ کر روانہ ہوتے...... وہ کچھ ٹھیک سے نہیں جان سکی کہ وہ خوش تھی یا نہیں......

اسے ایک عجیب احساسِ جرم تھا...... اس نے کسی کا کچھ نہیں چرایا تھا پھر بھی اسے لگا وہ کوئی کام ادھورا چھوڑ کر جا رہی ہے۔ آج بہت دن بعد اس کے دل میں میگی...... مریم فیروز معظم خان سے دوبارہ ملنے کی خواہش پیدا ہوئی تھی۔ کیا تھا، جو اپنی جان بچانے کے ساتھ میگی کے بارے

مانوس قطرہ اس نے خوب لمبی سانس میں بھر کر محسوس کیا۔
کیسی ہوتی ہے ناں آزادی کی خوشبو...... کوئی اس سے پوچھتا تو سہی...... افسوس اس شہر میں بھی اب ایسا کوئی نہیں...... جس کے ساتھ وہ آزادی کے ناچ میں شریک ہوسکے۔
وہ ملول ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے ہوئے بھی سخت دلگیر ہورہی تھی...... وہ امیگریشن سے باہر آئی، اپنا سوٹ کیس سامان والی بیلٹ سے اٹھایا اور گھسیٹ کر باہر لانے کے عرصے میں، ٹرمینل سے باہر جانے والے راستے پر اسے ایک چمکدار اور روشن چہرہ دکھائی دیا جو اس کی محبت میں کسی نیون سائن کی طرح دور سے جگمگ کررہا تھا۔
''ایما...... اس کی پیاری بہن......'' اس روئے زمین پر باقی رہ جانے والا اس کا واحد خونی رشتہ......
وہ کتنی دیر تک اسے گلے سے لگائے روئے جارہی تھی۔ کبھی ہنسے جارہی تھی تو کبھی چومے جارہی تھی۔ تاوقتیکہ کسی نے دونوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر انتہائی مہذبانہ معذرت سے انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کردیا۔
وہ جو بھی تھا...... اتنا دراز قد تھا کہ سبرینہ کو اسے دیکھنے کے لیے باقاعدہ سر اٹھانا پڑا۔
ایما کے پاس اس کے لیے سچ مچ کا سرپرائز تھا۔ ایما نے بالکل ہی کمال کردیا تھا۔ اس کی اکلوتی اور سمجھدار بہن...... اب مسز ایما احمد الباسم تھی۔
اس کا دراز قد، دبلا پتلا فلسطینی، مسلمان شوہر فرانسیسی شہریت کا حامل تھا۔ ایما کی ملاقات اقوام متحدہ کے ایک رضا کار مشن کے دوران ہوئی تھی۔ اور شادی فرانس میں......
''وہ اتنا اچھا ہے، اتنا خیال رکھنے والا ماشاء اللہ کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں سبرینہ...... جب تک میں اس سے نہیں ملی تھی مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میرے دل میں اتنی خالی جگہ ہے۔ اب میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ زندگی میں کسی ایک دن بھی وہ میرے ساتھ نہیں ہوگا۔''
اس نے اپنے جملے میں ماشاء اللہ کا لفظ خالص عربی انداز میں زور دے کر ادا کیا تھا۔ وہ اپنے شوہر احمد سے ملاقات کا احوال سناتے اتنی اندرونی خوشی سے تمتما رہی تھی کہ سبرینہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

میں بھی کچھ معلوم کرنے کی کوشش کی ہوتی۔
اس نے پلٹ کر الوداعی کلمات کہتی، نیک دل ہستیوں کی ''اپنا بہت سا خیال رکھنا...... ہم سے رابطہ رکھنا'' جیسی مہربان تاکیدوں کا مسکرا کر جواب دیتے اپنے آپ کو سختی سے لتاڑا تھا۔
اس کے ہاتھ سے اس کا کم وزنی سوٹ کیس لینے والا ہائی کمیشن کے عملے کا رکن تھا جو اسلام آباد سے خاص لگژری گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ بائے روڈ اسے لینے آیا تھا۔
''اور سب سے اہم سوال یہ ہے کہ وہ جہاں جارہی ہے، وہاں کون اس کی راہ میں آنکھیں بچھائے منتظر بیٹھا ہوگا؟'' اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہی سوچا۔
''اور کتنا اچھا ہو، اگر اس سوال کا جواب پاؤں کے نیچے کی زمین چھوڑنے سے پہلے ہی مل جائے۔''
ہائی کمیشن کی سفید گاڑی رینگنا شروع ہوچکی تھی۔
اب تک وہ جیسے کسی المیہ کہانی کا کردار تھی، جس کا کلائمکس آنے سے ذرا پہلے ہی پکچر ختم کردی گئی تھی۔ اس نے گاڑی کے شیشے کے پاس پیچھے رہ جانے والی کہانی کی سپورٹنگ کاسٹ کو ہاتھ ہلا کر ایک بار پھر خدا حافظ کہا تھا۔
اور اتنے دنوں میں پہلی بار اس کے دل میں جس شخص سے ملنے کی آرزو پیدا ہوئی تھی...... وہ وہی تھا جس کے مشورے ماننے اور جس سے ملنے سے وہ پچھلے کئی دنوں سے مسلسل انکار کرتی آرہی تھی اور جس نے اس آخری ملاقات کے بعد ایک بار پھر اس کی مرضی کے خلاف اس سے ملنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

☆☆☆

لاہور سے اسلام آباد تک کا راستہ اور برطانوی ہائی کمیشن سے برٹش ائیرویز کی پہلی دستیاب پرواز پر لندن اترنے تک کا زمینی اور فضائی فاصلہ جتنا بھی مختصر ہوتا اسے لگا وہ ایک سامری کے طلسم کدے میں صدیوں تک سوئے رہنے کے بعد اچانک زندہ ہوگئی تھی۔
یہ لندن تھا...... اس کا اپنا...... خنکی بھرے آسمان کے نیچے بجلیاں کڑکڑاتے بادلوں سے گرنے والا بارش کا پہلا

''اور پھر مجھے احساس ہوا کہ تم نے وہ فیصلہ کیوں کیا تھا، مجھے معاف کردو سبرینہ...... میں نے تمہیں غلط سمجھا تھا۔ جبکہ میں خود غلط تھی۔''

اس کی پیاری بہن اس کے باپ کی ڈائننگ ٹیبل پر اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے اپنی ایک ایسی کوتاہی کا اعتراف کر رہی تھی جو اس کی تھی ہی نہیں...... اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا۔

کافی کے خالی مگ کے کنارے کو اپنے انگوٹھے کی پور سے ہلکے، ہلکے سہلاتے وہ جیسے نئے سرے سے خود کو یقین دلانا چاہتی تھی کہ تحفظ، سچی خوشی اور اچھی امید، اسی زمین پر انسانوں کا ہاتھ تھامتی ہیں۔

''خصوصاً ان کا تو ضرور جنہوں نے اپنی فکر کرنے والوں کا دل نہیں دکھایا ہوتا۔'' اس کے دل میں کہیں آلتی پالتی مارے گیان میں مصروف محتسب نے آرام سے ایک چٹکی کاٹی تھی۔

''ڈیڈی کے جانے کے بعد میرے لیے یہاں رہنے کا کوئی مطلب ہی نہیں تھا۔'' ایما کہہ رہی تھی۔ ''مجھے ہر صورت یہاں سے جانا تھا۔ تمہارا ابھی کوئی خط نہیں آیا، کوئی فون نہیں آیا تو میں نے مان لیا کہ تم اپنی زندگی میں اتنی خوش ہو کہ تمہیں ہماری کوئی ضرورت نہیں، مجھے معاف کر دینا سبرینہ۔''

باپ کے مرنے کے بعد سے ایما کا زیادہ وقت اپنے رضا کار مشنز پر ہی گزرتا رہا تھا۔ سبرینہ کے پچھلے ایک سال کے خطوط اس نے لندن واپس آنے پر اپنے گھر کے میل باکس میں اکٹھی ہونے والی اس ڈاک سے نکالے تھے۔ جس میں اب مزید کی جگہ نہیں رہی تھی۔

سبرینہ پر کیا گزری ...... اس کا اولین اندازہ اسے اپنے یو این مشن کے سرکاری میل باکس میں ایک اجنبی نام سے موصول ہونے والے خط سے ہوا۔ فہد مرتضیٰ نامی اس شخص نے کچھ زیادہ نہیں بس اتنا لکھا تھا کہ سبرینہ جلد لندن پہنچنے والی ہے اور ایما کو اسے ہر طرح کی مورل سپورٹ دینی ہوگی۔ انٹرنیٹ ابھی عام نہیں ہوا تھا۔ ایسے میں جس شخص نے ایما کو اقوامِ متحدہ دفاتر کے آفیشل انڈیکس اور فون نمبروں کے سہارے ڈھونڈ نکالا، وہ اس کی بے حد احسان مند تھی۔

سبرینہ نے بہت ایمانداری سے سوچا تھا۔ اسے سب کو سب کچھ معاف کر دینا چاہیے مگر دنیا چھوڑ دینے والے اپنے باپ سے خود اپنی نافرمانی اور بدگمانیوں کی معافی کیسے ملے گی۔ اس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

☆☆☆

فہد مرتضیٰ نے کتاب بند کر کے بہت دیر پہلے اپنے سامنے میز پر رکھی تھی۔ کتاب کے ٹائٹل پر بنے سنہرے چمکدار کیس میں ایک خوب صورت رنگوں والی حسین تتلی کی تصویر تھی...... تتلی کے دونوں پروں پر لوہے کی موٹی میخیں گاڑ کر اسے کیس کی دیوار سے چپکا دیا گیا تھا۔ کیس کے شفاف شیشے کے باہر، اپنی مکروہ تھوتنی چپکائے، ایک خوفناک صورت، کالا سیاہ بلا اپنے سالم شکار کو دبوچنے کے لیے تیار تھا۔ اس کی پُراسرار آنکھوں کی پتلیوں میں تتلی کی تصویر اور پس منظر میں ہریالی اور سبزہ دور تک دیکھا جا سکتا تھا۔

فہد نے کتاب کا نام اور اس کے نیچے لکھی عبارت کو ایک بار پھر بہت دھیان سے پڑھا تھا۔

Tale of a fairy

Hard bargains and bitter truths

کتاب کے پہلے باب کا عنوان تھا۔

Maggy - the artist

کسی انگریزی روزنامے کے نقاد کی نظر سے دیکھیں...... تو کتاب کا پہلا باب مکمل فکشن معلوم ہوتا تھا۔ البتہ بیک ٹائٹل پر مصنفہ کی چند سالہ تحقیق کا ذکر تھا...... کتاب کے اندرونی فلیپ پر جملہ حقوق بحق مصنفہ محفوظ ہونے کی اطلاع ایک ذہین آنکھوں اور مسکراتے چہرے والی تصویر کے ساتھ درج تھی۔ برطانیہ کے ایک بہت پرانے اور معتبر میک ملن پبلشرز کی چھاپی ہوئی یہ کتاب، دسمبر انیس سو چورانوے میں شائع ہوئی تھی۔ پبلشرز کو کتاب کے مندرجات پر پورا یقین تھا یا نہیں...... پاکستانی اشرافیہ کے ایک مخصوص طبقے کی طرف سے غیر ملکی مصنفہ اور پبلشر کی نیت کے بارے میں سخت شبہات کا اظہار کیا جا رہا تھا۔

جاگیردار طبقے سے ہی اٹھنے والی عوامی حکومت کا تیسرا دور تھا۔ ملک کی قیادت، اعلیٰ برطانوی یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ،

بے داغ برٹش انگریزی میں پریس کانفرنسز کرنے والی خاتون وزیر اعظم کے ہاتھ میں تھی۔ جنہیں تاریخی طور پر دوسری بار وزیر اعظم کا پورٹ فولیو سنبھالے ایک سال اور چار مہینے ہوئے تھے۔ حزب اختلاف کی روایت پسند سیاسی جماعتیں اپنے ،اپنے حلقۂ انتخاب میں، ووٹ نام کی بے معنی پرچی ڈالنے پر قادر بھیڑ بکریوں جیسی عوام کو یقین دلانا چاہتی تھیں کہ عورت کا اقتدار اسلام میں جائز ہو ہی نہیں سکتا۔

فہد مرتضٰی نے کتاب کے پاس تہ کیے رکھے گزشتہ دن کے باسی ڈان انگریزی اخبار کو دوبارہ کھول کر سیدھا کیا۔ اخبار کے اندرونی صفحے پر ایک چھوٹی سی بلیک اینڈ وائٹ تصویر اور چند ہی حروف پر مبنی دوسطری خبر تھی۔ ابھی ابھی جس کتاب کے نفس مضمون کو اس نے پچھلے ایک ماہ میں پتا نہیں کتنی بار دُہرایا تھا۔ اس کی مصنفہ سبرینہ گیبرئیل پاکستان پہنچ چکی تھی۔

اس نے اٹھ کر اپنے کمرے کی کھڑکی سے پردے ہٹا دیے تھے۔

☆☆☆

وہ ویسی ہی تھی جیسی اس سے آخری ملاقات میں دکھائی دی تھی۔ نازک سی، سادہ اور شفاف سی، کندھوں تک آتے گہرے براؤن بالوں اور میرون اور سیاہ سوتی کے کرتے میں سفید شلوار دوپٹے کے ساتھ...... پتا نہیں وہ سب کو اتنی اچھی لگتی ہو گی یا ایسا اس کے ساتھ ہی تھا۔ وہ گرلز کالج کی اس تقریب میں ہال کی اولین قطاروں میں سے ایک پر موجود تھا۔ جہاں ابھی چند ماہ پہلے ہی اس کی بہن لیکچرر تعینات ہوئی تھی۔

ڈیبیٹنگ کلب کی پُراعتماد طالبہ، بالوں کی سیدھی مانگ نکالے، بے داغ لہجے میں پینل پر موجود سبرینہ گیبرئیل کو دعوت خطاب دے چکی تھی...... اور اب تالیوں کے شور میں ڈائس پر منتظر کھڑی تھی۔ کالج کی پرنسپل کے ساتھ بیٹھی وہ سنجیدہ سی لڑکی کہیں سے بھی کسی بھی طرح ایک ظالم دیوزادے کی قید سے فرار ہوئی تتلی معلوم نہیں ہوتی تھی۔

''کاش ہم ان بدذات عورتوں کو اپنے ملک کا نام مٹی میں ملانے سے روک سکیں۔'' بڑبڑاہٹ کی آواز فہد کے برابر والی نشست سے آئی تھی۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ ایک انگریزی روزنامے کا صحافی تھا، سلیقے سے تراشی ہوئی، گرے داڑھی اور سر پر موجود خوب گھنے سرمئی بالوں کے ساتھ۔

''کیا آپ نے خاتون کی کتاب پڑھی ہے، زبیری صاحب؟'' فہد مرتضٰی نے اردو میں پوچھا تھا۔ صحافی نے کندھے اچکا دیے تھے۔

''اوہ...... یہ سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ ہر کوئی اپنے بارے میں کہیں کی ستی ساوتری اور عظیم عورت ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ آپ ہی بتائیں ڈاکٹر مرتضٰی آج کے زمانے میں کس کے پاس ایسی عورتوں کی لکھی بیکار کتابیں پڑھنے کا وقت ہے؟'' فہد مرتضٰی کے چہرے کی سنجیدگی گہری ہو گئی۔

''تو پھر مجھے افسوس ہے، میں سمجھا نہیں، آپ کو اعتراض کس بات پر ہے؟'' اس کے جواب نے صحافی کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا تھا۔ صاف ظاہر تھا، ڈاکٹر مرتضٰی کو جیسے وہ کسی اور حوالے سے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کی بات مزید سننے میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ وہاں ڈائس پر سبرینہ گیبرئیل، پاکستانی معیشت اور معاشرے کو درپیش کچھ اہم مسائل پر تفصیلی تجزیہ کرنے کے بعد اب کچھ حل تجویز کر رہی تھی۔ جن میں سب سے اہم تھا۔

''تعلیم اور معاشی ترقی سب کے لیے...... اور تعلیمی نظام ایک جیسا۔''

پینل ختم ہونے کے بعد، کالج کی نوجوان لیکچرر ریما مرتضٰی نے اپنے عزیز بھائی کو تیزی سے باہر اس میز تک جاتے دیکھا تھا جہاں ڈاکٹر سبرینہ گیبرئیل اپنی کتاب

Hard bargains and bitter truths

کی کاپیاں، خریدنے والی لڑکیوں کو اپنے دستخط کر کے دے رہی تھی۔

یہ بے حد دلچسپ منظر تھا۔ ریما مرتضٰی چند سال پہلے اسی کالج میں ڈاکٹر سبرینہ گیبرئیل سے اکنامکس پڑھ چکی تھی۔ انہی دنوں جب اسے ہلکا سا شبہ ہوا تھا کہ اس کا سنجیدہ بھائی اسے کالج لانے، لے جانے میں کچھ غیر معمولی دلچسپی لے رہا ہے۔ آج اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ یہ انکشاف حیرت انگیز بھی تھا اور خوشگوار بھی۔

مگر شاید یہ بات اتنی سادہ نہیں تھی۔

سبرینہ کی میز تک آنے والا بلاشبہ وہی شخص تھا جس سے ایک بار پھر ملنے کی اس نے بارہا خواہش کی تھی...... صرف خواہش......

وہ اس سے اس کی کتاب پر دستخط کروانے آیا تھا۔ اور نہ کوئی مشکل سی بات کہنے...... وہ اسے کسی سے ملوانا چاہتا تھا۔

''کس سے......؟'' یہ سوال سبرینہ نے پوچھا ہی نہیں۔

☆☆☆

سبرینہ گیبرئیل ...... دنیا کے اربوں انسانوں میں ایک بے معنی نام...... ایک نکتہ، ایک ذرہ...... ایک کمزور لڑکی کہ جس کی لاش چند سال پہلے مملکتِ خداداد کے کسی نامعلوم مقام پر خاموشی سے کٹ کر گرنے والی گمنام چڑیا کی طرح چیل کوؤں کو کھلادی گئی ہوتی۔ آج فہد مرتضیٰ کی گاڑی میں دن دہاڑے شہر لاہور کی سڑکوں پر کسی گنجان آباد علاقے کی طرف دوڑی جارہی تھی۔

ان کے درمیان بات چیت نہ ہونے کے برابر ہوئی تھی فہد نے اس کی میز پر جھک کر صرف اتنا ہی کہا تھا۔

''تو زندگی آپ کے ساتھ اچھا برتاؤ کر رہی ہے، ڈاکٹر گیبرئیل؟'' لیکن اس کی آنکھوں سے اترتی ہلکی سی مسکراہٹ میں سوال نہیں تھا، اسے جواب معلوم تھا۔

زندگی نے پچھلے کچھ سالوں میں واقعی سبرینہ کے ساتھ اچھا سلوک کیا تھا۔ اسے کسی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ سوائے اپنے آپ سے۔ اس کی فہرست میں درج گناہوں میں، ایک گناہ تھا میکنا کارٹا...... بیگم مریم فیروز معظم خان کی خیریت دریافت نہ کرنے کا گناہ۔ میکی سے آخری بار ملے زیادہ نہیں تو بھی کچھ سال گزر چکے تھے۔

فہد مرتضیٰ اسے جہاں لایا تھا وہ پرانے لاہور کی نچلی متوسط آبادی میں قائم ایک بہت بڑے رقبے پر واقع کسی غیر سرکاری ادارے کا قائم کیا ہوا اسکول اور اسپتال برائے ذہنی امراض تھا۔ یہاں قدرے کم متاثرہ مریضوں کو مختلف غیر روایتی طریقوں سے علاج اور تھراپی مہیا کی جاتی تھی۔ یہاں بہت سے بچے بھی تھے۔

اس نے دیکھا فہد اس کی رہنمائی کرتا، جہاں تک آکر رک گیا تھا۔ وہ ایک کلاس روم کا کھلا دروازہ تھا۔ بلیک بورڈ پر رنگ برنگے چاک سے بنے انتہائی خوب صورت پھولوں کا گلدستہ، جاپانی فلورل آرٹ کی زبردست مثال پیش کر رہا تھا۔ دس، بارہ اور پندرہ سال کے کچھ بچے جن کی حرکات مکمل صحت مند بچوں جیسی ہی تھی۔ کلاس روم کے بیچوں بیچ ٹیچر کی میز کے گرد جمع تھے۔ ٹیچر ڈرائنگ بورڈ پر پینسل سے کوئی زبردست سا خاکہ بنا کر اس میں تیزی سے ہاتھ چلاتی شیڈنگ کر رہی تھیں۔ اپنے ہاتھوں کی حرکت پر نظر جمائے بچوں کے پُرتجسس چہروں کے پیچھے ٹیچر کو کسی غیر معمولی آہٹ کا احساس ہوا تھا۔ اس نے بچوں کی پُرشوق آنکھوں کے اُدھر، گردن اٹھا کر دیکھا تھا اور کلاس روم کے دروازے سے جھانکتی جانی پہچانی لڑکی کے منہ سے بے ساختہ ایک چیخ بلند ہوئی تھی۔

''او مائی گاڈ......'' وہ ایک شاک کی کیفیت میں حیرت کی زیادتی سے کھلتے اپنے منہ پر ہاتھ رکھے بے اختیار آگے بڑھی تھی۔

آرٹ ٹیچر نے دیکھا۔ یہ معتبر سی کچھ، کچھ کامیاب نظر آنے والی اچھی سی لڑکی وہی تھی جسے اس نے خود فاروق فیروز خان کے سنہری پنجرے میں اپنی آخری ملاقات کے وقت سمجھدار نہ ہونے کا طعنہ دیا تھا۔

سبرینہ دوڑتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اس نے پچھلے چند برسوں میں خود پر ضبط کا جو پہرہ بٹھایا تھا اسے بے ساختہ توڑتی ہوئی وہ کب سے مسلسل روئے جارہی تھی۔ مریم فیروز معظم خان نام کی سفید بالوں والی بزرگ آرٹ ٹیچر کو آج کلاس وقت سے پہلے برخاست کرنی پڑی تھی۔ سبرینہ بار، بار اس کے سفید بالوں اور بوڑھے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے چھو کر یقین کرنا چاہتی تھی کہ وہ میکی ہی ہے۔

مریم فیروز معظم خان...... وہ وہی تھی مگر جہاں تھی وہاں پہنچنے میں اس کی اپنی زبردست قوتِ مدافعت کے ساتھ اس کلاس روم میں موجود خاموش کھڑے تیسرے فرد کی مہربانی کا بھی دخل تھا۔

فیروز معظم خان کا سومنات گر چکا تھا۔ اس کے بیٹوں میں پھوٹ پڑ چکی تھی۔ سبرینہ گیبرئیل، فاروق فیروز نام کے جس مٹی کے پتلے کے ہاتھوں اتنے سال یرغمال بنی رہی، وہ

کب کا اپنی جان کے خوف سے اپنے باپ کے تمام لیکوڈ اثاثے بیچ کر پاکستان سے فرار ہو چکا تھا۔ وہ کس ملک میں تھا میگی کچھ ٹھیک سے نہیں بتا سکی۔ مگر اس کے جرائم کی فہرست میگی کے مرحوم شوہر فیروز معظم خان سے زیادہ بڑی نہیں تھی۔ پھر بھی اس کے خلاف حکومتِ پاکستان کی اعلیٰ عدلیہ میں راتوں رات اتنے بڑے کون سے مقدمے دائر کیے گئے تھے کہ اگر فرار نہ ہوتا تو ساری زندگی جیل میں کاٹنی پڑ سکتی تھی۔

اس کے خاندان کو ملنے والی انگریز کے زمانے کی لامحدود جاگیر کا ایک حصہ ان اربوں ڈالر کے قرض کی ادائیگی میں بک چکا تھا۔ جنہیں روپوں میں تبدیل کر کے گننا آسان نہیں تھا۔ یہ بری قسمت ہی تھی کہ اس بااثر خاندان کی نئی نسل کے غیر محتاط رویے اور سیاسی وابستگیاں قومی سطح کے سب سے بڑے کھیل میں اترتے ہی سب سے پہلے جس کے گلے کا پھندا بنیں...... وہ وہی تھا فاروق فیروز خان......

میگی، سبرینہ کو بتا رہی تھی کہ اس کے خیال میں وہ اپنے باپ سے کئی گنا زیادہ اور جلد جائداد، دولت، شہرت... حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہی خواہش اسے ڈبونے کا باعث بن گئی۔

سبرینہ نے کسی کو کبھی نہیں بتایا کہ دو سال پہلے آدھی رات کو اس کے اپارٹمنٹ کے فون کی گھنٹی کیوں بجی تھی۔ دوسری طرف سے سنائی دینے والی آواز کو وہ خواب میں سن کر بھی دہشت زدہ ہو سکتی تھی۔ وہ اسے کسی بھی ملک کی عدالت میں، کسی بھی کیس میں اپنے خلاف گواہ کے طور پر پیش ہونے سے انکار کے بدلے اس نام نہاد رشتے سے آزادی کی پیش کش کر رہا تھا۔ جسے وہ بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ سبرینہ نے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا...... پھر بھی ایک دن اس کے میل باکس سے نکلنے والی ڈاک میں اس بڑے سے خاکی لفافے پر وہ فاروق فیروز خان کی ہینڈ رائٹنگ پہچان سکتی تھی۔ اسے آزاد کر دیا گیا تھا۔

☆☆☆

میگی کی کہانی کو نیا موڑ اس وقت ملا جب فاروق اپنے سیاسی دشمنوں کی طرف سے قائم کیے گئے قتل اور غداری کے زبردست مقدموں میں بری طرح پھنسا...... اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ پیر مار رہا تھا...... اور اس کا زوردار اثر رسوخ والا باپ فیروز معظم خان عین انہی دنوں ایک رات سو کر دوبارہ نہیں اٹھ سکا تھا۔

موضع محمد خان میں کوئی کبھی نہیں جان سکا کہ علاقے کا بڑا جاگیردار، آخری عمر میں...... جس بیماری سے چپ چاپ ختم ہوا اسے ایڈز کہتے ہیں۔ فیروز معظم خان کی کتنی زندہ بیویاں ایچ آئی وی پوزیٹو تھیں۔ کوئی ٹھیک سے نہیں بتا سکتا...... میگی البتہ یہ ضرور جانتی تھی کہ وہ خود ایچ آئی وی پوزیٹو ہے۔ اکثر کھانسی کا شکار رہتی ہے، جلد تھک جاتی ہے لیکن جتنے دن بھی زندہ ہے، دنیا کے غم کم کرنا چاہتی ہے۔

وہ عورت جس کا نام فہد نے سبرینہ گیبرئیل سے اپنے کلینک میں ہونے والی اکلوتی ملاقات میں ایک سے زیادہ بار سنا تھا۔ وہ بیمار اور لاغر عورت اتنی اچھی آرٹسٹ ہو سکتی ہے۔ شاید وہ کبھی یقین نہیں کر پاتا۔ اگر اپنی آنکھوں سے فاروق فیروز خان کے محل کی دیواروں پر وہ پینٹنگز نہ دیکھ چکا ہوتا...... جو ماسٹر پیس نہ ہو کر بھی کسی زبردست فنکار ہاتھوں کی مہارت کا ثبوت تھیں...... وہ کچھ ایسا کلاسکی نوعیت کا خاص کام تھا کہ وہ بے ساختہ تجسس سے مجبور ہو کر ایک پینٹنگ کے قریب گیا تھا۔ اس نے ابھرے ہوئے آئل پینٹ والی تصویر کے ہر غیر نمایاں کونے میں آرٹسٹ کا نام تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ مصور کا نام اس کی توقع کے عین مطابق تھا...... ''میگنا کارٹا''

زندگی اتفاقات سے بھری ہوئی ہے، بس کبھی کبھار وہ صحیح وقت پر صحیح جگہ بھی ہو جاتے ہیں۔ اس روز سبرینہ کو محفوظ مقام پر پہنچانے کے لیے کی گئی چند ضروری فون کالز اور اپنے ڈسٹرکٹ منیجمنٹ گروپ سے تعلق رکھنے والے بارسوخ بھائی سے کچھ جوابی اور اہم یقین دہانیاں حاصل کرنے کے بعد اس نے خود فاروق سے ملاقات کا ارادہ کیا تھا۔

وہ گاڑی چلا کر آٹھ گھنٹوں میں لاہور سے موضع محمد خان پہنچا تھا۔

بارہ سے چودہ فٹ بلند دیواریں اور کانٹے دار لوہے کی باڑھ سے بوجھل ہیبت ناک کمپاؤنڈ جسے دیکھ کر اس میں رہنے والوں کے کروفر کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔

اسے سخت حفاظتی انتظامات والے گیٹ کو پار کرنے کی

اجازت صرف اس لیے ملی کہ پکے قلعے کے بھاری بھرکم آہنی گیٹ کے باہر اس کی ہارن دیتی گاڑی کے بالکل پیچھے ایک اور بہت بڑی گاڑی عین اسی وقت رکی تھی...... جس میں بیٹھے اسلحہ برداروں میں سے ایک فاروق اور فیروز معظم خان کے لاہور میں رہنے والے چند دوستوں سے واقف تھا۔ علم دار حسین...... اس نے فہد کو پہچان کر اپنے ہاتھ میں پکڑی جدید پسٹل کا بیرل نیچے کرلیا تھا اور گاڑی سے اتر کر گیٹ پر لگے انٹر کام کے ذریعے گیٹ کے دوسرے سرے پر موجود گارڈز کو اسے اندر آنے دینے کی ہدایت کی تھی۔ فہد کی گاڑی کو جاگیر پر آنے والے مہمان کے گیسٹ ہاؤس تک گارڈز نے اپنی حفاظت میں پہنچایا تھا۔ پھلوں سے لدے پھندے دور تک پھیلے ان گنت درختوں کے جھنڈ میں قائم یہ عظیم الشان عمارت جاگیر کا صرف عارضی گیسٹ ہاؤس تھی۔

اسے بتایا گیا تھا کہ فاروق جہاں بھی ہے وہاں سے رات تک واپس آسکتا ہے۔

وہ ساری شام فہد مرتضیٰ نے گیسٹ ہاؤس کی انتہائی قیمتی آرائش اور مالکوں کی حقیقی رہائش گاہ کے جاہ و جلال کے درمیان خیالی تقابل کرنے میں گزاری تھی۔ وہیں اس نے میگنا کارٹا نام کی مصورہ اور اس کے فن پاروں کو اپنی آنکھوں سے دریافت بھی کرلیا تھا۔

مریم فیروز معظم خان نے دیکھا ڈرائنگ روم میں کسی کے انتظار میں ٹہلنے والا صورت سے ہی فاروق کے باقی دوستوں جیسا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بے چین سا قیمتی ایرانی قالین پر خوب اچھی طرح ٹہلنے اور انتظار کرنے کے بعد اب ڈرائنگ روم کی دیواروں پر لگی بڑی، بڑی پینٹنگز کو قریب جاکر غور سے دیکھ رہا تھا۔ مریم نے دیکھا اس نے کونے میں ابھرے اس کے ننھے سے نام کو بہت غور سے پڑھا تھا۔ وہ یقیناً اس خاندان کے دیگر ملنے والوں سے مختلف تھا۔ اسے کسی کی تلاش تھی۔

مریم گیسٹ ہاؤس کے مہمانوں کی میزبانی سے عرصہ ہوا کنارہ کرچکی تھیں۔ اب تو اکثر ان کا گیسٹ ہاؤس تک آنا بھی نہیں ہوتا تھا۔ ان کی جواب دیتی صحت، کب کی ایسی پابندیوں سے آزاد ہوچکی تھی۔ آج خواہ مخواہ ہی عمارت کے اس حصے کی طرف آئی تھیں۔

''اسے میں نے پینٹ کیا ہے۔'' اس نے برطانوی لہجے میں کہا۔

وہ اس کے ہاتھ سے بنی بلا مبالغہ چوتھی پینٹنگ کو خراجِ تحسین پیش کرتا چاروں کونوں میں مصور کے نام کی تلاش میں نظریں دوڑا رہا تھا۔ جب کسی نے کسی قدر سکون سے پیچھے سے آکر اس کی مشکل آسان کی تھی۔ وہ سیدھا ہوکر کھڑا ہوگیا۔ اس کے سامنے سبرینہ گیبرئیل کی ادھوری کچھ، کچھ غیر واضح کہانی کے کم از کم ایک کردار کے نقش واضح ہورہے تھے۔

''اگر میں غلطی نہیں کررہا تو آپ میگی ہیں، میگنا کارٹا...... آپ سے مل کر خوشی ہوئی میم۔''

لاہور سے چلتے وقت فاروق کے علاوہ جس دوسری شخصیت سے ملنے کا خیال فہد کے دل میں تھا وہ میگی ہی تھی۔

فہد ذہنی امراض کا معالج، ایک نفسیات دان تھا۔ وہ یہ جاننے میں دلچسپی رکھتا تھا کہ انسانی ذہن، انتہائی ناپسندیدہ حالات میں رہنے پر مجبور کردیا جائے تو قدرت اس سے مقابلے کے لیے کون سا مدافعتی نظام حرکت میں لاتی ہے۔ عموماً انتہائی ناموافق اور ناپسندیدہ حالات میں ہونے والے ہر انسان کے اندر ایسی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے قدرت کا اپنا بنایا ہوا دفاعی نظام، ایک غیر متوقع شخصیت کے جنم کا باعث بنتا ہے۔ اکثر ظلم سہنے والے ظلم کرنے والے بن جاتے ہیں۔ ساس کا ظلم سہنے والی، اس سے بھی ظالم ساس بنتی ہے۔ سخت مزاج باپ کا بیٹا اس سے بھی سخت مزاج سربراہ ثابت ہوتا ہے۔ میگی کی ٹوٹی پھوٹی عزتِ نفس کو بچائے رکھنے والی زرہ بکتر، اپنی گھٹن کو اپنے آرٹ کے ذریعے باہر نکالنے کا راستہ تھا۔ فہد کو اپنے کچھ اور سوالوں کے جواب بھی ملے تھے۔

یہ وہ عورت تھی جو سبرینہ گیبرئیل کی کہانی کا سب سے اہم کردار اور اس قلعہ نما قید خانے سے اس کے فرار کا سب سے مضبوط محرک ثابت ہوئی تھی۔ فہد کی اپنی ماں سے بھی کہیں بزرگ میگی کے سفید چاندی ایسے بالوں اور کشادہ پیشانی کے نیچے دو تھکی ہوئی آنکھیں، کسی انجانے عارضے کا پتا بھی دے رہی تھیں۔ فاروق تو اس رات جاگیر پر واپس

نہیں آیا تھا...... لیکن فہد مرتضیٰ نے مریم فیروز خان کو اپنے ہر نوعیت کے رابطے کی تفصیلات اور کسی بھی مشکل کی صورت میں اپنے تمام فون نمبر لکھ کر دے دیے تھے۔

''مشکل کی صورت میں؟'' مریم نے جاگیر سے بحفاظت رخصت ہوتی فہد کی گاڑی کو دیکھ کر زیرِ لب دُہرایا تھا لیکن وہ ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ تاوقتیکہ ایک صبح، جاگیر کی اصلی والی خاندانی بیگم کی حویلی میں کہرام مچ گیا۔ ساری زندگی انسانوں کو حقیر کیڑوں کی طرح مسل کر ایذائیں دینے والا میکی کا دیو زادہ ایک ایسے مرض کے ہاتھوں چپ چاپ ختم ہوگیا تھا جس کا ابھی کوئی علاج دنیائے سائنس نے دریافت نہیں کیا تھا۔

فاروق کا اتا پتا ان دنوں سوائے چند لوگوں کے کسی کے علم میں نہیں تھا۔ وہ ایک پُراسرار مقدمے میں پھنسا کئی دن جاگیر پر آتے کا راستہ بھولا ہوا تھا۔ اور اس کا راستہ ایسا کھویا تھا کہ اپنے باپ کے جنازے کو کندھا دینے بھی نہیں آسکا۔ مریم فیروز خان، میکی کو صرف اتنا ہی پتا چلا کہ وہ پاکستان سے فرار ہو چکا ہے۔ اور کسی ایسے سنگین معاملے میں پھنس گیا ہے۔ جس میں اللہ ہی اسے بچا کر لائے تو لائے۔

اسے خبر دینے والی عورت آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر توبہ توبہ کر رہی تھی۔ اور ایسا کرتے ہوئے اس کی آنکھوں سے بہتا بہت سا خاموش پانی اس کے میلے دوپٹے میں پھسل پھسل کر جذب ہو رہا تھا۔ اس کو جاگیر کے مالکوں نے کہاں، کیوں اور کب تکلیف پہنچائی ہوگی۔ ایسے سوال مریم نام کی کبھی اجنبی اور کبھی مہربان ہو جانے والی گوری مالکن کبھی کسی سے نہیں پوچھتی تھی۔

فہد کو خوشگوار حیرت ہوئی جب اس نے فون پر مریم فیروز معظم خان کی آواز سنی تھی۔ وہ صاف بتا رہی تھی کہ وہ ایچ آئی وی پوزیٹو ہے۔ بیمار رہتی ہے لیکن جتنی سی بھی زندگی باقی ہے، اسے ضائع نہیں کرنا چاہتی...... وہ یہ بھی نہیں جانتی کہ وہ کیا کام کرسکتی ہے لیکن کچھ ایسا ضرور کرنا چاہتی ہے۔ جس سے اس کی self loathing (خود سے نفرت کرتے رہنے) کی عادت میں کمی واقع ہو۔

فہد اسے ذہنی امراض کے اس غیر سرکاری ادارے تک لایا تھا۔ جہاں آرٹ اور رنگوں کو طریقۂ علاج کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ مریم یا میکی وہ اب خود کو جو بھی سمجھتی ہو۔ خوش تھی، سکون میں تھی۔ زندگی میں پہلی بار ان کے پاس کچھ ایسا کرنے کو تھا جسے کرنے کے لیے وہ ہر رات صبح کی منتظر رہنے لگی تھی۔

☆☆☆

اگلے دن کے اخبارات نے ایک نئی برطانوی اسکالر کی پاکستان کے بارے میں لکھی گئی کتاب کی تقریب کا احوال اس میں شرکت کرنے والے صحافیوں کی مرضی سے شائع کیا تھا۔ لاہور کے اس سرکردہ کالج میں، جہاں پاکستان کے اعلیٰ خانوادوں کی بیٹیاں پڑھتی ہیں، کتاب کو ملنے والی پزیرائی پر صحافیوں کی رائے ملی جلی تھی...... ایک متنازع موضوع پر لکھی گئی کتاب کی رونمائی کے لیے اسی کالج کا خصوصی انتخاب کیوں کیا گیا...... اس سوال کا انہیں کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا تھا۔

ایک افواہ کے مطابق کتاب کی مصنفہ سبرینہ گیبرئیل کا کالج سے کوئی پرانا قلبی تعلق تھا۔ یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ وہ کالج میں ماسٹرز لیول کا کوئی نیا ڈسپلن شروع کرانا چاہتی ہے۔

ایک انگریزی اخبار کے صحافی محمد جنید بٹ کو سبرینہ گیبرئیل کے بارے میں کوئی دلچسپ اسکوپ بھی ملا تھا۔ اس نے اپنے رپورٹنگ انچارج کو اپنی تحقیقات کے نتائج سے بڑے اعتماد سے آگاہ کیا تھا کہ سبرینہ گیبرئیل کوئی بڑا دھماکا کرنے والی ہے۔

سبرینہ گیبرئیل کوئی ایکٹریس نہیں تھی۔ کوئی بڑی بین الاقوامی صحافی نہیں تھی۔ اس کا ماضی پُراسرار تھا اور حال شاید اس سے بھی زیادہ پُراسرار...... مگر اس کی کتاب میں کچھ ایسا ضرور تھا جس نے اس ملک کی جدی پشتی اشرافیہ کلاس کے ایک مخصوص حصے کو بڑے عجیب طریقے سے چوکنا کیا تھا۔ صحافی اس کی کھوج میں تھے...... مگر وہ بڑے آرام سے ایک بار پھر اسی کالج کے ہاسٹل میں وکٹوریہ ڈیوڈ اور تزئین اظہر کی مہمان داری کا لطف اٹھا رہی تھی۔ جس کی دیواروں نے ایک بار پہلے بھی اسے دشمن دنیا سے تحفظ فراہم کیا تھا۔

ایک فرق البتہ ضرور تھا۔ اس بار ہاسٹل سے کالج گیٹ کو جاتی لمبی پگڈنڈی پر دور، دور تک کوئی اس طرف آتا

نظر نہیں آتا تھا یا شاید ایک بار پھر سبرینہ سے اندازہ لگانے میں غلطی ہو گئی تھی۔

کوئی دور سے آرہا تھا۔ مضبوطی سے ایک کے پیچھے دوسرا قدم جماتا۔ وہ بالکل اندھی بھی ہوتی تو بھی اس مانوس سی پُراعتماد چال کو ہزاروں لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔ اور یہ مان لینے میں حرج ہی کیا تھا کہ وہ کتنی شدت سے، کتنے دھیان کے ساتھ اس ایک شخص کی آہٹ کا انتظار کرتی رہی تھی۔

ہاں وہ ڈاکٹر سبرینہ گیبرئیل ایک بار پھر اس ملک کے ایک پڑھے لکھے، قابل اور ذہین سپوت کو اپنے ملک کے بارے میں اپنی رائے بدلنے کا ایک اور موقع دینے کے لیے تیار تھی۔

''کوئی حرج نہیں...... ہوتا ہے، ایسا بھی ہوتا ہے۔''

اس کے دل کے اندر کہیں دور آلتی پالتی مارے بیٹھے محتسب بدھا نے جس کی شکل پچھلے چند سالوں کی اندرونی ریاضت کے دوران اس کے باپ سے ملنے لگی تھی مسکرا کر ایک شفقت بھری تھپکی دی تھی۔

فہد مرتضیٰ اسے چائے کی پیالی پر اردو کی ایک ایسی نظم کا مفہوم سمجھا رہا تھا جو اس کے بقول اس نے پچھلے کچھ سالوں میں کسی دعا کی طرح بار، بار پڑھی تھی۔

''سنا ہے گم شدہ چیزیں جہاں پر کھوئی جاتی ہیں وہیں پر مل بھی جاتی ہیں ہاں ڈھونڈنے کی لگن ہونی چاہیے تو کھوئے کھوئے لمحے بھی لوٹ آتے ہیں۔'' وہ فاروق کی طرح جادوگر باتیں کرنے والا ذہین، اسمارٹ اور کوئی Macho اسپورٹس مین نہیں تھا۔ بس وہ ایک بہت ہی اچھا انسان تھا۔

☆☆☆

16 مئی 1995ء

کینال ویو لاہور کے ایک انتہائی پڑھے لکھے مڈل کلاس گھرانے کے ڈرائنگ روم میں سادگی سے انجام پانے والے نکاح کی خبر بظاہر عام نہیں ہوئی تھی جس کی دلہن لبنانی نژاد برٹش نیشنل، پی ایچ ڈی ڈاکٹر سبرینہ گیبرئیل تھی اور دولہا ہر ایک کے بھائی بندوں جیسا ایک عام سا پڑھا لکھا، روشن ذہن، نیک دل، شریف پاکستانی......

☆☆☆

''واقعی لڑکیاں تجربے کرنے سے ڈرتی نہیں ہیں۔''

ایما گیبرئیل احمد الباسم نے اپنے سوئے ہوئے ایک سالہ بچے کو برابر والی خالی نشست پر رکھی چائلڈ سیٹ پر لٹا دیا۔ ائر لائن کے علامتی نشان والا کمبل دُہرا کر کے بچے پر ڈالا۔ اس کا شوہر احمد الباسم بچے سے اگلی والی نشست پر گردن تک کمبل اوڑھے لاہور سے سارا رستہ مسلسل سوتا ہوا آیا تھا۔ لاہور جہاں وہ سبرینہ کے نکاح میں شرکت کرنے گئے تھے۔

وہ اگلے ڈیڑھ گھنٹے میں پیرس کے چارلز ڈیگال ائرپورٹ پر اترنے والے تھے۔ جہاں ایما نے اپنی مرضی اور سبرینہ کے مشورے سے اپنے باپ کے لندن والے گھر کو فروخت کر کے مستقل طور پر رہنا پسند کیا تھا۔ احمد کا سارا خاندان پیرس میں تھا اور سبرینہ کا نیا خاندان پاکستان میں۔

ایما کو واقعی یاد نہیں تھا کہ اس نے کبھی اپنی بہن کو ایک مسلمان سے شادی کرنے سے منع کیا تھا۔ اس کی اپنی زندگی میں احمد کو ملنے سے بڑی خوشی کوئی نہیں آئی تھی۔ اس نے طمانیت سے اپنے سوئے ہوئے شوہر پر نظر ڈالی۔

''اچھا ہے وہ کچھ دیر اور آرام کرلے۔''

انہیں کل سے اپنی اپنی ڈیوٹی جوائن کرنی تھی۔ بچے کے بعد سے دونوں میاں بیوی کسی یو این مشن پر ایک ساتھ نہیں گئے تھے۔

ایما نے سیٹ کی پشت سے کمر ٹکا کر گردن تک تانے ہوئے کمبل میں اپنا منہ اور بھی گھسیڑ لیا۔

''ہاں! کیا حرج ہے اگر ہم یہ سوچ لیں کہ سفر کرتے، کرتے واقعی ہمارا گھر آگیا ہے۔''

اس نے قناعت سے آنکھیں بند کرلی تھیں۔

اسے ابھی ایک ایسے گھر کے خواب دیکھنے تھے جہاں دنیا کے دو براعظموں میں رہنے والی سبرینہ فہد مرتضیٰ اور ایما احمد الباسم کی اولادیں ایک دوسرے کے لیے بہت ڈھیر ساری گنجائش پیدا کرسکیں گی۔

(ختم شد)



گھٹن

رضوانہ پرنس

"سنو...... میں آفس جارہا ہوں...... کم از کم چلتے وقت مسکرا کر خدا حافظ ہی کہہ دو......" ارسل اس کی غصیلی آنکھوں میں جھانک کر شرارت سے مسکرایا لیکن جواباً وہ رخ پھیر کر بلاوجہ ہی سائڈ ٹیبل پر رکھے گلدان کے پھولوں کو دوبارہ سیٹ کرنے لگی۔

"اچھا بھئی جیسی تمہاری مرضی......" وہ ایک طویل سانس لے کر کھڑا ہوگیا۔

"انسان کے اگلے پل کی کوئی خبر نہیں...... اگر

زندگی رہی تو شام کو پھر ملیں گے۔'' اس نے چلنے سے پہلے اسے ایک جذباتی جملے کی گرفت میں پکڑنا چاہا لیکن وہ اس کے تمام ہتھیاروں کا مقابلہ اپنے سرد مہر رویے کی آڑ میں بڑی کامیابی سے کررہی تھی۔ تب ہی تو اتنا جذباتی جملہ بھی اس کے گرد بنی غصے اور بیزاری کی دیوار سے ٹکرا کر بے نیل و مرام واپس آگیا۔ رمنا نے نظر اٹھا کر اس کی جانب دیکھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔

ارسل کچھ مایوس اور دل گرفتہ سا ہو کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ کچھ دیر یونہی گم صم سی بیٹھی رہی۔ دل بری طرح سے بھر آیا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا اور آنسوؤں نے اس کا چہرہ پوری طرح سے بھگو دیا۔ تب ہی ماں جی کے آنے کی آہٹ پر اس نے بے اختیار اپنا سر اٹھایا تو انہیں بہت اچنبھے سے اپنی جانب دیکھتے پا کر وہ کچھ شرمندہ سی ہو کر آنسو پونچھتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

''کیا بات ہے رمنا، رو کیوں رہی ہو؟ اور یہ ارسلان بھی ناشتا کیے بغیر آفس چلا گیا۔'' وہ کچھ پریشان سی ہو کر اس کے نزدیک چلی آئیں۔ اس وقت رمنا کو ان کا یہ سوال بہت بے محل سا محسوس ہوا۔ ان کے پورے جملے میں ہی ان کے سوال کا جواب پوشیدہ تھا پھر بھی وہ انجان بن رہی تھیں۔

''ظاہر سی بات ہے اگر بہو رو رہی ہے اور بیٹا ناشتا کیے بنا ہی آفس چلا گیا ہے تو ان دونوں کے درمیان یقیناً کچھ کھٹ پٹ ہی ہوئی ہوگی۔'' اس نے بے حد کوفت سے سوچا۔

کبھی، کبھی انسان اپنے دکھ، پریشانی اور اپنے آنسوؤں کو صرف اپنے ساتھ ہی شیئر کرنا چاہتا ہے۔ تنہائی اسے اپنی سب سے بڑی غم خوار محسوس ہوتی ہے۔ رمنا کے بھی یہی احساسات تھے ایسے میں ماں جی کی آمد اسے خاصی گراں گزری تھی۔ تب ہی وہ ان کے سوال اور ان کی موجودگی کو اگنور کرتی ہوئی ان کے قریب سے گزر کر واش روم میں گھس گئی کہ اس وقت وہی اسے اپنی پناہ گاہ محسوس ہو رہا تھا۔ ماں جی کو اس کا یہ انداز قطعی پسند نہیں آیا۔ چند لمحے تیوریوں پر بل ڈالے وہ خاموش کھڑی کچھ سوچتی رہیں پھر دھیمے قدموں سے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

☆☆☆

رمنا جب دلہن بن کر اُن کے گھر میں داخل ہوئی تھی تو ان کا دل خوشی کے ساتھ، ساتھ انجانے وسوسوں سے بھی لبریز ہو رہا تھا۔ ساس، بہو کے روایتی رویوں اور جھگڑوں کا خوف ایک عفریت کی طرح اُن کے دل میں اپنے پنجے گاڑے بیٹھا ہوا تھا۔ ارسل ان کا سب سے بڑا بیٹا تھا اور ان کے رگِ جان کے سب سے قریب بھی...... اس کے بعد ان کے تین بیٹے اور بھی تھے لیکن اللہ نے انہیں بیٹی جیسی نعمت سے محروم رکھا تھا۔ چار بیٹوں کی ماں ہوتے کے فخر کے ساتھ، ساتھ انہیں ایک بیٹی کی کمی کا احساس بھی شدت سے ہوتا تھا۔ جب ارسل پیدا ہوا تھا تو پہلی بار انہیں پتا چلا تھا کہ ممتا سے زیادہ حسین کوئی اور جذبہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک عجیب سی خوشی نے انہیں اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ ان کے شوہر سلطان کی محبت اور ناز برداریوں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا اور پھر فیضان کی آمد پر تو مانو سلطان نے انہیں سچ مچ کی ملکہ بنا کر تخت پر بٹھا دیا۔ تیسری بار جب وہ امید سے ہوئیں تو دل بے اختیار ایک پیاری سی گڑیا کی تمنا کرنے لگا جسے وہ اپنے پسندیدہ پنک کلر کی فراک پہنا کر اس کے خوب صورت بالوں کی پونی ٹیل بنائیں۔ وہ جب بھی شاپنگ کے لیے جاتیں تو شوکیس میں ہی سجی ننھی منی دل فریب کلرز کی فراکس بے اختیار انہیں اپنی طرف کھینچنے لگتیں اور یوں آہستہ، آہستہ ڈھیر ساری فراکوں سے ان کا سوٹ کیس بھرتا چلا گیا۔ اس دن وہ اپنا سوٹ کیس کھولے ان پیاری، پیاری سی فراکوں کو ہاتھ میں اٹھا، اٹھا کر بہت شوق سے دیکھ رہی تھیں تب ہی اچانک سلطان کمرے میں چلے آئے۔ اندر کا منظر دیکھ کر وہ ایک لمحے کو جیسے ٹھٹک سے گئے۔

''یہ کیا بھئی...... کیا آنے والے مہمان کو لڑکیوں کے کپڑے پہناؤ گی؟'' ان کے لہجے میں چھپی حیرانی کو محسوس کر کے وہ شرما کر ہنس دیں۔

''جناب اس بار انشاء اللہ ارسل اور فیضان کی بہن آرہی ہے اسی کے لیے......'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر گلابی چہرے کے ساتھ کپڑے واپس سوٹ کیس میں رکھنے لگیں۔

''کیسی باتیں کر رہی ہو تم صباحت؟'' سلطان کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہوگیا۔صباحت نے خوفزدہ ہو کر اُن کی اس بدلتی ہوئی کیفیت کو دیکھا...... اس لہجے میں تو سلطان نے انہیں کبھی مخاطب نہیں کیا تھا۔تب ان کی آنکھوں میں آئی نمی کو محسوس کرتے ہوئے سلطان نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے پیار سے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

''دیکھو صباحت! ابھی کچھ ہی دن پہلے تو ڈاکٹر نے ہمیں یہ خوش خبری سنائی ہے اور تمہیں زیادہ سے زیادہ ریسٹ کرنے کی تاکید بھی کی ہے پھر ابھی سے یہ ساری شاپنگ قبل از وقت ہے۔''

''لیکن......'' صباحت نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن سلطان نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں کچھ بولنے سے روک دیا۔

''ابھی میں نے اپنی بات مکمل نہیں کی ہے صباحت!'' ان کے لہجے میں نہ جانے کیا تھا کہ وہ انہیں خاموشی سے تکتی رہ گئیں۔

''میں نے اکثر محسوس کیا ہے کہ اس بار تمہیں بیٹی کی تمنا کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی ہے لیکن میری کیا خواہش ہے......کیا تم جاننا چاہو گی؟'' انہوں نے سوالیہ نظروں سے بیوی کی جانب دیکھا تو وہ محض اثبات میں سر ہلا کر رہ گئیں۔

''صباحت مجھے اس بار ہی نہیں، ہر بار ایک بیٹے کی ہی تمنا ہوگی کیونکہ میں سات بیٹوں کا باپ بننا چاہتا ہوں۔''

''ہیں......!'' صباحت کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ایسی فرمائش تو شاید کبھی کسی شوہر نے اپنی بیوی سے نہیں کی ہوگی۔

''ہاں صباحت اور تمہیں میری خواہش کے احترام میں بیٹا پیدا ہونے کی دعا مانگنی ہوگی۔'' ان کے لہجے میں حکم لیکن آنکھوں میں ایک التجا سی مچل رہی تھی۔

''آپ کی خواہش سر آنکھوں پر سلطان......لیکن مجھے یہ دعا کرتے ہوئے اللہ سے ڈر ضرور لگے گا کیونکہ بیٹی کو اس نے اپنی رحمت کہا ہے اور آپ سرے سے ہی اس کی رحمت سے منکر ہو رہے ہیں۔'' صباحت کا انداز کافی جتانے والا تھا جسے سلطان نے فوراً ہی محسوس کر لیا۔

''میں نے اللہ سے صرف اپنی ایک تمنا، ایک آرزو کا اظہار کیا ہے اگر اسے ہماری یہ دعا پسند نہیں آئی تو وہ اسے رد ضرور کر دے گا لیکن مجھ سے ناراض کبھی نہیں ہوگا کیونکہ وہ اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہے اور بچے جیسے اپنی ماؤں سے ہر طرح کی فرمائش کر لیتے ہیں بالکل ایسے ہی میں بھی اپنے دل کی ہر بات اپنے اللہ سے کہہ دیتا ہوں، کیا پتا میری اس دعا کو وہ میری کسی نیکی کے صلے میں شرفِ قبولیت بخش دے۔'' صباحت بس اُن کو دیکھ کر رہ گئیں۔ ان سے بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں نظر آرہا تھا سو خاموشی سے سوٹ کیس بند کرتے ہوئے اس میں اپنی اس خوب صورت آرزو کو بھی دفن کر دیا جو ہمہ وقت ان کے دل میں ایک خوب صورت سی ہلچل مچائے رکھتی تھی اور کتنی عجیب بات تھی کہ تیسری بار بھی اللہ نے کامران کی صورت میں جیسے سلطان کی دعا کو شرفِ قبولیت بخشنے کا اشارہ دے دیا...... صباحت کا دل تھوڑا سا بجھا ضرور لیکن سلطان کی خوشی اور بیٹے کی پیاری سی صورت نے تھوڑی ہی دیر میں انہیں خوشیوں کی جھلملاہٹ میں ڈبو دیا...... ابھی کامران دو ہی سال کا تھا جب عدنان نے ان کی دنیا میں آکر جیسے سلطان کی دعاؤں پر اللہ کی قبولیت کی ایک اور مہر لگا دی۔ صباحت کو سلطان کی دعاؤں کی سچائی پر یقین سا ہونے لگا لیکن جب ڈاکٹر نے انہیں یہ بتایا کہ کچھ اندرونی پیچیدگیوں کے باعث اب ان کا ماں بننا ممکن نہیں تو وہ صدمے سے ساکت رہ گئیں۔

''ارے کمال ہے بھئی، تم تو ایسے ری ایکٹ

کر رہی ہو جیسے اللہ نہ کرے تمہاری پہلے کوئی اولاد ہی نہیں ہے۔ ماشاء اللہ چار بیٹوں کی ماں ہو تم پھر بھلا تمہیں کس بات کا غم ہے۔ ویسے بھی فیملی پلاننگ والے تمہارے اچھے خاصے دشمن بنتے جا رہے تھے۔'' سلطان نے ہنستے ہوئے انہیں اپنی بانہوں میں لے لیا۔

''لیکن سلطان آپ کی وہ سات بیٹوں والی خواہش......'' وہ بے اختیار رو دیں۔

''ارے پگلی' اللہ نے مجھے چار بیٹوں سے نواز کر مجھ پر جو احسان کیا ہے تو اس کا شکر ادا کرنے میں ہی زندگی گزر جائے گی۔ اگر وہ میری خواہش کے مطابق مجھے سات بیٹوں کا باپ بنا دیتا تو یقیناً میں اپنے آپ کو زمین کا خدا سمجھ بیٹھتا جس کی ہر بات پتھر کی لکیر ہوتی ہے۔ اللہ بڑا مہربان ہے، اس گناہ سے بچانے کے لیے ہی بس اس حد تک اس نے میری دعاؤں کو قبولیت کا درجہ دیا۔ جہاں تک اس کی مرضی تھی۔'' وہ بڑے جذب سے کہہ رہے تھے اور صباحت سوچ رہی تھیں کہ شاید سلطان کی یہ ہی ادا اللہ کو بہت پسند ہے۔

☆☆☆

ہنستے مسکراتے خوشیوں سے جھلملاتے دنوں کو گزرتا وقت اپنے پروں میں سمیٹ کر اتنی تیزی سے پرواز کر رہا تھا کہ صباحت لاکھ چاہنے کے باوجود اس کی رفتار کم کرنے سے قاصر تھیں۔ اپنے مہکتے ہوئے باغ کے چار خوب صورت پھولوں کی آبیاری کرتے ہوئے جیسے سارے زمانے کی راحتیں اُن کے وجود میں سمٹ آئیں اور پھر سلطان بھی تو قدم، قدم پر ان کی اس جنت کو مزید خوب صورت بنانے میں پیش، پیش رہتے لیکن نہ جانے کیوں انہیں اپنی اس بہشت میں ہلکی سی آگ کی تپش بھی محسوس ہونے لگتی تھی۔

وقت ہر چیز سے بے نیاز ایک بپھرے ہوئے دریا کی طرح تیزی سے بہتا ہی چلا جاتا ہے۔ آنسوؤں کو ہنسی میں بدلنا، خوشیوں کو غموں میں ڈھال دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ لیکن مزے کی بات یہ کہ اس بے مہر وقت نے نہ تو صباحت کی زندگی پر چھائی بہاروں کو چھیڑتا تھا اور نہ ہی ان کی شخصیت کے رنگوں کو اپنے ہاتھوں سے دھندلا کیا تھا۔ چار جوان بیٹوں کی ماں ہونے کے باوجود وہ ویسے ہی دلکش اور نازک انداز م نظر آتیں۔ لانبے گھنے بالوں کی چوٹی میں اکا دُکا ہی سفید بالوں کی جھلک نظر آتی تھی۔ آنکھوں کی چمک اور رخساروں کے گلاب بھی ماند نہیں پڑے تھے۔ پتا نہیں اپنے آپ کو بچوں سے ماں جی کیوں کہلوایا تھا جو اُن پر ذرا بھی سوٹ نہیں کرتا تھا۔ جب وہ اپنے چاروں بیٹوں کے ساتھ باہر نکلتیں تو اجنبی لوگ ان کو بچوں کی بڑی بہن ہی سمجھتے اور جب کوئی بیٹا انہیں ماں جی کہہ کر مخاطب کرتا تو سامنے والا ناقابلِ یقین نظروں سے انہیں دیکھتا رہ جاتا۔ سلطان خود بھی بہت وجیہہ شخصیت کے مالک تھے لیکن بقول ان کے وہ اپنی بیگم کی طرح عمر چور نہیں تھے۔ وہ اکثر ان کو اس حوالے سے چھیڑا بھی کرتے۔

''بھئی صباحت، میرے لیے تو بڑی مشکل ہو گئی ہے، تم سب کے ساتھ باہر نکلتا ہوں تو اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میرے پانچ بچے ہیں۔'' وہ آنکھوں میں شرارت اور چہرے پر مظلومیت لا کر بولے۔

''ہاں بابا، میرا ایک کلاس فیلو آج مجھ سے کہنے لگا کہ کل میں نے تمہیں' تمہارے بھائیوں اور بہن کے ساتھ شاپنگ سینٹر میں دیکھا تھا۔'' ارسل بھی مسکرا کر بتانے لگا۔

''اچھا، وہ مجھے بھی بھائی سمجھا تھا۔'' سلطان نے دلچسپی سے پوچھا۔

''ارے نہیں بابا، کل بھلا آپ ہم لوگوں کے ساتھ کہاں تھے۔'' ارسل بے اختیار ہنس دیا۔

''یار دل ہی رکھ لیتے ہمارا۔'' وہ مزید مظلوم بن گئے۔

''وہ تو آل ریڈی ماں جی کے پاس ہے۔'' پاس بیٹھے فیضان نے بے ساختہ کہا تھا جس پر سب کھلکھلا کر ہنس رہے تھے جبکہ صباحت نے سرزنش کرتی نگاہوں سے ان لوگوں کو گھورا تھا۔ جو باپ بیٹوں سے زیادہ ایک دوست کے مانند محسوس ہو رہے تھے۔

وقت کچھ اور آگے بڑھ گیا...... ارسل اپنی ایجوکیشن مکمل کرنے کے بعد ایک بڑی ملٹی نیشنل کمپنی میں بہت اچھی پوسٹ پر کام کر رہا تھا...... فیضان کا میڈیکل کمپلیٹ ہوگیا تھا۔ اور وہ آج کل ہاؤس جاب میں مصروف تھا۔ کامران انجینئرنگ کے آخری سال میں تھا جبکہ عدنان کو اس کی خواہش کے مطابق سلطان نے ہائیر ایجوکیشن کے لیے لندن بھیج دیا تھا۔ خود سلطان ریٹائرڈ ہو چکے تھے لیکن ایک پرائیویٹ کمپنی کی پُرکشش آفر کو قبول کرتے ہوئے وہ آج کل وہاں جاب کر رہے تھے۔

اس دن ارسل آفس سے واپس آیا تو ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے ماں جی اور بابا کے مسکراتے ہوئے چہروں کو دیکھ کر جیسے اس کی تھکن اتر گئی۔

”ارے بھئی بہت لمبی عمر ہے تمہاری...... ماشاءاللہ سے ابھی تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا۔“ سلطان کے چہرے کی جگمگاہٹ اور لہجے کا جوش کسی خاص بات کی نشاندہی کر رہے تھے جبکہ صباحت کے چہرے کی مسکان بھی بہت کچھ بتا رہی تھی۔ وہ ان دونوں کو تجسس بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اپنی ماں جی کے نزدیک بیٹھ گیا۔

”جی جناب...... جلدی سے اب وہ خاص بات بتا دیجیے جو آپ لوگوں سے چھپائے نہیں چھپ رہی۔“ وہ ماں کے شانوں پر اپنے بازو دراز کرتے ہوئے بولا تو سلطان بے ساختہ ہنس دیے جبکہ صباحت بلا تمہید فوراً ہی شروع ہوگئیں۔

”ارسل آج میں بیگم فراز کے یہاں پارٹی پر گئی تھی۔ وہاں لاہور سے آئی ہوئی اُن کی بھانجی سے بھی ملاقات ہوئی۔ سچ اتنی پیاری اور بھولی بھالی سی صورت ہے اس کی کہ دل چاہ رہا ہے اسے تمہاری دلہن بنا کر ہمیشہ کے لیے اس گھر میں لے آؤں۔“ فرطِ جوش سے ان کا چہرہ تمتمانے لگا۔ ارسل نے بہت پیار سے اپنی ماں کو دیکھا۔ بیٹے سے وابستہ خوشی کے تصور نے ہی ان کے چہرے کو کیسی الوہی چمک سے جگمگا دیا تھا۔ ویسے تو جب سے ارسلان نے جاب شروع کی تھی اسی وقت سے ان کے دل میں اس کی شادی کے ارمان جاگ اٹھے تھے۔ لیکن کچھ وسوسوں کے پھنکارتے سانپ ان کے ارمانوں کو جیسے سہما سا دیتے تھے۔

پتا نہیں آنے والی لڑکی کس مزاج کی ثابت ہو، ان کے محبتوں اور خوشیوں سے گندھے ہوئے پُرسکون سے گھر میں کوئی دراڑ نہ پیدا ہو جائے۔ ایک چاہنے والے بیٹے اور بھائی کو صرف اپنا شوہر بنا کر وہ سب سے دور نہ کر دے۔ ایسے کتنے ہی اندیشے انہیں اندر ہی اندر دہلاتے رہتے تھے لیکن پتا نہیں کیوں آج رمنا سے ملنے کے بعد جیسے وہ سارے وسوسے تمام اندیشے کسی دھیمے، دھیمے سے خوب صورت جذبے میں تبدیل ہو گئے تھے۔ جیسے برسوں سے ان کے دل میں دبی ہوئی ایک بیٹی کی تمنا رمنا کے روپ میں مجسم ہو کر اُن کے سامنے آگئی ہو۔ ان کا دل بے اختیار اس کی جانب کھنچا جا رہا تھا۔ رمنا کے وجود سے لپٹی محبت اور خلوص کی خوشبو براہِ راست انہیں اپنے دل تک پہنچتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اپنی خالہ کا برابر سے ہاتھ بٹاتی اور مہمانوں سے بہت اپنے پن سے باتیں کرتی ہوئی وہ پُرخلوص سی لڑکی ان کی اس تشنہ آرزو کی پوری تکمیل کرتی ہوئی نظر آرہی تھی جس کے لیے ان کی روح برسوں سے پیاسی تھی۔ خوب صورت آسمانی کلر کے ڈریس میں وہ سچ مچ آسمان سے اتری ہوئی کوئی حور ہی لگ رہی تھی اور صباحت سوچ رہی تھیں کہ ان کی جنت بھلا اس حور کے بغیر کیسے مکمل ہو سکتی ہے۔ اللہ نے اگر پہلے صباحت کی ایک بیٹی کی تمنا پوری نہیں کی تھی تو سدِ باب کے طور پر اب رمنا کی صورت میں، ان کو ان کے اپنے صبر کا انعام عطا کر ہی دیا تبھی تو سارے مرحلے آسانی سے طے ہوتے چلے گئے۔

بیگم فراز نے اپنی بھانجی کو لاہور سے بلوایا ہی اس نیت سے تھا کہ اس کا کہیں اچھی جگہ رشتہ کروا سکیں۔ ارسل جیسے لڑکے کا رشتہ ان لوگوں کے لیے بھی لاٹری نکلنے کے مترادف تھا۔ ارسل کو بھی وہ

بھولی بھالی پیاری سی لڑکی پہلی ہی نظر میں بھا گئی تھی۔ سو تین ماہ کے اندر، اندر ہی رمنا دلہن بن کر صباحت کی بنائی ہوئی جنت میں جا اتری۔

☆☆☆

شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ صباحت نے جی بھر کر ارمان پورے کیے، عدنان بھی لندن سے بھائی کی شادی میں شرکت کے لیے آ گیا۔ تینوں بھائیوں نے مل کر خوب ہی رونقیں بکھیریں۔ رمنا کو اپنا یہ ہنستا بستا کھلکھلاتا محبتوں سے معمور سسرال بہت ہی اچھا لگا تھا۔ اسے اپنی خوش قسمتی پر رشک آنے لگا۔ سب نے اسے ہتھیلی کا پھپھولا بنا کر رکھا ہوا تھا۔ جہاں ارسل کی چاہتوں پر وہ مغرور ہوتی وہیں نٹ کھٹ دیوروں کی مزے دار سی چھیڑ چھاڑ اسے ہمہ وقت مسکرانے پر مجبور کرتی رہتی۔ اور سب سے بڑھ کر ماں جی اور بابا کی محبت نے اسے جیسے ان کا گرویدہ ہی بنا ڈالا تھا۔ خود وہ بھی تو پیار اور خلوص کا ایک ایسا مہکتا ہوا پیکر تھی جس کی خوشبو نے سارے گھر کو مہکا سا دیا تھا۔ صباحت کو اکثر اپنے وسوسوں پر ہنسی آتی، ناحق وہ اتنی خوفزدہ رہتی تھیں رمنا نے تو آ کر ایک بیٹی کی کمی پوری کر دی تھی۔ ان دونوں کے درمیان ساس بہو والا روایتی رشتہ قائم ہی نہیں ہوا تھا، نہ رمنا کو اپنے شوہر پر بلاوجہ کا حق جمانے کا شوق تھا اور نہ ہی ماں جی کے دل میں اپنی بہو کے لیے کسی بھی قسم کی جیلسی کا کوئی احساس جاگا تھا۔

اس رات ارسل کی پھوپی کے یہاں نئے دولہا دلہن کے اعزاز میں ڈنر تھا۔ رمنا کافی دیر سے..... وارڈ روب کھولے دعوت کے لیے ڈریس کا انتخاب کرنے میں مشغول تھی۔ جہیز اور بری کے دمکتے کپڑوں سے وارڈ روب بھی جیسے جگمگا رہی تھی لیکن رمنا کو ان میں سے کسی ایک کو چوز کرنا تھا جو اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پچھلی بار ارسل کے دوست کے یہاں دعوت پر جانے کے لیے جب وہ لائٹ گرین شیفون کی ساڑی میں تیار ہو کر کمرے سے باہر آئی تھی تو ماں جی نے پیار بھری خفگی سے اسے سمجھایا تھا۔

''نئی دلہن پر اتنا لائٹ کلر بالکل اچھا نہیں لگتا..... بیٹا ابھی تم نئی، نئی دلہن ہو..... خوب بھاری، بھاری جوڑے پہن کر دعوتوں میں جایا کرو۔ ورنہ لوگوں کو کیسے پتا چلے گا کہ کون سی نئی دلہن ہے۔'' آخری جملہ کہتے ہوئے وہ بے اختیار ہنس دی تھیں۔

''اُف ان کی ہنسی بھی کتنی دلکش ہے۔'' رمنا نے بڑے رشک سے سوچا تھا اور اس وقت ماں جی کے جملوں کی بازگشت ہی اسے کپڑے سلیکٹ کرنے میں الجھا رہی تھی۔ ارسل بیڈ پر نیم دراز ٹی وی دیکھنے میں محو تھا۔ آخر کافی سوچ بچار کے بعد اس نے گرے اور سرخ کامبینیشن کا ایک بہت اسٹائلش سوٹ نکال کر ارسل کو پکارا۔

''سنیں، میں سوچ رہی ہوں کہ رات کو ڈنر پر یہ سوٹ پہن لوں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟'' ارسل نے ٹی وی پر سے نگاہیں ہٹا کر رمنا کے ہاتھوں میں پکڑے سوٹ کو ایک لمحے کے لیے دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

''تم تو ہر ڈریس میں آفت لگتی ہو، بھئی جو دل میں آئے پہن لو۔'' رمنا اس کے جواب سے کچھ چڑ سی گئی۔

''مجھے آپ کی تعریف نہیں بلکہ مشورہ چاہیے۔''

''تو پھر میرا مشورہ یہ ہے کہ ماں جی سے مشورہ کرلو، وہ یقیناً اچھا مشورہ دیں گی۔'' ارسل نے شرارت سے مشورے کی گردان کرتے ہوئے کہا تو وہ کچھ خفا سی ماں جی کے کمرے میں چلی آئی۔

''ارے رمنا بیٹا، آؤ اندر آؤ.....'' سلطان نے اسے دروازے پر کھڑا دیکھ کر پیار سے پکارا تو صباحت جو پیٹھ موڑے بیڈ پر رکھے کپڑوں کو ہینگر میں لگا رہی تھیں بے اختیار اس کی طرف مڑ کر دیکھنے لگیں۔

''وہ ماں جی..... دراصل مجھے آپ سے ایک رائے لینی تھی لیکن آپ شاید بزی ہیں۔'' رمنا نے بیڈ پر بکھرے کپڑوں کی جانب دیکھا جنھیں اب صباحت سلیقے سے ہینگر میں ٹانگ رہی تھیں۔

''ارے نہیں بھئی، ایسی کوئی بات نہیں۔

تمہارے بابا کے بکھیڑے ہیں سارے۔'' انہوں نے کچھ خفگی سے کہا تو رمنا کی سوالیہ نظریں بے اختیار بابا کی طرف اٹھ گئیں تو وہ کھسیا گئے۔

''اصل میں تمہاری ماں جی بہت ڈل کلر کے کپڑے پہن رہی تھیں رات کی دعوت میں......'' پھر وہ بیڈ پر رکھے فیروزی کلر کے سوٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ ''سو میرے عقلمندانہ مشورے پر عمل کرتے ہوئے اس سوٹ کی قسمت جگانے کا فیصلہ کیا ہے انہوں نے...... خیر اب اپنی بہو سے مزید مشورہ کرلو......'' وہ مسکراتے ہوئے باہر چلے گئے۔

''توبہ ہے بھئی، آدھے گھنٹے سے اسی مسئلے میں الجھایا ہوا تھا مجھے۔ جب بھی کہیں جانا ہوتا ہے، سب سے پہلی فکر انہیں یہ ہی ستانے لگتی ہے کہ میں کیا پہن رہی ہوں۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے کپڑے الماری میں لٹکانے لگیں۔

''واہ ماں جی ایسے شوہر تو کم ہی ہوتے ہیں، ان فیکٹ زیادہ تر مردوں کو تو شاید یہ بھی نہیں پتا ہوتا کہ بیوی کا سوٹ نیا ہے یا پرانا......'' رمنا ہنستے ہوئے ان کے بیڈ پر بیٹھ گئی تو ماں جی بھی مسکرانے لگیں۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو رمنا...... ان کی تو ہر بات ہی نرالی ہے۔ میری نئی، نئی شادی سے لے کر آج تک بس وہ مجھے ایک گڑیا کی طرح سجانے بنانے میں لگے رہتے ہیں جبکہ اب میں گڑیا نہیں بڑھیا ہوں۔''

''ہائے نہیں ماں جی...... آپ تو اب بھی بے حد حسین لگتی ہیں۔ میری شادی میں تو بہت سے لوگ آپ کو میری نند سمجھ رہے تھے۔'' رمنا نے ان کے نازک پیکر کو تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ارے بیٹا وہ نیوی بلیو جگ مگ کرتی ساڑی پہننے کو میں بالکل بھی تیار نہیں تھی لیکن تمہارے بابا اتنے شوق سے خرید کر لائے تھے کہ بس ان کا دل رکھنے کو اسے پہننا ہی پڑا۔'' ان کے وضاحت دینے پر وہ ہنس دی۔

''اچھا تو بابا خرید کر لائے تھے وہ ساڑی؟''

''تو اور کیا...... میں تمہاری بری کے جوڑے

اس کی یادیں

اس کی یادیں، مری تنہائی مجھے بخش دو
جو ہو سکے تو اس کے نام کی رسوائی مجھے بخش دو
میں بھی ہو جاؤں معتبر اس کے نام سے
کچھ نہیں تو الزام بے وفائی ہی مجھے بخش دو
میں تنہا لگتی ہوں اس بھرے شہر میں تو کیا
رُوم رُوم میں ہے وہ اس کی ہمراہی مجھے بخش دو
اس شہر میں اس کی خوشبو ہے کُو بہ کُو
دیکھو اس کے شہر میں گدائی مجھے بخش دو
آنکھ کی پتلی، دل کی دھڑکن میں ہے اک شخص
کوئی نہ پڑھ پائے اس راز کو
ایسی تنہائی مجھے بخش دو

شاعرہ: سدرہ شیخ

خریدنے میں بزی رہتی تھی، ایک بار یہ بھی ساتھ ہو لیے اور پتا نہیں کس وقت تین ساڑیاں خرید لیں کہ یہ مہندی پر پہننا، یہ بارات، یہ ولیمے کے لیے ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے بتانے لگیں تو رمنا حیرت سے منہ کھولے انہیں دیکھتی رہ گئی۔

''اوہ مائی گاڈ...... ماں جی ایسا تو میں نے کبھی نہیں سنا...... واقعی بابا کی چاہت تو بہت مثالی اور افسانوی ہے۔''

''اچھا یہ سب چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ تم آج رات کیا پہن رہی ہو؟'' ماں جی کے پوچھنے پر اسے اچانک ہی اپنی پرابلم یاد آ گئی لیکن پتا نہیں کیوں ان سے رائے لینے کے بجائے اس نے آہستگی سے کہا تھا۔

''ماں جی ریڈ اور گرے کلر کے کنٹراسٹ کا خوب صورت کام والا سوٹ ہے۔ ارسل بھی اصرار کر رہے ہیں کہ وہی سوٹ پہنوں۔''

☆☆☆

موبائل کی بیل بج رہی تھی۔ رمنا نے جلدی سے آ کر کال ریسو کی تو دوسری طرف ارسل تھا۔

''رمنا، ماں جی کا بخار اب کیسا ہے؟''

''اس وقت تو بخار نہیں ہے، ماشاء اللہ سے کافی بہتر لگ رہی ہیں۔'' رمنا کے تسلی آمیز لہجے پر ارسل نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ آفس کے کام سے دو دن کے لیے اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ کل شام ہی رمنا نے اسے بتایا تھا کہ ماں جی کو اچانک ہی تیز بخار چڑھ گیا ہے لیکن شکر ہے کہ گھر میں فیضان کی صورت میں ایک ڈاکٹر موجود تھا سو جلد ہی اس نے بخار پر کنٹرول کر لیا تھا لیکن بابا کی پریشانی حد سے سوا تھی۔ رمنا کی شادی کو اب چھ ماہ کا عرصہ ہو رہا تھا۔ اس دوران بابا کی چاہتوں کے بہت سے خوب صورت رنگ اس پر آشکار ہوئے تھے لیکن ماں جی کی بیماری پر ان کی بے چینی دیکھ کر اس کو حیرانی کے ساتھ، ساتھ ماں جی پر رشک بھی بہت آرہا تھا۔ وہ بھی تو کسی کی بیوی تھی بلکہ نئی نویلی دلہن ہی تھی لیکن ارسل تو خاصا بے پروا اور اپنے آپ میں مگن سا شوہر ثابت ہوا تھا۔ بابا کا ذرا سا بھی تو سایہ نہیں پڑا تھا اس پر۔ اکثر دعوتوں میں وہ سب میں کچھ ایسا گھل مل جاتا کہ کچھ دیر کے لیے وہ جیسے اس کے وجود کو فراموش ہی کر دیتا جبکہ بابا وہاں بھی ماں جی کو ہر بات میں اہمیت دیتے رہتے تھے۔ کھانے کی میز پر ماں جی کی پلیٹ پر اُن کی نظر رہتی۔

''صباحت یہ کباب ضرور چکھیے گا...... راضیہ بھابی کی خاص اسپیشلٹی ہے۔ ارے صباحت، یہ نہاری نہیں کھائی تو سمجھو کچھ نہیں کھایا۔'' اور دوسری طرف ارسل مزے سے اپنی پلیٹ بھرے دوسروں سے محوِ گفتگو رہتا۔ رمنا کافی جز بز سی ہو جاتی۔ کبھی، کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے ماں جی اور بابا نئے نویلے دولھا، دلہن ہیں اور وہ اور ارسل ان کے ساس، سسر...... اپنی اس منطق پر کبھی اسے ہنسی آتی اور کبھی ارسل سے اس کا دل برا ہونے لگتا۔ ماں جی کی بیماری کے دوران بابا نے جس طرح اُن کی تیمار داری کی تھی، ان کے نخرے اٹھائے تھے کھانے پینے اور دوائیوں کا خیال رکھا تھا۔ ان سب چیزوں نے رمنا کے دل میں عجیب سے احساسات جگا دیے تھے۔ ارسل نے اسے چاہا ضرور تھا لیکن بنا کسی خوب صورت لفظی اظہار کے۔ اس کی محبت میں ایک عجیب سی تشنگی محسوس ہونے لگی تھی رمنا کو...... اور ماں جی کی مثالی زندگی اس کے دل میں احساسِ محرومی جگانے لگی تھی۔ رات ارسل کا فون آیا تو اس کا دل ہی نہ چاہا اس سے بات کرنے کو...... تبھی بے حد بجھے ہوئے انداز میں اس نے ہیلو کہا تھا۔ ارسل اس کے سرد مہر انداز پر ہنس پڑا۔

''لگتا ہے ہماری بیگم کو ہماری جدائی کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی ہے۔ ارے بھئی کل صبح کی فلائٹ سے مابدولت واپس تشریف لا رہے ہیں۔ ویسے آپس کی بات ہے میں نے بھی تمہیں کچھ زیادہ ہی مس کیا ہے۔'' اس کے پیار بھرے لہجے نے رمنا کے اداس ہوتے ہوئے دل میں کچھ رنگا رنگ سے پھول کھلا دیے اور ان پھولوں کی مہک پوری رات اس کے خوابوں پر چھائی رہی جہاں اس کا پریتم اس کا ہاتھ تھامے اسے خوب صورت وادیوں میں لیے گھوم رہا تھا۔

☆☆☆

گزرتے دنوں کے ساتھ، ساتھ رمنا کا دل بھی جیسے بجھتا جا رہا تھا۔ گھر کا پُرسکون ماحول، چاہنے والا شوہر، مہربان سے ساس، سسر، خیال رکھنے والے دیور، نہ کوئی رنجش اور نہ کوئی چپقلش...... سب ہی کچھ تو میسر تھا اسے لیکن پھر بھی روح بے چین سی رہتی تھی۔ ایک عجیب سی الجھن اور بے اطمینانی اس کے سارے وجود پر چھائی رہتی۔ اس دن بابا اور ماں جی اپنے کسی عزیز سے ملنے گئے ہوئے تھے۔ فیضان اسپتال سے نہیں لوٹا تھا اور کامران اپنے دوستوں کے ساتھ باہر گیا ہوا تھا۔ وہ اور ارسل لاؤنج میں بیٹھے چائے پیتے ہوئے ٹی وی پر کوئی دلچسپ پروگرام دیکھ رہے تھے تب ہی ارسل نے نوٹ کیا کہ رمنا کا دھیان ٹی وی کی طرف ہے ہی نہیں...... نہ جانے کن سوچوں میں گم تھی وہ۔

''کیا بات ہے رمنا، کہاں گم ہو بھئی؟'' ارسل نے اس کو مخاطب کیا تو وہ بے اختیار چونک گئی۔

''وہ دراصل میں ماں جی کی یہ تصویر دیکھ رہی تھی کتنی خوب صورت بنی ہوئی ہے۔ لگتا ہے بابا نے بہت دل سے بنائی ہے۔'' وہ کھوئے، کھوئے سے لہجے میں ماں جی کی دیوار پر لگی تصویر کو دیکھ کر بولی۔

''ہاں، بابا بہت اچھے آرٹسٹ ہیں اور تمہیں پتا تو ہے کہ یہ تصویر بھی انہوں نے اپنی دسویں ویڈنگ اینورسری پر ماں جی کو تحفے میں دی تھی۔'' ارسل کے جواب پر رمنا نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا۔

''ہماری بھی پہلی ویڈنگ اینورسری نزدیک ہے لیکن آپ تو ایسا کوئی تحفہ مجھے نہیں دے سکتے۔'' اس کے لہجے میں نہ جانے کیا تھا کہ ارسل نے بے اختیار چونک کر اسے دیکھا پھر کچھ سوچ کر ہنس دیا۔

''اوہ تو ہماری پیاری بیوی میں حرص کا مادہ بھی ہے، یہ تو مجھے پتا ہی نہیں تھا۔''

''جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے لیکن......'' وہ کچھ کہتے، کہتے رک سی گئی۔

''ہاں، ہاں بولو لیکن کیا......؟'' وہ اس کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ وہ کچھ لمحے خاموش سر جھکائے بیٹھی رہی پھر بہت شکایتی نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

''ارسل کبھی، کبھی دل چاہتا ہے کہ میں بھی کسی لمحے آپ کی توجہ کا مکمل مرکز بن جاؤں، میری اداسی آپ کو پریشان کردے، میں دعوتوں میں، پارٹیز میں کیا پہن رہی ہوں، کیسی لگ رہی ہوں، آپ کو ذرا بھی دلچسپی نہیں ہوتی۔ کھانے کی ٹیبل پر کبھی آپ نے نوٹ نہیں کیا کہ میں ٹھیک سے کھا بھی رہی ہوں یا نہیں...... اس دن مجھے ٹمپریچر تھا لیکن آپ کلب ٹینس کھیلنے چلے گئے۔ میری کوئی خاص پروا ہی نہیں کرتے ہیں آپ۔'' وہ کہنے پر آئی تو کہتی ہی چلی گئی۔ ارسلان ششدر سا بیٹھا اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ رمنا اس کے ساتھ بہت خوش اور مطمئن ہے لیکن شاید رمنا ان عورتوں میں سے تھی جو حسد اور حرص گھونٹ، گھونٹ پی کر اپنی زندگی کی ساری خوشیاں اور لطافتوں کا خود ہی خاتمہ کرلیتی ہیں۔ اس نے ایک طویل سانس لے کر رمنا کی جانب دیکھا جو اپنی آنکھوں میں آئی نمی کو پونچھتے ہوئے بدستور سر جھکائے ہوئے تھی۔ ارسل کو اس کی باتوں نے بہت ہرٹ کیا تھا۔ اس نے بہت شاکی نظروں سے رمنا کو دیکھا۔

''سوری رمنا، مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہارے دل میں میرے لیے اتنی شکایتیں ہیں، میں نے تو تمہیں دل کی تمام تر گہرائیوں سے چاہا ہے، ہر ممکن خوشی دینے کی کوشش کی ہے لیکن شاید تمہاری نظر میں محبت کا معیار کچھ اور ہے، میں ایک سیدھا، سادہ سا پریکٹیکل سا بندہ ہوں...... رمنا میں تمہارے ٹی وی ڈراموں اور افسانوں کا ہیرو نہیں...... پلیز میری محبت کی سچائی کو ان چھوٹی، چھوٹی باتوں کے ساتھ مشروط نہ کرو۔'' ارسل کا لہجہ بہت دل گرفتہ سا تھا۔

''بابا تو کسی افسانے یا ڈرامے کے ہیرو نہیں ہیں لیکن جب وہ ماں جی کی انہی چھوٹی، چھوٹی سی باتوں کی پروا کرتے ہیں تو آپ کو بہت فخر محسوس ہوتا ہے۔'' رمنا تڑخ کر بولی تو ارسل کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

''بابا کی اپنی شخصیت ہے، ہر ایک مختلف طبیعت اور انداز کا مالک ہوتا ہے، مجھے بے حد افسوس ہے رمنا کہ تم ان لوگوں سے حسد کررہی ہو جنہوں نے تمہیں بیٹی کا مان دیا ہے، اُن کی خوشیوں پر کڑھ کر تم اپنی زندگی کو جہنم بنارہی ہو۔'' ارسل کی آواز اونچی ہوگئی تھی۔

''ارسل پلیز میری بات کو غلط رنگ مت دیں۔ میں اُن سے حسد نہیں بلکہ ان پر رشک کرتی ہوں۔ ان کا جو مقام میرے دل میں ہے وہ آپ سمجھ ہی نہیں سکتے۔'' وہ اس کے الزام پر غم و غصے سے بے حال ہوگئی۔

''تمہاری باتوں نے مجھے اچھی طرح سے ان کا مقام سمجھا دیا ہے اور سنو...... آئندہ کبھی ماں جی اور بابا کو درمیان میں مت لانا، میں ہرگز برداشت نہیں کروں گا۔'' وہ تنتناتا ہوا لاؤنج سے نکل گیا۔ رمنا بے اختیار دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔ گھر میں پھیلے سناٹے میں اب اداسی سی گھل گئی تھی۔

☆☆☆

صبح ارسل نے اس کے خفا، خفا سے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔ کتنی اداس اور ٹوٹی ہوئی سی لگ رہی تھی، وہ ارسل کو اپنے رات والے رویّے پر ندامت سی ہونے لگی۔ کچھ زیادہ ہی تلخ ہو گیا تھا وہ اور پھر رات کو اس کے بیڈروم میں آنے سے قبل ہی سو بھی گیا تھا جبکہ وہ جانتا تھا کہ وہ باہر لاؤنج میں رو رہی ہے۔ ارسل نے ٹھنڈے دل سے سوچا کہ اگر رمنا نے کچھ معصوم سی شکایتیں کر بھی دیں تو کون سی قیامت آگئی۔ وہ بھی تو محبت سے اسے سمجھا سکتا تھا۔ ماں جی اور بابا والی بات کو لے کر وہ ناحق اتنا بھڑک اٹھا اگر رمنا نے ان دونوں کے لائف اسٹائل کو آئیڈیالائز کر لیا تھا تو وہ کوئی اس کا اتنا بڑا قصور تو تھا نہیں کہ وہ یوں چلّا اٹھا تھا۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ کتنا ماں جی اور بابا کا خیال رکھتی ہے، ایک بیٹی سے بڑھ کر اُن کو چاہتی ہے، اس نے کتنے دل دکھا دینے والے جملوں کے تیر برسا دیے تھے اس پر۔ ارسل کو شدید تاسف کا احساس بے کل کرنے لگا۔ رمنا پر بے اختیار پیار بھی آنے لگا تھا لیکن روٹھے ہوئے محبوب کو منانا آسان کام نہیں تھا۔ وہ کچھ زیادہ ہی اس سے خفا ہو گئی تھی۔ ارسل نے منانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ موم ہو کر نہیں دی تھی۔ لیکن اب ارسل کے جانے کے بعد جب آنسوؤں نے کافی دل کا غبار دھو ڈالا تو خفگی میں بھی کچھ کمی آگئی اور دل ارسل کے لیے فکر مند ہونے لگا جو اس کی ناراضی پر کتنا دل شکستہ سا آفس گیا تھا اور جاتے ہوئے اس نے کتنے مایوس لہجے میں کہا تھا کہ ''انسان کے اگلے پل کی کوئی خبر نہیں ...... مجھے کم از کم پیار سے خدا حافظ ہی کہہ دو......'' رمنا کے کانوں میں بار، بار یہ جملہ سرگوشی کر کے جیسے ڈرانے لگا اور آج پہلی بار ماں جی سے بھی وہ کتنی تلخ ہو گئی تھی۔ یقیناً ماں جی بھی بہت ہرٹ ہوئی ہوں گی۔ پشیمانی کے ایک اور احساس نے اسے مزید بے کل کر دیا۔ یہ سچ ہے کہ غصہ ہزار بلاؤں کو دعوت دیتا ہے۔ رمنا نے تاسف سے سوچا۔ دل بری طرح سے گھبرانے لگا تو وہ بے اختیار کمرے سے باہر نکل آئی۔ سامنے ہی لاؤنج میں ماں جی کرسی پر بیٹھی نہ جانے کن سوچوں میں گم تھیں۔ رمنا کو اپنے اوپر اختیار نہیں رہا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ماں جی کے زانو پر سر رکھے ہوئے روتے ہوئے بس یہی کہے جا رہی تھی۔

''سوری ماں جی...... آپ مجھے ڈانٹ لیجیے...... لیکن پلیز مجھ سے ناراض نہ ہوں۔'' ماں جی نے پیار سے اس کا جھکا ہوا سر تھپتھپایا۔

''رمنا بیٹا' میں تم سے ناراض نہیں ہوں بلکہ تم دونوں کے لیے فکر مند ہوں۔''

''ماں جی بجائے اس کے کہ میں اپنی الجھن آپ سے شیئر کرتی میں نے......'' اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

''کوئی بات نہیں بیٹا، تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا یہ ہی بہت بڑی بات ہے اور مجھے پتا ہے کہ تم سے یہ غلطی ناراضی میں ہوئی ہے۔ کبھی، کبھی انسان ایسی کیفیت سے گزر رہا ہوتا ہے کہ اسے کسی اور کی مداخلت گراں گزرتی ہے شاید میں ہی بے وقت تمہارے کمرے میں آ گئی تھی۔'' ٹھنڈے میٹھے چشمے جیسا لہجہ رمنا کے تپتے ہوئے دل و دماغ کو ایک عجیب سا سکون بخش گیا۔ اس نے بے اختیار ان کے ہاتھوں کو تھام لیا۔

''نہیں ماں جی، آپ بالکل صحیح وقت پر آئی تھیں لیکن بعض اوقات انسان اللہ کی بخشی ہوئی نعمت کی قدر و قیمت وقت پر سمجھ ہی نہیں پاتا۔ کاش میں، اسی وقت سب باتیں آپ سے ڈسکس کر لیتی تو اتنی اذیت سے نہ گزرتی۔''

''کون سی باتیں رمنا بیٹی؟'' ماں جی نے تشویش سے اسے دیکھا۔

''ماں جی مجھے تھوڑا سا ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں آپ بھی ارسل کی طرح میری باتوں کا غلط مطلب نہ لیں۔'' اس نے بڑی بیچارگی سے اُن کی طرف دیکھا تو وہ اس کے معصوم سے انداز پر ہنس پڑی۔

''رمنا میری بچی، تم میری زندگی کی ایک ایسی

آرزو ہو جس کی تکمیل میں برسوں لگے ہیں۔ تم تو میری بے حد پیاری محبت کرنے والی بیٹی ہو، میں بھلا تمہیں کیسے غلط سمجھ سکتی ہوں۔'' ان کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا۔

''ماں جی۔'' رمنا بے اختیار اُن کے گلے لگ گئی تھی۔

☆☆☆

ماں جی سر جھکائے بہت گہری سوچ میں غلطاں تھی۔ رمنا نے سہمی ہوئی نظروں سے اُن کی جانب دیکھا۔ سب کچھ بتا دینے کے بعد وہ ایک مجرم کی طرح سر جھکائے ان کے سامنے بیٹھی تھی حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی لیکن وہ پھر بھی گلٹی فیل کر رہی تھی۔

''ماں جی یقین کریں، میں نے کبھی آپ سے جیلسی فیل نہیں کی۔ میرا مطلب ارسل کو بابا سے کمپیئر کرنا نہیں تھا بلکہ.....'' وہ گھبراہٹ میں صفائی دینے کی کوشش کرنے لگی تو ماں جی نے رسان سے اسے ٹوک دیا۔

''بیٹا تمہاری باتوں سے میں بالکل ناراض نہیں ہوئی ہوں۔ تم نے جو کچھ سوچا یہ ایک فطری سی بات ہے لیکن رمنا.....'' وہ کچھ کہتے، کہتے رک گئیں تو رمنا نے دھڑکتے دل کے ساتھ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

''بیٹا تم کو یہ جان کر یقیناً حیرانی ہوگی کہ میں اپنے شوہر کی اتنی شدید محبت کے حصار میں رہ کر بھی اپنی کزنز یا دوستوں کی زندگی کو اکثر بہت رشک اور حسرت سے دیکھا کرتی تھی بلکہ آج تم کو دیکھ... کر بھی میں یہ سوچا کرتی ہوں کہ اللہ ایسی کیئر فری اور خوب صورت زندگی سب لڑکیوں کو عطا فرمائے۔'' وہ رمنا کی آنکھوں میں بے پناہ حیرت امنڈتی دیکھ کر ہنس دیں۔

''لیکن ماں جی اتنی مکمل آئیڈیل لائف اور اتنے چاہنے والے شوہر کے ہوتے ہوئے بھلا آپ کیسے کسی اور پر رشک کر سکتی ہیں۔'' رمنا نے یقین نہ آنے والے انداز میں پوچھا۔

''رمنا مجھے سلطان نے بے پناہ چاہا ہے لیکن شاید ان کی محبت کا دائرہ میرے گرد کچھ اتنا زیادہ تنگ ہوگیا ہے کہ کبھی، کبھی مجھے شدید گھٹن کا احساس ہونے لگتا ہے۔'' ان کی آنکھوں میں انجانا سا دکھ ڈولنے لگا۔

''ماں جی پلیز......آپ مجھ سے وہ سب کچھ کہہ ڈالیے جو آپ اپنے دل میں چھپائے بیٹھی ہیں، وہ آنسو جنہیں آپ ہنسی کا روپ دے کر دنیا کے سامنے لاتی ہیں، میں ان کی اصل حقیقت جاننا چاہتی ہوں۔'' اور اک کا ایک ہی لمحہ جیسے آگاہی کے سارے در رمنا پر وا کر گیا تھا۔

''نہیں بیٹا، اب ایسی بھی بات نہیں ہے میں اپنی زندگی سے بہت خوش ہوں۔'' وہ کچھ گڑ بڑا کر بولیں۔

''لیکن ماں جی آپ کی باتیں اور یہ آنکھیں تو کچھ اور کہہ رہی ہیں۔'' رمنا کا لہجہ بے یقین تھا۔ تب انہوں نے ایک طویل سانس لے کر رمنا کی جانب دیکھا۔

''رمنا جانتی ہو سلطان کی محبت میرے لیے ایک ایسے گلاب کے مانند ہے جس کی خوشبو سے جہاں میری روح مہکی رہتی ہے وہیں کبھی، کبھی کانٹوں کی چبھن کا احساس بھی بے کل کرنے لگتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھ سے میرا اصل کھو گیا ہے۔ میں اکثر اپنے آپ کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتی ہوں۔'' وہ کھوئے، کھوئے سے انداز میں بول رہی تھیں اور رمنا خاموش بیٹھی ان کا ہر لفظ اپنے دل میں اترتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

''رمنا تم نہیں جانتیں کہ میری شخصیت کا ہر رنگ صرف اور صرف سلطان کی پسند اور ان کی خواہشات میں ڈھل چکا ہے۔ مجھے کون سا رنگ پسند تھا یہ مجھے یاد نہیں لیکن سلطان کے فیورٹ کلرز مجھے ازبر ہیں۔ کپڑے میں ان کی مرضی کے مطابق پہنتی ہوں، جانتی ہو رمنا، اپنے بیٹے کی شادی میں پہلی بار میں نے اپنی پسند کے کپڑے بنوانے کا سوچا تھا لیکن سلطان اپنی شدید محبت کا ثبوت دیتے ہوئے میرے لیے تین خوب صورت ساڑیاں خرید کر لے آئے اور تم یقین کرو رمنا کہ اس وقت ایک روحانی کرب سے گزرنے کے باوجود میں نے سلطان کے سامنے خوشی کا اظہار بھی کیا بلکہ بڑے شوق سے ان ساڑیوں کو پہنا بھی......کیونکہ ان ساڑیوں کے ہر ستارے میں سلطان کی محبت بھی تو چمک رہی تھی اور میں اس محبت کو

کھونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔" ماں جی کے لہجے میں بابا کے لیے محبت کے ساتھ، ساتھ کچھ بے بسی بھی تھی۔ رمنا کو ان پر ترس آنے لگا۔

"ماں جی، بابا سے محبت بے اندازہ کرتی ہیں لیکن گھٹن کا احساس بھی اس محبت میں گھلا ہوا ہے۔"

اس نے تاسف سے اپنی سوچتی ہوئی نگاہیں ماں جی جانب اٹھاتے ہوئے ان سے پوچھا۔

"ماں جی اگر بابا آپ کو اتنا چاہتے ہیں تو انہیں آپ کے جذبات اور احساسات کا خیال کیوں نہیں آتا؟" اس کے سوال کی چبھن ماں جی نے اپنے دل پر محسوس کی۔

"نہیں رمنا، میرے خیال میں زیادہ قصور میرا ہی ہے۔ میں نے اول دن سے ہی ان کے مزاج سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ میں بہت کم سن تھی، ان کا بے پناہ پیار پا کر میرا بس نہیں چلتا تھا کہ میں زمانے بھر کی خوشیوں سے اُن کا دامن بھر دوں...... ان کی ہر بات ہر خواہش کو پورا کرنا جیسے میرا ایمان بن گیا تھا۔ ان کی ذرا سی خفگی میری برداشت سے باہر ہوتی تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ میرا یہ عشق، میرا یہ جنون آہستہ، آہستہ میری شخصیت کے سارے رنگ چرا رہا ہے۔ میری زندگی کو سلطان نے جینا شروع کر دیا یہاں تک کہ ایک بیٹی کی تمنا کو بھی میں نے اپنے دل میں کہیں دفن کر دیا کیونکہ سلطان کو صرف بیٹوں کی خواہش تھی۔ رمنا شروع، شروع میں یہ سب کچھ بہت اچھا لگتا تھا لیکن اب بھی، کبھی دل چاہتا ہے کہ میں بھی اپنی مرضی سے جیوں...... جہاں دل چاہے آؤں جاؤں، اپنی پسند کے کپڑے پہنوں لیکن اب سلطان یہ سب برداشت نہیں کر سکیں گے اور میں ان کی محبت کی ایسی قیدی ہوں جو خود رہائی نہیں چاہتی......

تھی سر پہ سائباں کی طرح تیز، تیز دھوپ
میں جس کے سائے، سائے رہی آفتاب تھا"

انہوں نے بات کے آخر میں ہنستے ہوئے یہ شعر پڑھا تو رمنا بھی مسکرانے لگی لیکن اُن کی آنکھوں سے چھلکتے کرب کو وہ اچھی طرح سے محسوس کر رہی تھی۔ ماں جی اور بابا کی مثالی زندگی کی جگمگاہٹ میں چھپے کچھ اندھیرے رمنا سے کہہ رہے تھے کہ دوسروں کی زندگیوں کی چکا چوند سے متاثر ہو کر اپنی خوشیوں کو آگ لگانے والے کتنے بدنصیب ہوتے ہیں۔

"کیا سوچ رہی ہو رمنا؟" ماں جی آواز پر وہ بے اختیار چونک گئی۔ پھر پیار سے اُن کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولی۔

"ماں جی کاش آپ جیسی ساس ہر لڑکی کو ملے۔ آپ نے میری باتوں کو غلط رنگ دے کر اسے مزید الجھانے کے بجائے مجھے اتنے خوب صورت طریقے سے زندگی کی حقیقتیں سمجھائی ہیں کہ میری توبہ جو آئندہ بلاوجہ کی سوچوں میں گھر کر اپنی خوشیوں کو برباد کرنے کا سوچوں بھی۔" ماں جی، اس کے انداز پر بے اختیار ہنس دیں۔

"ویسے رمنا ہے نہ مزے کی بات کہ ساس بہو دل ہی دل میں ایک دوسرے پر رشک کرتی رہی ہیں...... لیکن بیٹا میری باتوں سے یہ ہرگز نہ سمجھ لینا کہ میں تمہارے بابا کے ساتھ خوش نہیں ہوں۔ ان کی محبت ہی تو میری زندگی ہے اور اس زندگی میں چھپی یہ گھٹن بھی اب مجھے از حد عزیز ہے۔" ان کے لہجے میں بابا کی محبت بول رہی تھی۔

"میں جانتی ہوں ماں جی...... اور پھر آپ نے اپنے لاڈ پیار میں خود ہی تو بابا کو بگاڑا ہے پھر یہ گھٹن آپ کو کیوں نہ عزیز ہوگی۔" رمنا نے دیکھا کہ اس کی بات پر ماں جی کے چہرے پر بڑے پیارے رنگ بکھر گئے تھے۔ وہ ان کے گال پر پیار کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ماں جی کی زندگی کی کچھ تلخ حقیقتوں نے اسے اپنی خوشیوں کی صحیح معنوں میں قدر کرنا سکھا دیا تھا۔ اب اسے اپنے سیاں جی سے اپنے رویے کی تلافی بھی تو کرنا تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اپنا سیل فون اٹھایا کہ شام تک ارسل کے آنے کا انتظار کرنا اب اس کے بس میں نہیں رہا تھا۔

''ارے میری گڑیا...... میری چندا اٹھ جا......
بہت دیر ہو رہی ہے۔''

''امی بس ابھی، تھوڑی دیر اور پلیز، توبہ ہے آپ تو سونے بھی نہیں دیتیں۔'' میری بیٹی بڑی گہری نیند سے کسمسائی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا...... گیارہ بج رہے ہیں، ابھی تمہارے بابو جی بازار سے آتے ہوں گے اور یہاں بستر تک نہیں سمیٹے...... سارا گھر پھیلا ہوا ہے، نری نحوست...... توبہ ہے۔'' مجھے اپنے میاں کی ممکنہ ناراضی نے بوکھلایا ہوا تھا اور میری بیٹی صاحبہ کو نیند سے بیدار کرنا...... اُف ایک بہت صبر آزما مرحلہ ہے...... اِدھر ان کے ابا جو ذرا سی بے قاعدگی برداشت نہیں کر سکتے پر ان کی اپنی بیٹی کی تو ہر ادا پیاری، ہر عادت اچھی لیکن دوسرے کی بیٹی (یعنی میں) کے ساتھ یہ تفریق کہ اگر برابر والوں کے گھر میں پتا بھی گرے تو میرا قصور... اگر ان کے مزاج کے خلاف ہوا بھی چلے تو میرا اور میرے خاندان کا قصور......

''ارے یہ کیا! ابھی تک منہ کیوں نہیں دھویا صبیحہ...... تمہارے ابا آنے والے ہوں گے۔'' میں نے صبیحہ کو سستی سے صحن میں بچھے تخت پر لیٹے ہوئے دیکھ کر کہا۔

''آپ نے کہا اٹھ جاؤ...... میں اٹھ گئی...... اب یہاں لیٹنے پر بھی پابندی ہے۔ کہیں آپ میری سوتیلی ماں تو نہیں ہیں۔'' وہ شرارت سے مسکرائی۔

لوہے کی روٹی

عقیلہ حق



”ارے میری بچی، کرلو عیش، نہ تمہارا کام میں دل لگے نہ تمہاری نیند خراب ہو، جھولتی رہو باپ کے کندھوں پر لیکن پرائے گھر بھی جانا ہے اور باپ کے گھر تو اناج کی روٹی کھاتی ہو لیکن میاں کے گھر لوہے کی روٹی چبانی پڑتی ہے۔“ بے ساختہ منہ سے نکلے ... اس جملے نے کیا، کیا نہ یاددلادیا۔

☆☆☆

میں ایم ایس سی گولڈ میڈلسٹ اپنے بابو کی چہیتی بیٹی، اپنی ماں کی تابعدار، فرمانبردار اور آنکھ کا تارا۔

جب بیاہ کر جواد احمد کے گھر آئی تو بہت خوش تھی کہ اب جو میرا دل چاہے گا وہی کروں گی، خوب زیور پہنوں گی، خوب اچھے، اچھے کپڑے پہنوں گی اب کوئی روک ٹوک نہ ہوگی کہ اب میں شادی شدہ ہوں کیونکہ بات، بات پر اماں یہی تو کہتی تھیں اپنے گھر جانا تو سب ارمان پورے کرلینا۔

میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ لیکن جواد ایک بھرے پُرے گھر کے سب سے بڑے بیٹے...... ماں، باپ، تین چھوٹی بہنیں اور دو چھوٹے بھائی، بھرا پُرا گھر تھا، نندیں سب جوان اور سسر ریٹائرڈ آدمی تھے۔ جواد کی امی بظاہر اِک نرم خُو اور محبت کرنے والی عورت لیکن اندر سے انتہائی ظالم بلکہ ظلم کی حد تک خود غرض عورت تھیں۔

انہوں نے ویسے سے پہلے ہی بیٹے کو سمجھا دیا تھا کہ ان پر بہت ذمّے داریاں ہیں۔ چونکہ آنے والی بہو اپنے ماں باپ کی لاڈلی بیٹی ہے۔ لہٰذا پہلے دن سے ہی بیوی پر لگام کھینچ کر رکھے۔ بقول ان کے ابھی کم از کم دس سال تک مجھے زیور، کپڑے، جوتے غرضیکہ کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے کہ جہیز اور بری کا بہت سامان میرے پاس ہے۔

پہلے ان کو بہنیں بیاہنی ہیں، بھائیوں کی تعلیم مکمل کروانی ہے، باپ کے بوجھ کو ہلکا کرنا ہے...... کیونکہ وہ گھر کے بڑے بیٹے ہیں۔ اگر وہ یہ سب کریں گے تو کسی پر احسان نہیں کریں گے بلکہ یہ سب ان کی ذمّے داری اور فرائض میں شامل ہے۔

اور انہی ذمّے داریوں میں وہ مجھے، میری خوشیوں اور امیدوں کو کہیں رکھ کر بھول گئے...... اور پھر بعد میں، میں اپنا آپ خود بھول گئی، یاد رہا تو صرف یہ کہ میرے بابو مجھے گوہرِ نایاب کہتے تھے۔ کہیں ان کا مان نہ ٹوٹ جائے...... میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے ماں، باپ کی تربیت پر حرف آئے کہ ان سے محبت تو مجھے شاید ازل سے تھی لیکن شادی شدہ زندگی میں قدم رکھنے کے بعد مجھے اُن سے عشق ہوگیا ہے۔

میں نے جواد کو ہر طرح سے جیتنا چاہا لیکن میری ہر کوشش بیکار رہی کہ اُن کی ماں کی ہدایت تھی کہ تعریف سے میں سر چڑھ جاؤں گی۔

میں بہت محنت سے کھانے پکاتی، گھر کے فرش چمکاتی، ساس کے سر میں تیل کی مالش کرتی، نندوں کے کپڑے استری کرتی، دیوروں کے جوتے پالش کرتی، سسر کے کُرتے سیتی کہ شاید جواد خوش ہوجائیں لیکن بقول جواد یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے یہ سب میرا فرض ہے۔

میں نے ہر ممکن طریقے سے اپنائیت کا اظہار کیا۔ میں بڑے سے بڑا جملہ اور گہرے سے گہرا طنز خوش دلی سے سہہ جاتی۔ نندوں کی شادیوں پر اپنے جہیز کا بیش قیمت زیور اور کپڑے نکال کر دے دیے...... دیوروں کی پڑھائی کے لیے اپنی سیونگ پیش کردی کہ شاید میری سسرال والے خوش ہوجائیں اور جواد کے کان میرے خلاف بھرنے چھوڑ دیں۔ اور جواد کے دل میں میرے لیے محبت پیدا ہوجائے۔ لیکن انہوں نے ہر بات کو اپنا حق سمجھا لیکن اپنا فرض بھول گئے۔

اپنی بیٹی سے بہت محبت کی وہ تو فطری امر ہے۔ وہ بھی سارا بچپن دادی، پھوپی کی گود میں کھیلتی رہی۔ اور بڑی ہوکر باپ کے کندھوں پر جھولتی ہے۔ میری گود تو پہلے بھی خالی رہی اور میرے ہاتھ آج بھی خالی ہیں کیونکہ بقول اُن کے آخر پوتی بھی انہی کی اولاد ہے، ان کا خون ہے۔ آج نندوں کی شادیاں بھی ہوچکی ہیں۔ ساس، سسر بھی جنت کو سدھارے، دونوں دیور الگ، الگ گھروں میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں۔ سب کام ختم ہوگئے، ذمّے داریاں خوش اسلوبی سے نمٹ گئیں۔ اب جواد کا دل نماز، روزے میں بہت لگتا ہے

کیونکہ پُر مشقت زندگی گزارنے کے بعد وہ بہت تھکن محسوس کرتے ہیں...... اور فارغ وقت میں وہ نفلی نمازیں پڑھ کر اپنے ماں باپ کو بخشتے رہتے ہیں۔ ان کے پاس آج بھی میرے لیے وقت نہیں ہے۔ لیکن میری زندگی میرے خواب کہاں گئے...... اس زندگی میں، میں کہاں ہوں؟ میری صبحیں، میری شامیں، کہاں بسر ہوئیں؟ میری زندگی کے ماہ وسال کس نے بسر کیے۔

زندگی میری تھی اور بسر کسی اور نے کی...... تو کیا اس زندگی کا حساب کتاب مجھے دینا ہوگا؟

☆☆☆

''امی میں یونیورسٹی جارہی ہوں، میرے لیے کیلے منگوا لیجیے گا، میں انشاء اللہ دو بجے تک آجاؤں گی، میرے آنے سے پہلے ملک شیک بنوا کر فریزر میں رکھ دیجیے گا، مجھے بہت گرمی لگتی ہے۔'' میں نے فائل میں پیپرز لگائے ہوئے جلدی، جلدی اپنی سیدھی سادی ماں سے کہا۔

اور ماں تو ہوتی ہی ہے محبت سے لبالب... وہ مسکرادیں۔

وقت اور عمر کیا چیز ہوتی ہے، کبھی کچھ احساس ہی نہیں ہوتا کہ ماں، باپ کے کیا حالات ہیں؟ کیا مجبوریاں ہیں؟ ہماری فرمائشیں اور نخرے ان کو روز کتنی آزمائش میں ڈالتے ہیں لیکن ہم اور ہماری نادانیاں کچھ نہیں جانتیں۔

☆☆☆

''بابو وہ میری سمسٹر کی فیس جانی ہے۔'' میں اپنے والد کو پیار سے بابو پکارتی۔

''اچھا بیٹا...... بتاؤ کب تک؟'' بابو نے پوچھا۔

''کل آخری تاریخ ہے۔'' میں نے اپنے سفید پوش باپ کے لیے ایک اور مسئلہ کھڑا کیا۔

''امی میں برتن نہیں دھورہی۔'' میں نے شام کی چائے کی ٹرے سنک پر پٹخی۔

''ارے بیٹا، دو چار کپ ہی تو ہیں۔ اور تو کیا کام کرتی ہے، سوائے کتابوں میں گھسے رہنے کے۔'' امی نے روٹی پکاتے ہوئے بہت سادگی سے کہا۔

میری ماں جو گھر کے ڈھیر سارے کام خوش اسلوبی سے نبھاتیں اور میرے بابو کی خدمت گزاری اور تابعداری پر ہر وقت کمر بستہ ہوتیں جو گھر میں چالیس پچاس آدمیوں کی دعوت ہوتی تو کھانا خود ہی پکاتیں، رشتے داریاں نبھاتیں، میاں کی غم گساری بھی کرتیں، گھر کے ہر فرد کی خدمت اور خوشی کے لیے ہر وقت تیار رہتیں۔

ان کی دی گئی یہ ذمے داری...... شام کے برتن دھو! مجھے وہ بھی بہت ناگوار گزرتی، ہائے وقت۔

''امی میں نہیں کھارہی شلجم کی بھجیا۔'' میں نے غصے سے ڈش پرے کی۔

''کیوں بیٹا...... کیا بھوکی رہوگی؟'' میرے محبت کرنے والے بابو گھبرا گئے۔

''ارے تم سے کہا ہے کہ جو اسے پسند ہو وہ پکایا کرو لیکن یہ عورت زندگی بھر صرف اپنی چلاتی آئی ہے چلو اب اس کے لیے بازار سے کچھ منگوالو......'' میرے محبت کرنے والے بابو ایک سخت گیر شوہر کے روپ میں میری ماں پر برس پڑے۔

''کچھ بازار سے نہیں آئے گا۔ یہ یہی کھائے گی، ارے باپ کے گھر میں اناج کی روٹی کھاتی ہے تو اتنا نخرہ، کل میاں کے گھر میں جو لوہے کے نوالے چبائے گی اور نہ جانے کیا، کیا سہے گی اس وقت سے پہلے اسے ہر چیز کی عادت ہونی چاہیے۔'' اس لمحے میری ماں کی آنکھیں یقیناً پانی سے بھر گئی ہوں گی۔

لیکن اس وقت وہ پانی مجھے نظر آیا اور نہ ہی بابو کو۔

☆☆☆

آج عمر کی اس دہلیز پر کھڑے ہو کر سوچتی ہوں امی صحیح کہتی تھیں، میاں کے گھر کی روٹی لوہے کی روٹی ہی ہوتی ہے اور ان دو نوالوں.... ایک نام اور ایک سائبان کے لیے عورت کیا، کیا سہتی ہے۔ یہ بات وہ باپ کے گھر میں رہ کر کبھی نہیں جان سکتی، ہاں کبھی نہیں۔ دل ہی دل میں کہتے ہوئے میں ایک ٹھنڈی آہ بھر کر باورچی خانے میں بیٹی کا ناشتا اور شوہر صاحب کے لیے کھانا تیار کرنے چل دی۔ اور میری بیٹی میرے جملے ''لوہے کی روٹی'' پر غور کیے جارہی تھی۔



گم شُدہ محبت

انجم انصار

قسط 3

انسان نہ کچھ ہنس کر سیکھتا ہے، نہ رو کر سیکھتا ہے، جب بھی سیکھتا ہے یا کسی کا ہو کر سیکھتا ہے یا پھر کسی کو کھو کر سیکھتا ہے... چونکہ لوگ دل کے امیر کم، کم ہوتے ہیں، اس لیے زندگی کی کتاب میں اتنی غلطیاں نہ کرو کہ پنسل سے پہلے ربڑ ختم ہو جائے اور توبہ سے پہلے زندگی...

جو آنکھوں اوٹ ہے چہرہ اسی کو دیکھ کر جینا
یہ سوچا تھا کہ آساں ہے مگر آساں نہیں ہوتا
نہ بہلاوا نہ سمجھوتا، جدائی سی جدائی ہے
ادا سوچو تو خوشبو کا سفر آساں نہیں ہوتا

محبت کے انوکھے روپ سنوارتی ایک حسین تحریر......



آفس آتے آج مجھے تین دن ہو گئے تھے اور ابھی تک میری ملاقات ندیم خان سے نہیں ہوئی تھی۔'' وہ اصولوں کا پابند شخص ہے...... '' فرزانہ بارہا مجھے بتا چکی تھی مگر مجھے ایسی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ آج بھی مجھے آفس آنے میں دیر ہو گئی تھی مگر مجھ سے کسی نے باز پرس نہیں کی تھی...... حد تو یہ تھی کہ فرید صاحب نے بھی کچھ نہیں کہا تھا۔

'' ظاہر ہے سب جانتے ہیں کہ اتنی قابل ایڈیٹر کہاں مل سکتی ہے۔'' میں نے اپنے آپ پر از خود فخر کرتے ہوئے سوچا۔ '' میں کوئی پیون (چپڑاسی) تھوڑی نہ ہوں...... جو وقت پر آفس پہنچوں......''

اور جب پیون نئے آنے والے میگزین کی کاپی میری ٹیبل پر رکھ کر گیا تو اس کے صفحات کی ورق گردانی کرتے ہوئے میرا خون کھول سا گیا...... میگزین میں کی گئی غلطیوں کو ریڈ قلم سے انڈر لائن کیا گیا تھا...... بلکہ صحیح سطروں کو خواہ مخواہ لہولہان کر دیا گیا تھا۔

'' یہ سب کس نے کیا ہے؟''

میگزین کی ایڈیٹر تو میں ہی تھی...... اور میرے کیے گئے کام میں کس نے یہ خنجر آزمائی کی ہے کہ ریڈ قلم کے کثرت سے استعمال نے میرے میگزین کو لالو لال کر کے رکھ دیا تھا۔

'' یہ سب کس نے کیا ہے؟'' میں غصے میں فرزانہ کے کیبن میں گئی کہ میرا پکا خیال تھا میری غیر موجودگی میں وہی عالمہ بنی ہوگی اور میرے منتخب کیے ہوئے میٹر میں اس نے ہی کیڑے ڈالے ہوں گے۔

'' اب کیا ہو گیا......؟'' فرزانہ نے کی بورڈ پر اپنی انگلیاں روک کر مجھ سے پوچھا...... اس کا مسکراتا چہرہ علیحدہ سوال کر رہا تھا کہ آج کا دن تو شاید مجھ پر ہنسنے کے لیے تھا۔

'' فرزانہ یہ سب کیا ہے؟ کیوں کیا ہے تم نے یہ سب؟''

میں نے ریڈ قلم سے خون آلود میگزین کا ایک صفحہ اس کے سامنے لہرایا۔

'' میں کیوں کروں گی...... ایسا سب کچھ۔'' فرزانہ نے پاس بیٹھی ناعمہ کو دیکھ کر کہا۔

'' ارے مجھے بھی دکھانا ذرا۔'' ناعمہ نے میگزین رغبت سے دیکھا اور پھر مسکرا کر بولی۔ '' اوہ...... تو...... یہ آٹوگراف ندیم خان نے تمہیں دیا ہوگا۔''

'' کیا مطلب......؟'' میں چونکی۔

'' نئے ایڈمن آئے ہیں ناں...... تو انہیں اپنی قابلیت کسی نہ کسی طرح تو دکھانی ہوگی۔'' ناعمہ نے بھی میرے زخموں پر نمک چھڑکتے ہوئے کہا۔

'' کیا مطلب......؟''

'' یہی کہ جو کام تم نہیں جانتی ہو...... وہ سیکھ لینے میں کوئی حرج تو نہیں ناں......'' وہ مجھے تپانے سے باز نہیں آ رہی تھی۔

'' میں صبا رحیم جس نے جرنلزم کی ڈگری لینے میں گولڈ میڈل حاصل کیا تھا اسے لکھنا نہیں آتا۔ میں جو ٹاپ کے اخبارات میں آنریری کام کر کے بہترین رائٹر کے سرٹیفکٹ لے چکی ہوں، مجھے لکھنا نہیں آتا۔ میں جسے ہر دوسرا پروڈکشن ہاؤس جاب دینے میں سوچ بچار نہ کرے...... اسے کام کرنا ہی نہیں آتا؟'' میں آخر برس ہی تو پڑی۔

'' مگر یہ میں نے نہیں کیا...... تو غصہ مجھ پر کیوں اتار رہی ہو...... اگر اتنی ہی ہمت ہے تو سامنے والے کمرے میں چلی جاؤ...... وہاں ندیم خان بیٹھے ہیں۔'' فرزانہ نے مجھے اچھا خاصا اکسایا۔

اور چند ہی لمحوں بعد میں اجازت مانگے بغیر ندیم خان کے کمرے میں موجود تھی...... غصے کے مارے میری بری حالت تھی۔

''جی فرمائیں۔'' ندیم خان کام کرنے کے دوران قدرے رک کر میری طرف دیکھ کر بولے۔اور چشمہ آنکھوں سے اتار لیا۔

''یہ میرے میگزین کو لالو لال کرکے آپ نے رکھا ہے؟'' میرا لہجہ تلخ تھا۔

''جی......'' وہ وثوق بھرے لہجے میں بولے۔

''میں نے جو کہانی اشاعت کے لیے منتخب کی تھی آپ کو اس میں کیا برائی نظر آئی۔'' میں خاصی روہانسی بھی ہو رہی تھی۔

''کہانی کا پیغام منفی نوعیت کا تھا......'' جواب دوٹوک تھا۔

''مگر یہ ایک سوفی صد سچی کہانی تھی...... اس لڑکی کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا...... کیا ہمیں سچی تحریریں نہیں لگانی چاہئیں...... یا صرف جھوٹی خبروں کے ساتھ، ساتھ میگزین کا میٹر بھی جھوٹ پر مبنی ہونا چاہیے؟''

''ہمیں ایسے سچ کو ہرگز نہیں شائع کرنا...... جو دوسروں کو غلط راہ پر لے جائے...... اگر ایک لڑکی کو اس کے محبوب کی بے وفائی کا سامنا کرنا پڑا ہو تو وہ اسے سزا دینے کے لیے گھر چھوڑ دے اور ایسی انجانی منزل پر روانہ ہو جائے جس کا انجام اسے معلوم ہی نہ ہو...... اس سے بڑھ کر بے وقوفی نہیں ہوا کرتی۔''

''میرا مقصد تو یہ بتانا تھا کہ سزا صرف مرد ہی نہیں خواتین بھی دے سکتی ہیں۔''

''مگر یہ تو کوئی طریقہ نہیں ہوا...... اپنے والدین، بہن بھائیوں کو بتائے بغیر ایک جوان لڑکی ٹرین کا ٹکٹ لے کر بیٹھ جائے تاکہ بردہ فروش اسے پکڑ کر لے جائیں...... آپ کیا سکھانا چاہ رہی ہیں؟''

''مگر وہ لڑکی جوڈو کراٹے کی ماہر تھی۔''

''اسلحے کے سامنے کوئی کچھ نہیں کرسکتا...... اور آئندہ آپ کے میگزین کا تمام میٹر پہلے چیک ہوگا۔''

''اوہ تو یہ بات ہے۔'' میں نے ناک سکوڑی۔ ''اور کچھ......''

''یہ کہانی جو آپ نے شائع کی ہے آئندہ شمارے کے لیے اس کہانی کا دوسرا اور اختتامی حصہ آپ خود لکھ کر مجھے دکھایئے گا۔''

''میں سمجھی نہیں آپ کا مطلب......؟''

''تاکہ کہانی کی وجہ سے جو منفی پیغام ہمارے قارئین کو دیا گیا ہے اس کی تلافی ہوسکے...... اور یہ کہانی ایک مثبت سوچ بھی عطا کرے......'' ان کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ کوئی پروفیسر ہوں اور کسی کند ذہن طالبہ سے مخاطب ہوں۔

''پھر یہ اس لڑکی کی کہانی تو نہیں رہے گی۔'' میں نے بھی توقفی سے باور کرایا۔

''مجھے اس سے سروکار نہیں ہے...... کیا آپ کو کہانی لکھنے میں کوئی مشکل ہے تو مجھے بتائیں۔'' لہجہ پُررعب تھا۔

''مجھے کیا مشکل ہوگی۔'' میں کندھے اچکا کر بولی اور واپس اپنے کیبن میں چلی آئی۔

مگر یہی جو بات تھی مجھے ندیم خان بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ بلاشبہ ایک خوب صورت جوان تھا مگر تکبر سے مزین تھا۔ آفس میں آتے ہی اس نے ہر معاملے میں گھسنے کی ٹھان لی تھی۔

اگلے دن جب میں لنچ بریک کے اوقات کے بعد کھانا کھانے باہر نکلی تو وہ سامنے آکر بولا۔

''آپ کا لنچ بریک ختم نہیں ہوا کیا ابھی تک؟''

''وہ اس لیے نہیں ہوا کہ میں ابھی آئی ہوں۔ میں بریک ٹائم میں فرید صاحب کے ساتھ میٹنگ میں موجود تھی۔''

''اوہ سوری...... مگر میں آئندہ فرید کو بھی کہوں گا کہ بریک یا چھٹی کے اوقات میں کسی قسم کی کوئی میٹنگ نہیں

رکھی جائے۔''
''اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں اپنا لنچ مکمل کرلوں؟'' میرا لہجہ تمسخر آمیز سا تھا۔
''وائے ناٹ...... آپ کھائیں ناں۔'' وہ ایک اچٹتی سی نظر میرے لنچ باکس پر ڈالتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔
''ہونہہ یہ اوقات ہوگئی ہے اب میری...... کہ میں اس لمبو سے پوچھ کر لنچ کروں گی......'' اب میں اپنے کیبن میں آکر نہ صرف لنچ کر رہی تھی بلکہ مسلسل بڑبڑا بھی رہی تھی۔
''اس طرح کی شوبازی کی باتیں کرکے پتا نہیں وہ ثابت کیا کرنا چاہتا ہے۔ نیا، نیا آیا ہے ناں...... اس لیے اترائے گا تو سہی...... دیکھ لیا ہوگا...... کہ اس دفتر میں کام کرنے والی لڑکیاں سب ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت ہیں، ان پر اپنا رعب تو ڈالے گا ناں...... ہونہہ باؤلے کو کپڑے پہننے کی تمیز ہے نہیں چیک والی شرٹ پر لائن دار پتلون پہن آیا، اس کو تو جینز پہننی چاہیے۔ ہونہہ مجھے کیا...... وہ بے شک شیروانی کے ساتھ شارٹ پہن آئے...... میں نے کون سا اسے نظر اٹھا کر دیکھنا ہے۔'' میری بڑبڑاہٹ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔
''سارے کھانے کا سواد ہی ختم کر گیا...... منحوس کہیں کا۔''
میں پانی پینے کے لیے مڑی تو ایسا لگا جیسے کوئی سایہ تیزی سے آگے بڑھ گیا ہو۔
''شاید یہ میرا کوئی واہمہ تھا......'' میں نے سوچا...... کہ اکثر ایسے واہمے میرے ساتھ ہوا کرتے تھے کہ اگر میں کسی سوچ میں محو ہوتی اور آنکھیں بند کرکے کھو سی جاتی...... تو آنکھیں کھولنے پر ایسا ہی لگتا جیسے کوئی گزر رہا ہو۔ امی کا کہنا تھا کہ یہ ہمارے خیال ہوتے ہیں جو ایک کے بعد ایک آتے جاتے ہیں۔ فرح خالہ اس کو اثرات کا نام دیا کرتی تھی کہ ہمارے گھر پر کوئی اثر و ثر ہے...... جب ہی تو خالہ کو کوئی سفید چیز یوں تیزی سے جاتی نظر آتی ہے۔
مگر اس وقت میرا یہ پکا خیال تھا کہ یہ میرا کوئی واہمہ نہیں بلکہ وہ فرزانہ تھی...... آج وہ سفید سوٹ میں آئی تھی اور اسے ہی لوگوں کی باتیں چھپ کر سننے کا شوق تھا...... اب وہ میری باتوں کو چار سے ضرب دے کر آگے پہنچائے گی...... میں نے سوچا۔
''کہتی ہے تو کہہ دے، میری بلا سے، میں کون سا کسی سے ڈرتی ہوں۔ ہاں، اب کوئی ایک کہے گا تو میں اسے چار سناؤں گی۔'' میں نے اپنے آپ کو تسلی دی۔
فرزانہ کے کیبن سے ہنسی کی آواز آئی تو مجھے پکا یقین ہوگیا کہ اب وہ میری ہی باتوں کی چاٹ بنا کر مزے لے رہی ہے۔
''اتنی اچھی لڑکی ہو کر کتنی عجیب حرکتیں کرتی ہے یہ بھی......'' میں پھر بڑبڑائی۔
''کبھی یہ فرید صاحب کے روم کے باہر کھڑے ہو کر باتیں سنا کرتی ہے تو کبھی کسی اور کے...... اور پھر اسے کلی سے پھندنا بنانے کا فن بھی آتا ہے...... کہ اپنے فیانسی ساجد کو ہر وقت ہنساتی ہی رہے۔ میری بلا سے تم جو دل چاہے کرو۔'' پانی کا گلاس پی کر میں نے اپنا لنچ بکس بند کر دیا...... وہ بھوک جو چمک کر لگی تھی وہ اچانک ہی ختم ہوگئی تھی۔
اس آفس کے ورکرز کو تو کسی خفیہ ایجنسی میں کام کرنا چاہیے تھا۔ ہر شخص ہر ایک کی ٹوہ میں ہر وقت لگا رہتا تھا۔
''یہ کھالو، تم نے دوپہر کا کھانا بھی پورا نہیں کھایا ہے۔'' شام کی چائے پیتے ہوئے جب فرزانہ نے مجھے برگر دیتے ہوئے کہا۔ تو مجھے پورا یقین ہوگیا کہ اس نے میری بڑبڑاہٹ پوری طرح سن لی تھی۔
''تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں نے کھانا نہیں کھایا۔''
''پیون تمہارے لنچ بکس کو دھونے کے لیے لے کر گیا تھا...... تو وہ چائے کے ساتھ آلو بھرے پراٹھے کھا رہا تھا۔''

''اور تمہیں تو ہر بات پتا ہوتی ہے سب کی۔'' میں نے تمسخرانہ لہجے میں ذو معنی بات کی۔

''ظاہر ہے پتا بھی ہونی چاہیے، اخبار کے دفتر میں کام کرتی ہوں، خبریں خود چل کر میرے پاس آتی ہیں اور......''

''اور جو نہیں آتیں اُن کو پکڑنے تم خود چلی جاتی ہو۔'' میں نے اس کا ادھورا جملہ پورا کیا...... اور ابرو چڑھا کر اسے دیکھا۔

علی اثبات میں سر ہلا کر مسکرانے لگا اور فرزانہ...... مجھ سے بے نیاز ہو کر ساجد علی کو چائے کا دوسرا کپ دینے لگی۔ جیسے کہ اس نے میری بات سنی ہی نہیں ہو یا اگر سن بھی لی ہو تو اس کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا ہو۔

ناعمہ کا بھی یہ خیال تھا کہ ندیم خان ایک تکبر بھرا انسان ہے اور خواہ مخواہ رعب دکھانے کے لیے آیا ہے۔

''یہ تمہیں کیسے پتا چلا......؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''میں نے کئی بار اسے موبائل پر چیختے چلاتے ہوئے دیکھا ہے...... کل بھی اور پرسوں بھی ایسا لگ رہا تھا کہ جس کو وہ ڈانٹ رہا ہے اگر وہ اس کے سامنے ہوتا تو اسے کچا ہی چبا جاتا۔''

''ارے ایسے ہی شو آف کر رہا ہوگا...... کہ دیکھو میں ایسا بھی ہوں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''نہیں، اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ میں اسے دیکھ رہی ہوں اور اس کی باتوں کو سن بھی رہی ہوں۔ حالانکہ میں اس کے قریب ہی فوٹو شوٹ کر رہی تھی۔''

''جیسے تم اسے دیکھ رہی تھیں اور پوز یہ کر رہی تھیں کہ تمہاری توجہ اس کی جانب بالکل نہیں ہے، بالکل ایسے ہی وہ بھی کر رہا ہوگا۔''

''اب یہ سب تو مجھے نہیں معلوم۔''

''فرید صاحب کا دوست ہے ناں۔'' میں نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

''ہاں، یہی سنا ہے اسکول سے کالج بلکہ یونیورسٹی تک کی دوستی رہی ہے۔''

''تو وہ بھی ویسا ہی ہوگا...... جیسے ہمارے بگ باس ہیں۔''

''ہم چاہتے ہیں کہ سب لوگ ایکٹو ہو جائیں...... ہم چاہتے ہیں سب لوگ رات کو بھی دن سمجھیں۔'' میں نے فرید صاحب کی نقل اتاری۔

''ہاں یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' ناعمہ نے قہقہہ لگایا۔

''کسی کو پہچاننا ہو تو اس کے دوستوں کو دیکھ لو...... وہ بھی ویسا ہی ہوگا...... اور تو مجھے پتا نہیں بس وہ زہر لگتا ہے۔'' میں نے بے دھڑک کہا۔

''رائٹ۔'' ناعمہ نے ہنس کر کہا۔ اور اس وقت مجھے یہ قطعی نہیں معلوم تھا کہ یہ جملہ میرے سامنے لوٹ کر بھی آ سکتا ہے۔

''ناعمہ باجی آپ اپنے کیبن میں چلی جائیں...... ندیم سر ناراض ہو رہے ہیں۔'' پیون کسی کام سے گزرا اور کیبن میں جھانک کر بولا

''ارے میں تو ابھی آئی ہوں، اُن سے جا کر کس نے کہہ دیا کہ میں صبا کے پاس ہوں۔'' ناعمہ نے حیرت سے کہا۔

''انہیں سب پتا چل جاتا ہے اگر میں اپنی سیٹ پر بیٹھا سو جاؤں تو وہ اپنے کمرے میں بیٹھے، بیٹھے بتا دیتے ہیں۔''

''ارے شاکر بھائی کیا بات کر رہے ہو...... تمہارے خراٹے سن کر تو اوپر کے فلور والوں تک کو پتا چل جاتا ہے کہ تم سو رہے ہو......'' ناعمہ نے ہنس کر کہا اور چائے پیے بغیر چل دی...... کہ ندیم خان کا یہ رعب تو سب پر پڑ گیا تھا کہ اب اپنی سیٹ چھوڑ کر گھومنے کا دورانیہ کم سے کم ہو رہا تھا۔

☆☆☆

فرح خالہ کی برتھ ڈے تھی...... ان کا گفٹ خریدتے ہوئے میں قدرے دیر سے آفس پہنچی تھی اور سوچ رہی تھی آج میں فرید سر سے کہہ کر شام کو جلدی گھر چلی جاؤں گی۔ اب خالہ کی برتھ ڈے میں ارینج نہیں کروں گی تو کون کرے گا...... وہ ہمہ وقت میرا اور امی کا اتنا خیال رکھا کرتی تھیں اور اب ان کی سالگرہ ایک چھوٹی سی خوشی تھی ہم سب کے لیے...... اور میں اسے بھرپور انداز میں منانا چاہتی تھی۔ میں نے ان کی یونیورسٹی کی دو پرانی سہیلیوں کو انہیں بتائے بغیر مدعو بھی کر لیا تھا...... مجھے معلوم تھا کہ وہ ان کو دیکھ کر از حد خوش ہوں گی۔

فرح خالہ کو پہلے سے کچھ نہ پتا چلے...... یہ سوچ کر میں آج آفس سے واپسی پر کھانے پینے کا سامان باہر سے خرید کر لے جانے کا پلان بنا چکی تھی۔

''جاؤ اسے فرید سر کو دے آؤ......'' پیون آیا تو...... تو میں نے ہاف ڈے کی ایپلی کیشن لکھ کر دیتے ہوئے کہا۔ میں نے فرید سر سے بات کرنے کے بجائے ایپلی کیشن دینی زیادہ بہتر سمجھی۔

''باجی سر بہت ناراض ہیں...... اور آپ کو اپنے آفس میں بلا رہے ہیں...... اور کہہ رہے ہیں کہ فوراً آئیں آپ......'' پیون دو منٹ میں ہی کسی بوتل کے جن کی طرح حاضر تھا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''تم سر سے کہہ دو، میں کام کر رہی ہوں، فارغ ہو کر آتی ہوں۔'' میں نے رسان سے کہا...... ان کے بلاوے کو میں نے کبھی سنجیدگی سے لیا ہی نہیں تھا۔

اور اب میں دھیمے لہجے میں گنگناتے ہوئے آج کا آیا ہوا میٹر پڑھنے میں محو تھی۔

پیون پھر آیا اور اس نے کچھ کہنے کے بجائے دروازے کو ناک کر کے مجھے متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

''کہہ دیا ناں...... میں مصروف ہوں، اس لیے نہیں آسکتی، یہ کام کا ٹائم ہے میرا...... تم بگ باس سے پھر کہہ دو...... ویسے بھی انہیں ایک دفعہ کی بات سمجھ میں نہیں آیا کرتی۔'' میں نے سر جھکائے جھکائے کہا۔

''آپ بہت مصروف ہیں اس لیے میں خود حاضر ہو گیا ہوں۔'' طنزیہ لہجے میں کہا گیا۔

میں نے گھبرا کر دیکھا تو ندیم خان میرے کیبن کے دروازے پر ایستادہ تھے۔

''سر آپ؟'' میرا لہجہ حیرت زدہ تھا۔

''اگر کوئی آپ کو بلائے تو آپ کو آنا بھی گوارا نہیں ہوتا......'' وہ غصہ ضبط کر کے پوچھ رہے تھے۔

''سر، میں نے کہا تھا پیون سے وہ......'' میں ہکلائی۔

''ہاں یہی کہ ایک دفعہ کی بات میری سمجھ میں نہیں آیا کرتی۔'' انہوں نے جملہ مکمل کیا۔

''مس صبا...... کوئی تمیز تہذیب بھی ہوتی ہے۔'' وہ جملہ کہہ کر کے مگر میرا تو دماغ ہی کھول کر رہ گیا تھا...... ندیم خان مجھ سے اس طرح گفتگو کریں گے یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔

اب جمعہ، جمعہ چار دن سے آفس آنے والے یہ حضرت مجھے تمیز و تہذیب سکھانا چاہتے ہیں...... میں اب سیٹ سے اٹھ کر عین ان کے سامنے کھڑی تھی۔ اور مارے غصے کے میرا پورا وجود کانپ رہا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کچھ کر ڈالوں......

''مس صبا رحیم......!'' انہوں نے رسان سے پکارا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس وقت مجھے ان کی شکل دیکھنے تک کا دل نہیں کر رہا تھا۔
''آپ نے یہ اپیلی کیشن بھیجی تھی۔''
میں نے اس کا بھی کوئی جواب نہیں دیا کہ میں جو دل چاہے کروں، تم ہوتے کون ہو......؟ یہ سب میں اپنے دل میں سوچ رہی تھی۔
''اس اپیلی کیشن کو اپنے پاس رکھیے۔'' مزید کچھ کہنے سے قبل انہوں نے مجھے دیکھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں یہ آفس کے لوگوں پر اپنی دھاک بٹھانے کے لیے آج اترانے کی غرض سے مجھے باتیں سنانے آئے ہیں۔ میں نے کھولتی ہوئی نفرت بھری آنکھوں سے انہیں ایک بار پھر دیکھا۔ اس لمحے شاید وہ زبردستی کی مسکراہٹ اپنے لبوں پر سجائے کھڑے تھے۔
میرا دل چاہ رہا تھا...... اپنے سامنے کھڑے ہوئے اس شخص کی ایسی طبیعت صاف کروں کہ آئندہ اسے لڑکیوں سے بات چیت کا قرینہ تو آسکے مگر اسے اپنے سامنے چپ چاپ کھڑے دیکھ کر اپنے غصے پر قابو پا کر کہا۔
''میں نے اپنا میسج آپ کو نہیں' سر فرید کو بھیجا تھا تو آپ کیوں میری جواب طلبی کے لیے چلے آئے؟''
''فرید آج آفس نہیں آئیں گے...... اور یوں بھی اب اس اخبار کا ایڈمن میں ہوں تو جواب طلبی کرنے کا حق بھی میرا ہے۔'' وہ جلدی ہی اپنی اوقات پر آ گیا۔
''تو کیا اب اپیلی کیشن دینے کے بجائے مناظرہ ہوا کرے گا۔'' میرا لہجہ تمسخرانہ تھا۔
''مگر یہ تو کوئی اصول نہیں ہے کہ آپ روز دیر سے آئیں اور اسے اپنی عادت بنالیں...... تو وقت پر آنے والے ورکرز کا کیا قصور ہے...... انہیں بھی جلدی آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ تمام لوگوں کو ہی لیٹ آنا چاہیے۔''
''میں اگر دیر سے آؤں بھی مگر کام تو اپنا پورا کرتی ہوں ناں......'' میرے لہجے میں تناؤ تھا۔
''یہ تو آپ کا خیال ہے ناں......'' ان کا لہجہ ہنوز طنزیہ تھا۔
''مگر آج تو مجھے ہر حال میں جلدی جانا ہے اور اس کی اہم وجہ بھی ہے۔''
''ہر شخص کو ہمیشہ گھر جانے کی جلدی ہوتی ہے اور ان کے پاس بھی ہمیشہ معقول وجوہات ہوتی ہیں۔'' ان کے لہجے میں برہمی تھی۔
''تو آپ چاہتے ہیں آج میں گھر نہ جاؤں......'' میں اُن کے رعب میں کیوں آتی۔
''یہ میں نے کب کہا ہے۔ آپ ضرور جائیں مگر روزانہ نہیں......'' لہجہ دوٹوک تھا۔
پھر وہ رکے نہیں مجھے تمسخرانہ انداز میں دیکھتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں چلے گئے...... جیسے وہ میرا مذاق اڑا رہے ہوں...... یا جتلا رہے ہوں کہ تمہاری اوقات ہے کیا؟
''اُف خدایا، اتنی بے عزتی!'' میں گرنے کے انداز میں اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔
میں تو سر فرید کی باتوں سے ہی خائف تھی اور یہ سوچتی تھی کہ انہیں اپنے ورکرز سے بات کرنے کی کوئی تمیز نہیں ہے مگر یہ ندیم خان تو ان سے بھی کہیں دس ہاتھ آگے تھے۔
وہ میرے کیبن میں آ کر اتنی زور سے بول رہے تھے ساتھ جڑے تمام کیبنز میں پتا چلا گیا تھا کہ وہ میری کلاس لینے آئے ہیں۔
اور پیون شاکر نے تو میرے متعلق کیا، کیا خبریں پورے فلور پر پھیلا دی تھیں۔ یوں بھی افواہ کی رفتار آواز سے زیادہ تیز ہوا کرتی ہے۔
''صبا تم نے ایسی بات ہی کیوں کی...... جس کی وجہ سے تمہیں ندیم خان سے معافی مانگنی پڑی......'' لنچ ٹائم میں

جب فرزانہ نے مجھ سے پوچھا۔ تو میں حیرت سے پھٹ پڑی۔
''کس نے معافی مانگی ہے ندیم خان سے...... اور میں کیوں مانگنے لگی؟''
''بھئی ہمیں تو پتا نہیں' سنا ہے تم نے دیر سے آنے کی معافی طلب کی ہے......'' وہ بے پروائی سے بولی۔
''جی نہیں، ایسی کوئی بات ہوئی ہی نہیں۔''
''اچھا تو پھر تم کل بھی دیر سے آنا......'' یہ ساجد تھا جو فرزانہ کی کہنی کھا کر اپنا منہ کھول رہا تھا۔
''یہ آپ لوگوں کو میرے معمولات میں یک دم اتنی دلچسپی کیوں ہوگئی ہے......؟'' میرا لہجہ خاصا طنزیہ سا تھا۔
''ارے یار تم تو برا مان گئیں۔ ہمیں تو بھئی خود اچھا نہیں لگا تھا کہ ندیم خان...... تمہارے کیبن میں آ کر تمہیں اس طرح ڈانٹیں...... اُف کس قدر تیز آواز تھی ان کی جیسے زلزلہ آگیا ہو سچی میں آرزدہ سی ہوگئی تھی'' ناعمہ تاسف سے کہہ رہی تھی۔
''ہاں اور کیا...... بیچاری صبا کی آج بہت بے عزتی ہوئی ہے...... چچ چچ......'' فرزانہ کا لہجہ بھی رنجیدہ سا تھا۔
تب میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ اور شاید میرے سب کولیگز بھی یہی چاہتے تھے۔ تب میں نے ان آنکھوں میں جو طمانیت دیکھی۔ وہ صرف میں ہی محسوس کرسکتی تھی۔
''پلیز صبا...... مت روؤ...... ورنہ میں بھی رو دوں گی۔'' یہ فرزانہ مجھ سے کہہ رہی تھی۔
''ارے صبو...... تم تو لوگوں کو حوصلہ دیا کرتی ہو۔ اور آج تم نے خود ہی حوصلہ ہار دیا۔'' ناعمہ مجھے پچکار رہی تھی۔
''باجی، کیا میں چائے زیادہ لے آؤں...... ابھی اوپر کے فلور سے لوگ آپ کے پاس آنے والے ہیں بریک میں۔'' پیون مجھے اطلاع دے رہا تھا یا اس کے تسلی آمیز کلمات اسی کے حساب سے تھے۔
تب میں نے دونوں ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں پونچھیں۔ اور بیگ اٹھایا اور کسی سے کچھ کہے بغیر آفس سے باہر آگئی۔ اس وقت...... میں تیز ترین انداز میں اپنی گاڑی ڈرائیو کررہی تھی۔ سگنل زندگی میں کبھی نہیں توڑا تھا...... مگر آج راستے میں آنے والے تینوں سگنلز کو توڑتی ہوئی میں اس طرح جارہی تھی۔ جیسے کوئی غیظ و غضب بھری لاری بھاگتی ہوئی جارہی ہو۔
''یہ صبا بتائے بغیر چلی کیوں گئی ہے......'' اُدھر ساجد حیرت سے پوچھ رہا تھا۔
''شاید...... اب یہ آفس نہیں آئے گی...... آفس چھوڑنا تو ویسے بھی اس کی ہابی ہے......'' فرزانہ ہنس رہی تھی۔
''مگر یہ سب اچھا تو نہیں ہوا...... اپنی اتنی اچھی کولیگ یوں اتنی سی بات پر چلی جائے......'' ساجد کو تاسف ہو رہا تھا۔
''آجائے گی وہ...... ابھی غصہ چڑھا ہوا ہے ناں اس کو اتر جانے دو......'' ناعمہ کا تجزیہ خاصا گہرا تھا۔
''فرید سر کہتے تھے ناں کہ ندیم خان کے آنے سے اس اخبار کے دفتر میں تبدیلی آجائے گی تو آج بہت بڑی تبدیلی تو آہی گئی۔'' جاوید کو یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا۔
''ہاں، صبا کو کبھی اتنے غصے میں نہیں دیکھا......'' فرزانہ کو حیرت تھی۔
''غصہ تو اسے کبھی کبھار آہی جاتا تھا۔ مگر میں نے اسے کبھی یوں روتے ہوئے نہیں دیکھا......'' یہ ناعمہ تھی۔
''ہاں ندیم خان نے صبا کو رُلا دیا۔ ندیم خان تو بہت خوش ہوں گے۔ انہوں نے صبا جیسی لڑکی کو رُلا دیا......'' ساجد پھر تاسف سے کہہ رہا تھا۔
اور ندیم خان اپنے روم کے مانیٹرنگ کیمرے سے ان سب کو دیکھ بھی رہے تھے اور ان سب کی باتیں سن بھی رہے تھے۔ انہوں نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ صبا ان کی وجہ سے روئے گی یا کوئی بھی ان کی وجہ سے اپنی آنکھوں

میں آنسو لائے۔
"یہ لڑکیاں...... کیا اتنی کمزور سی ہوتی ہیں، اتنی چھوٹی سی بات پر اُن کے آنسو یوں بھل بھل بہنے لگتے ہیں۔"
انہوں نے اپنے آپ سے کہا اور بے اختیاری میں اپنے ہاتھ سے دوسرے ہاتھ پر مکا مارتے ہوئے بولے۔
"ہونہہ...... پاگل نہیں کی...... یا شاید اپنی ان حرکتوں سے دوسروں کو ڈرانا چاہتی ہیں۔ مگر میں ڈر کر نہ کبھی رہا ہوں اور نہ رہ سکتا ہوں۔" اب وہ خود بڑبڑا رہے تھے۔

☆☆☆

"کیا بات ہے......؟ تم دو دن سے اپنے آفس کیوں نہیں جا رہی ہو؟" امی نے پوچھا۔
"بس ایسے ہی...... چھٹیاں کرنے کو دل چاہ رہا تھا اور بس......" میں کھسیا کر ہنسی۔
"کسی سے کوئی بد مزگی ہوگئی ہے ناں......" انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر میری آنکھوں میں دیکھا۔
"ہاں......" میں نے سر جھکا لیا۔
"کس بات پر......؟" انہوں نے اپنی انگلیوں سے میرا چہرہ اوپر کیا۔
"آفس دیر سے آنے کی وجہ سے......" میں نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔
"افوہ...... تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا...... میں سمجھی پتا نہیں کیا بات ہوگئی ہے۔" وہ ہنس دیں۔
"تو کیا یہ بڑی بات نہیں ہے...... کوئی مجھ سے سب کے سامنے باز پرس کرے۔"
"بیٹا...... اگر تم کوئی اپنا آفس کھولو تو کیا چاہو گی؟"
"یہی کہ سب ورکرز باقاعدگی سے کام کریں......" میں نے کہا۔
"اور یہ بھی چاہو گی کہ آفس کے ماحول میں کسی قسم کی کوئی ڈسٹربنس نہ ہو...... اگر کوئی ایک ورکر دیر سے آتا ہے تو دیگر لوگ اگر کچھ کہتے نہیں ہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ اس بات کو اگنور کر دیتے ہیں۔"
"اب میرا آفس، گھر سے کتنی دور ہے...... صبح کے وقت کس قدر رش ہوتا ہے تو اس لیے اکثر دیر ہو جاتی ہے۔"
"بیٹا اب کسی کا بھی آفس اس کے پڑوس میں تو نہیں ہو سکتا ناں...... پہلے جہاں تم جاب کرتی تھیں، وہ واکنگ ڈسٹینس پر تھا اس لیے تمہیں وہاں آنے جانے کے مسائل ہوئے ہی نہیں۔"
"مگر میں کسی کی ڈانٹ نہیں سن سکتی......"
"تو تم کہہ دینا کہ آئندہ مجھ سے لکھ کر باز پرس کی جائے......" امی کو شرارت سے مسکراتا دیکھ کر میری جھنجلاہٹ مزید بڑھ گئی۔
"دیکھ لیجیے گا...... یہ آفس بھی میں چھوڑ دوں گی۔"
"بیٹا تم جہاں بھی جاب کرو گی...... اپنے گھر جیسا ماحول کہیں نہیں ملے گا۔ سیاست تو اب ہر جگہ ہے۔"
"مگر میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ فرزانہ، ناعمہ سب ایسی ہوں گی کہ مجھے رُلا کر ہی دم لیا ان لوگوں نے۔"
"بیٹا ہر جگہ ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں، بس ان کے نام تبدیل ہو جاتے ہیں۔" خالہ نے پاس آ کر سمجھاتے ہوئے کہا۔
"مگر میرا آفس جانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا۔"
"تو مت جاؤ...... اللہ کا شکر ہے، ہمارا گھر کوئی تمہاری جاب کی وجہ سے تھوڑی چل رہا ہے۔ میں تو پہلے بھی تم سے کئی بار کہہ چکی ہوں کہ نوکری کرنا تمہارے بس کا کام نہیں ہے......" اور فرح خالہ کی اس بات پر میں صرف جھنجلا

ہی سکتی تھی۔
آج تیسرا دن تھا...... میں آفس سے چھٹی پر تھی...... فرزانہ اور دیگر لوگوں کے فون آئے تھے اور میں نے ان سب سے یہی کہہ دیا تھا کہ میری طبیعت خراب ہے...... اسی لیے میں آفس نہیں آسکتی۔
گلے کی خرابی کی وجہ سے آواز بھی بیماروں جیسی ہوگئی تھی۔
''ارے یار مجھے تو تم بہت بیمار لگ رہی ہو......'' ناعمہ نے خاصی تشویش بھرے لہجے میں کہا۔
''ہاں بخار کی وجہ سے نہیں آسکتی......'' میں نے قصداً نحیف سے لہجے میں کہا۔
''اچھا کل تو آؤ گی ناں......'' فرزانہ کو خاصی کرید تھی کہ کہیں میں کوئی بہانہ تو نہیں بنا رہی۔
''اگر بخار اترا تو......'' میرا جواب بھی مبہم تھا۔
''بھئی ہم سب تو یہ سمجھے کہ اس دن ندیم سر کی ڈانٹ کھا کر تم گھر میں بیٹھ گئی ہو...... ورنہ تم کہاں چھٹی کیا کرتی ہو...... لگتا ہے ڈر گئی ہو...... ہے ناں......'' فرزانہ اپنے دل کی بات پوچھنے سے بالآخر باز نہ آئی۔
''میں نے کبھی کسی سے ڈر کر جاب نہیں کی اور میں کیوں ڈروں گی اُن سے...... یہ تم نے سوچا بھی کیسے......''
میرا اجلال پھر لوٹ آیا تھا۔
''تو کیا کل بھی تم آفس نہیں آؤ گی؟''
''سنو اگر میرا دل چاہا تو آفس آؤں گی اور اگر دل نہیں چاہا تو آفس نہیں آؤں گی...... چاہے وہ کل ہو یا پرسوں یا ترسوں اور میری امی نے تو مجھے خاصی سختی سے منع کر دیا ہے کہ ایسی جگہ جاب کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، جہاں تمہارا دل نہیں لگے۔'' یہ کہہ کر میں رکی نہیں بلکہ فون ہی منقطع کر دیا۔
میں جو تیسرے دن اپنے آپ کو قدرے بحال محسوس کر رہی تھی اور غصے میں کمی بھی آئی تھی تو آفس فیلو کی باتیں سن کر پھر ذہنی طور پر اپ سیٹ سی ہوگئی۔
ندیم خان کے جملے میرے سر پر علیحدہ سنگ باری کر رہے تھے۔
کتنے طنزیہ لہجے میں انہوں نے مجھ سے بات کی تھی...... یہ شاید حقیقی اور پہلا تعارف تھا ان کا میرے ساتھ جو وہ اس طرح کھل کر میرے سامنے آئے تھے۔ ایسے روڈ لہجے میں تو میرے ساتھ کسی نے بات نہیں کی تھی آج تک۔
اور وہ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ کوئی تمیز، تہذیب بھی ہوتی ہے۔ جیسے کہ میں تمیز، تہذیب سے عاری تھی اور مجھ میں گفتگو کرنے تک کا سلیقہ نہیں تھا۔ ندیم خان نے مجھے سمجھا کیا تھا؟ میرا دماغ میرے غصے کو مزید اکسا رہا تھا۔ ایک ایسی آفس ورکر جو شاید اُن کے رحم و کرم پر تھی۔ اور ان کا جو دل چاہے وہ کہہ سکتے تھے...... چاہے اس سے دوسرا...... کتنا ذلیل ہو جائے...... اور واقعی آفس میں میری ہتک کرنے میں وہ کامیاب ہو چکے تھے۔ میں سوچے چلی جا رہی تھی۔
کامیاب تو شاید وہ ہو چکی تھی...... اس لمحے کہ جب کتابوں کی نمائش میں اندھا دھند بھاگتے ہوئے وہ ندیم خان سے ٹکرائی تھی اور اکھڑ لہجے میں بولی تھی۔
''نظر نہیں آتا کیا......؟''
''کیا میں آپ سے ٹکرایا ہوں......'' ندیم خان نے اس لاابالی سی لڑکی کو خود پر اس طرح الزام دھرتے دیکھ کر کہا تھا۔ وہ واقعی حیرت زدہ تھا۔
''کوئی بھی ٹکرایا، نقصان تو میرا ہوا ناں...... ابھی وہ ادھر ہی تھیں...... آپ کی وجہ سے پتا نہیں وہ کہاں نکل گئیں۔''

''کون تھیں اور کہاں نکل گئیں......؟'' ندیم نے پھر حیرت سے پوچھا تھا۔
''پتا نہیں......'' وہ پھر بھاگتی ہوئی آگے نکل گئی تھی مگر وہ وہیں رک گئے تھے اور آفس میں آکر خود اپنے ہی بارے میں اس کے جلے دل کے ریمارکس سن کر ان کو ہنسی آگئی تھی۔
''ہونہہ کپڑے پہننے تک کی تمیز نہیں ہے...... چیک شرٹ کے ساتھ پلین پینٹ پہننی چاہیے...... پتا نہیں یہ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں......'' ندیم خان اپنے کمرے میں مسلسل سوچے چلے جارہے تھے۔
اس کا رونا......اور بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ گھر جانا، ان کے دل کے دروازے پر بار، بار دستک دے رہا تھا۔
ایک ایسا شخص جو اپنے اصولوں کے ساتھ رہنے کا عادی ہو اور جو لڑکیوں سے قدرے فاصلے سے گفتگو کرنے کا عادی ہو......اسے صبا رحیم کی آنسو بھری آنکھیں بے چین کیے دے رہی تھیں۔
اور آفس ورکرز نے جب اس کی بیماری کی اطلاع دی تھی تو وہ اس ضمن میں اپنے آپ کو پورا قصوروار سمجھنے لگے۔
''اگر صبا رحیم اکھڑ اور منہ پھٹ سی لڑکی ہے تو مجھے اتنا سنجیدہ اور پھر اتنا رنجیدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔'' وہ اپنے آپ کو بار، بار سمجھا رہے تھے۔
''آفس میں ہر روز ہر طرح کے مسائل سر اٹھا کر آیا کریں گے، تو تم کس، کس سے نمٹو گے......'' اس کا دماغ اسے خود سمجھانے کی سعی بھی کر رہا تھا۔

☆☆☆

میری اپنی ہی سوچوں نے میری ذہنی حالت اتنی ناگفتہ کردی کہ شام تک مجھے بخار ہوگیا اور پھر اتنا تیز کہ امی کو ٹھنڈے پانی کی پٹیاں تک رکھنی پڑ گئیں۔
''لو بے وجہ بیمار بن رہی تھیں ناں...... دیکھو کیسا بخار چڑھ کر آگیا...... ارے مقابلہ کیا کرتے ہیں......نوکری کرتے ہیں......تو منہ چھپا کر گھر میں نہیں بیٹھا کرتے......'' فرح خالہ مجھے علیحدہ تاؤ دلا رہی تھیں کہ مجھ جیسی بزدل لڑکی جاب کرنے کی اہل ہی نہیں ہے۔
رات گیارہ بجے میں دوا کھا کر اپنے کمرے میں لیٹی تھی......کہ میرے موبائل پر بیپ ہوئی۔ انجان نمبر دیکھ کر میں نے کال ریسیو نہیں کی...... جب دوسری اور تیسری بار کال آئی تو میں نے فون اٹھایا اور نہ چاہتے ہوئے سلام کر کے پوچھا۔ ''آپ کون......؟''
''ندیم خان......'' پُرسکون لہجے میں کہا گیا۔
''جی فرمائیں......؟'' میرے لہجے میں از خود تناؤ آگیا۔
''کیسی طبیعت ہے آپ کی......؟'' رسان سے پوچھا گیا۔ ''سنا ہے آپ بیمار ہیں......''
''آپ سے مطلب......کیسی بھی ہوں......ویسے بھی غیر مہذب اور بدتمیز لوگوں کو اپنی بیماری کی بھی کوئی پروا نہیں ہوا کرتی......اس لیے میں بھی ٹھیک ہوں۔''
''آئی ایم سوری مس صبا رحیم......'' اُن کے لہجے میں نرمی تھی۔
''کس بات کی سوری......آپ نے بھرے آفس میں مجھے ذلیل کرنا تھا سو کردیا۔'' میرا غصہ اور دکھ پھر پلٹ آیا تھا آواز علیحدہ رندھ گئی تھی۔
''مجھے واقعی آپ سے اس لہجے میں بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ آئی ایم رئیلی سوری......''
''بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ...... کیونکہ لڑکیوں سے بات کرتے ہوئے تمیز اور تہذیب کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے......'' ان کے کہے ہوئے جملے میں نے ان کے ہی منہ پر دے مارے تھے۔

”رائٹ...... اب تو بدلہ بھی لے لیا۔ تو غصہ تو اتر جانا چاہیے......“ دھیمے مگر سنجیدہ لہجے میں کہا گیا۔
”میں نے آپ کو کچھ نہیں کہا...... صرف ایک مثال دی ہے......“ میرا غصہ بھی اب سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ اس لیے لہجے کے تناؤ میں کمی آگئی تھی۔
”تو کل آپ آرہی ہیں ناں......؟“ وثوق بھرے لہجے میں پوچھا گیا۔
”مجھے اس وقت بھی 103 بخار ہے“ میں نے انہیں بتایا ”مگر میں کوشش کروں گی کہ آفس آجاؤں...... بستر پر لیٹے لیٹے میں خود بھی بور ہو چکی ہوں......“ پتا نہیں غصہ کہاں چلا گیا تھا۔
”اوہ...... تو...... اگر بخار ہے تو آپ کل بخار کی حالت میں ہرگز نہیں آئیں گی۔“
”مگر مجھے اپنے میگزین کا میٹر سلیکٹ کرنا ہے......“ اب آفس کی پریشانیاں میرے لہجے پر بھی حاوی ہوگئی تھیں۔
”میں دیکھ لوں گا مگر آپ ریسٹ کیجیے اور جب طبیعت ٹھیک ہو جائے تب آفس آیئے گا۔“
”اوکے......“ میں نے مطمئن ہو کر اُن کی بات سے اتفاق کر لیا۔

☆☆☆

شہلا اپنے کمرے میں چپ چاپ بیٹھی تھی اور اپنا موبائل بار، بار ایسے چیک کر رہی تھی...... جیسے اسے کسی خاص میسج کا انتظار ہو۔
”آپا...... آپ کی حارث سے فون پر تو بات چیت ہوتی ہوگی۔“
”نہیں...... وہ زیادہ مصروف رہتے ہیں...... اس لیے وہ فون نہیں کر پاتے۔“
”کیا اُن کا بینک دن رات کھلا رہتا ہے......؟“ راحیلہ نے حیرت سے پوچھا۔
”نہیں، رات دن کہاں کھلا ہوتا ہے بینک...... مگر وہ کچھ بے پروا سے ہیں۔“
”مگر محبت میں تو کوئی بے پروا نہیں ہوا کرتا۔“
”ہاں...... وہ واقعی بے پروا سے ہیں۔“
”تو آپ ان کو فون کر لیا کریں...... ہو سکتا ہے کہ انہیں آپ کے فون کا انتظار رہتا ہو۔“
”ہاں...... تم بھی ٹھیک کہہ رہی ہو......“ شہلا نے بڑی رغبت سے فون ملایا...... مگر وہ پاور آف جا رہا تھا۔ ایک بار، دوبار...... پانچ بار مگر وہ ہر مرتبہ بند ہی ملا۔ ”اس وقت رات کے گیارہ بج رہے ہیں...... لگتا ہے وہ سو گئے......“ شہلا نے اپنے آپ کو خود ہی تسلی دے دی۔
اگلے دن صبح وہ اپنے اسکول جانے کے بجائے سیدھی حارث کے بینک کی برانچ میں پہنچی...... حالانکہ اسکول کے حوالے سے اسے بینک سے متعلقہ کوئی کام بھی نہیں تھا۔
یہ خیال کل رات ہی اس کے دماغ میں آیا تھا کہ اسے اپنا ایک اکاؤنٹ حارث کی برانچ میں بھی کھول لینا چاہیے...... اسی لیے وہ سرشاری بینک پہنچی تھی تو اس وقت حارث اپنی برانچ سے نکل رہا تھا۔
وہ موبائل پر کسی سے بات کر رہا تھا...... اسی لیے اس نے شہلا کو نہیں دیکھا۔ شہلا نے اسے دیکھا تو دوڑ کر اس کے پاس پہنچی اور اسے سلام کیا۔ مگر حارث نے نہ اس پر نظر ڈالی...... اور نہ ہی اس کے سلام کا جواب دیا۔
اس کی ساری توجہ اپنی بات پر تھی...... جو وہ اس وقت کسی سے موبائل پر کر رہا تھا اور اپنی گاڑی کی جانب بڑھ بھی رہا تھا۔
شہلا کو برا تو بہت لگا...... مگر کر ہی کیا سکتی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ برانچ میں داخل ہوگئی اس نے سیکنڈ آفیسر سے پوچھا۔

''یہ حارث صاحب کب تک واپس آئیں گے۔''
''وہ ہیڈ آفس، میٹنگ میں گئے ہیں، واپسی کے بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا۔''
''ٹھیک ہے، پھر میں کل آجاؤں گی......'' شہلا نے اٹھتے ہوئے کہا۔
اور سیکنڈ آفیسر نے بے پروائی سے اپنے کندھے اچکا دیے۔

☆☆☆

پانچ دن چھٹی کے گزار کے جب میں آفس پہنچی تو میرے کولیگز مجھے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے میں سات سمندر پار سے آئی ہوں۔
''ہم تو سمجھ رہے تھے کہ اب تم آفس نہیں آؤ گی......'' ناعمہ نے کہا۔
''کیوں نہیں آتی میں......'' مجھے اس کی بات بالکل پسند نہیں آئی تھی۔
''صرف بخار ہی ہوا تھا ناں......کوئی ٹائیفائڈ تھوڑی ہوا تھا جو پورے ہفتے تم نے چھٹی منائی۔''
''جب میرا بخار اترا میں آگئی......'' میں نے اپنے کیبن میں جاتے ہوئے کہا۔
''تم ندیم خان سے تو جا کر مل لو......تمہاری غیر موجودگی میں میگزین کا سارا کام انہوں نے کیا تھا......کیا پتا......اب وہ تمہیں یہ کام کرنے دیں گے بھی کہ نہیں......'' یہ رائے فرزانہ کی تھی۔
''مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے کسی سے جا کر ملنے کی اور اگر وہ مجھے میگزین کا کام نہیں دینا چاہتے تو وہ خود رابطہ کر سکتے ہیں......'' میرا لہجہ دوٹوک تھا۔
''تمہارے پیچھے سرگی ہیلپ میں نے کی......انہیں تو پتا تک نہیں تھا کون سی چیز کہاں رکھی ہوئی ہے۔''
''ہاں بہت بڑا سا محل ہے ناں میرا کیبن......جو چیزوں کی تلاش مشکل ہوگئی۔'' مجھے غصہ سا آگیا......باتیں بنانے میں ہمارا اسٹاف کتنا ماہر تھا۔
اور پھر لنچ بریک میں آفس کے لوگ مجھ سے یہ پوچھنے کے لیے بے قرار تھے کہ اتنی چھٹیاں کرنے پر مجھے ندیم خان نے کیوں نہیں ڈانٹا اور میری تحریری جواب طلبی کیوں نہیں ہوئی۔
''اب مجھے کیا پتا کہ انہوں نے یہ سب کیوں نہیں کیا تا کہ تم لوگوں کو کچھ انجوائے منٹ ہی مل جاتی......'' میں نے اپنے دل کی بات مسکرا کر کہی تو فرزانہ بغلیں جھانکنے لگی اور رازدارانہ لہجے میں بولی۔
''میرا تو یہ خیال ہے کہ تمہارے غصے میں آفس چھوڑ کر جانے سے ندیم خان ڈر گئے۔ جب ہی تو انہوں نے تم سے کچھ نہیں کہا...... سچی میں تم جیسی قابل جرنلسٹ کہاں ملے گی انہیں۔''
''فرزانہ یہاں ہم آفس میں کام کرنے کے لیے آتے ہیں، ایک دوسرے سے ڈرنے اور ڈرانے کے لیے نہیں آتے۔''
تب اپنے کمرے میں بیٹھے ندیم خان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ دل ہی دل میں بولا......'' یہ بات تو تم نے بالکل صحیح کہی ہے صبا......اس کا مطلب ہے کہ تمہیں باتیں کرنا بھی آتا ہے۔ ورنہ مجھے تو اس کی امید نہیں تھی......کہ جیسی باتیں ہمارا اسٹاف تم سے کر رہا تھا۔''

☆☆☆

رات کا کوئی ڈیڑھ بج رہا تھا، گھر کے مکین سب بے خبر سو رہے تھے مگر شہلا آج بھی اپنے کمرے میں چپ چاپ بیٹھی تھی۔ حارث کا اسے نظر انداز کر کے گزر جانا......بالکل بھی پسند نہیں آیا تھا۔ وہ جب بھی سونے کی کوشش کرتی......اس کی آنکھوں میں وہی منظر اسے کلسانے سا لگتا......اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی کہ ''کہیں ایسا تو نہیں کہ میری یہ محبت یک طرفہ ہو اور حارث کے دل میں میرے لیے ایسا کچھ بھی نہیں ہو......جب ہی تو وہ مجھے

قصداً نظر انداز کرتا ہے۔''
''مگر میری دوست نے تو مجھ سے کہا تھا کہ جب کسی سے محبت ہوتی ہے تو دوسری جانب بھی اس کے اثرات لازمی ہوا کرتے ہیں۔ تاخیر ہو سکتی ہے مگر نفی نہیں...... ورنہ محبت کبھی پنپتی ہی نہیں ہے۔''
تب وہ گلدان سے گلاب کا پھول نکال کر اس کی ایک، ایک پتی علیحدہ کرنے لگی کہ حارث اس سے محبت کرے گا یا نہیں...... اور آخری پتی جب اس کے ہاتھ میں آئی تو وہ اس بات کی نوید تھی کہ حارث اس سے محبت کرے گا۔ اور وہ چھن سے یوں ہنس دی جیسے اس نے اقرارِ محبت کا جرم اس کے سامنے قبول کر لیا ہو۔
راحیلہ پانی پینے اٹھی...... تو شہلا کو یوں اکیلے میں اپنے آپ سے باتیں کرتے اور مسکراتے ہوئے دیکھ کر حیرت زدہ سی ہو گئی۔
''آپا...... کیا بات ہے، اتنی بے تحاشا خوش کیوں ہو رہی ہو؟'' وہ پوچھنے لگی۔
''اس گلاب کے پھول نے مجھے بتایا ہے کہ حارث بھی مجھ سے محبت کرتا ہے......'' اس نے اپنے اردگرد بکھری پتیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''جس گلاب کو آپ کے ہاتھوں نے ٹکڑے، ٹکڑے کر دیا اس کی گواہی کہاں سے اتنی وثوق بھری ہو سکتی ہے......'' راحیلہ نے خاصی گہری بات کی تھی۔
''تو پھر مجھے کیسے پتا چلے گا کہ حارث مجھ سے محبت کرتا ہے؟''
''محلے کی نسرین نے تو کسی کو خط لکھ کر پوچھا تھا تو اس کو جواب آیا تھا کہ وہ بھی اس سے محبت کرتا ہے۔''
''تو تمہارا کیا خیال ہے، مجھے بھی حارث کو خط لکھنا چاہیے؟''
''ہاں آپا...... آپ کو خوب اچھا سا خط لکھنا چاہیے...... اچھے سے کاغذ پر گل بوٹے بنا کر اُن میں کلر بھر کر مہکتا سا خط ایسا لکھیں کہ اس میں اپنا کلیجا نکال کر رکھ دیں۔''
''تو پھر کیا ہو گا......؟''
''وہ بھی آپ کو ویسا ہی خط لکھ دیں گے جیسے ڈراموں میں ہوا کرتا ہے......''
''اور اگر فرض کرو...... انہوں نے یہ لکھ دیا...... کہ میرے پاس محبت کرنے کے لیے وقت نہیں ہے تو...... پھر......''
''پھر کریم بھائی تو ہیں ناں......'' شہلا شرارت سے مسکرائی۔
''پگلی...... کیا تمہارا خیال ہے...... کریم مجھے اس لیے برا لگتا ہے کہ میں حارث کو پسند کرتی ہوں......''
''ظاہر ہے بات ہی یہ ہے......'' راحیلہ اب وہیں اس کے پاس بیٹھ گئی تھی۔
''نہیں راحیلہ...... اگر حارث کا وجود نہ بھی ہوتا تو میں تب بھی کریم سے شادی کرنے کے بارے میں نہیں سوچ سکتی تھی۔''
''وہ غریب ہیں، اس لیے آپ کو پسند نہیں ہیں ناں......'' راحیلہ نے پوچھا۔
''نہیں اگر وہ امیر بھی ہوتا تب بھی مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔''
''اور ان بیچارے کی یہ دلی خواہش ہے کہ آپ اُن کی دلہن بنیں......'' راحیلہ کا لہجہ تاسف بھرا تھا۔
''راحیلہ...... تم میری پیاری سی بہن ہو...... کریم بھائی اس گھرانے میں رشتہ کرنے کے خواہش مند ہیں تو وہ تم سے بھی تو شادی کر سکتے ہیں...... ان کو مزید چھوٹی لڑکی مل جائے گی...... تم تو مجھ سے تین سال چھوٹی ہو......''
''مگر آپا...... وہ مجھے پسند نہیں کرتے......'' راحیلہ کا لہجہ غم زدہ سا تھا۔
''کیوں پسند نہیں کرتے...... اتنی پیاری سی میری بہن ہے۔''

''مت جھوٹ بولو آپا...... میں پیاری سی نہیں ہوں، پیاری ہیں تو آپ ہیں اور آپ کے سامنے کسی کو کچھ نظر ہی نہیں آسکتا تو اس میں ان کی بھی کیا غلطی......''

''اوہ...... یہ بات ہے......!''

اور راحیلہ نے دکھ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تو سن میری پیاری سی بہنا...... اگر حارث نے میرے خط کا جواب محبت بھرا دے دیا تو میں اپنی شادی کے بعد تیری شادی اتنی اچھی ...... جگہ کراؤں گی کہ تو بھی دیکھتی رہ جائے گی۔''

''نہیں آپا...... مجھے کوئی ایسا شوق نہیں ہے کہ میں کہیں بڑے گھر میں بیاہی جاؤں......''

''اوہ تو یہ بات ہے...... پھر تم صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ تمہیں کریم بھائی پسند ہیں اور اگر ایسی بات ہے تو کم از کم امی کو تو بتا دو...... تاکہ وہ اپنے حساب سے تمہارے لیے کچھ کوشش کرسکیں۔'' تب راحیلہ کھسیا کر رہ گئی۔

☆☆☆

''یہ کیا ہے......؟'' حارث نے اس کا ضخیم سا لفافہ ہاتھ میں پکڑ کر پوچھا۔

شہلا نے پوری رات جاگ کر جو خط لکھا تھا آج وہ اسے دے کر سرخروسی اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

حارث نے یہ سوچ کر لفافہ کھولا کہ اس کے اسکول کی اونر نے شاید کوئی دعوت نامہ بھجوایا ہوگا اور جب وہ لفافہ کھولا تو تیز خوشبوؤں میں مہکتا خط اس کے ہاتھ میں تھا۔

''یہ سب کیا ہے......؟'' وہ پڑھتے ہوئے شہلا کو حیرت سے دیکھ رہا تھا جو اس کے سامنے کرسی پر شرمائی سی بیٹھی تھی۔

''مس شہلا...... ان تمام خرافات کے لیے میرے پاس واقعی وقت نہیں ہے۔''

''محبت کیا خرافات ہوتی ہے؟'' شہلا نے پوچھا۔

''ہاں...... میرے لیے تو ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اس گلابی خط کے کئی ٹکڑے کیے اور ردی باسکٹ میں یوں ڈال دیا جیسے اپنی جانب سے اس نے اسے جواب دے دیا ہو۔

اور جب اس نے شہلا کو دیکھا تو وہ سرعت سے واپس جا رہی تھی۔

''شکر میری جان چھوٹی...... خواہ مخواہ پریشان کر رہی تھی یہ لڑکی...... ذرا سی بات کیا کرلوں...... یہ لڑکیاں بے وجہ اوور ہو جاتی ہیں۔'' حارث نے اطمینان کی سانس لی۔

اور جب حارث برانچ سے باہر نکلا تو اس نے دیکھا وہ باہر کھڑی تھی اور آنکھیں اشکبار تھیں۔ اور اسے کسی کی پروا تک نہیں تھی۔ یہ سب دیکھ کر اسے اچھا نہیں لگا...... اس کا دل چاہا کہ وہ اسے سمجھائے۔

''مس شہلا......'' حارث نے اسے آواز دی۔

شہلا نے اسے پلٹ کر دیکھا...... آنکھوں میں شکایات درج تھیں۔

''میری بات سنیں گی آپ......؟'' اس نے اسے نرمی سے پکارا۔

''نہیں...... اس نے نفی میں گردن ہلائی۔.. اور تیزی سے آگے چلی گئی۔

''پاگل کہیں کی......'' اس کے لبوں سے بے ساختہ نکلا...... اور وہ واپس مڑ گیا۔

☆☆☆

''آپا...... آپ ویسے تو اپنے آپ کو بے حد عقل مند سمجھتی ہو...... مگر ہو نہیں......'' راحیلہ نے اس کی دن بھر کی

روداد سن کر کہا۔
''جب ایک شخص محبت کو خرافات کہہ رہا ہے تو پھر بات بچی ہی کہاں...... اس نے تو ہر بات ختم ہی کر دی......''
شہلا کا لہجہ ہنوز سسک رہا تھا۔
''اگر اس نے ہر بات ختم کر دی تھی تو پھر اس نے آپ کو آواز کیوں دی تھی؟''
''ایسے ہی مزید دل جلانے والی باتیں کہنا چاہ رہا ہوگا۔''
''اس نے آپ کو نرمی سے پکارا تھا؟ یا جلے بھنے لہجے میں غصے سے؟'' راحیلہ نے پوچھا۔
''پکارا تو اس نے نرمی سے ہی تھا مگر اس کے سینے میں دل کی جگہ پتھر ہی فٹ ہے...... اس کا تو اندازہ مجھے ہو گیا ہے کہ وہ کس بے رحمی سے میرے خط کو میرے ہی سامنے پھاڑ کر ڈسٹ بن میں ڈال رہا تھا۔'' اس کے آنسو پھر بہنے لگے۔
''آپا میرا یہ سو فیصد خیال ہے کہ وہ آپ کے پیچھے معذرت کرنے ہی آیا تھا کہ اس کے ساتھ یقیناً کوئی نہ کوئی مجبوری ایسی ہوگی جو وہ فی الوقت آپ کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکا تھا...... مگر آپ نے اس کی کوئی بات ہی نہیں سنی۔''
''مگر میں اب اس کی برانچ میں بھی گئی تو اس سے بات نہیں کروں گی۔'' شہلا کا ملال کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔
''آپ بات نہ کیجیے گا...... مگر وہ ضرور آپ سے بات کرے گا۔''
''کیا واقعی......'' وہ آنسو پونچھ کر اب اپنی بہن کی باتیں رغبت سے سن رہی تھی اور اس کے ملال کا گراف بھی قدرے نیچے آ رہا تھا۔
''ہاں آپا، حارث کے آپ کے پیچھے آنے اور آپ کو پکارنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ آپ اس کے لیے صرف کلائنٹ کا درجہ نہیں رکھتی ہیں۔''
''تو پھر...... میں اس کے لیے کیا ہوں......؟'' انتہائی بے وقوفی سے پوچھا گیا۔
''آپ اس کے لیے خاص الخاص ہیں...... یہ میرا دل کہہ رہا ہے......'' راحیلہ نے محبت بھرے لہجے میں بھرپور بے وقوفی دکھاتے ہوئے کہا۔
''شاید......'' وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔
''یوں کریں آپ اسے فون کریں، دیکھتے ہیں کہ وہ کیا کہتا ہے؟''
''مگر میں نے تو آج تک اس سے فون پر بات ہی نہیں کی۔''
''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ آج کر لیں......''
''ابھی کر لوں......؟'' شہلا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''یوں بھی محبت کرنے والے تو بے صبرے ہی ہوا کرتے ہیں۔''
''ہاں...... ابھی کر لو......'' راحیلہ نے بھی جیسے فیصلہ سنا دیا۔
لرزتے ہاتھوں سے اس نے اس دشمنِ جاں کا نمبر ملایا۔ پہلی بار نہیں اٹھایا گیا۔ دوسری بار جب اس نے ملایا تو قصداً کاٹ دیا گیا۔ اور جب تیسری بار اس نے کال ملائی تو فوراً اٹھایا گیا۔
''حارث صاحب...... میں آج آپ کے بینک آئی تھی......'' اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گئی۔
''جی، جی مجھے معلوم ہے، مجھے دراصل ہیڈ آفس جانا پڑ گیا تھا۔ اس لیے برانچ میں زیادہ دیر نہیں رک سکا......

اور آپ سے بات بھی نہیں ہو سکی۔ اور جو تھوڑی سی ہوئی وہ بھی ادھوری سی......''

''اسی لیے تو میں نے آپ کو فون کیا ہے۔'' شہلا نے روانی میں کہا۔

''مس، میں واقعی معذرت خواہ ہوں...... میں آئندہ دو تین دن بھی بینک نہیں آسکوں گا...... میں پرسنلی بہت مصروف ہوں...... اور ویری سوری کہ آپ سے میری بات بھی نہیں ہو سکے گی۔''

''اگر آپ کہیں تو میں فون پر آپ سے......'' شہلا نے سرشار لہجے میں کچھ کہنے کی کوشش کی...... مگر اس نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی دوبارہ سوری کہتے ہوئے کہا۔

''پلیز...... جب میں برانچ آؤں گا تو یکسوئی سے آپ کی بات بھی سنوں گا اور آپ کا مسئلہ بھی حل کروں گا......'' یہ کہہ کر اس نے فون منقطع کر دیا۔

حارث اس وقت اسے اپنی وہ کلائنٹ سمجھ رہا تھا جن کے لاکر کی چابی کھو گئی تھی...... اور حارث نے ان سے یہ وعدہ کیا تھا کہ جلد ہی وہ ان کا لاکر کھلوا دے گا جو کئی برسوں سے بند پڑا تھا۔

اور شہلا اپنے تئیں یہ سمجھ رہی تھی کہ حارث کو اس کے خط پھاڑنے کا اتنا افسوس ہے کہ وہ خود کہہ رہا ہے کہ وہ اس کی محبت کا جواب محبت سے ضرور دے گا...... مگر کچھ وقت ٹھہر کر دے گا...... اور اپنی بدتمیزی کی سوری علیحدہ کر لی تھی۔ اب شہلا خوشی سے بے حال تھی اور راحیلہ اسے خوش دیکھ کر خود بھی خوش ہوئی جا رہی تھی۔

''آپا...... تم مجھے ہمیشہ پگلو کہتی ہو ناں...... دیکھو آج تمہارے کام تمہاری یہ پگلو... بہن ہی آئی ناں......'' راحیلہ نے فخر آمیز لہجے میں کہا۔

''میری بہن سے بڑھ کر تو واقعی کوئی عقل مند نہیں......'' وہ ہنسی اور بے اختیار اپنی بہن کو گلے سے لگا لیا۔ اور پھر نہ جانے کیوں وہ پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔

''آپا...... ابھی تو آپ اتنا خوش ہو رہی تھیں اور اب اس قدر رونا آرہا ہے کیوں......؟''

''پتا نہیں کیوں...... خود بخود ہی دل بھر کر آرہا ہے۔''

''شاید...... خوشی نہیں سنبھالی جا رہی۔''

''میں واقعی نہیں سوچ سکتی تھی...... حارث میری بات اتنی توجہ سے بھی سن سکتے ہیں۔''

''آپا...... محبت کرنے والے کبھی رلاتے تھوڑی ہیں۔'' راحیلہ نے کہا۔

''ہاں......'' جب ہی.... شہلا کو اس کی بات سمجھ میں آگئی۔ اب وہ دونوں بہنیں خوب ہنس رہی تھیں۔

☆☆☆

ندیم خان کو اخبار جوائن کیے ہوئے تین ماہ کے قریب ہو گئے تھے اور ان کے آنے سے پہلی تبدیلی یہ آئی تھی کہ اب آہستہ، آہستہ اخبار کے بنڈل واپس آنا بند ہو گئے تھے...... یعنی جتنا اخبار شائع ہو رہا تھا اس کی کھپت بھی ہو رہی تھی۔

''اور مختلف ایجنسیز سے ان کا آرڈر بھی بڑھنا شروع ہو رہا تھا۔ اور یہ خاصی بڑی کامیابی تھی اور سر فرید کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اور آج سب ورکرز کے لیے دوپہر کا لنچ سر فرید کی جانب سے تھا۔ مسالے والی بریانی سب بے حد شوق سے کھا رہے تھے مگر ندیم نے دو چمچے کھا کر اپنی پلیٹ ایک جانب کر دی تھی۔

''سر...... کیا آپ ہمارے ساتھ لنچ نہیں کریں گے؟'' ناعمہ نے یہ سب دیکھ کر پوچھا۔

''میں آپ سب کے ساتھ شامل ہوں...... دراصل میرا گلا کچھ خراب ہے...... اس لیے میں چاول نہیں کھانا چا رہا۔''

''سر میں آپ کے لیے زبردست تمہاری لے آؤں......؟'' جاوید نے پُرجوش لہجے میں کہا...... ''میں یوں گیا اور یوں آیا۔''

''نہیں...... میں آج گھر جا کر اپنی اماں کے ہاتھ کے قیمہ کریلے کھاؤں گا اور اگر انٹ شنٹ کھا کر پیٹ بھر گیا تو اپنی فیورٹ ڈش نہیں کھا سکوں گا۔''

تب میرا دل چاہا کہ میں بھی بتاؤں کہ میری فیورٹ ڈش بھی یہی ہے...... مگر ایسی باتیں آفس میں کرنے کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ سر کی چمچہ گیری کی جا رہی ہے...... اور میں ان چیزوں سے حتی الامکان بچا کرتی تھی۔

اور اس کے بعد وہ چوتھا دن ہوگا جب میں لنچ ٹائم میں قیمہ کریلے کھا رہی تھی اور مجھے ندیم خان کا خیال آیا تو میں نے موبائل پر پوچھا۔

''سر آپ نے اگر لنچ نہ کیا ہو تو میں آپ کے لیے کریلے قیمہ بھجواؤں۔''

''آپ اپنے لنچ سمیت میرے کمرے میں آجائیں......'' اس نے مسکرا کر کہا۔

اور جب میں نے اپنا ٹفن باکس اس کے سامنے کھول کر رکھا تو وہ رغبت سے کھاتے ہوئے بولا۔ ''بہت لذیز ہیں آپ نے بنائے ہیں کیا......؟ سچ کہہ رہا ہوں اتنے مزے کے میں نے اس سے قبل نہیں کھائے۔''

''میری امی بناتی ہیں اور مجھے ان کے ہاتھ کے بہت اچھے لگتے ہیں۔''

''میری جانب سے بھی شکریہ کہیے گا...... واقعی مزہ آگیا۔'' وہ خوش دلی سے تعریف کرتے ہوئے بولا۔

اور جب لنچ کے بعد میں اس کے روم سے چائے پی کر نکلی تو فرزانہ مجھے دیکھ کر مسکرا کر بولی۔

''کیا بات ہے صبو...... ندیم خان کے ساتھ بڑی دوستی ہو رہی ہے؟''

''میری دشمنی تو کسی سے بھی نہیں ہے۔'' میں اس کا جملہ نظرانداز کر کے بڑھی۔

''دوست تو ہم بھی تمہارے ہیں...... ہمیں بھی اپنے گھر کا لایا کھانا کھلا دیتیں......'' اب فرزانہ دوسری نہج پر آگئی تھی۔

''ضرور کھلا دیتی مگر مجھے معلوم ہے کہ تمہیں اور ناعمہ دونوں کو کریلے انتہائی زہر لگتے ہیں تو تمہاری ناپسندیدہ ڈش کیونکر آفر کر سکتی تھی۔''

''اوہ یہ بات ہے، جب ہی......'' ناعمہ نے فرزانہ کو دیکھ کر قصداً گہری سانس لی۔

''ہماری صبا آج زہر کو زہر دینے گئی تھی۔''

''اللہ نہ کرے......'' میں آگے جاتے، جاتے پلٹ کر پریشان لہجے میں بولی۔ ''یہ تم لوگ کس قدر فضول باتیں کرتی ہو۔''

''ارے بھئی، تم نے ہی تو ایک مرتبہ کہا تھا کہ مجھے یہ ندیم خان سخت زہر لگتے ہیں۔ ہم تو تمہارا ہی جملہ دہرا رہے تھے۔''

''مگر میں نے یہ بھی نہیں کہا کہ اب وہ مجھے شہد جیسے لگتے ہیں۔''

''نہیں کہا تو کہہ دوگی...... آثار تو ہمیں ایسے ہی نظر آ رہے ہیں......'' ناعمہ نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ تب فرزانہ مجھے دیکھ کر گنگنانے لگی۔

اور میں لاتعلقی سے کندھے اچکا کر اپنے کیبن میں آگئی۔

مگر یہ سب باتیں سن کر...... ندیم خان اپنے روم میں بیٹھا کافی دیر تک مسکراتا رہا۔

اسے اب صبا واقعی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ ہر روز سے زیادہ...... اور اپنے دل میں آنے والی اس تبدیلی سے

وہ خود آگاہ بھی تھا۔

☆☆☆

وہ اپنے کمرے میں بیٹھا اخبار کی سرخیاں چیک کررہا تھا۔ میں اپنا کالم لے کر اس کے کمرے میں گئی تو اس نے ہاتھ سے بیٹھنے کو کہا۔

''مس صبا آپ نیوز سیکشن میں کیوں نہیں آجاتیں؟''

''سر میں زیادہ بھاگ دوڑ نہیں کرسکتی...... دراصل مجھے ٹیبل ورک پسند ہے۔''

''میرا مطلب ہے صرف خواتین سے مل کر رپورٹنگ تو دیکھ سکتی ہیں آپ؟''

''اس میں بھی مجھے باہر جانا پڑے گا ناں......''

''چلیں آپ ان خواتین کے خصوصی انٹرویوز تو کرسکتی ہیں جن کے ساتھ معاشرے کے بااثر افراد نے کوئی ظلم کیا ہو یا اُن کا کوئی حق کسی بھی حوالے سے چھینا ہو...... اور اسی نوعیت کے فیچرز بھی کہ سب کچھ کہہ بھی دیا اور کہا بھی کچھ نہیں۔''

''سر، اس سے تو لوگ میرے خلاف ہوجائیں گے...... آج کل جو بھی سچ کی پکار بننا چاہتا ہے پہلے اس کی آواز دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔''

''ہوں پھر تمہارا نام کوئی فرضی لکھ دیا جائے گا کہ اس کے بارے میں آفس والوں کو بھی پتا نہ چلے کہ وہ کس کا نام ہے۔''

''ہاں، ایسی صورت میں تو مجھے کوئی تامل نہیں ہوگا۔''

''تو پھر اس ویک...... آپ ان خاتون کا انٹرویو کریں گی......'' ندیم خان نے ایک لفافے میں سے تصویر اور اس کے بارے میں معلومات دیتے ہوئے کہا۔

''اگر میں جس شخصیت کے پاس جاؤں...... اور اسے بھی یہ باور کرواؤں کہ میرا کام تو صرف میٹر جمع کرنا ہے...... مگر آپ کے بارے میں فیچر لکھنے والی...... شخصیت کسی دوسرے کی ہوگی تو کوئی مضائقہ تو نہیں ہوگا۔''

''ارے اگر آپ اتنا ڈر رہی ہیں تو میرا نام لے سکتی ہیں۔ مجھے حق بات کہنے میں کسی سے کوئی ڈر نہیں لگا کرتا۔''

تب میں ندیم خان کو دیکھتی رہ گئی کہ بات تو اس نے میرے دل کی کہی تھی مگر حالات کو دیکھتے ہوئے میں یہ سب نہیں کہہ سکتی تھی۔

اور پھر ساحر کے نام سے لکھے ہوئے فیچرز اور انٹرویوز قارئین میں بے حد پسند کیے جانے لگے۔

اور آفس کے لوگوں میں پہلے یہ کھلبلی مچی کہ یہ باہر سے کس رائٹر کو لیا گیا ہے...... جس کے قلم کی کاٹ میں اتنا تیکھا پن ہے اور پھر سب کو یہ پتا چلا کہ یہ سب ندیم خان لکھ رہے ہیں تو اُن کے پاس جاکر تعریف کرنے والوں کی تعداد بڑھنے لگی۔

''سر...... ایسا انٹرویو آپ ہی لکھ سکتے تھے......'' ایک دن دورانِ میٹنگ فرزانہ نے کہا تو وہ ہنس دیا اور بولا۔

''جی نہیں...... ایسا انٹرویو آپ بھی کرسکتی تھیں، ناعمہ بھی اور صبا رحیم بھی......''

''نو سر...... صبا رحیم کو تو آؤٹ ڈور جانا بالکل ہی پسند نہیں ہے...... اور نہ اس کے قلم میں اتنی ہمت ہے کہ وہ ایسے نڈر لہجے میں کچھ لکھ سکے۔'' اس سے قبل ندیم خان کچھ بولتا...... میں نے فرزانہ کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''جی سر...... فرزانہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں...... مجھے فیچر لکھنے میں واقعی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

اور ندیم خان نے بات کا موضوع ہی بدل دیا تھا۔
وہ سنجیدہ مزاج شخص تھا...... اور اپنا ہر کام انتہائی ذمّے داری سے کرنے کا قائل تھا۔ مگر اس شخص کے دل کے دروازے پر صبا رحیم دستک دے چکی تھی۔
کتابوں کی نمائش میں وہ بھاگتی، دوڑتی لڑکی...... اور پھر اس سے ٹکرا کر لاابالی انداز میں بڑبڑاتی ہوئی...... وہ صبا اسے واقعی بہت اچھی لگی تھی۔
اور جوں، جوں وقت گزر رہا تھا ندیم خان کے دل میں اس کے لیے پسندیدگی میں اضافہ ہو رہا تھا۔
جس دن وہ آفس نہ آتی...... یا فیچر کی تیاری کے سلسلے میں وہ قدرے تاخیر سے آتی تو اسے اس کے بغیر عجیب کی سی محسوس ہوتی اور جب وہ آجاتی تو اسے ہر چیز اچھی لگ رہی ہوتی۔
اور ایک دن جب وہ آئی تو بڑی تھکی، تھکی سی تھی...... چہرہ بھی پژمردہ سا تھا اس کی فائل چیک کرتے ہوئے، ایک اچٹتی ہوئی نظر اس پر ڈالتے ہوئے اس نے پوچھ ہی لیا۔
''خیریت تو ہے ناں......؟''
''جی سر......''
''تو پھر آپ نڈھال سی کیوں نظر آرہی ہیں؟''
''سر مجھے پتا نہیں تھا...... کہ آج پٹرول پمپ بند رہیں گے...... میں آفس کے لیے نکل رہی تھی تو دیکھا میری گاڑی میں پٹرول تھا نہ گیس...... اور آج پبلک ٹرانسپورٹ کے حصول کے لیے مجھے کس طرح بھاگنا پڑا...... بتا نہیں سکتی...... واقعی بہت تھک گئی میں۔''
''اگر ایسی بات تھی تو آپ فون کر دیتیں......'' بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔
''میں کس کو فون کرتی......؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔
''میرا مطلب، آفس میں کسی کو بھی...... کوئی بھی آپ کو گھر سے پک کر لیتا۔''
''نو سر...... میں ساجد، جاوید یا عباس کی بائیک پر بیٹھ کر تو نہیں آسکتی...... مجھے ایسا کرنا خود سے پسند نہیں ہے۔'' اب میں نیچی نظریں کیے بولے جا رہی تھی۔ الل ٹپ جو دل میں آرہا تھا وہ سب اور وہ قلم ہاتھ میں دبائے اسے دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اور دلچسپی سے سن رہا تھا۔
مگر اس نے چاہتے ہوئے بھی، ایک مرتبہ یہ نہیں کہا تھا کہ اگر میں اپنی گاڑی میں تمہیں لینے آجاتا تو تم کیا میرے ساتھ آجاتیں یا نہیں...... کہ وہ بہت محتاط تھا...... اور اخبار کے ماحول سے واقف تھا کہ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ کبھی منع کر سکتی ہی نہیں۔ وہ جب بھی اس سے کہے گا وہ اس کے ساتھ چلی آئے گی۔
''صبا اگر میں تمہیں لینے آجاتا تو تم میرے ساتھ آتیں یا نہیں......'' اس نے اپنے دل ہی دل میں اس سے پوچھا۔
''ضرور آتی......'' اسے صبا کا جواب سنائی دیا۔
حیرت سے اس نے اسے دیکھا۔
وہ موبائل پر کسی سے بات کر رہی تھی۔
شاید کوئی یونیورسٹی کی دوست اسے اپنی انگیجمنٹ پر بلانا بھول گئی تھی اور وہ اسے باور کرا رہی تھی اگر تم مجھے بلاتیں تو میں ضرور آتی۔
مگر ضرور آتی کا یہ جملہ اسے اپنے دل کا جواب لگ رہا تھا۔
''جی ہاں، ضرور آتی......'' کہا تو ندیم خان نے دل میں ہی تھا مگر اس نے سن لیا اور موبائل آف کرتے ہوئے

معصومیت سے بولی۔
''سر آپ کو کیسے پتا چلا...... کہ میں نصرت کے ہاں ضرور جاتی؟''
''اس لیے کہ وہ آپ کی دوست ہے اور دوستوں کے بلاوے پر انکار نہیں کیا کرتے ہیں، رائٹ۔''
''یس......''اس نے اثبات میں سادگی سے سر ہلایا اور مگر ندیم خان بے حساب خوش ہو گیا۔

☆☆☆

سبین آج کافی دنوں کے بعد اپنے میکے آئی تو ماں کو اکیلے بیٹھے دیکھا۔
''آج چھٹی کے دن بھی......ندیم اور عدیم گھر پر نہیں ہیں؟''
''عدیم تو باہر گیا ہوا ہے...... ہاں ندیم اپنے کمرے میں ہے......''
اور جب ندیم باہر آیا تو سبین چائے پیتے ہوئے اس سے پوچھ رہی تھی۔
''یہ اپنا بزنس کرتے، کرتے ایک دم اخبار کیوں جوائن کر لیا......؟''
''فرید میرا گہرا دوست ہے......اس کے کہے کو ٹال نہیں سکتا تھا۔''
''کیسا رہا تجربہ......اردو اخبار کا......؟''
''برا نہیں رہا......انشاء اللہ یہ اخبار اپنی جگہ بنا لے گا۔''
''اسٹاف تو کم ہی ہوگا......''سبین نے پوچھا۔
''نہیں، اچھا خاصا ہے۔''
''لڑکیاں بھی ہوں گی؟''
''ہاں کافی ہیں...... بلکہ لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہے۔''
''اُن میں سے بھی کیا کوئی اچھی نہیں لگی......؟''بہن نے شرارتی سے لہجے میں پوچھا۔
''میں وہاں کام کرنے گیا ہوں یا اپنے لیے لڑکی تلاش کرنے......؟''
''اگر ایک ساتھ دو کام ہو جائیں تو کیا برا ہے...... ہے ناں امی......؟''سبین نے اپنی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''کوئی مضائقہ نہیں......''سلمیٰ بیگم نے بھی سنجیدگی سے کہا۔
''ایک لڑکی......تھوڑی سی اچھی لگی تھی......مگر اتنی اچھی بھی نہیں کہ اس سے شادی کر لی جائے......''ندیم نے ٹرالی سے چائے کا مگ اٹھاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔
''بھائی پہلے وہ تھوڑی سی ہی اچھی لگے گی......اور آہستہ، آہستہ زیادہ اچھی لگنے لگے گی۔''
''اگر ایسا ہوا تو آپ کو بتا دوں گا۔''
''ایسا نہ ہو جائے......جب تک وہ تمہیں کلی طور پر پسند آئے بیچ میں کوئی دوسرا آ کر لے اڑے۔''
''اگر ایسا ہوا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ میری قسمت میں ہی نہیں تھی۔''ندیم خان سنجیدہ سے لہجے میں بہن سے بولا۔
''مگر وہ ہے کیسی؟ جو تمہیں تھوڑی سی ہی سہی اچھی تو لگی۔''
''فی الحال تو پگلوسی ہی لگ رہی ہے، اس لیے اس بارے میں زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔''
''پگلوسی......؟''سبین نے برا منہ بنایا......''کیا اخبارات میں پاگل بھی جاب کرتے ہیں؟''
''میرا مطلب ہے لا ابالی سی......ذرا سی بات پر رو دینے والی۔''

''اچھا.....آ.....آ'' سین نے اچھا ذرا کھینچ کر کہا اور پھر تفکر بھرے لہجے میں بولی۔ ''پھر تو سوچ سمجھ کر پسند کرنا.....ہاں..... مجھے روتی دھوتی لڑکیاں، زیادہ چالاک لگا کرتی ہیں۔''

''کیا مطلب.....؟'' بہن کی یہ بات اس کے دل کو ذرا بھی نہیں بھائی تھی۔

''میں یہ کہنا چاہ رہی ہوں کہ جو لڑکیاں اپنے آپ کو جتنا بھولا بھالا، سیدھا سادہ سا پوز کیا کرتی ہیں ناں اتنی وہ ہوتی نہیں ہیں۔ اور یوں بھی لوگ اپنے آپ کو بے وقوف کہہ کر لوگوں کو بے وقوف بنا رہے ہوتے ہیں۔ یہ میرا کھرا تجزیہ ہے۔''

''اوہ.....تو یہ بات ہے.....'' وہ مزید تبصرے سے رکا۔

''اور جو لڑکیاں..... اپنے آفس کے لڑکوں کو رو، رو کر ڈراتی ہیں..... وہ تو سب سے زیادہ چالاک ہوتی ہیں۔ اور ...... ایسی لڑکیاں تو اپنی جاب کے ساتھ، ساتھ اپنا شوہر بھی آسانی سے ڈھونڈ لیا کرتی ہیں.....اور مجھے تو ایسی لڑکیاں ہی سخت ناپسند ہیں۔'' سین نے برا سا منہ کر کہا۔

''اللہ کرے..... میری قسمت میں جو بہو لکھی ہے اسے اگر میرا بیٹا نہیں ڈھونڈ رہا تھا تو میری بہو ہی اسے ڈھونڈ لے..... بات تو ایک ہی ہے ناں.....'' سلمیٰ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا تو ندیم بھی ماں کے ساتھ مسکرانے لگا۔

پر صبا تو ایسی نہیں لگتی تھی۔ اس نے تو بے وجہ کبھی اسے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی وہ اس کے پاس آنے کے بہانے ڈھونڈا کرتی تھی۔ وہ تو اپنے حال میں مست رہنے والی لڑکی تھی۔ اور اس نے اس کے لبوں سے کبھی ایسا کوئی جملہ نہیں سنا تھا جو اس کی وارفتگی کا مظہر ہوتا..... جبکہ دیگر لڑکیاں اس سے بے وجہ فری ہونے کی بھی کوشش کیا کرتیں مگر صبا تو اپنے آپ کو الگ تھلگ.....اور لیے دیے رکھنے والی لڑکی تھی۔

''اماں جیسا آپ سوچ رہی ہیں ناں..... ایسا صرف فلموں اور ڈراموں میں ہوا کرتا ہے..... حقیقی دنیا میں نہیں ہوتا کہ ایک اچھی سی لڑکی خود ہی آپ کے سامنے آجائے.....'' سین کہہ رہی تھی۔

''مگر ایسی لڑکی میرے سامنے تو خود ہی آچکی ہے.....'' ندیم خان نے سوچا مگر بہن سے کچھ کہا نہیں۔

☆☆☆

موسم بہار کی مناسبت سے تمام ٹی وی چینلز پر خواتین کے ٹاک شو خوب دھوم دھام سے دکھائے جا رہے تھے۔ جس میں رنگوں کی، فیشن کی اور بسنت کی خوب باتیں کی جا رہی تھیں۔ ایک چینل کی جانب سے ہمارے اخبار میں دعوت نامہ آیا تھا کہ خوب دھواں دھار گفتگو کرنے والی دو خواتین کو بھیجا جائے..... میرا خیال تھا کہ ناعمہ اور فرزانہ کو اس میں شرکت کے لیے کہا جائے گا..... کہ آفس سے باہر کی سرگرمیوں میں شرکت کرنے پر یہ دونوں ہی بہت خوش ہوا کرتی تھیں..... مگر ندیم خان نے ٹی وی کے اس ٹاک شو کے لیے صرف میرا نام بھیجا تھا۔

فرزانہ کو ان کے اس اقدام پر خاصا غصہ بھی آیا تھا اور وہ برملا کہہ بھی رہی تھی۔

''ہمارے اخبار کا یہ الٹا اصول ہے کہ جو جانا چاہتا ہے اسے بھیجا نہیں جاتا اور جو نہیں جانا چاہتا اسے بھیجا جاتا ہے.....اور اگر صبا بہت خوب صورت ہے تو اس کا یہ قطعی مطلب نہیں کہ وہ ٹی وی پر بھی خوب صورت دکھائی دے گی..... میں نے تو بڑی، بڑی خوب صورت لڑکیوں کو اتنا برا دیکھا ہے کہ ایک نظر ڈالنے کے بعد دوسری نظر ڈالنے کی خواہش بھی نہیں ہوتی۔''

''صبا رحیم کو اس وجہ سے ٹاک شو میں بھیجا جا رہا ہے کہ وہ اپنے زمانۂ طالب علمی میں ڈیبیٹر رہنے کے ساتھ پروگرامز کی اینکر بھی رہی ہے..... وہ ٹاک شو کے رموز ..... دیگر لوگوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر جانتی

ہیں......'' تب ندیم خان نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا...... اور مجھے یہ سب باتیں سن کر واقعی وحشت ہو رہی تھی...... اسی لیے میں نے ندیم خان کے روم میں جا کر ملتجی لہجے میں کہا۔

''سر پلیز آپ میرے بجائے فرزانہ اور ناعمہ دونوں کو ٹی وی کے مذاکرے کے لیے بھیج دیجیے...... مجھے تو واقعی ٹی وی تک دیکھنے کا شوق نہیں ہے...... اور خاص طور پر ٹاک شوز تو اچھے خاصے دنگل بنتے جا رہے ہیں...... اور مجھے بالکل بھی پسند نہیں ہیں۔''

''کیوں پسند نہیں ہیں۔''

''بس...... مجھے لڑائی جھگڑوں سے کوئی دلچسپی ہے ہی نہیں......''

''نہیں ہے تو کر لینی چاہیے۔ یہ لڑائی جھگڑوں میں مہارت بھی سنا ہے خواتین کے کام آیا کرتی ہے......'' اس کے لبوں پر جیسے اب شرارتوں کے شگوفے سے کھل رہے تھے۔

''بس آپ فرزانہ یا ناعمہ کو بھیج دیجیے، ہاں...... اور میں کہیں نہیں جا رہی...... اوکے۔'' میرا لہجہ بھی وثوق بھرا سا تھا۔ جیسے کہ میری بات وہ نہیں ٹالیں گے...... واقعی وہ ایک مہربان باس تھے۔

''مس صبا رحیم...... آپ اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہیں......'' اچانک ہی وہ ہتھے سے اکھڑ گئے۔ اب وہ چشمہ آنکھوں پر چڑھا کر سنجیدگی سے کہہ رہے تھے۔

''جی......'' میں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

چند لمحے پہلے مسکراتے ہوئے گفتگو کرنے والے نے اپنے لہجے کا اس طرح یوٹرن لیا تھا کہ میں واقعی حیران سی ہو گئی۔

''اس اخبار کا ایڈمن میں ہوں یا آپ......؟'' اب لہجہ مزید درشت تھا۔

''جی...... آپ......'' میں ہکلائی۔

''اس لیے جو آپ سے کہا جا رہا ہے...... آپ کیجیے اور بس...... ہاں، اس طرح بار، بار انکار کرنے کے طریقے مجھے ہرگز پسند نہیں ہیں......'' اس کا تاؤ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

''مگر...... سر......'' مجھے ان کے اس طرح اچانک غصے میں آنے پر بے حد دکھ سا ہو رہا تھا۔

''سر، میں نے...... ایسی تو کوئی بات نہیں کہی...... جس پر آپ کو اس قدر غصہ آ رہا ہے...... میں نے تو صرف جانے سے انکار کیا تھا۔'' میں نے اپنے آنسو اپنے حلق میں اتار کر بہ مشکل کہا۔

''جی ہاں...... آپ نے تو کچھ نہیں کہا......'' اس کا لہجہ مزید بگڑا۔

''آپ کیا چاہتی ہیں؟ اور کیا نہیں چاہتیں...... اب یہ فیصلے اس حساب سے تو نہیں ہو سکتے ناں......''

''جی......'' میں واقعی اب حق دق سی انہیں دیکھے جا رہی تھی۔

''میری بات مکمل ہو گئی ہے...... انڈر اسٹینڈ!'' وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولے۔

تب میں آنکھوں میں آنسو لیے اس تیزی سے باہر نکلی کہ باہر کھڑی فرزانہ کے چہرے سے میرا سر بری طرح ٹکرایا۔

''یا وحشت......'' وہ اپنے چہرے کو اپنی ہتھیلیوں میں تھامے انتہائی غصے سے مجھ سے کہہ رہی تھی۔

مگر اب میں اندر کی سب باتیں بھول کر یہ سوچ رہی تھی کہ یہ فرزانہ اس طرح چپ چاپ ندیم خان کے کمرے کے باہر کھڑے ہو کر کیا ثابت کرنا چاہتی تھی؟

اور یہ کن سوئیاں کس وجہ سے لے رہی تھی......؟ اور کیوں لے رہی تھی؟

باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ پڑھیے



حیثیت

ہاجرہ ریحان

میں نے فون اس کے کان سے لگا رکھا تھا.....اس نے دھیمے کمزور لہجے میں بس اتنا ہی کہا۔

"بھائی.....پلیز لینے آجاؤ....."

اور جواب سن کر اس کی آنکھوں سے ٹپ، ٹپ آنسو بہنے لگے تھے.....امی نے گھبرا کر اپنے ہاتھوں کی ہتھیلی سے اس کے آنسوؤں کو پونچھنا شروع کردیا اور محبت سے دلاسا دینے لگیں۔

"امی کا بس چلے تو اس کو اپنے دل میں پناہ دے دیں۔"

میں امی کی والہانہ محبت دیکھ کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا، میں نے فون اپنے کان سے لگا کر کچھ بتانا چاہا تھا کہ دوسری طرف ہونے والی زور شور سے گفتگو نے مجھے دم بخود کر دیا...... اس کے بھائی کی بیوی اپنے شوہر پر زور دے رہی تھی کہ وہ کوئی بہانہ بنا کر اپنی بہن کو واپس نہ لائے...... جبکہ بھائی بار، بار یہی بتا رہا تھا کہ ایسے وہ اپنی بہن کو کیسے کسی کے ہاں رات بھر چھوڑ سکتا ہے......اور وجہ کیا بتائے......؟

میں ان لوگوں کی فضول باتوں سے تنگ آ گیا......اور فون بند کر کے خاموشی سے کمرے سے باہر آ گیا...... بہر حال کوئی حرج نہیں اگر رات بھر یا تین چار دن وہ یہاں...... ہمارے گھر میں ہی رہ جائے...... کم از کم اس کی دیکھ بھال تو اچھی ہو جائے گی...... خوراک بھی پوری ملے گی...... آخر اس کی اس حالت کا ذمے داری بھی تو میں ہی ہوں...... میں ایک بار پھر سے شدید ترین شرمندگی محسوس کرنے لگا......اور فی الحال اس کے بھائی بھاوج کی اس حرکت پر مجھے اس پر رحم بھی آ رہا تھا...... اب امی کا کیا گیا فیصلہ اور حقیقت مجھ پر کھل کر عیاں ہو گئی تھی...... پہلے تو شاید میں اس کو صرف امی کا احساسِ ندامت سمجھتا تھا۔ یہ احساسِ ندامت ہی تو تھا بھلا اور کیا تھا......؟ کیا محبت؟ حالانکہ امی نے بھی وہی کیا تھا جو اُن کی عمر کی لڑکیاں اکثر کیا کرتی ہیں...... انہوں نے اپنے لاڈلے بھائی سے اپنی عزیز ترین سہیلی کا رشتہ کرایا تھا...... اب یہ تو بھائی کی یا سہیلی کی قسمت کہ ماموں جان ایک سیاسی پارٹی میں شمولیت اختیار کر کے دو چار بار جیل چلے گئے تھے......اور پھر ایک دن ان کو جیل میں ہی قتل کر دیا گیا...... بقول ...... امی ان کی بھاوج (ممانی) اس وقت جوان تھیں اور بچے چھوٹے تھے...... شروع کے چند سال ماموں جان کی سیاسی سرگرمیوں اور پھر ان کے قتل کے باعث ممانی جان اپنے بچوں سمیت کہیں گم نامی میں چلی گئیں...... امی بے بس تھیں......ہم سب پاکستان میں ہوتے تو مجھے یقین ہے کہ امی اپنی بھابی (سہیلی) کو اس طرح بچوں سمیت گم ہونے نہ دیتیں۔

کافی سالوں دنیا کے مختلف ملکوں میں رہنے کے بعد ابو کی ریٹائرمنٹ کے بعد ہم پاکستان واپس آئے تو مجھے رئیل اسٹیٹ کے بزنس میں اپنا مستقبل تابناک لگا اور چند ہی دنوں میں میرا کاروبار پورے ملک میں پھیل گیا...... میں ساتھ، ساتھ کنسٹرکشن میں بھی ہاتھ ڈال چکا تھا اور چند ایک بڑے، بڑے پروجیکٹ میں مصروف تھا کہ امی کو اپنے مرحوم بھائی کے گم شدہ بچے مل گئے...... گو کہ وہ ہم سے حیثیت میں بہت کم تھے مگر امی نے ان پر مہربانیوں کے دروازے ایسے کھول رکھے تھے کہ لگتا تھا کہ وہ اب تک خود کو ہی ان کا قصور وار سمجھتی رہی ہیں...... وہ دو بھائی بہن تھے...... ماں کا کافی سال ہوئے انتقال ہو گیا تھا۔ بڑا بھائی جو موٹر مکینک تھا اپنی بیوی اور تین بچوں کے ساتھ چھوٹے سے کوارٹر میں رہتا تھا اور اب وہ اپنی چھوٹی بہن کی شادی کے لیے کافی پریشان تھا۔

میں دن بھر مصروف رہتا اور امی نے بھی کبھی مجھے میرے کاروباری معاملات کے دوران تنگ نہیں کیا......مگر میرے ماموں زادوں کے ملنے کے ساتھ ہی وہ اکثر آفس فون کر کے مجھے جلدی آنے کا کہتیں کہ میرے کزنز آئے ہوئے ہیں...... میں نے ماموں زاد بھائی سے تو کئی بار بات چیت کی تھی مگر اس کی بہن شاذو نادر ہی میرے سامنے آئی تھی...... اکثر امی کے ساتھ لگی رہتی...... امی اس پر فدا تھیں...... بقول ان کے وہ ہو بہو اپنی ماں پر گئی تھی۔

اور پھر وہ دن بھی آ پہنچا جس کا مجھے ڈر تھا......امی نے مجھ سے کہا کہ میں اپنی ماموں زاد بہن کو اپنی کمپنی میں کوئی نوکری دے دوں......وہ بہت پڑھی لکھی ہے...... اسکول میں ٹیچری بھی کر چکی ہے اور شام کو ٹیوشن بھی پڑھاتی ہے......وہ اپنے بھائی پر بوجھ کبھی نہیں بنی...... میں اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ یہی ہونا

تھا، وہ لوگ ہمارے قریب آئے ہی اسی لیے تھے......
میں نے امی کو سمجھانا چاہا کہ میری کمپنی کا معیار عام کنسٹرکشن کمپنی سے اونچا ہے...... میرے ہاں نوکری ان لوگوں کو دی جاتی ہے جو اس کام میں پہلے سے تجربہ رکھتے ہوں...... پھر جو کام وہ لڑکی کر سکتی ہے وہ صرف ایک سیکرٹری کا تھا۔ اور میں کسی لڑکی سیکرٹری رکھنے کے لیے فی الحال تیار نہیں تھا...... میرا سیکرٹری ایک ایم بی اے لڑکا تھا جو اپنی ذمے داریوں اور میرے مزاج سے اچھی طرح آگاہ تھا...... اب میں بلاوجہ ایک نئی نویلی لڑکی کو لا کر کام سکھاؤں اور تب تک سارے کام خود کروں...... اور پھر لوگ کیا کہیں گے کہ اپنا رشتے دار ہے تو تعلیم، تجربہ کچھ نہیں دیکھا اتنی اہم پوسٹ پر لا کر بٹھا دیا...... سو میں بالکل تیار نہیں تھا۔

مگر امی نہیں مانیں...... اور وہ اسے لے کر میرے آفس پہنچ گئیں...... میں مصروف تھا مگر اب کیونکہ وہ دونوں آ ہی چکی تھیں تو ان کے لیے وقت نکالنا بھی ضروری تھا...... میں نے امی کو دلاسا دیا کہ وہ گھر چلی جائیں میں ان کی لاڈلی کا چھوٹا سا انٹرویو لے کر اسے کام کے بارے میں سمجھا کر گھر روانہ کر دوں گا...... امی نے کچھ شاپنگ کرنے کا کہا اور واپسی پر دوبارہ آفس آنے کا کہہ کر چلی گئیں۔

میں نے جب اسے آفس میں بلایا اور چند ایک بات کیں تو اندازہ ہو گیا کہ وہ بہت ہی معمولی سی پڑھی لکھی کسی قسم کے بھی آفس ورک سے نابلد لڑکی ہے...... میں نے کمپیوٹر کے بارے میں کچھ سوالات کیے ...... انٹرنیٹ پر ریسرچ کیسے کرتے ہیں...... فون پر کس طرح بات کی جاتی ہے...... میٹنگ میں بیٹھنے پر سیکرٹری کے کیا، کیا کام ہیں...... وہ ہر سوال پر حیران ہو جاتی اور اس کی آنکھیں جو غیر معمولی حد تک بڑی، بڑی تھیں اس کی زبان بن جاتیں...... اب معلوم ہوا کہ یہ اتنی خاموش سی کیوں رہتی ہے...... اس کی تو آنکھیں ہی سب کہہ جاتی ہیں...... لگتا یہی تھا کہ الفاظ اس کی زبان پر نہیں بلکہ ان گہری سیاہ آنکھوں میں اتر آتے ہیں......

میں کچھ دیر تک تو اس کی آنکھوں میں امنڈتے سوالات کھوجتا اور پھر اکتا گیا۔

میں نے جھنجلا کر ہاتھ میں پکڑی پینسل اپنے بائیں طرف شیلف پر رکھی کتابوں پر کھینچ ماری...... اور اسے بے نقط سنانے لگا...... یہی کہ اس نے میری معصوم ماں کو کھلونا بنالیا ہے...... اور یہ کہ میں سب جانتا ہوں کہ اس کا اصل مقصد مجھ تک پہنچنا تھا...... بلیک میل کرنا تھا اور یہ بھی کہ اس کو سوائے میری دولت کے میرے اتنے دن کی انتھک محنت اور جدوجہد نظر نہیں آئی...... اس کے خاندان کے ساتھ جو بھی ہوا اس کا خمیازہ میں کیوں بھگتوں اور یہ کہ میں اپنی ماں سے اتنی محبت اور ان کی اتنی عزت کرتا ہوں کہ ان کے صدقے میں یہ سب جان بوجھ کر بھی اس کو نوکری دے رہا ہوں...... بس اتنا کہ میرا سابقہ سیکرٹری برقرار رہے گا اور وہ صرف امی کو دکھانے کے لیے آفس آیا کرے گی اور اس دکھاوے کے لیے میں اچھی خاصی رقم بطور تنخواہ ہر ماہ پکڑا دیا کروں گا...... یہ سب سنانے کے بعد میں نے مزید ایک جملہ کہا۔ ”اب آپ جا سکتی ہیں۔“

اور جلدی سے نظریں پھیر لیں...... میں اس کی آنکھوں میں دوبارہ دیکھنا ہی نہیں چاہتا تھا...... جانتا تھا کہ وہاں کہانیاں ہی کہانیاں ہوں گی...... کچھ دیر میں امی واپس آ گئیں اور وہ امی کے ساتھ واپس چلی گئی اور میں اپنے دن بھر کے معمولات میں مصروف ہو گیا...... شام کو گھر کے لیے نکلا تو مجھے آج کے دن کی اپنی ساری کارستانی یاد آ گئی اور میں تیار تھا کہ گھر پہنچنے پر امی سے خوب باتیں سننے کو ملیں گی۔ اپنے فیملی ڈاکٹر انکل کی گاڑی پورچ میں کھڑی دیکھ کر میرے اوسان خطا ہونے لگے۔

”یا اللہ...... امی نے میری باتوں کا اتنا اثر لے لیا؟“ امی کے کمرے کے دروازے پر انکل سے ملاقات ہو گئی جو اپنے مخصوص انداز میں گہری سوچ میں تھے...... انہوں نے مجھے دیکھتے ہی ساتھ... تاسف سے آہ بھری۔

"بہت گہرا ذہنی جھٹکا لگا ہے بیچاری کو...... بخار رات بھر رہے گا...... اس لیے پریشان نہ ہونا...... بس احتیاط لازمی ہے...... دوائی وقت پر دیں اور غذا میں دودھ اور سوپ...... اللہ شفا دینے والا رحیم و کریم ہے۔" میں معصوم سی شکل بنائے ان کی ہدایات سنتا رہا...... کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ امی اس کے سرہانے بیٹھی اس کا سر دبا رہی ہیں...... وہ آنکھیں موندے بے سدھ پڑی تھی...... امی مجھ سے ناراض تھیں مگر ان کو ابھی اس کی بیماری میں کچھ اور سوجھ بھی نہیں رہا تھا...... امی نے مجھے ہدایات دیں کہ میں اس کے بھائی کا نمبر ملا کر اس سے بات کروں...... میں نے جھٹ فرمانبردار اولاد کی طرح سے اس کے بھائی کا نمبر ملا کر فون امی کو دے دیا...... امی نے بہت سلیقے سے بات کی...... اور پھر تھوڑی دیر میں دوبارہ فون کرنے کا کہہ کر بند کر دیا۔

اصولاً تو اس کے بھائی کو فوراً ہی اپنی بہن کی بیماری کا سن کر آ جانا چاہیے تھا کہ آخر اسے ہوا کیا ہے...... اس کی بہن نے بھی بات کی اور اسے خوب بلایا مگر وہ یہ کہہ کر ٹال گیا کہ جس علاقے میں وہ رہتا ہے وہاں حالات بہت خراب ہیں اور سڑکوں پر گولیاں چل رہی ہیں...... امی نے پوچھا کہ ہم لے کر آ جائیں تو بھی نہ مانا...... میں کیونکہ ان دونوں میاں، بیوی کی آپس میں بات چیت سن چکا تھا اس لیے جانتا تھا کہ وہ دونوں عہد کر کے بیٹھے ہیں...... کوئی بھی دلیل ان کی سمجھ میں نہیں آئے گی...... میں لاؤنج میں بیٹھا تھا اور اس کے بھائی، بھاوج کی اس غیر اخلاقی حرکت پر غور کر رہا تھا کہ امی بھی اس کے سو جانے پر لاؤنج میں آ گئیں۔

تمام روداد سن کر امی نے مجھے بتایا کہ بھائی، بھاوج اس کے ساتھ ایسا ہی ظالمانہ رویہ رکھتے ہیں...... غربت کے باعث دونوں بھائی بہن کی تعلیم معمولی سی ہوئی...... اور شادی کے بعد سے بھائی کو اپنی بہن ایسی ہی کچھ بھاری ہو گئی ہے کہ وہ امی سے کئی بار باتوں باتوں میں اسے امی سے گھر میں ملازمہ کے طور پر ہی رکھ لینے کی گزارش کر چکا ہے۔

میں نے تصور میں ہی اسے ایک ملازمہ کے طور پر اپنے گھر کے مختلف کام کرتے، جھاڑ پونچھ کرتے...... کھانا پکاتے یا چائے دیتے ہوئے دیکھا تو اداس ہو گیا...... "ملازمہ تو خیر نہیں لگتی۔" میں نے دل میں سوچا...... امی بھی کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں...... پھر وہ گویا ہوئیں۔

"ویسے تو یہ میرے مرحوم سگے بھائی کی اولاد ہے...... اس کو تو میں پھوپی کی حیثیت سے بھی رکھ سکتی ہوں اور ایک اور حیثیت سے بھی یہ اس گھر میں آ سکتی ہے...... مگر......" امی نے میری طرف کن انکھیوں سے دیکھ کر بات جاری رکھی۔

"تم سے ڈر لگتا ہے...... میں تم پر ایسا کوئی بوجھ ڈالنا نہیں چاہتی جو پہلے میں نے اپنی دوست پر ڈالا تھا اور جس کا خمیازہ وہ بیچاری ساری زندگی بھگتی رہی اور اب اس کی اولاد بھی......"

امی روہانسی سی ہو کر بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہو گئیں...... میں نے دل ہی دل میں اسے دوسری حیثیت سے اپنے گھر میں چلتے پھرتے، امی سے باتیں، شاپنگ پر جاتے، مجھے آفس میں فون کرتے، میرے ساتھ تیار ہو کر نکلتے دیکھا تو بے اختیار مسکرا اٹھا۔

"خیر میں ماموں جان کی طرح جیل جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا...... اور نہ ہی میرا ارادہ کسی سیاسی پارٹی میں شمولیت کا ہے...... لہٰذا اس لحاظ سے تو آپ کی بھتیجی ہمیشہ محفوظ رہے گی۔"

"یہ تو ہے......" امی نے پہلے تو میری بات پر معمول کے مطابق ہاں میں ہاں ملائی پھر میری بات کی گہرائی کا اندازہ کر کے مجھے چونک کر غور سے دیکھنے لگیں...... اور پھر مجھے مسلسل مسکراتا ہوا دیکھ کر خود بھی مطمئن سی ہو کر مسکرانے لگیں۔

چار پل کم نہیں تھے

ہما بیگ



وقت جیسا بھی ہو گزر ہی جاتا ہے بس اپنے تلخ و شیریں اثرات چھوڑ جاتا ہے۔ اچھی بھلی زندگی گزر رہی تھی کہ اچانک سلمٰی بی بی کے شوہر رضا کی نوکری ختم ہوگئی۔ آج کل کے زمانے میں اچھا عزت دارانہ کام ملنا آسان کام ہے بھلا...... دونوں نے سوچا اپنا کاروبار شروع کرتے ہیں۔ دونوں کے ہی لیے نیا تجربہ...... سلمٰی نے کبھی گھر سے بلاوجہ قدم باہر نہیں رکھا تھا اور رضا نے زندگی بھر افسری کی تھی۔ مگر جان پر جب بنتی ہے تو سب کرنا پڑتا ہے۔ کام بھی ایسا کہ 18 گھنٹے کی ذمّے داری...... صبح سے رات تک ایک پاؤں پر کھڑے رہنا کیونکہ جب کام والوں پر بھروسا کیا تو انہیں نقصان اٹھانا پڑا۔ سچ ہے مالک جب تک خود موجود نہ ہو کوئی ذمّے داری سے کام نہیں کرتا۔

"امی جانی کب گھر آؤ گی بہت یاد آرہی ہو۔" سلمٰی کی چھوٹی بیٹی یونیورسٹی سے آکر فون کرتی، اس نے کبھی ماں کے بغیر گھر نہیں دیکھا تھا۔ اب ایک دم تنہائی ...... سو پریشان ہوا تھی۔

"میری شہزادی سمجھنے کی کوشش کرو، ابھی میں نہیں آسکتی، تم کھانا کھا کر سو جاؤ مجھے اور ابو کو دیر ہو جائے گی۔"

"میں آپ کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی، بس میں ایسے ہی سونے جارہی ہوں۔" آمنہ نے غصے سے فون رکھ دیا۔

آمنہ تھی بھی سب بہنوں میں چھوٹی اور لاڈلی...... بڑی دونوں بہنوں کی شادیاں ہوچکی تھیں اور وہ دوسرے ملکوں میں آباد تھیں۔

سلمٰی اور رضا جب گھر آتے تو وہ بغیر کھانا کھائے سو چکی ہوتی...... اس وقت سلمٰی کا بھی تھکن سے برا حال ہوتا خود اس کی بھی ہمت جواب دے چکی ہوتی تھی۔ وہ کہاں بیٹی کو سوتے سے اٹھا کر لاڈ اٹھاتی۔

روز اسی طرح صبح بھاگتے دوڑتے ماں، بیٹی کی ملاقات ہوتی اور رات بغیر ملاقات کے گزر جاتی۔ کاروبار

بھی ایسا کہ کوئی چھٹی نہیں۔ اس دن سب سے زیادہ آمنہ اداس ہوتی، ویسے تو دن گزر ہی جاتے تھے...... رات کو اکثر جب وہ کام سے واپس آتے تو آمنہ کو اپنا منتظر پاتے' وہ لاڈ سے ماں سے کہتی۔

''مما میرے ساتھ آکر لیٹو ناں، باتیں کریں گے۔''

''بچے جی ابھی گھر کے کام بھی تو نبٹانے ہیں، کیسے لیٹ جاؤں، تم ابو سے باتیں کرو۔'' آمنہ منہ بسور کے رہ جاتی۔ اس کی شکل دیکھ کر ماں دل مسوس کے رہ جاتی مگر ذمے داریوں کا احساس اس کو ممتا کے جذبات کے سامنے جھکنے نہ دیتا۔

ایسے میں ایک بھلے گھر کا رشتہ آمنہ کے لیے آگیا۔ ہر لحاظ سے وہ رشتہ آمنہ کے لیے مناسب تھا۔ سب کچھ جلدی، جلدی طے ہوگیا۔ اور شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ سب کچھ یوں تو ٹھیک تھا مگر انہوں نے اپنی تمام جمع پونجی کاروبار میں لگادی تھی۔ شادی کا انتظام کیسے ہوتا۔

ان کی راتوں کی نیندیں اڑ گئیں۔ رضا کی پریشانی دیکھ کر سلمٰی اس کو تسلی دیتی۔

''میاں جی پریشان نہ ہوں۔ اللہ پہ چھوڑ دیں' اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اپنے بندے کو کبھی اپنے در سے خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا۔ اس پر بھروسا رکھو وہی ہماری عزت رکھے گا انشاء اللہ۔''

اب دونوں میاں، بیوی نے اپنی بہترین کوششیں کاروبار کی ترقی پر لگادی۔ سب سے بڑا مسئلہ پہلے دن سے یہی تھا کہ کاروبار میں غلط کام کر کے رات بھر میں کہیں سے کہیں پہنچا جاسکتا تھا مگر ان دونوں نے اصولوں پہ سودے بازی نہیں کی۔ انہیں اپنی محنت اور صلاحیت پر بھروسا تھا۔

شادی کی تیاریاں شروع ہونے کو تھیں' آمنہ چاہتی تھی کہ ماں کے ساتھ کام کرے مگر ماں کے پاس وقت نہیں تھا وہ بھی تو دن رات اپنے گھر اور بچوں کے لیے ہی محنت کر رہی تھی۔

''امی میرے ساتھ شادی کے جوڑے کے لیے تو چلیں۔'' آمنہ ماں کی خوشامد کرتی۔

''آمنہ تم سمجھدار ہوگئی ہو، بچوں کی طرح ضد نہ کرو اپنی دوستوں کے ساتھ چلی جاؤ...... اب تو فیس بک پر یہ سب کچھ ہوتا ہے' اسی پر پسند کر کے آرڈر دے دو۔''

''ٹھیک ہے، آپ میرے ساتھ نہ جائیں' میں خود سب کرلوں گی۔'' وہ زچ ہو کر کہتی۔

اور پھر اس نے سب کچھ خود ہی کرلیا...... شادی ہال سے لے کر کارڈ، زیور، کپڑے حتیٰ کہ ماں اور باپ کے کپڑے بھی۔

''اللہ خوش رکھے، بڑی سمجھداری سے سارے کام نبٹائے ہیں میری بیٹی نے۔'' سلمٰی اس وقت تو کہہ کر رہ گئی۔

مگر دوسری طرف وہ اندر ہی اندر ٹوٹ رہی تھی۔ شوہر کی ہمت بڑھانا، کاروبار میں محنت، گھر کی ذمے داریاں...... آمنہ سے جدا ہونا، اس بچی نے بچپن سے ماں باپ کی بہت خدمت کی تھی۔ کبھی ان کو اداس نہیں ہونے دیا تھا وہی تو والدین کے جینے کا سہارا تھی مگر کون اپنی بیٹی کو گھر رکھ پایا ہے وہ تو پرایا دھن ہوتی ہے۔ جان سے پیاری بیٹی تین بول پڑھ کر اجنبی ہو جاتی ہے۔

اور پھر رخصتی کا دن بھی آگیا۔ اللہ پاک نے اوقات سے بڑھ کر نوازا، یہ اسی کے کام ہیں بندے کی سوچ بھی وہاں تک نہیں پہنچ پاتی۔

بیٹی کی رخصتی سے پہلے رضا کو پہلے سے اچھی جاب مل گئی انہوں نے جلدی سے کاروبار بند کیا تاکہ شادی کے کام کرسکیں...... یوں سب احسن طریقے سے انجام پاگیا۔

مگر اب جب سلمٰی گھر میں ہوتی ہے تو اس کو آمنہ کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

''مما جانی گھر آجاؤ ناں...... میں بور ہو رہی ہوں، کہیں باہر کھانے پر چلتے ہیں۔''

صرف آوازیں، اب گھر کی تنہائیاں ہیں اور یادیں...... وہی سب کچھ ہے مگر پیار سے گھر بلانے والا کوئی نہیں...... مجبوریاں بھی پچھتاوے کا سبب بنتی ہیں، سلمٰی پورے گھر میں بولائی، بولائی پھرتی تھی۔

پیار کے لیے چار پل کم نہیں تھے
کبھی تم نہیں تھے کبھی ہم نہیں تھے



سرِ آئینہ مرا عکس ہے پسِ آئینہ کوئی اور ہے

شیریں حیدر

ایک تھی مریم...... بہت پیاری، بھولی بھالی سی بچی۔ ایک تھے اس کے ابا جن کا نام تھا سہیل اور ایک تھیں اس کی اماں جن کا نام تھا رابعہ۔ مریم کے دو بھائی تھے خلیق اور لئیق لیکن اُن کا ذکر اس کہانی میں یہیں پر ہوگا کہ ان کا ہونا اور نہ ہونا ایک برابر ہے اور مریم کی کہانی سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ خلیق کے بعد لئیق کے باہر چلے جانے سے مریم گویا اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد بن گئی تھی، ان کی ساری محبت، توجہ اور ظاہر ہے کہ ان کے وسائل بھی

مریم کے لیے ہی تھے۔ مریم کی اماں ایک نجی اسکول میں ہیڈ مسٹریس تھیں وہ انتہائی باذوق، تعلیم یافتہ اور بردبار سی خاتون تھیں اور مریم کے ڈاکٹر والد کی بہترین رفیقہ۔ ان دونوں کی خواہش تھی کہ مریم بہت سا پڑھے اور مریم نے ان کی خواہش پر ہی نہ صرف بہت سا پڑھا بلکہ بہترین اداروں سے اور بہترین پوزیشنیں حاصل کر کے پڑھا، اس کے ہوتے ہوئے اس کے والدین کو اپنے بیٹوں کی بھولی بسری یاد آتی تھی مگر اگلے ہی لمحے مریم انہیں اپنی خوشگوار طبیعت کے باعث اس طرح بہلاتی کہ وہ اپنے آنسو خشک کر لیتے۔

تعلیمی میدان میں معرکے سر کرتی ہوئی مریم نے عملی میدان میں قدم رکھا اور ایک اہم ادارے میں ملازمت اختیار کر لی۔ وہ اس ادارے میں انتظامی عہدے پر تھی اور اس کی نرم طبیعت کے باوصف اس کی احتیاط پسندی تھی کہ اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، کسی ماتحت کو جرأت نہ ہوتی کہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا نہ ہی کسی اعلیٰ افسر کی تاب کہ اس پر خواہ مخواہ میں رعب جھاڑتا۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتی اور ہر کام منظم طریقے سے اور وقت پر پورا کرتی...... اپنی انہی عادات کے باعث وہ اپنے پورے محکمے میں عزت اور احترام کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔

بیٹیاں چاہے جو بھی کر لیں، ان کے فرض سے بہ عافیت فارغ ہونا ہر ماں باپ کے دل کی خواہش ہوتی ہے، مریم کے ماں باپ نے بھی جب مریم کی شادی کی بابت سوچا تو سب سے پہلے اسے کو ہی اعتماد میں لیا اور اس سے اس کی رائے پوچھی اور یہ کہ اگر کوئی لڑکا اس کی نظر میں ہو یا کوئی ایسا جسے وہ پسند کرتی ہو! مریم نے فرمانبرداری سے سارا اختیار اپنے ماں باپ کو تفویض کر دیا اور بتایا کہ اس کے ساتھ عمر بھر میں ایسا کوئی سلسلہ نہیں ہوا۔ مریم کی اماں نے اپنی جاننے والیوں سے کہا اور انہی کے توسط سے کبھی کوئی اور کبھی کوئی مریم کو دیکھنے کے لیے آنے لگا۔ ابھی تک مریم کے والدین کو کوئی رشتہ اس کے حساب سے اچھا نہیں لگا تھا۔ مریم بھی پُر اعتماد تھی کہ اس کے والدین اس کے لیے جو بھی انتخاب کریں گے وہ بہترین ہو گا۔

☆☆☆

''ماشاء اللہ......'' مریم کے کمرے میں داخل ہوتے ہی کئی آوازوں نے کہا، وہ محجوب سی ہو کر اپنی ماں کے ساتھ سمٹ کر بیٹھ گئی۔ ''بہت پیاری بچی ہے!'' ماں کے ساتھ بیٹھی خاتون نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ چند لمحے پہلے ہی وہ سب لوازمات سے بھرپور چائے پی کر فارغ ہوئے تھے۔

''کیا کرتی ہو بیٹا گھر پر سارا دن؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''جی جاب سے واپس آتی ہوں۔ آج کل تو مما کچن میں کسی نہ کسی کام پر لگائے رکھتی ہیں...... وہ کہتی ہیں کہ لڑکیوں کو کام کار بھی آنا چاہیے۔'' اس نے کہا۔ ''ویسے مجھے کتابیں پڑھنے کا شوق ہے اس لیے فارغ وقت میں کتابیں پڑھتی ہوں۔''

''ماشاء اللہ...... یہ تو بڑا اچھا شوق ہے۔'' خاتون نے مزید کہا۔

''کیا پڑھتی ہیں آپ؟'' ایک جوان اور شوخ سی لڑکی نے سوال کیا۔ ''اسلامی کتابیں وغیرہ پڑھنے کا شغف ہے آپ کو تو ہمارے پاس بہت سی کتابیں ہیں......''

''جی میں سب کچھ پڑھ لیتی ہوں، جو بھی مل جائے، ویسے آج کل شاعری پڑھ رہی ہوں!'' اس نے ہولے سے کہا، سر اٹھا کر ایک لمحے کے لیے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھا جس کے حوالے سے وہ سب لوگ اس وقت اسے ناقدانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے، اس کا دل عجیب سے انداز سے دھڑکا، اس نے فوراً سر جھکا لیا مبادا کہ وہ بھی اسی لمحے اسے دیکھ لیتا، دفتر میں وہ درجنوں مردوں کی باس تھی مگر اس وقت ایک شخص کی وجہ سے اس کی دھڑکنیں اتھل پتھل ہو گئیں۔

''آپ آئیں ناں کسی وقت ہماری طرف......'' لڑکے کی ماں نے مریم کی ماں سے کہا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ انہیں مریم پسند آ گئی تھی، رواج کے مطابق لڑکے والوں کا لڑکی والوں کو یوں کہنا اسی بات کا غماز

ہوتا ہے کہ انہیں سب کچھ پسند ہے اور وہ لڑکی والوں کی طرف سے مطمئن ہیں۔

''جی آئیں گے ضرور کسی وقت......'' انہوں نے مسکرا کر کہا۔

''ارے ہاں بیٹا، پوچھنا تھا کہ تم کون سے دفتر میں کام کرتی ہو؟'' لڑکے کے باپ نے پوچھا۔ مریم نے ان کی طرف سوالیہ نظر سے دیکھا، اس سوال کی اسے سمجھ نہ آئی تھی پھر بھی اس نے انہیں اپنے دفتر کا بتایا۔

''مریم کے دفتر کا کیوں پوچھا آپ نے؟'' مریم کے ابا نے سوال کیا۔

''مائنڈ نہ کیجیے گا بھائی صاحب، ہم نے عمر بھر کے لیے رشتہ جوڑنا ہے انشاء اللہ...... اور میں چاہتا ہوں کہ اپنی ہونے والی بہو کے بارے میں ہر طرح سے تسلی کروالوں، مردوں کے ساتھ دفتروں میں کام کرنے والی لڑکیوں کے بارے میں ہر طرح سے تسلی ہونا بہت ضروری ہے ناں، کل کلاں کو کوئی بات نکلے اور اس وقت صورتِ حال خراب ہو تو بہتر ہے کہ ابھی سے......'' اس بات پر مریم کے ابا کا خون کنپٹیوں سے ٹکرانے لگا، جی تو چاہا کہ اُن کے منہ پر ایک گھونسا ماریں مگر کمالِ ضبط دکھا گئے وہ، مریم اور اس کی اماں بھی ان کی اس خاموشی پر حیران تھیں مگر کچھ کہہ نہ سکیں۔

☆☆☆

''کیا ارادہ ہے سہیل؟'' مریم کی اماں نے سوال کیا۔ ''کیا جانا ہے سلمان کے گھر؟''

''چند دن ٹھہر جاؤ......'' انہوں نے پُراسرار سے لہجے میں کہا۔

''میں تو اس دن سلمان کے ابا کی بات سن کر ششدر رہ گئی تھی، یوں تو سب اچھا لگا مجھے مگر ان کی بات بہت عجیب تھی اور اس سے بھی بڑھ کر عجیب بات یہ کہ آپ نے اس پر خاموشی اختیار کی۔'' بیوی کی اس

بات کے جواب میں بھی وہ خاموش رہے، کہیں خلا میں کچھ تک رہے تھے۔

''وہ لوگ اپنی تسلی کرلیں پھر جب وہ کہیں گے تو ہم چلے جائیں گے!'' انہوں نے کافی توقف کے بعد رابعہ کو جواب دیا۔

''اب وقت آ گیا ہے سہیل کہ ہمیں ان چند رشتوں میں سے کوئی رشتہ فائنل کر دینا چاہیے...... باقی سب میں سے تو ہم نے ان کے گھر تک جا کر دیکھ لیے......کلثوم آپا کا بیٹا گھر کا دیکھا بھالا بچہ ہے، میں چاہتی تھی کہ پہلے ہم اپنی تسلی کر کے اپنے دل میں جو ارادہ بنائیں، میں اس کی بابت مریم سے پوچھ لوں گی۔''

''ہاں کلثوم کا جاوید دیکھا بھالا تو ہے رابعہ مگر تعلیم میں کچھ کم ہے اور مرد کسی بھی معاملے میں عورت سے کمتر ہو تو وہ اور طریقوں سے اس پر حکمرانی کرنے کی کوشش کرتا ہے......کوئی مرد، عورت کو برابری یا برتری کی سطح پر دیکھنا پسند نہیں کرتا۔''

''تو پھر؟'' انہوں نے سوال کیا۔ ''اسلم صاحب کے علی کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''رابعہ......'' انہوں نے گہری سانس لی۔

''اگلے پل کیا ہونا ہے اور کہاں ہماری بیٹی کا نصیب لکھا ہے، میں نہیں جانتا مگر ایک خواہش ہے کہ اپنی اکلوتی بیٹی کو اس ملک سے باہر نہ بھیجوں...... باہر جا کر میرے دونوں بیٹے کبھی لوٹ کر آنے والے نہیں، ان کا اور ان کے بچوں کا مستقبل اب وہیں ہے، بیٹی یہاں ہو گی کل کلاں کو اس کے بچے ہمارے بڑھاپے کی رونق ہوں گے، کبھی کبھار ہمیں اپنے مصروف وقت میں سے چند لمحے نکال کر ملنے کو آ جایا کرے گی تو یہی ہمارے بڑھاپے کی ساری خوشیاں ہوں گی، بیٹوں کی شکل دیکھنے کو سالوں سے ترس رہے ہیں......'' ان کی اس بات کا کوئی جواب رابعہ کے پاس نہ تھا کہ بیٹوں کی جدائی سے وہ خود بھی اداس رہتیں اور یہی خوف انہیں بھی دہلاتا تھا کہ کل کلاں کو بیٹی بھی رخصت ہو کر کہیں دور چلی گئی تو۔

☆☆☆

''رابعہ بہن...... آپ پروگرام بنائیں ناں ہماری طرف آنے کا!'' سلمان کی اماں کی کال آئی تھی۔ ''چھ ہفتے گزر گئے ہیں، آپ لوگ آئے نہیں!''

''جی، جی...... سہیل آتے ہیں تو ان سے بات کرتی ہوں، جلد ہی ہم چکر لگائیں گے انشاء اللہ!'' انہوں نے اپنے مخصوص نرم لہجے میں کہا۔

''ہمیں اب ہر طرح سے تسلی ہے، اب آپ نے ضرور اور بہت جلدی آنا ہے!'' انہوں نے ایک بار پھر اصرار کر کے فون بند کر دیا۔

شوہر کی اسپتال سے واپسی پر رابعہ نے انہیں ساری بات بتائی اور ان سے جلد پروگرام بنانے کو کہا، دل ہی دل میں سوچ رہی تھیں کہ شاید سہیل منع کر دیں گے مگر انہوں نے انہیں اپنا عندیہ دے دیا تو انہیں لگا کہ سہیل کو سلمان پسند آ گیا تھا اسی لیے تو اس کے باپ کی انوکھی اور کڑوی بات کو گولی کی طرح نگل لیا تھا......

اگلے ہی روز انہوں نے کال کر کے سلمان کی ماں کو اپنے پروگرام کی بابت بتا دیا اور تیاری کرنے لگیں، کون سا کوئی لمبا چوڑا سلسلہ تھا، دونوں میاں بیوی کو ہی جا کر سلمان کا گھر بار دیکھ کر آنا تھا اور ممکن ہے کہ اس کے بعد یہی رشتہ فائنل ہو جاتا۔

سادگی سے تیار ہو کر رابعہ اور سہیل سلمان کے گھر پہنچے، ان کی خاطر تواضع میں کوئی کمی نہ رکھی گئی تھی مگر ان کی تواضع پھر بھی اس تواضع سے کم تھی جو رابعہ نے ان کی کی تھی مگر لڑکے اور لڑکی والوں میں ایسا فرق تو ہماری معاشرت کا حصہ ہے۔ اصرار کر کر کے انہیں چائے کے سارے لوازمات کھلائے جا رہے تھے۔

''آپ نے کہاں سے پڑھا بیٹا؟'' سہیل نے سلمان سے سوال کیا۔

''جی انکل وہ......'' اس نے تابعداری سے ان کے سوال کا جواب دیا۔

''اچھا......کو ایجوکیشن ہے ناں وہ ادارہ تو؟''

سہیل نے سلمان سے پوچھا۔
''جی انکل......'' اس نے پھر کہا۔ ''میں تو شروع سے ہی کوایجوکیشن میں پڑھا ہوں۔''
''اچھا!'' سہیل نے پُرسوچ انداز میں سر ہلایا۔
''دفتر میں تو سارا عملہ مردوں پر ہی مشتمل ہو گا ناں؟'' انہوں نے اگلا سوال کیا۔
''ارے نہیں انکل......'' اس نے فوراً کہا۔ ''ہمارے دفتر میں تو زیادہ تر لڑکیاں ہیں، لڑکے بہت ہی کم ہیں، ہمارے باس کا خیال ہے کہ لڑکیاں زیادہ محنتی ہوتی ہیں، اپنے کام سے کام رکھتی ہیں......'' اس نے وضاحت کی۔
''ارے بھائی، اِدھر اُدھر کی باتیں چھوڑ کر اب کیوں نہ اس بات کو فائنل کرلیا جائے......'' سلمان کے ابا نے مداخلت کی۔
''ہاں، ہاں کیوں نہیں!'' سلمان کی اماں نے تائید کی۔ ''ہمیں سب کچھ پسند ہے بھائی صاحب، امید ہے کہ آپ کو بھی ہم اور ہمارا بیٹا پسند آیا ہوگا، اب تاخیر کا کوئی جواز نہیں، آپ بتائیں کہ ہم بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرنے کے لیے کب آئیں؟''
''ہاں، ہاں......'' سلمان کے ابا بولے۔ ''اب واقعی اس نیک کام میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے!''
''آپ نے اپنی ہر طرح تسلی کر لی ناں بھائی صاحب؟'' سہیل نے ان سے سوال کیا۔
''ارے ہاں ...... ہر طرح سے تسلی کر لی ہے، کوئی رکاوٹ اب راہ میں حائل نہیں!'' انہوں نے پورے جبڑے کو پھیلا کر کہا، اچھے خاصے عہدے پر فائز بہو ملنے والی تھی ان کو۔ ''امید ہے کہ آپ نے برا نہیں منایا ہوگا، کرنا پڑتا ہے بھائی صاحب!''
''کیوں نہیں ...... بے شک، دو بچوں ہی نہیں بلکہ دو خاندانوں کے عمر بھر کے ساتھ کا معاملہ ہوتا ہے، دو ایک دن کی بات تو نہیں......'' سہیل نے کہا۔ ''اور اس میں برا منانے کی بات ہی کیا ہے، آپ کا حق تھا اور آپ کی ضرورت بھی سو آپ نے کیا!''

''جی، جی!'' سلمان کے والد کھسیانے سے ہو کر بولے۔ ''تو اب کون سا مبارک دن طے کیا جائے؟''
''کرلیں گے بھائی صاحب، دن بھی طے کرلیں گے......'' سہیل نے بے پروائی سے ایک سموسے کو چٹنی لگائی۔ ''ذرا میں سلمان میاں سے تو کچھ استفسار کرلوں۔''
''ہاں، ہاں کیوں نہیں...... جو چاہے پوچھیں!'' سلمان کی والدہ نے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔
''سلمان میاں...... ایسا ہے کہ تم کوایجوکیشن میں پڑھتے رہے ہو ہمیشہ سے، یہی بتایا ناں تم نے......''
''جی، جی انکل!'' سلمان نے فخر سے کہا۔
''تمہارے دفتر میں بھی لڑکوں سے زیادہ لڑکیاں کام کرتی ہیں!'' انہوں نے سموسے کا آخری نوالہ لیتے ہوئے کہا۔
''بالکل......'' سلمان نے حیرت سے کہا۔
''تو بیٹا...... ایسا کرو کہ مجھے ایک کاغذ پر اپنے اسکول، کالج، یونیورسٹی اور دفتر کی تفصیلات لکھ دو!''
''وہ کس لیے بھائی صاحب؟'' سلمان کے بجائے اس کے والد صاحب نے پوچھا۔
''دیکھیے ناں بھائی صاحب......'' انہوں نے پانی کا گلاس منہ سے لگایا۔ ''مریم میری اکلوتی اور نازوں پلی بیٹی ہے...... نیک، تعلیم یافتہ، سلیقہ شعار، باکردار اور اعلیٰ عہدے پر فائز ہے...... آپ نے اس کے کردار کے بارے میں بھی چیک کروالیا ہے ناں، کوئی شکایت تو نہیں ملی آپ کو؟''
''نہیں، نہیں ...... ہرگز نہیں!'' سلمان کے ابا جوش سے بولے۔ ''اس کے دفتر میں تو لوگ اس کی بہت تعریف کرتے ہیں اور کسی قسم کے شبہ یا شک کی گنجائش نہیں نکلی، ہمیں پورا اطمینان ہے!''
''آپ نے تو اپنا اطمینان کرلیا بھائی صاحب، ہماری اکلوتی بیٹی نے اپنی شادی کے فیصلے کا اختیار ہمیں تفویض کر کے ہم پر بڑی بھاری ذمے داری ڈال دی ہے...... تو ہمارا بھی تو حق ہے ناں کہ ہم اپنا اطمینان کرلیں؟''

''کس قسم کا اطمینان کرنا چاہتے ہیں آپ؟'' انہوں نے حیرت سے سوال کیا۔

''جس قسم کا اطمینان آپ نے کیا۔'' انہوں نے سکون سے کہا۔

''یعنی آپ ہمارے بیٹے کے کردار کے بارے میں اس کے دفتر اور یونیورسٹی سے چیک کریں گے؟'' ان کا لہجہ گرم ہونے لگا۔

''کیوں نہیں...... کوئی دو چار دن کی تو بات نہیں بھائی صاحب، ہم نے عمر بھر کے لیے جس شخص کے ہاتھ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ دینا ہے اس کے بارے میں ہمیں ہر طرح کی تسلی کرنے کا حق تو ہے ناں؟'' سہیل نے آہستگی سے کہا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے خود بھی تائید کی ہے کہ ہمیں یہ حق حاصل ہے......''

''لڑکوں کے کردار کے بارے میں کون چیک کرتا ہے سہیل صاحب؟'' انہوں نے بھنا کر کہا۔

''کیوں...... کردار صرف عورتوں کا وصف ہے اور کردار کی کمزوریاں صرف عورت سے ہی مختص کیوں کی جاتی ہیں؟ اگر آپ کو یہ لگا کہ آپ کی بہو باکردار ہونی چاہیے اور آپ نے اس کے دفتر تک جا کر اس کے کردار کے بارے میں چیک کیا، تو ہمیں بھی تو حق حاصل ہے کہ ہم اپنی بیٹی کے لیے ایک باکردار شخص کا انتخاب کریں!'' انہوں نے تحمل سے کہا۔

''یہ بات آپ کو اسی دن کہنا چاہیے تھی کہ ہم آپ کی بیٹی کے بارے میں باز پرس نہ کریں!'' انہوں نے خفگی سے کہا۔

''اس دن کہتا جناب تو آپ سمجھتے کہ ضرور ہماری بیٹی کے کردار میں کوئی کجی ہے اس لیے میں نے آپ کی بات پر اعتراض نہیں کیا، اب جبکہ آپ اپنی تسلی کر چکے ہیں کہ ہماری بیٹی کے کردار پر کسی نے انگلی نہیں اٹھائی تو اب ہماری باری ہے...... کیوں ٹھیک کہا ناں میں نے!''

''لڑکی والوں کو ایسی باتیں کرنا زیب نہیں دیتا بھائی صاحب!'' اب کے سلمان کی اماں نے دخل دیا۔

''کیوں لڑکی والے کس طرح لڑکے والوں کے زیر بار ہوتے ہیں؟ اپنے جگر کا ٹکڑا پال پوس کر لڑکے والوں کے حوالے کرنے والوں کو کمتر کیوں سمجھا جاتا ہے؟'' انہوں نے تاسف سے کہا۔

''دیکھیے......'' سلمان کی اماں آئیں بائیں شائیں کرنے لگیں۔

''معذرت چاہتے ہیں بہن جی، ہمیں ایسے لوگوں میں بیٹی نہیں بیاہنی جو دوسروں کی بیٹیوں کو تو چھلنی میں سے گزار کر جانچیں اور خود اپنے بیٹے کی باری آئے تو انہیں برا لگے...... مجھے یقین ہے کہ کوئی آپ سے آپ کی بیٹی کی بابت بھی یوں بات کرتا تو آپ کو برا لگتا!''

''ہماری بیٹی کوئی غیر مردوں کے ساتھ کام تو نہیں کرتی دفتر میں!'' انہوں نے فوراً کہا۔

''یہی تو سوچ ہے آپ کی کہ گھر سے باہر نکل کر کام کرنے والی ساری لڑکیوں میں کوئی نہ کوئی عیب ضرور ہوتا ہے...... آپ کا بیٹا بھی...... تو ایسے ہی دفتر میں کام کرتا ہے ناں وہ بھی تو کردار کا ہلکا ہو سکتا ہے......'' انہوں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''چلیں رابعہ بیگم!''

''جی!'' کہہ کر وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئیں، انہیں بھی اس روز تک الجھن ہی تھی کہ ان کے شوہر کیسے اس بات کو ہضم کر گئے تھے۔

''دیکھیے بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں......'' سلمان کے ابا نے کہا۔

''بات ختم ہو گئی ہے بھائی صاحب، مجھے آپ لوگوں کی سوچ اس رشتے کی بنیاد پڑنے سے پہلے ہی سمجھ میں آ گئی ہے...... اللہ کا لاکھ، لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھے آپ کا اصلی چہرہ دکھا دیا ہے!''

سلمان ہکا بکا یہ سب دیکھ رہا تھا، اس کی اماں سونے کی چڑیا ہاتھ سے نکلنے پر تاسف سے ہاتھ مل رہی تھیں اور اس کے ابا کا سر جھک کر ان کی ٹھوڑی سے جا لگا تھا اور ان کی اپنی نظر ان کے گریبان میں جھانک رہی تھی۔

اے عشق ترے ہیں کھیل عجب

دُرِّ ثمن بلال

وہ کمالِ ہنر یوں بھی کرتا گیا
زخم دیتا گیا زخم بھرتا گیا
دُور اُس کی نگاہوں سے منزل ہوئی
جادۂ عشق میں جو بھی ڈرتا گیا
رات پھولوں پہ شبنم برستی رہی
رنگ پھولوں کے رخ کا نکھرتا گیا

عشق، محبت، چاہت، پیار، ایک جذبے کے کتنے اظہار... یہ جذبہ ہر کسی کے دل میں پنپ سکتا ہے بشرطیکہ دل کا ظرف وسیع اور خلوص کے موتیوں سے مرصع ہو، زیرِ نظر کہانی اسی جذبے کے اتار چڑھاؤ کو بے حد متاثر کُن انداز میں قاری کو ایک نئی سوچ سے روشناس کراتے ہوئے بڑھتی ہے۔

عشق کے آفاقی جذبے کو ایک نئے انداز میں بیان کرتی دلکش تحریر

قسط 8





نور بیگم کے کمرے میں اس وقت چار نفوس بیٹھے تھے...... داؤد چوہدری، سمیرا بیگم اور خود نور بیگم...... تینوں کے لبوں پر ایک گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

"پہلے وقتوں میں بچوں کی شادی بیاہ کے معاملات بڑے طے کرتے تھے آج کل بچے یہ معاملات خود طے کر کے بعد میں والدین کو بتاتے ہیں۔" نور بیگم نے کمرے کی خاموشی کو توڑتے ہوئے اپنی رائے دی۔

ان کی بات پر داؤد چوہدری نے ایک طویل سانس لی وہ ابھی تک ایک ٹرانس کی کیفیت میں تھے۔

"بس اماں جی وہی دور اچھے تھے...... آج کل کے بچے والدین کو بے وقوف سمجھتے ہیں...... میری بہت بڑی خواہش تھی کہ عنایہ کے ساتھ میری ایشو بھی اسی گھر میں رہتی...... میرے مرحوم بھائی کی بیٹیاں میری نظروں کے سامنے رہتیں تو میرا دل مطمئن رہتا...... اپنی نازوں میں پلی بیٹیاں لوگوں کے گھروں میں بھیجنے کے لیے بڑا حوصلہ چاہیے ہوتا ہے۔"

"مگر داؤد کیا کریں......؟ ایشو اور اقصم کسی صورت بھی یہ نیا رشتہ بنانے کو تیار نہیں...... اب بچوں کے ساتھ زبردستی تو نہیں کی جا سکتی ناں......" سمیرا بیگم نے انہیں سمجھایا۔

"کیا عینی نے ایشو سے ارسل کے رشتے کے سلسلے میں بات کی......؟" نور بیگم کو جیسے کچھ یاد آیا تو انہوں نے بہو سے دریافت کیا۔

"جی اماں، عینی نے بات کی تھی ایشو سے...... وہ تو پروپوزل کا سنتے ہی بھڑک اٹھی تھی۔"

"اُف خدایا...... ان آج کل کے بچوں کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔" ان کی بات سن کر نور بیگم کو افسوس ہوا۔

"ویسے ارسل اتنا برا لڑکا نہیں ہے، ویل ایجوکیٹڈ ہے...... پھر اس کے والدین کو بھی ہم اچھی طرح سے جانتے ہیں...... دیکھے بھالے لوگ ہیں۔" داؤد چوہدری نے اپنی رائے دی۔

"ہاں لوگ تو اچھے ہیں مگر ابھی انہیں ہمیں کوئی حتمی جواب نہیں دینا چاہیے...... بہتر یہی رہے گا کہ ارسل اور ایشال ایک دوسرے کو دیکھ بھال لیں...... اگر ان دونوں میں انڈر اسٹینڈنگ ہو جاتی ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ ایشال کی کون سی عمر نکلی جا رہی ہے۔ اس کے لیے بہتر سے بہتر رشتہ مل سکتا ہے اگر اس کے لیے کسی ڈاکٹر کا ہم انتخاب کریں تو یہ زیادہ بہتر ہو گا۔" سمیرا بیگم نے شوہر کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں بہو، کہتی تو تم ٹھیک ہو۔" نور بیگم نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ہوں...... آئی ایگری...... اگر ایشال اور عمر کے درمیان ایج ڈیفرنس نہ ہوتا تو عمر اس کے لیے بہترین انتخاب ہو سکتا تھا۔" داؤد چوہدری نے قیاس ظاہر کیا۔

"ایشو تو عمر سے اتنا چڑتی ہے...... اگر ان کے درمیان ایج ڈیفرنس نہ بھی ہوتا تو وہ کبھی نہیں مانتی۔" سمیرا بیگم نے اپنی رائے دی۔

"اب ایسا بھی کیا عمر کا فرق ہے؟ مرد کو عورت سے پانچ چھ سال بڑا ہی ہونا چاہیے...... عمر اور ایشال کے بارے میں اب بھی تو سوچا جا سکتا ہے۔" نور بیگم کو تو عمر سے ویسے بھی بہت پیار تھا...... وہ داؤد کی رائے پر از حد مسرت سے بولیں۔

"اماں جی عمر، ایشال سے پورے دس سال بڑا ہے۔" سمیرا نے انہیں یاد دلایا۔

"تو کیا فرق پڑتا ہے بیٹا...... تمہارے مرحوم سسر مجھ سے پندرہ برس بڑے تھے ہم نے بھی تو ایک اچھی زندگی گزاری...... سارا خاندان جانتا ہے۔" نور بیگم نے کہا تو داؤد چوہدری دھیرے سے مسکرا دیے۔

"اماں جی بے شک آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں مگر اماں جی وہ پرانے وقتوں کی بات تھی...... آج کل کے بچے اپنی من مانی کرتے ہیں، والدین کے فیصلے سننے کے بجائے وہ اپنے فیصلے سناتے ہیں۔" داؤد چوہدری نے وضاحت دی۔

''ساجدہ بھی ایشو سے بے حد پیار کرتی ہے اگر یہ لڑکی عمر کے لیے مان جائے تو میرا دل مطمئن ہو جائے گا کہ میرے مرحوم بیٹے کی بچیاں اپنوں کے درمیان ہیں۔'' نور بیگم آبدیدہ ہوئیں۔ ''میرا دل نہیں مانتا میری ایشو خاندان سے باہر بیاہی جائے۔''

''اماں جی آپ پریشان نہ ہوں...... ابھی دیکھتے ہیں آنے والا وقت کیا تبدیلی لاتا ہے باقی اللہ بہتر کرنے والا ہے۔'' داؤد چوہدری نے انہیں مطمئن کیا۔

''اماں آپ کیوں ٹینشن لیتی ہیں...... ایشو اور عینی ہمیں اپنے بیٹوں سے بڑھ کر ہیں، ایشو کی شادی کا فیصلہ ہم اس کی رضامندی سے ہی کریں گے...... ابھی تو شکر ہے وہ اپنی فیلڈ کو سیریس لے رہی ہے...... اس کا انٹرسٹ کافی ڈویلپ ہوا ہے۔ اور آج کل وہ باقاعدگی سے اسپتال جا رہی ہے۔'' سمیرا بیگم کی بات پر داؤد چوہدری مسکرا دیے۔

''ہاں یہ بھی اللہ کا احسان ہے...... ورنہ میں اس کے فیوچر کے حوالے سے بہت پریشان رہتا تھا۔ عمر مجھے بتا رہا تھا کہ اپتال میں پہلے کی نسبت خاصا چینج آیا ہے...... اب عمر کو اسے ڈانٹنے کی نوبت پیش نہیں آتی۔''

''یا اللہ تیرا شکر ہے۔'' نور بیگم نے مسکراتے ہوئے شکر ادا کیا۔ داؤ داور سمیرا بھی مسکرا دیے۔

''سمیرا اچھی سی چائے بنواؤ...... اور یہ عینی اور زارون کہاں ہیں؟'' داؤد چوہدری نے ٹیبل سے آج کا اخبار اٹھاتے ہوئے سمیرا سے پوچھا۔

''میں ابھی چائے بھجواتی ہوں..... عینی اور زارون کی اپنے ڈیزائنر سے اپائنٹمنٹ تھی، وہیں گئے ہوں گے۔'' سمیرا بیگم صوفے سے اٹھتے ہوئے بولیں۔

''اماں آپ چائے لیں گی؟''

''ہاں بیٹا بنوا دو...... ایشو اور اقصم کے یوں انکار کرنے پر میرے تو سر میں درد شروع ہو گیا ہے...... سمیرا میری بچی...... تم ذرا پینو کو بھیجو...... میرا سر دبا دے۔''

''جی اماں، میں ابھی بھیجتی ہوں اسے۔'' سمیرا بیگم ساڑی کا پلو سنبھالتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔

☆☆☆

زویا کا گلو سے اس جھوٹ پر زبردست جھگڑا ہوا تھا۔ جسے شاکر حسین سہہ نہ پائے تھے...... گلو اپنا جھوٹ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا۔ لہٰذا اس جھگڑے کے نتیجے میں گلو بکتا جھکتا گھر سے نکل گیا تھا...... اور اب بیس پچیس روز ہونے کو تھے اس کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ گھر کے تمام معاملات کی ذمے داری زویا پر آن پڑی تھی...... کبھی، کبھی اس کا جی چاہتا کہ وقت پیچھے چلا جائے وہ اسکول ٹیچر کے بجائے پھر سے ایک بچی بن کر اسکول کا بیگ ہاتھ میں پکڑ لے...... کتابوں میں پڑھا سبق آسان لگتا تھا اسے...... اور اب زندگی کے دیے ہوئے سبق نے اس کی ہنسی چھین لی تھی۔

آج کل وہ نوکری ڈھونڈنے کے لیے مختلف اخباروں میں ضرورت اسٹاف کے اشتہار پڑھ کر اسکول سے چھٹی کے بعد انٹرویو دینے کے لیے گھر سے نکل جاتی...... کہیں اس کی کم تعلیم آڑے آتی...... تو کہیں اسے مردوں کی غلط نظروں کا سامنا کرنا پڑتا...... اور کہیں انٹرویو سے پہلے ہی کوئی سفارشی جاب حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا اور وہ مایوس گھر لوٹ آتی...... ایک اخبار میں کسی مشہور ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں ریسپشنسٹ کی سیٹ خالی تھی زویا وہاں انٹرویو کے لیے گئی تھی تو وہاں کے مالک نے اس کا فوٹو جینک فیس دیکھتے ہی اسے ماڈلنگ کی آفر کر دی...... ایک ایڈ کے لاکھوں کی آفر کرنے کے باوجود زویا نے اس شخص کو کھری، کھری سناتے ہوئے انکار کر دیا تھا اور وہ انٹرویو میں کوالیفائی ہونے کے باوجود انکار کرتے ہوئے واپس گھر آ گئی تھی۔ ادھر زارا کا شوہر خالد بیٹے کی پیدائش پر از حد خوش تھا مگر اس کا اپنے گھر والوں سے جھگڑا ہو گیا تھا اور وہ لڑ جھگڑ کر یہاں سسرال میں ہی ڈیرے جما کر بیٹھ گیا تھا...... اور ہمیشہ کی طرح سیما بیگم سے کچھ رقم کی ڈیمانڈ کر رہا تھا جس سے وہ اپنے بیوی بچوں کے لیے کرائے کا

الگ گھر لینا چاہتا تھا…… دوسری طرف سارہ ان تمام گھریلو معاملات سے بے خبر اپنے ہی گھر میں کسی اجنبی کی طرح زندگی گزار رہی تھی۔

وہ گھر کے کسی کام کاج میں حصہ لیتی نہ کچھ کھاتی پیتی اور نہ ہی زیادہ بات کرتی…… وہ کالج سے واپس آتی کپڑے بدلتی اور چپ چاپ لیٹی رہتی، ہر وقت کچھ سوچتی رہتی…… اور گم صم سی رہتی گھر والے شاکر حسین کی اچانک ہونے والی موت کو سارہ کی اس کیفیت کا سبب سمجھتے۔ شاید اس نے باپ کی موت کا صدمہ دل پر لے لیا تھا۔ سارہ کسی کو نہیں بتا سکتی تھی کہ کون سا غم اسے دیمک کی طرح اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا…… بار، بار اپنی عزت ایک نام نہاد عاشق لٹیرے کے ہاتھوں گنوانے کے بعد وہ ہر وقت موت کے بارے میں سوچتی رہتی۔ گناہوں کی اس دلدل سے وہ خود کو کیسے نکال سکتی تھی ہر وقت وہ یہی سوچتی رہتی…… مگر اسے باہر نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

☆☆☆

نور منزل میں ہونے والی اس پارٹی میں شہر کی تمام اعلیٰ ترین شخصیات کو مدعو کیا گیا تھا، سمیرا بیگم بیک لیس بلاؤز کے ساتھ ساڑی میں ملبوس تھیں، داؤد چوہدری بھی سیاہ ڈنر سوٹ میں ملبوس تھے…… وہ دونوں اقصم کو اپنے ساتھ لیے اپنے دوست احباب سے ملوانے میں مصروف تھے۔

زارون اور عنایہ دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے اپنے دوستوں سے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ باوردی مستعد ویٹرز تمام مہمانوں کو سرو کر رہے تھے۔ بیسمنٹ کے اس وسیع ہال کو اس پارٹی کے لیے مشہور آرگنائزر Moon نے خوب صورت ترین بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی…… ہال میں گول ٹیلبز لگائی گئی تھی جن پہ جلتی ہوئی کینڈلز اور ہال میں جلنے والی مدھم لائٹوں نے ماحول کو نہایت خوب صورت اور رومینٹک بنا رکھا تھا…… ہال کے درمیان ڈانسنگ فلور بنایا گیا تھا جس کی چھت پہ شاندار قسم کی رنگ برنگی لائٹیں جلتی بجھتی نظر آ رہی تھیں۔ بہترین ساؤنڈ سسٹم کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ ڈانسنگ فلور کے چاروں کونوں پر خوب صورت ستون بنائے گئے تھے…… جن کو اس پارٹی کے حوالے سے خصوصی طور پر سجایا گیا تھا۔ رات گیارہ بجے یہ پارٹی شروع ہوئی تھی۔

پارٹی کا آغاز بازار حسن کی مشہور اور حسین ڈانسر کی کلاسیکی پرفارمنس سے ہوا تھا۔ اس کے بعد اقصم نے گٹار بجاتے ہوئے Ariana grande کا مشہور گیت love me سنایا تھا جسے سنتے ہوئے کئی من چلے نوجوان لڑکے لڑکیوں نے پُرجوش انداز میں وسلنگ بھی…… کی تھی۔ اقصم کی پرفارمنس کو سب نے بہت انجوائے کیا تھا۔ کئی لڑکیوں نے تو اسے اپنے فون نمبرز تک دے ڈالے تھے……اس پارٹی میں سبھی موجود تھے سوائے مناب اور ڈاکٹر عمر کے…… کیونکہ وہ دونوں ایسی کاک ٹیل پارٹیز اٹینڈ نہیں کرتے تھے…… پارٹی میں موجود تمام افراد خوش گپیوں میں مصروف تھے…… سب کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے صرف ایک ایشال ہی تھی جو چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ سجائے زبردستی اس پارٹی کا حصہ نظر آ رہی تھی…… آج اس کا دل اس پارٹی میں بالکل بھی نہیں لگ رہا تھا۔ علینہ بھی اس کے ساتھ تھی۔

''یار ایشو آج تم مجھے بور کر رہی ہو……'' علینہ نے سوفٹ ڈرنک پیتے ہوئے شکوہ کیا۔

''تو تم سے کس نے کہا ہے میرے پاس بیٹھ کر بور ہونے کو…… جاؤ تم بھی اپنے لیے کوئی پارٹنر تلاش کرو اور ڈانسنگ فلور پر جا کر ڈانس کرو…… اور chill shill کرو۔''

''تو تم کیوں یہاں بیٹھی ہوئی ہو یار، اٹھو چلو پارٹی کو انجوائے کرو۔'' علینہ نے اصرار کیا۔

''میرا تو دل نہیں چاہ رہا…… مگر تم تو اٹھو…… انجوائے کرو…… پارٹی کو۔'' ایشال کے انکار پر علینہ کندھے اچکا کر اٹھ کھڑی ہوئی…… علینہ نے آج خاصا نازیبا قسم کا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ کیا اس پارٹی میں موجود ہر عمر کی خاتون کا لباس ایسا ہی تھا…… ایشال نے چوڑی دار پاجامے کے ساتھ لمبی شرٹ پہن رکھی

تھی۔ کسی کی ڈانٹ نے اسے ڈھنگ کا لباس پہننے کی عادت ڈال دی تھی۔ وہ ہمیشہ ایسی پارٹیز کو بھرپور طریقے سے انجوائے کیا کرتی تھی مگر ایسا آج پہلی بار ہوا تھا، اس کا دل کسی چیز میں نہیں لگ رہا تھا۔ وہ ہال کے ایک کونے میں رکھی ٹیبل پر بیٹھی تھی۔

ڈانسنگ فلور پر اب میوزک چینج کر دیا گیا تھا فاسٹ میوزک اور جلتی بجھتی لائٹوں کے نیچے لڑکے، لڑکیاں میوزک کے ساتھ تھرک رہے تھے...... منی بار میں ایک چیئر پہ بیٹھا اپنے پسندیدہ مشروب کی چسکیاں لیتا ارسل مسلسل ایشال کو دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور گلاس ہاتھ میں لیے، لیے ایشال کے پاس ٹیبل پر آ گیا۔

''کیا میں دنیا کی حسین اور مغرور ترین لڑکی کے ساتھ تھوڑی دیر بیٹھ سکتا ہوں؟'' ارسل، ایشال کے جواب کا انتظار کیے بغیر...... چیئر پر بیٹھ چکا تھا۔ ایشال کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔

''ویسے میں نے تم جیسا ڈھیٹ شخص اس دنیا میں نہیں دیکھا۔''

''آج میں آپ کا مہمان ہوں کم از کم آج تو ایسے القابات سے نہ نوازیں مجھے......'' ارسل اسے دیکھ کر مسکرایا پر ایشال خاموش رہی۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ اس پارٹی کو انجوائے کیوں نہیں کر رہیں؟''

''میں تمہارے کسی بھی سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتی۔'' ایشال نے لٹھ مار جواب دیا۔

''آپ مجھ سے ابھی تک خفا ہیں؟''

''خفا صرف اپنے خاص رشتوں سے ہوا جاتا ہے...... میں تم سے کیوں خفا ہوں گی؟''

''او آئی سی...... تو مجھے بھی ان خاص لوگوں میں شامل کر لیں ناں......!''

''ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔''

''مگر کیوں؟ میں اتنا برا انسان نہیں ہوں جتنا آپ سمجھتی ہیں۔''

''مجھے وضاحتیں مت دو۔''

''مگر میں دینا چاہتا ہوں۔''

''پر میں نہیں لینا چاہتی...... کہہ دیا ناں میں نے۔'' وہ بیزار ہوئی۔

''کم آن یار......؟ جس واقعے پہ آپ مجھ سے خفا ہیں، ناراض ہیں اس واقعے کو دو مہینے ہو چکے ہیں...... میں کئی بار آپ سے ایکسکیوز کر چکا ہوں...... اور میں واقعی بہت شرمندہ ہوں۔ اس رات میں اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ اس رات جو بھی ہوا میں آج پھر آپ سے معذرت کرتا ہوں...... آپ پلیز مجھ سے اس طرح بی ہیو مت کیا کریں، مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

ارسل کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ ایشال اب اسے کسی بات پر سرزنش نہیں کر سکی تھی۔

''ویسے آپ پر ہر ڈریس سوٹ کرتا ہے......'' ارسل نے اس کی تعریف بھی کی...... ایشال خاموش رہی...... اس کی نظریں علینہ پر مرکوز تھیں جو ایک لڑکے کے ساتھ ڈانسنگ فلور پر تھی۔

''آئی تھنک اب ہمیں اپنے درمیان فاصلوں کو ختم کر دینا چاہیے...... اور مزید ایک دوسرے کو بور کرنے کے بجائے ہمیں اس پارٹی کو انجوائے کرنا چاہیے۔''

ارسل نے چیئر سے اٹھ کر اپنا ہاتھ ایشال کی طرف بڑھایا۔

اس نے چند لمحے ارسل کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھا اور پھر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا...... شاید وہ اپنے اندر کی فرسٹریشن دور کرنا چاہتی تھی اسے کسی ساتھی کی ضرورت تھی۔

ارسل اس کا ہاتھ تھامے ڈانسنگ فلور کی طرف لے آیا تھا...... ایشال اپنے دل و دماغ سے ڈاکٹر عمر کو اور ان

کی باتوں کو جھٹلانا چاہتی تھی...... کئی دنوں سے اس کے دل و دماغ پر ڈاکٹر عمر سوار تھے، اُن کے کڑے تیوڑ اُن کی کڑوی باتیں...... ان سب نے اس کا دماغ خراب کر رکھا تھا...... افصم کی آمد کی خوشی میں صبح چار بجے تک ہونے والی اس پارٹی کو یادگار بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی تھی۔

☆☆☆

سارہ کافی دیر سے برآمدے کی سیڑھی پر ستون سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ کمرے میں سب دستر خوان بچھائے کھانا کھا رہے تھے۔

زویا ڈونگے میں دوبارہ سالن ڈالنے کے لیے کمرے سے کچن کی طرف جا رہی تھی۔ جب اس نے سارہ کے بوجھل وجود اور اترے ہوئے چہرے کو تفکر سے دیکھتے ہوئے تیسری بار اسے کھانا کھانے کو کہا تھا اور تیسری بار بھی سارہ نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا تھا...... آج کل اسے اپنی طبیعت میں بھی عجیب سی تبدیلی محسوس ہو رہی تھی؛ اسے آج کل نیند بھی بہت آ رہی تھی...... زویا اس کے پاس سالن کا ڈونگا پکڑے کھڑی تھی اور اس سے کھانا نہ کھانے کی وجہ پوچھ رہی تھی...... آج خالد کی فرمائش پہ گھر میں گوشت بنایا گیا تھا۔ ڈونگے سے آنے والی گوشت کی خوشبو نے یک دم سارہ کا دل متلایا تھا اور وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر بے ساختہ واش بیسن کی طرف بھاگی تھی۔

زویا نے کمرے میں جاتے، جاتے سارہ کو پریشان نظروں سے دیکھا اور پھر آدھے گھنٹے میں اسے تین بار الٹی آئی تھی۔

☆☆☆

جوں جوں شادی کے دن قریب آ رہے تھے عنایہ کے پارلر کے چکر بھی زیادہ لگ رہے تھے...... ابھی، ابھی وہ پارلر سے واپس آئی تھی تو اسے اپنے سر میں ہیڈک سی محسوس ہو رہی تھی۔ عنایہ بیڈ پر بیٹھی تھی اور پینو اس کی پشت پہ بیٹھی اس کے کندھے اور سر دبا رہی تھی۔ سامنے ہی ایشال ٹراؤزر شرٹ میں ملبوس ٹریڈمل پر بھاگ رہی تھی۔

''ایشو بی بی اب بس وی کر دیں جی...... پچھلے آدھے گھنٹے سے آپ اس مشین پہ انے وا بھاگ رہی ہیں...... آپ کو ویکھ ویکھ کر تو مجھے چکر آتے لگے ہیں۔'' پینو کے شکوے پہ عنایہ بے ساختہ مسکرا دی۔

''پینو تمہیں کس نے کہا ہے تم مجھے بار، بار دیکھو......'' ایشال نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ جواب دیا۔

''پینو ٹھیک کہہ رہی ہے ایشو...... ایک دن کی ایکسر سائز سے پندرہ بیس دن میں چار کلو وزن کم نہیں ہونے والا تمہارا...... ایکسر سائز کے ساتھ تمہیں کھانے پینے میں بھی بہت کنٹرول رکھنا ہوگا...... تمہیں مارننگ واک یا پھر سوئمنگ کرنے کی عادت ڈالنی ہوگی۔''

''سوئمنگ تو میں بالکل بھی نہیں کر سکتی...... تمہیں تو پتا ہے عینی بچپن سے ہی مجھے پانی میں جانے سے کتنا خوف آتا ہے...... ہاں مارننگ واک کی عادت میں ڈال لوں گی۔'' ایشال نے اسی طرح پھولی سانسوں کے ساتھ جواب دیا۔

''اچھی بات ہے ویٹ لوز کرو، مجھے دیکھو...... میں نے ڈائٹ اور ایکسر سائز سے خود کو کتنا سلم رکھا ہوا ہے۔'' عنایہ کو اپنے حسن اور اپنے دبلے پتلے تراشیدہ سراپے پہ مان بھی بہت تھا۔

''تمہاری ہمت کی داد دیتی ہوں میں...... نہ جانے تم باقاعدگی سے کس طرح ایکسر سائز کے لیے ٹائم نکال لیتی ہو۔'' ایشال مشین سے نیچے اتر آئی...... اور ٹاول سے فیس خشک کرتے ہوئے چیئر پہ لیٹنے والے انداز میں گر گئی۔

''زارون کو میرا اسمارٹ فگر پسند ہے، اس کے لیے اپنا خیال رکھنا مجھے اچھا لگتا ہے۔'' عنایہ کے لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ کھل اٹھی تھی...... ''اسی لیے تو وہ میرا نام لے، لے کر جیتا ہے کہ میں اس کی پسند ناپسند کا خیال رکھتی ہوں۔''

''عینی بی بی اللہ آپ کی قسمت چنگی کرے جی...... رب سوہنا آپ کو دنیا جہان کی خوشیاں نصیب

کرے..... پر ان مردوں کا بھی کوئی دین، ایمان نہیں ہوتا ان کو ہیرے ورگی بیوی بھی مل جائے تو یہ اس کو وی مٹی میں رول دیتے ہیں جی..... اِک منٹ وچ عورت کو ستویں آسمان سے نیچے سٹ (گرا) دیتے ہیں جی۔'' پینو دھیرے، دھیرے عنایہ کے کندھے دبا رہی تھی۔ پینو کے لہجے میں اپنے اوپر بیتا دکھ بول رہا تھا۔

''ہر مرد تمہارے خاوند جیسا دھوکے باز نہیں ہوتا پینو..... اور پھر تمہارے طبقے کے مرد تو بالکل جاہل اور گنوار ہوتے ہیں..... عورت کی قدر و قیمت ہی نہیں جانتے.....'' عنایہ کی آنکھیں بند تھیں..... اسے پروین کے دبانے سے سکون مل رہا تھا..... عنایہ کے جواب پر پروین نے ایک دکھ بھری سانس لی۔

''عینی بی بی..... مرد پڑھا لکھا ہو یا جاہل..... بیوی کے معاملے میں اس کی عقل اس کی سوچ اکوئی جیسی ہوتی ہے جی..... انہیں عورت اپنی منگیتر یا محبوبہ کے روپ میں ہی سوہنڑی لگتی ہے..... جب ہی محبوبہ یا منگیتر مرد کی بیوی بن جائے تو پھر اس عورت کی ایسی مت مارتے ہیں کہ وہی سوہنڑی اور عقل مند عورت بے عقلی اور کوجی ہو جاتی ہے.....''

''پینو، تمہارا یہ مرد کی سائیکی کے بارے میں لیکچر کم از کم میری سمجھ میں تو بالکل بھی نہیں آرہا.....'' ایشال نے پینو کی بات پہ بیزار ہو کر ہینڈ فری کانوں سے لگایا اور موبائل ہاتھ میں پکڑ لیا۔

''پہلے مینوں وی ایسی باتوں کی سمجھ نہیں آتی تھی عینی بی بی..... فیر دل پہ جب چوٹ لگی تو آپے ہی سمجھ وی لگ گئی۔'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

''کسی زمانے وچ میں اپنے پنڈ کی سب سے سوہنڑی کڑی ہوا کرتی تھی۔ شوکت میرے اوپر جان چھڑکتا تھا جی..... میرے صدقے واری جاتا تھا اور اپنی قسمت پہ ناز کرتا تھا اور مجھ سے کہتا تھا تو ساری دنیا کی سب سے سوہنڑی کڑی ہے جب تو میرے گھر میں آئے گی تو میرا گھر جنت بن جائے گا.....'' پینو آج موڈ میں تھی عنایہ کا سر دباتے ہوئے وہ اپنے دل کے زخموں کو پھر سے تازہ کر رہی تھی۔

''پھر کیا ہوا پینو.....؟'' عنایہ کو اس کی کہانی میں دلچسپی پیدا ہوئی۔

''فیر کی ہونا سی عینی بی بی..... جب میں ویاہ کر شوکت کے گھر چلی گئی تو پہلے پہل تو اس نے میرے بڑے چاہ کیے..... فیر آہستہ آہستہ اسے مجھ میں عیب نظر آنے لگے..... وہ مجھ پر جان چھڑکتا تھا اب وہی مجھ سے جان چھڑانے لگا..... جو اپنی قسمت پہ پہلے ناز کرتا تھا وہی شوکت اب اپنی قسمت کو کوستا نظر آتا تھا۔ جو ہر وقت مجھے کہتا تھا کہ پینو تیرے آنے سے میرا گھر جنت بن جائے گا۔ وہی شوکت مجھے اب کہتا کہ تیرے آنے سے میرا گھر جہنم بن گیا ہے۔'' پینو کے لہجے میں بیتا ہوا دکھ بول رہا تھا۔

''مگر کیوں پینو..... وہ ایسا کیوں کہتا تھا؟ تمہیں تو شوکت کی ایسی باتوں سے بہت دکھ ہوتا ہوگا؟'' عنایہ کے سوالوں پر اس کے چہرے پر پھر سے دکھوں کی پرچھائیاں ابھرنے لگی تھیں۔

''عینی بی بی کچھ نہ پوچھو جی..... میرا تو دل چیر جاتا تھا، میں ہر ویلے شوکی کے ان لفظوں کی ہیر پھیر میں الجھی رہتی تھی، سڑتی رہتی تھی..... میں روز فیر وی اس کے لیے بنتی سنورتی تھی پر وہ مجھ میں دلچسپی ہی نہیں لیتا تھا۔''

''مگر کیوں..... تم تو اس کی محبت تھی ناں.....؟ پھر وہ ایسے کیوں کرتا تھا تمہارے ساتھ؟''

''بس عینی بی بی مرد کی زندگی میں..... کب، کیوں اور کیسے کے لفظ نہیں ہوتے..... یہ اِک منٹ لگاتے ہیں عورت کو ستویں آسمان سے نیچے سوٹنے میں..... شوکت بڑے شوق سے مجھے بیوی بنا کر اپنے گھر لے آیا تھا پر میری اہمیت اس کی زندگی وچ گھر کے کسی پرانے ٹوٹے پھوٹے سامان کی طرح ہو گئی تھی..... جب اسے سامان کی ضرورت پڑتی وہ گھر آتا..... سامان کو استعمال کرتا اور فیر اسے اپنے کمرے کے کسی کونے میں چھڈ کے باہر

نکل جاتا...... اور میں اتنی کملی اور بے وقوف تھی کہ اس سے اپنی محبت کے بدلے میں صرف اس کی گواچی ہوئی محبت مانگتی تھی اور بدنصیب اتنی تھی کہ وہ مجھے اپنی گواچی ہوئی محبت کبھی نہ دے سکا......'' پینو کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔ عنایہ کو دکھ ہو رہا تھا اس کی کہانی سن کر۔

''کیا اسی وجہ سے تم نے شوکت سے طلاق لی تھی؟''

''بس عینی بی بی کیا بتاؤں...... وہ کسی دوسری عورت کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ جب مرد کو پرائی چوکھٹ سے کھانے کی عادت پڑ جائے تو اسے اپنے گھر کا پکا ہوا چنگا نہیں لگتا جی...... وہ مجھ سے لڑائی کرنے کے بہانے ڈھونڈتا تھا۔ ہر ویلے مجھے اولاد نہ ہونے کے تانے دیتا تھا۔ میرے مقدر کا رزق اسے بڑا مل رہا تھا پر اس کے مقدر کی اولاد مجھے نہ مل سکی۔ ان پریشانیوں میں مجھے امید وی نہ لگی۔ اور پھر شوکی مجھ پر ہاتھ وی اٹھانے لگا تھا......'' اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

''فیر میں نے سوچا کہ پرائی عورت کے عشق میں ڈوبے اپنے پرائے خاوند کو اپنا بنانا نرا فضول ہے، نرا دھوکا...... ہم دونوں کے وچ اب وہ گل وی نہیں رہی تھی...... روز، روز مرنے سے میں نے اپنے آپ کو اِکو واری مارنے کا فیصلہ کرلیا اور اس سے طلاق لے لی۔'' اس نے ایک طویل سانس باہر نکالی۔

''پنڈ والوں نے بڑی باتیں بنائیں میرے کردار پر انگلیاں وی اٹھائیں۔''

''مگر کیوں؟ طلاق لینے کا حق تو خود ہمارے مذہب نے عورت کو دیا ہے...... عورت اگر اپنے شوہر کے ساتھ خوش نہیں ہو تو وہ خلع لے سکتی ہے۔''

''آپ تو پڑھے لکھے شہری لوگ ہو جی...... وڈے لوگ ہو، ہم چھوٹے لوگوں کو غریب اور ان پڑھ لوگوں کو ایسی وڈی باتوں کا کیا پتا جی...... پر ہمارے پنڈ میں طلاق لینے کو بہت برا سمجھا جاتا ہے جی۔''

''مائے گڈنس...... پینو تمہارے طبقے کی عورت کی زندگی کتنی مشکل ہوتی ہے ناں......''

''ہاں جی عینی بی بی...... میری تو پنڈ میں جتنی وی زندگی گزری اوکھی اور عذابوں میں ہی گزری...... وہ تو بھلا ہو وڈے صاحب جی کا...... وہ حویلی آئے تو میری ماں نے صاحب جی سے گزارش کی کہ پینو کو کام کاج کے واسطے اپنی شہر والی کوٹھی لے جائیں یہاں آکر وڈی اماں کی خدمت میں اور آپ دونوں بہنوں کے ساتھ میرا ایسا دل لگا کہ مجھے تو اب کبھی اپنے پنڈ کی یاد وی نہیں آئی۔'' پینو نے دوپٹے سے اپنے آنسو صاف کیے۔

''شوکت تمہیں یاد تو کرتا ہوگا پینو......؟''

''ہاں جی، میری سہیلی رجو کا اِک واری فون آیا تھا۔ وہ بتا رہی تھی کہ اب شوکی بڑا روتا ہے مجھے یاد کر کے...... اس نے اپنی معشوقہ سے شادی کرلی تھی پر سنا ہے شادی کے بعد اس عورت نے شوکی کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے...... بڑا ستاتی ہے اسے۔''

''شوکی نے تمہیں بھی تو ستایا تھا...... شاید قدرت اس سے یہی انتقام لے رہی ہے۔''

عنایہ کا دل اس کی کہانی سن کر بہت افسردہ ہوگیا تھا...... وہ پچھلے آٹھ دس سال سے ان کے ساتھ تھی ان کی خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی تھی۔

''پینو تم کتنی اچھی ہو...... تمہارے شوہر نے تمہاری قدر نہیں کی۔ مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔''

''عینی بی بی یہ مرد ذات بھی ناں بڑی بدذات ہوتی ہے...... مرد ہمیشہ اس چیز کی قدر کرتا ہے جو اسے حاصل نہ ہو...... اور ویسے بھی عورت نمانی کو سکھ تو مقدروں سے ملتے ہیں جی، میرے وی مقدروں میں خوشیاں نہیں تھیں۔'' پینو نے بھی شاید اب حالات سے سمجھوتا کرلیا تھا۔

''پینو تمہارا...... ''شوکت نامہ'' اگر ختم ہوگیا ہو تو میرے لیے اورنج جوس لے آؤ۔'' ایشال کانوں سے ہینڈ

فری ہٹا کر پینو سے مخاطب ہوئی۔

''اچھا ایشو بی بی میں ابھی لا دیتی ہوں......'' پینو اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

☆☆☆

اب کی بار ایشال نے دل میں عہد کرلیا تھا کہ وہ ڈاکٹر عمر کے اسپتال نہیں جائے گی۔ کئی دن تک وہ اپنے دل سے الجھتی رہی تھی......لڑتی رہی تھی بالآخر اس کے دل نے اسے یہ باور کروادیا تھا کہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی غلطی اس کی اپنی ہی تھی......اسے خواہ مخواہ ڈاکٹر عمر کی پرسنل چیزیں نہیں دیکھنی چاہیے تھیں......پھر اُن کی محبت کی نشانی بھی تو وہ توڑ چکی تھی......ایک ہفتے کے بعد جب وہ اسپتال میں ڈاکٹر عمر کے روم میں داخل ہوئی تھی تو وہ سامنے اپنی ریوالونگ چیئر پر بیٹھے کسی سے فون پر نہایت خوشگوار موڈ میں بات کررہے تھے۔

وہ جزبزسی روم میں داخل تو ہوگئی تھی مگر اب اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ جو ایک ہفتے اسپتال نہیں آئی تھی ڈاکٹر عمر کو وہ کیا اور کیسے وضاحتیں دے گی؟ بات کرتے ہوئے ڈاکٹر عمر نے لحظہ بھر اسے دیکھا اور اسے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔

وہ شش و پنج میں اپنی چیئر پر بیٹھ چکی تھی......تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر عمر نے فون بند کرنے کے بعد رخ ایشال کی طرف موڑا۔

''السلام علیکم......'' ایشال نے انہیں سلام کرنے کے بعد سر جھکا لیا۔

''وعلیکم السلام......ٹائم مل گیا تمہیں یہاں آنے کا......'' خشمگیں نگاہوں سے سوال کیا گیا۔

''وہ مم......میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی......'' ایشال نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''بہانہ چینج کرلو......کافی پرانا ہوگیا ہے یہ اب......'' غور سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے مشورہ دیا گیا تھا۔

''نن...... نہیں مم...... میں کیوں بہانہ بناؤں گی۔'' وہ گڑبڑائی...... ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ وہ ڈاکٹر عمر کے سامنے کبھی ڈھنگ سے جھوٹ بھی نہیں بول پاتی تھی۔

''جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے...... سچ بولو گی تو کھا نہیں جاؤں گا میں تمہیں...... سیدھی طرح سے کہہ کیوں نہیں دیتیں کہ تمہیں مجھ پر غصہ تھا...... اور اسی وجہ سے تم ایک ہفتے سے اسپتال نہیں آرہی تھیں۔''

ایشال نے گڑبڑا کر نظریں اٹھائیں اور پھر اگلے ہی لمحے جھکا بھی لیں وہ اسی کو دیکھ رہے تھے۔

''نن...... نہیں...... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' اس نے ایک بار پھر انکار کیا۔

''تمہیں مجھ سے مزید جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے ایشو...... آئی ایم سوری...... مجھے تم سے اس روز اتنا روڈ نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' ڈاکٹر عمر نے کھلے دل سے اپنی غلطی تسلیم کی تو وہ بھی نظریں چراتی، انگلیاں مسلتی دھیرے سے اپنے اندر کا سچ بتاتے ہوئے معذرت کرنے لگی۔

''میں بھی سوری کرتی ہوں، مجھے بھی آپ کی پرسنل چیزیں آپ کی اجازت کے بغیر نہیں دیکھنی چاہیے تھیں اور...... اور مجھ سے آپ کا وہ تاج محل بھی ٹوٹ گیا تھا......'' ایشال نے تسلیم کیا۔

''کچھ چیزیں شاید ٹوٹ جانے کے لیے ہی ہوتی ہیں...... اور اُن کا ٹوٹ جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔'' ڈاکٹر عمر نے ٹیبل پر رکھے پیپر ویٹ کو گھماتے ہوئے آہستگی سے جواب دیا۔

ایشال نے سر اٹھا کر اُن کی طرف دیکھا...... ان کے لہجے میں کرب اور چہرے پر بیتے ہوئے کل کی پرچھائیاں تھیں۔

اگلے ہی لمحے وہ سر جھٹک کر اپنا اسٹیتھو اسکوپ ٹیبل سے اٹھا کر چیئر سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ''any way let,s go پہلے راؤنڈ لگاتے ہیں، پھر پیشنٹ چیک کریں گے۔'' ایشال بھی ان کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ جنرل وارڈ اور ایمرجنسی وارڈ کا راؤنڈ لگانے کے بعد ڈاکٹر عمر نے نان اسٹاپ شام چار بجے تک پیشنٹ بچوں کو چیک کیا تھا...... اب ان کے گھر جانے کا ٹائم تھا۔

''تم اپنی گاڑی پر آئی ہو؟'' ڈاکٹر عمر نے ٹیبل سے اپنا موبائل اٹھاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''نہیں، آج میں ڈرائیور کے ساتھ آئی تھی......'' ایشال نے چیئر سے اپنا اوورآل اور اسٹیتھو اسکوپ اٹھاتے ہوئے بتایا۔

''اوکے تو پھر تم میرے ساتھ ہی چلو...... میں تمہیں راستے میں ڈراپ کر دوں گا۔'' ڈاکٹر عمر نے اسے گھر چھوڑنے کی آفر کی۔

''چلیں، یہ بھی ٹھیک ہے......'' اس نے اثبات میں سر ہلایا...... اور ڈاکٹر عمر کے پیچھے، پیچھے چلنے لگی...... پارکنگ میں ان کی گاڑی تو کھڑی تھی مگر ڈرائیور نہیں تھا۔

''ایکچو ئیلی آج میرا ڈرائیور بھی چھٹی پر ہے۔'' انہوں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا۔

ایشال آگے بیٹھ گئی۔

وہ گاڑی پارکنگ سے نکال کر مین روڈ پر لے آئے تھے۔

''پھپھو کیسی ہیں عمر بھائی؟''

''خود آکر دیکھ لینا...... تمہارے گھر نہ آنے سے بہت اداس ہو جاتی ہیں مما......''

''میری پھپھو اس دنیا کی سب سے لونگ پھپھو ہیں۔'' ایشال مسکرائی۔

''مما روز تمہارا پوچھتی تھیں مجھ سے...... اور جب انہیں پتا چلتا کہ تم اسپتال نہیں آرہی ہو تو وہ مجھے بہت ڈانٹتیں اور کہتیں کہ یقیناً میں نے ہی تمہیں کچھ کہا ہے جس کی وجہ سے تم اسپتال نہیں آرہی ہو۔''

اُن کی بات سن کر ایشال دھیرے سے مسکرادی تھی۔

''پھپھو نے ہمیشہ عینی کو اور مجھے ماں جیسا پیار دیا ہے۔'' ایشال کی آنکھوں کے کونے بھیگ گئے۔

''نو ڈاؤٹ مما تم دونوں سے بے حد پیار کرتی ہیں۔'' ڈاکٹر عمر نے سر ہلا کر تسلیم کیا۔

''اینی وے دو چار دن سے مناب کراچی گئی ہوئی ہے...... مجھے اس کے ہاتھ کی کافی پینے کی عادت ہے میں اچھی کافی پینے کو ترس گیا ہوں۔'' ڈاکٹر عمر نے اسے بتاتے ہوئے اچانک گردن موڑ کر کہا۔

"what do you say about having a cup of coffee?"

ایشال نے پہلے حیرت سے ڈاکٹر عمر کی طرف اور پھر اثبات میں سر ہلایا۔

"yeah !sure" اور پھر ڈاکٹر عمر نے گلبرگ میں ایک مشہور کافی شاپ کے سامنے گاڑی روک لی تھی...... جو کافی اور دیگر اسنیکس کے لیے ایک نام رکھتی تھی۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ ڈاکٹر عمر کے ساتھ وہ پہلی بار یوں اکیلے کسی ایسی جگہ آئی تھی...... جہاں اکثر وہ اپنے دیگر کزنز کے ساتھ آیا کرتی تھی سوائے ڈاکٹر عمر کے...... کیونکہ انہوں نے ایسی آفر آج کسی کزن کو بھی نہیں کی تھی انہیں اکیلے اور الگ تھلگ رہنے کی عادت تھی، آج نہ جانے انہوں نے اپنی یہ قسم کیسے توڑ دی تھی۔

ڈاکٹر عمر ویٹر کو cappuccino 2 آرڈر کر چکے تھے مگر وہ اب بھی ورطۂ حیرت میں مبتلا تھی۔

''مجھے یہاں کی کافی بہت پسند ہے، میں اکثر یہاں آتا ہوں۔'' ڈاکٹر عمر نے اپنے سامنے بیٹھی ایشال کو بتایا۔

''عمر بھائی گھر جانے سے پہلے آپ میرے ساتھ یہاں ایک تصویر ضرور بنوائیے گا۔'' ایشال کی فرمائش پر وہ حیران ہوئے۔

''وہ کیوں......؟''

''مناب اور عینی میری بات پر یقین نہیں کریں گی ناں اس لیے......'' ڈاکٹر عمر دھیرے سے مسکرائے اور پھر اُن کے چہرے کے ساتھ، ساتھ لہجے میں بھی سنجیدگی اتر آئی۔

''مانا کہ میں ہٹلر ٹائپ انسان ہوں مگر میں لوگوں کو نہیں کھاتا...... ان فیکٹ ہٹلر بھی تو ایک انسان ہی تھا ناں...... ظالم ہی سہی۔''

''نن نہیں...... عمر بھائی وہ تو بس...... اس دن...... ایویں...... غصے میں نہ جانے میں نے کیا، کیا بکواس کر دی تھی۔'' ایشال شرمندگی سے سر جھکا گئی۔

''ایکچوئلی میں اتنا ظالم ہوں نہیں جتنا تم سب نے مجھے بنا رکھا ہے...... مجھے ہمیشہ غلط حرکتوں پر، غلط باتوں پر غلط چیزوں پر غصہ آتا ہے...... اینی ویز...... تم نے ابھی پریکٹیکل لائف کا آغاز کیا ہے آہستہ آہستہ خود ہی سمجھ جاؤ گی...... زندگی کی الجھنیں رفتہ، رفتہ ہماری ہنسی کو کم کر دیتی ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ اب ہم بڑے ہو گئے ہیں، میچور ہو گئے ہیں۔'' ویٹر کافی سرو کرنے لگا...... ایشال خاموشی سے اُن کی بات کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرنے لگی...... ویٹر کے جانے کے بعد ڈاکٹر عمر نے کافی کا سپ لیا۔

''میں نے سنا ہے ارسل نے تمہیں پروپوز کیا ہے؟''

ایک غیر متوقع سوال پر حیرت سے کافی پیتی ایشال نے سر اٹھایا۔

''جی ٹھیک سنا آپ نے......''

''ارسل سے کسی بھی قسم کی...... کمٹ منٹ کرنے سے پہلے اسے اچھی طرح سے پرکھ لینا...... کبھی، کبھی لوگ وہ نہیں ہوتے جو ہم انہیں سمجھتے ہیں۔'' ڈاکٹر عمر دھیرے سے اسے سمجھا رہے تھے۔

''آئی نو...... ارسل نے میرے لیے پروپوزل ضرور بھیجا ہے مگر میرے دل میں فی الحال اس کے لیے کوئی فیلنگز نہیں ہیں۔'' ایشال نے کافی کا سپ لیا...... اور فیصلہ سنایا۔

''اس نے اپنے غلط رویے پر معافی مانگی جو اچھی بات ہے...... مگر مجھے وہ ٹوٹلی فلرٹ لگتا ہے......'' ڈاکٹر عمر نے اظہار کیا...... نہ جانے وہ اس طرح ارسل کے بارے میں اس سے کیوں ڈسکس کر رہے تھے۔ ایشال نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔

''یہ تو وقت ثابت کر دے گا کہ وہ کس حد تک سنجیدہ ہے۔''

ڈاکٹر عمر نے اس کی بات پر کافی پیتے ہوئے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا۔

''اچھا اب اپنی کافی ختم کرو...... ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔'' انہوں نے بات بدلتے ہوئے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی...... اس کے بعد ہلکی پھلکی گپ شپ لگاتے ہوئے وہ کافی شاپ سے باہر نکل آئے تھے۔ واپسی پر ایشال کو نور منزل ڈراپ کرتے ہوئے وہ نانو سے ملنے اندر تک آئے تھے۔ نانو اور سمیرا بیگم نے زبردستی ڈاکٹر عمر کو کھانے پر روک لیا تھا۔

گھر آ کر اس نے عنایہ کو بتایا تھا کہ عمر بھائی اسے کافی شاپ لے کر گئے تھے تو اسے یقین نہیں آیا...... شام میں اس نے علینہ کو بھی کال کر کے اطلاع دی تو اس نے بھی یہ ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

''امپاسبل ایشو...... عمر بھائی جیسے سڑیل انسان تمہیں کافی پلانے لے کر جائیں...... جنہیں شروع سے ہی تم سے خدا واسطے کا بیر ہے، وہ تمہاری انسلٹ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، وہ اور تمہیں کافی پلائیں گے؟'' علینہ کا انداز تمسخر اڑانے والا تھا...... ایشال کو پہلی بار اس کا ڈاکٹر عمر کے بارے میں یوں بولنا اچھا نہیں لگا تھا۔

''جی نہیں...... اب ایسے سڑیل بھی نہیں ہیں بیچارے عمر بھائی...... وہ دل کے بہت اچھے ہیں...... اور مجھ سے کیوں انہیں خدا واسطے کا بیر ہوگا؟ یہ سچ ہے مجھے ان سے ڈانٹ ہمیشہ اپنی غلطیوں کی وجہ سے پڑتی ہے۔'' ایشال نے تسلیم کیا۔

''اوئے ہوئے...... ایک بار کافی کیا پلا دی انہوں نے۔ تمہاری تو عمر بھائی کے بارے میں رائے ہی چینج ہوگئی...... ویسے اگر تمہیں یاد ہو تو تمہارے ہی الفاظ بول رہی تھی میں...... جو تم عمر بھائی کے متعلق کہا کرتی تھیں......'' علینہ نے اسے یاد دلایا۔

''مجھے افسوس ہوتا ہے تب میں کتنا غلط بولتی تھی عمر بھائی کے بارے میں۔'' اسے واقعی افسوس ہوا۔

''ویسے میری دادو ایک بات کہتی ہیں...... اللہ کی رحمت کی پہلی نشانی یہ ہوتی ہے کہ انسان کو اپنے عیب نظر آنے شروع ہو جاتے ہیں...... عمر بھائی کے ساتھ رہ، رہ کر تمہارا حلیہ چینج ہوتا جا رہا ہے...... اب کہیں خود ان کی طرح نیرو مائنڈڈ (تنگ نظر) اور روڈ مت ہو جانا ورنہ میری تمہاری فرینڈ شپ خطرے میں پڑ جائے گی......'' علینہ نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

''شٹ اپ علینہ...... اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ عمر بھائی اتنے روڈ اور تنگ نظر نہیں ہیں۔'' ایشال کو علینہ پر غصہ آیا۔

''ارے واہ...... آج تم عمر بھائی کے ساتھ جسٹ کافی پی کر مجھے شٹ اپ کہہ رہی ہو...... کل کلاں کو اگر انہوں نے تمہیں کہیں لنچ یا ڈنر کروا دیا تو پھر تو مجھے تم نہ جانے کیا، کیا کہو گی؟''
علینہ چیخی تو ایشال بے ساختہ ہنسنے لگی۔
''ہاں تو ٹھیک ہے ناں تم بھی آئندہ عمر بھائی کے بارے میں ایسے الفاظ استعمال مت کرنا ناں......'' اس نے مذاق میں اسے تنبیہہ کی۔
''اوہو...... واہ بھئی کتنے معتبر ہو گئے ہیں عمر بھائی ان چند دنوں میں؟ اپنے ساتھ، ساتھ اب ہم سے بھی کی عزت کروائی جا رہی ہے...... امیزنگ یار مجھے تو دال میں کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے۔'' علینہ نے اسے چھیڑا۔
''اوئیں...... اب زیادہ بکواس نہیں کرو۔''
''بکواس نہیں کر رہی ہوں سچ، سچ بتاؤ کہیں عشق وشق تو نہیں ہو گیا تمہیں عمر بھائی سے؟'' علینہ نے خدشہ ظاہر کیا۔
''اسٹاپ اٹ علینہ...... یہ کس طرح کی نان سینس باتیں کر رہی ہو تم......؟'' ایشال ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئی...... علینہ کی بات نے اسے حیرت انگیز کر دیا تھا، اس کی ہارٹ بیٹ تیز ہو گئی تھی۔
''کم آن ایشو میں صرف تم سے پوچھ رہی ہوں...... تم تو ایسے مجھ سے خفا ہو رہی ہو جیسے سچ مچ تمہیں عمر بھائی سے محبت ہو گئی ہو......'' علینہ اس کے ایٹی ٹیوڈ سے خفا ہوئی۔
''مجھے ان سے کبھی محبت ہو بھی نہیں سکتی......'' ایشال نے دھیمے لہجے میں علینہ کے ساتھ، ساتھ جیسے خود کو بھی یقین دلایا تھا۔

☆☆☆

مناب کراچی سے واپس آ گئی تھی...... اس کا لکھا ہوا ڈراما سیٹ پر چلا گیا تھا۔ جس شام کو وہ واپس آئی تھی اسی رات وہ ساجدہ بیگم اور ڈاکٹر عمر کے ساتھ نور منزل آ گئی تھی۔
بہت دنوں کے بعد نور منزل کے تمام افراد گھر میں اکٹھے دکھائی دیے تھے...... لونگ روم میں جیسے رونق سی رونق تھی۔
''بھئی ساجدہ، بچے تو چلو اپنی زندگیوں میں مصروف ہیں کم از کم دو چار دنوں کے بعد تم ہی اِدھر چکر لگا لیا کرو......'' نور بیگم نے اپنے پاس بیٹھی بیٹی سے شکوہ کیا...... تو ساجدہ بیگم مسکرا دیں۔
''اماں گھر کے بکھیڑے ہی جان نہیں چھوڑتے کیا کروں...... مجھے کچن کا کام خود کرنے کی عادت ہے...... اور عمر تو مجال ہے جو فیقو کے ہاتھ کا کچھ پکا ہوا کھا لے......''
''بس ماں کے لیے ٹائم نہیں ہے تمہارے پاس...... باقی دنیا جہان کے کام کرتی ہو۔'' نور بیگم خفا ہوئیں۔
''اماں...... اب ایسے تو مت کہیں...... آپ ہمارے لیے سب سے اہم ہیں۔'' ساجدہ بیگم نے مسکراتے ہوئے اُن کے ہاتھ تھام لیے۔
''ساجدہ آپا! اماں تو اب بچوں کی طرح خفا ہو جاتی ہیں...... بچوں کی طرح منانا پڑتا ہے انہیں۔'' داؤد چوہدری نے مسکراتے ہوئے اطلاع دی۔
''تو اور کیا...... پچھلے دنوں ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اماں کو پرہیزی کھانا بنوا کر دیا تو اماں خفا ہو گئیں کہ مجھے پھیکا کھانا کیوں دیا ہے...... میں تو وہی کھاؤں گی جو سب گھر والوں کے لیے بنا ہے۔'' سمیرا بیگم کچن سے لونگ روم میں آ کر داؤد چوہدری کے پاس بیٹھتے ہوئے مسکراتے ہوئے بولیں۔ لونگ روم میں بیٹھے تمام افراد

مسکرادیے تو نور بیگم جھینپ گئیں۔
"My grandmother is the best grandmother in the world"
زارون نے مسکراتے ہوئے نور بیگم کو دیکھا۔
"I agree" ڈاکٹر عمر نے بھی مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔
''ممانی، اقصم نظر نہیں آرہا...... کہیں گیا ہوا ہے کیا؟'' مناب نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''نہیں بیٹا، گیا تو وہ کہیں نہیں...... وہ اپنے روم میں ہوگا تم جا کر دیکھ لو اسے۔'' سمیرا بیگم کے بتانے پر مناب اٹھ کر اقصم کے روم کی طرف بڑھ گئی۔
''پھپو آپ کو ایک بریکنگ نیوز سناؤں؟'' عنایہ جو ایشال کے ساتھ بیٹھی پاؤں جھلا رہی تھی اچانک ساجدہ بیگم کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔
''کیسی بریکنگ نیوز؟'' ساجدہ بیگم کے ساتھ، ساتھ سب نے حیران نظروں سے عنایہ کو دیکھا۔
''ایشو نے آج پاستا بنایا ہے۔'' عنایہ نے نیوز سنائی۔
''میری ایشو نے......؟'' ساجدہ بیگم حیرانی سے مسکرائیں۔
''جی، آج کل اس پر کوکنگ سیکھنے کا ایک نیا بھوت سوار ہوگیا ہے۔''
''بھئی یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' داؤد چوہدری نے خوشی کا اظہار کیا۔
ایشال مسکرا کر سر جھکا گئی تھی، ڈاکٹر عمر نے خوشگوار حیرت سے اپنے سامنے بیٹھی اس غیر سنجیدہ سی لڑکی کو دیکھا جو اس وقت کافی سنجیدہ اور بڑی، بڑی سی لگ رہی تھی۔
''بڑے پاپا آپ زیادہ خوش مت ہوں...... اگر آپ نے ایشو کا بنایا ہوا پاستا کھالیا تو ساری خوشی ہوا ہوجائے گی...... اتنا ہولناک پاستا بنایا ہے اس نے۔'' عنایہ نے مسکراتے ہوئے اطلاع دی۔
''عینی اب اتنا بھی برا نہیں بنا ہے...... کیوں زارون بھائی؟ آپ نے ٹیسٹ کیا تھاں ناں، آپ ہی بتائیں...... کتنے مزے کا بنایا تھا میں نے پاستا......''
''ہاں، بہت مزے کا تھا...... اس میں صرف چکن بہت سخت تھا...... اور پاستا بہت زیادہ گل کر لئی ٹائپ ہوگیا تھا...... نو ڈاؤٹ وہ گلو کے طور پر بھی کام آسکتا تھا۔'' زارون نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔
''زارون بھائی بہت خراب ہیں آپ......'' ایشال نے خفگی سے زارون کو دیکھا۔
''کم آن ایشو...... ابھی تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ میں تمہیں بتاؤں پاستا کیسا بنا تھا؟'' زارون اسے تنگ کرنے اور چھیڑنے کے موڈ میں تھا...... وہاں بیٹھے سب افراد مسکرا رہے تھے۔
''رہنے دیں آپ اپنی تنقید نما تعریف...... عنقریب دودھ پلائی اور جوتا چھپائی کی رسم میں واسطہ تو مجھ سے ہی پڑے گا ناں آپ کا......'' ایشال نے بھی مسکراتے ہوئے دھمکی دی اور کشن اٹھا کر زارون کو مارا۔
''اس کا مطلب ہے اب میری خیر نہیں......؟'' زارون نے کشن کیچ کرتے ہوئے کہا۔
''جی بالکل، اب میں آپ کی ٹیپکل سالی بنوں گی۔''
''عمر بھائی میری کچھ ہیلپ کریں...... اِدھر میرے خلاف محاذ کھولا جارہا ہے۔'' زارون نے مدد طلب انداز میں ڈاکٹر عمر کو دیکھا۔
''بھئی یہ تم دونوں کا معاملہ ہے، میں کیا مدد کرسکتا ہوں۔'' ڈاکٹر عمر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''ایک آپ ہی تو ہیں جو مجھے ایشو کے چنگل سے چھڑا سکتے ہیں۔'' زارون نے دہائی دی۔ زارون کی بات پر ڈاکٹر عمر نے دھیرے سے اپنے سامنے بیٹھی اس ہنستی مسکراتی ہوئی زارون سے لڑتی جھگڑتی ہوئی لڑکی کو دیکھا...... جو ہمیشہ نہایت خاموشی سے ان کی ڈانٹ سہہ لیا کرتی تھی جو دو چار دن ان سے خفا رہ کر پھر سے ویسے ہی ہو جاتی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہو...... گزشتہ کئی دنوں سے اس میں خاصی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں...... ڈاکٹر عمر نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اگنور نہیں کر پا رہے تھے...... وہ ایشال چوہدری کے سحر میں دھیرے، دھیرے جکڑے جا رہے تھے لونگ روم میں ہنسی مذاق چل رہا تھا۔

مناب جب اقصم کے روم کا دروازہ ناک کر کے اندر داخل ہوئی تو اقصم گٹار بجاتے ہوئے کچھ گا رہا تھا۔ اس کے پاس پیپر اور قلم رکھا تھا...... کئی پیپر مروڑ کر اس نے کارپٹ پر پھینکے ہوئے تھے۔

''السلام علیکم......! کیسے ہو چھوٹو......؟'' مناب مسکراتے ہوئے اندر بڑھ آئی۔

''وعلیکم السلام......! فائن، تھینکس گاڈ آپ جلد واپس آ گئیں...... کیسا رہا آپ کا ٹور......؟'' اقصم اسے دیکھ کر از حد خوش ہوا۔

''بہت اچھا رہا...... میرا ڈرامہ سیٹ پر چلا گیا ہے، کاسٹ بہت اچھی ہے ڈائریکٹر نے میرے ڈرامے میں سپر اسٹارز کو کاسٹ کیا ہے...... اسی چینل کے ساتھ ایک اور پروجیکٹ پہ بھی میٹنگ ہوئی ہے میری...... انشاء اللہ ایک اور سیریل لکھوں گی اس ٹیم کے ساتھ۔'' مناب اس کے پاس صوفے پر بیٹھتے ہوئے خوشی سے اقصم کو تفصیل بتانے لگی۔

"oh wow great news" اقصم مسکرایا۔

''تم سناؤ کیا ہو رہا ہے آج کل؟ ماموں کے آفس بھی جاتے ہو یا عیش ہو رہے ہیں اب تک؟'' مناب نے

اس کے بال بکھیرے۔
''ایک دو دفعہ آفس گیا ہوں...... باقاعدگی سے فی الحال نہیں جا رہا۔'' اقصم دھیرے سے مسکرا دیا۔
''تو پھر کیا کرتے رہے ان پانچ دنوں میں؟ کہیں کوئی لڑکی شڑکی تو نہیں پھنسالی؟'' اس کے انداز پہ اقصم نے قہقہہ لگایا۔
''لڑکیاں خود پھنسنا چاہتی ہیں میرے ساتھ...... مجھے کوئی شوق نہیں ہے انہیں پھنسانے کا...... اینی وے میں نے ایک سونگ لکھا ہے...... یہ دیکھیں...... آدھا لکھ چکا ہوں باقی مکمل نہیں ہو رہا......'' اقصم نے پیپر مناب کے آگے بڑھایا۔
''اوہ، یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔'' مناب نے حیرت اور خوشی سے اس کے ہاتھ سے پیپر پکڑ کر پڑھنا شروع کیا۔

''اے عشق ترے ہیں کھیل عجب
تیرا ہجر عجب تیرا میل عجب
کبھی رانجھا جوگی بنتا ہے
کبھی مجنوں روگی بنتا ہے
اے عشق ترے ہیں کھیل عجب
کبھی سولی پر لٹکاتا ہے
کبھی انا الحق کہلاتا ہے
اے عشق ترے ہیں کھیل عجب
کبھی ہونٹوں سے کچھ کہہ نہ سکے
کبھی اشکوں سے تو بات کرے
اے عشق ترے ہیں کھیل عجب

ارے واہ چھوٹو یہ...... یہ تم نے لکھا ہے؟ مجھے تو یقین نہیں آ رہا تم تو بھئی چھپے رستم نکلے......'' مناب نے حیرانی سے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔
اقصم مسکرا دیا۔
''میں تمہیں یہ سونگ کمپلیٹ کر دوں گی...... بلکہ یہ قلم دو۔'' مناب نے اقصم کے ہاتھ سے قلم لیا اور کاغذ پر مزید اشعار لکھنے لگی۔

''کبھی سسی، سوہنی، ہیر بنے
کبھی ماتھے کی تقدیر بنے
اے عشق ترے ہیں کھیل عجب
کبھی سہتی کبھی مراد بنے
کبھی شیریں کا فرہاد بنے
اے عشق ترے ہیں کھیل عجب''

مناب کاغذ پر اشعار لکھتے، لکھتے اقصم کو سنا بھی رہی تھی۔
''واؤ گریٹ......'' اقصم نے بے ساختہ داد دی۔

''آخری شعر سنو......

کبھی ہونٹوں پر مہتاب سجے
کبھی آنکھوں میں سیلاب سجے
اے عشق ترے ہیں کھیل عجب
تیرا ہجر عجب تیرا میل عجب
اے عشق ترے ہیں کھیل عجب

چھوٹو کیسا رہے گا یہ؟'' مناب نے کاغذ قلم اقصم کی طرف بڑھایا......اقصم کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی...... بیٹھے بٹھائے اس کا سونگ مکمل ہوگیا تھا۔

''میں اس سونگ کو کسی اچھے سے کمپوزر سے کمپوز کرواؤں گا۔''

'' اور اس کی وڈیو بنوا کر کسی میوزک چینل پر چلوانا...... یہی کہا تھا ناں فاریہ نے؟'' مناب نے مسکراتے ہوئے اسے یاد دلا دیا۔

''ہاں، چیکو نے مشورہ اچھا دیا تھا۔'' اقصم نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

☆☆☆

زارون اور عنایہ کی شادی میں بہت کم دن رہ جانے کے پیش نظر ناردرن ایریا جانے کا پروگرام فی الحال ملتوی ہوگیا تھا...... البتہ یہ ویک اینڈ گاؤں میں اپنی آبائی حویلی میں گزارنے کا مشترکہ فیصلہ کرلیا گیا تھا۔
حویلی کے ملازمین متحرک ہوکر حویلی کی صفائی ستھرائی میں مصروف ہوچکے تھے۔ دوسری طرف نور منزل کی ینگ جنریشن اپنی بھاگتی دوڑتی شہری بے سکون زندگی سے ایک عرصے کے بعد ٹائم نکال کر دو دن گاؤں کی پُرسکون زندگی میں گزارنے کے لیے بے تاب نظر آرہی تھی...... جمعہ کو لنچ کے بعد نور منزل کے ملازمین گھر کے مکینوں کا سامان گاڑیوں میں رکھنے لگے تھے۔ پپو اور اسلم کو چند گھنٹے پہلے گاؤں بھجوا دیا گیا تھا سب اپنی، اپنی گاڑیوں میں بیٹھ چکے تھے۔ حیرت انگیز طور پر اس بار اقصم نے ڈاکٹر عمر کو بھی گاؤں چلنے پر آمادہ کرلیا تھا...... ایشال، اقصم کے ساتھ اس کی اسپورٹس کار میں بیٹھی تھی...... ایشال نے مناب کو بھی اپنی کمپنی کے لیے ساتھ بٹھالیا تھا۔ مناب نے شاکنگ پنک ڈھیر ساری چنٹوں والی پٹیالہ شلوار پر بلیک کلر کی ہاف سلیوز شارٹ شرٹ پہن رکھی تھی...... ساتھ میں اس نے کندھوں پر گرین کلر کا دوپٹا لے رکھا تھا...... بلیک گلاسز لگائے وہ اقصم کا دل بے ایمان کررہی تھی...... آج وہ اتنی خوب صورت لگ رہی تھی کہ ایک لمحے کو بھی اس سے نظر ہٹانے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

''وہ میرا سب کچھ ہے میرا مقدر نہیں
کاش وہ میرا کچھ نہیں ہوتا میرا مقدر ہوتا''

اقصم نے بھی آنکھوں پر لگائے گلاسز کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے نظروں کے ذریعے دل میں اتار لیا تھا۔
تمام گاڑیاں قطار کی صورت میں گاؤں کے لیے روانہ ہوچکی تھیں۔ مناب، اقصم کی پچھلی نشست پہ بیٹھی تھی اور اپنے سیل فون سے شاید ولی کو میسج کررہی تھی۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ سے اقصم کو اندازہ ہوگیا تھا یقیناً وہ ولی سے ہی چیٹ کررہی ہے...... اس کا دل ہمیشہ کی طرح حسد کی آگ میں جلنے لگا۔

''تجھے دل سے کیسے نکالوں

کسی نالائق طالب علم کی طرح
دل نے تیرے نام کے رٹے لگا رکھے ہیں''

''اقصم یار کتنے بدذوق ہو گئے ہو تم...... ایسے سفر کیسے گزرے گا...... اچھا سا میوزک ہی لگا لو۔'' ایشال بور ہوئی تو اقصم نے ڈرائیو کرتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر میوزک پلے کیا...... ارجیت سنگھ کی رومینٹک آواز گاڑی میں گونجنے لگی۔

''آج پھر تم پر پیار آیا ہے
بے حد اور بے حساب آیا ہے''

گلاسز لگائے اقصم نے بیک مرر سے مناب کو دیکھا...... اس کے ہاتھ میں اب بھی سیل فون تھا، وہ ولی کو گاہے بگاہے میسج کر رہی تھی...... جس کا ریپلائی پڑھ کر اس کے لبوں پر ایک خوب صورت اور گہرا سا دلفریب تبسم بکھر جاتا تھا...... اقصم کا دل چاہتا اس کے لبوں پر ولی کے نام کا تبسم چرا لے...... چھین لے اس کے ہونٹوں سے ولی کے نام کی مسکراہٹ......

اب بھی وہ سیل فون ہاتھ میں پکڑے اپنے ہی دھیان میں مسکرا رہی تھی۔ اقصم نے بے ساختہ بیک مرر سے اسے دیکھا تھا اور پھر چند لمحے اس کے مسکراتے ہوئے چہرے سے نظر نہیں ہٹا سکا تھا۔

اپنے دل کی قنوطی حالت پر وہ اکثر سوچا کرتا تھا کہ یہ عشق اسے سیدھے سادے راستے سے کن بھول بھلیوں میں لے گیا تھا...... جہاں وہ روز بروز گم ہو رہا تھا، لاپتا ہو رہا تھا۔

اب تمام گاڑیاں موٹروے سے اتر کر ان کے آبائی گاؤں کی حدود میں داخل ہو چکی تھیں۔ گاؤں اب پہلے جیسے نہیں رہے تھے...... وہاں کے لوگ بھی بہت حد تک Civilised ہو گئے تھے۔ حویلی میں ان سب کا بڑے شاندار انداز میں استقبال ہوا تھا۔

دو گھنٹے کا سفر طے کرنے کے باوجود سب خوش اور ہشاش بشاش نظر آ رہے تھے۔

غروب ہوتے سورج کی کرنوں نے حویلی کی اونچے کنگروں پر نارنجی سی لالی بکھیر رکھی تھی حویلی کے چاروں اطراف باؤنڈری وال کے ساتھ لگے گھنے اور پھل دار درختوں پر چڑیوں نے شور مچا رکھا تھا۔

حویلی کے وسیع تر لان میں ٹیبل اور کرسیاں بھی لگا دی گئی تھیں۔ اسلم اور پپو نے ان سب کے لیے کھانے پینے کے حوالے سے تمام انتظام کر رکھے تھے...... فریش ہونے کے بعد سب ایک ہال نما کمرے میں جمع ہونے لگے، پہلے وقتوں میں یہ کمرا لونگ روم کے طور پر استعمال ہوا کرتا تھا، نئی نسل حویلی کے منقش اور روایتی انٹیریز اور رکھ رکھاؤ سے بہت متاثر نظر آ رہی تھی...... اقصم نے تو آتے ہی اپنا کیمرا نکال لیا تھا اور کچھ تصویریں اپنے کیمرے میں مقید کر لی تھیں۔ زارون اور عنایہ حویلی کے دالانوں اور باغ میں گھوم پھر رہے تھے۔ ملازم نے انہیں چائے بن جانے کی اطلاع دی تو وہ دونوں بھی اندر آ گئے۔ ایشال گرم پانی سے شاور لے کر اب اپنے اور مناب کے مشترکہ روم میں اپنے بیگ سے گرم لانگ اپر ڈھونڈ رہی تھی۔ اس کی پشت پر گیلے بال بکھرے ہوئے تھے۔

''مناب بھئی میرا سوئیٹر کہاں رکھا ہے تم نے......؟'' اچانک ڈاکٹر عمر روم میں داخل ہوئے مگر روم میں مناب کی جگہ ایشال کو گیلے بالوں کے ساتھ کھڑے دیکھ کر ایک دم سے ٹھٹک کر وہیں رک گئے تھے۔

''سوری، میں دروازہ ناک کیے بغیر اندر آ گیا...... میں سمجھا کہ مناب ہو گی یہاں...... مگر...... آئی ایم سوری......'' اگلے ہی لمحے وہ شرمندہ سے انداز میں باہر نکل گئے تھے۔

(جاری ہے)

یادگار

ثمینہ عظمت علی

''ہر دو مہینے بعد اتنا سامان جمع ہو جاتا ہے، سمجھ ہی نہیں آتا کہ کیا کریں......'' کرن اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''ہاں، خاص طور پر کپڑے......'' فریال نے ہاں میں ہاں ملائی۔

''سارا مسئلہ ہی ان کپڑوں کا ہے۔'' ایمن نے کہا۔ ''اپنے...... میاں کے...... بچوں کے۔''

''ہمیں دراصل اپنی چیزوں کو reuse اور



recycle کرنا نہیں آتا جس طرح مغرب میں کیا جاتا ہے۔'' کرن نے کہا۔ ''میں نے بہت ساری ویب سائٹس دیکھی ہیں، وہ لوگ اپنے استعمال شدہ کپڑے، جوتے، جیولری، کھلونے غرضیکہ ہر چیز یوں دوبارہ استعمال کرتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جائے۔''

''رہنے دو۔'' فریال نے مذاق اڑایا جب سے اس کے میاں کا پروموشن ہوا تھا وہ کچھ زیادہ ہی ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔ ''معلوم ہے مجھے...... جیسے خالی کیچپ کی بوتل میں منی پلانٹ لگا دیا۔ پرانی جرسی سے بچے کا پاجامہ بنا دیا، بیڈ شیٹ کے دستر خوان یا گھسے ہوئے کپڑوں کی صافیاں، اب کون کرتا ہے ایسا آج کل۔''

''وہی تو میں کہہ رہی ہوں......'' کرن نے کہا۔

''آج کل ہر چیز زیادہ ایڈوانس ہوگئی ہے، تم دیکھو تو حیران رہ جاؤ۔''

''اول تو ہمیں اتنی شاپنگ کرنی ہی نہیں چاہیے، اس وقت تو پتا نہیں چلتا...... بعد میں پریشان کہ اتنا سامان جائے تو جائے کہاں...''

''کیسے اور کیوں نہ کریں شاپنگ......'' کرن بولی۔

''اتنا بڑا خاندان، سوشل سرکل، اٹھنا بیٹھنا، آنا جانا، آئے دن کی تقریبات، ضرورت ہے تو ہے ناں......''

''میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا ہے۔'' فریال نے اچانک کہا۔

''کیا؟'' باقی دونوں اس کی جانب متوجہ ہوگئیں۔

''ہم اپنے پرانے کپڑوں یا کوئی بھی پرانی چیزوں سے کوئی ایک یادگار چیز بناتے ہیں۔''

''ہاں!'' کرن پُرجوش ہوگئی۔ ''میں نے نیٹ پر دیکھا تھا لندن کی ایک عورت نے اپنے بچے کے پرانے کپڑے جوڑ کر اس کے لیے پوری ایک رضائی بنا دی۔ اتنی خوب صورت اور یونیک لگ رہی تھی کہ حد نہیں۔''

''آئیڈیا تو اچھا ہے۔'' ایمن بھی متاثر نظر آئی۔

''ہاں تو بس ٹھیک ہے، اگلی بار جب ایمن کے گھر جمع ہوں گے تو وہ ''یادگار چیز'' ساتھ لائیں گے۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔'' تینوں متفق ہوگئیں۔

☆☆☆

ایمن، فریال اور کرن کی دوستی بہت پرانی تھی جو ان کی شادیوں کے بعد بھی برقرار تھی۔ کرن اور فریال آپس میں کزنز بھی تھیں۔ تینوں دوستیں مہینے میں ایک بار کسی ایک کے گھر جمع ہو کر ساتھ وقت گزارتی تھیں اور ظاہر ہے کہ اُن کے میاں اور بچے بھی آپس میں دوست ہو چکے تھے سو سب بہت انجوائے کرتے تھے۔ سبھی کا تعلق خوشحال گھرانوں سے تھا، اس لیے گھومنا پھرنا، شاپنگ، پکنک، پارٹی وغیرہ، وغیرہ...... راوی ہر طرف چین ہی چین لکھتا تھا۔

☆☆☆

فریال نے ایک سالہ اسید کو بے بی کاٹ میں لٹا دیا۔ وہ سکون سے سو رہا تھا اور خود پاس ہی لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گئی۔ جب سے تینوں دوستوں نے ایک یادگار چیز بنانے کا فیصلہ کیا تھا اس کو جنون سوار ہوگیا تھا کہ سب سے اچھی چیز وہ بنائے...... یہ تو انسان اور خاص طور پر عورت کی فطرت ہے کہ چاہے جتنی دوستی اور محبت ہو لیکن اندر ہی اندر مقابلے کا جذبہ ضرور ہوتا ہے...... فریال کی طبیعت میں یوں بھی نسبتاً خود پسندی تھوڑی زیادہ تھی لیکن یہ بھی تھا کہ وہ کرن اور ایمن کے مقابلے میں اتنی آرٹسٹک یا سگھڑ نہیں تھی۔ وہ اکثر محسوس کرتی تھی کہ دعوت، پارٹی یا عام آنے جانے میں بھی لباس، طور طریقے میں وہ ان سے ذرا پیچھے رہ جاتی تھی پھر اس کمی کو وہ پیسے کی زیادتی سے پورا کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ بہر حال کچھ بھی تھا تینوں کی دوستی اس قدر تھی کہ یہ چیزیں اتنی اہمیت بہر حال نہیں رکھتی تھیں اور نہ کرن اور ایمن ہی اس کی باتوں کو سنجیدگی سے لیتی تھیں۔

اب بھی وہ گوگل سرچ کے سر پر سوار تھی۔ ری سائیکلنگ، ڈو اٹ یور سیلف، پن انٹرسٹ ہر طرح کی ویب سائٹس اس کے سامنے کھلی پڑی تھیں لیکن وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ایمن اور کرن

بھی یہیں سے آئیڈیا لیں گی۔ پھر اچانک اسے خیال آیا کہ اسے اگلے پیج پر چلے جانا چاہیے کیونکہ سب پہلے آنے والے لنک کھول لیتے ہیں۔

یوں اس نے ایک اچھا آئیڈیا حاصل کرلیا جس سے وہ یقیناً ایک یادگار چیز بنانے والی تھی۔

☆☆☆

کرن اسٹور سے پرانے میگزین نکالے بیٹھی تھی۔ اردو، انگریزی، فیشن، کھانے پینے کے، دستکاری ہر طرح کے...... اسے یہ خیال آیا کہ آج کل سب انٹرنیٹ ہی استعمال کرتے ہیں۔ اسے یقین تھا کہ فریال اور ایمن ضرور نیٹ سے ہی کوئی ڈیزائن، کوئی نمونہ نکالیں گی تو کیوں نہ وہ پرانے میگزین نکالے۔ جس میں ایسا کوئی اچھوتا خیال ہو...... کوئی قدیم رواج جس کا جدت سے کوئی تعلق نہ ہو اور وہ خود ہی ایک جدید چیز بن جائے...... اس کی ساس ایک پڑھی لکھی، سلیقہ مند اور سگھڑ خاتون تھیں، اُن کے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں اب بھی گھر کی رونق بنی ہوئی تھیں اسی لیے کرن نے ان کی کتابوں سے استفادہ کرنے کا فیصلہ کیا جو کہ اس کے حق میں نہایت اچھا بھی ثابت ہوا کیونکہ اس کو ایک سے ایک اچھے ڈیزائن اور چیزوں کو دوبارہ استعمال کرنے کے طریقے مل رہے تھے اور اس کا یقین تھا کہ وہ ایک یادگار چیز بنانے والی ہے۔

☆☆☆

ایمن نہایت الجھی ہوئی تھی۔ فریال اور کرن کے مقابلے میں اس کی شادی جلدی ہوئی تھی۔ لہٰذا فریال کا ایک، کرن کے دو اور ایمن کے تین بچے تھے۔ جس میں سے دو اسکول جاتے تھے اور آج کل اُن کے شیڈول ٹیسٹ ہو رہے تھے۔ ایمن بچوں کی پڑھائی کے معاملے میں بہت حساس تھی۔ اچھے اسکول، اچھے ٹیوٹر کے باوجود وہ خود بھی بچوں کی ایک، ایک چیز چیک کرتی تھی۔ اس لیے آج کل وہ بہت بزی تھی لیکن اس کے ساتھ، ساتھ اس کا ذہن اس چیز میں بھی اٹکا ہوا تھا جو اس کے فریال اور کرن کے درمیان طے ہوئی تھی۔

اس کی پوری کوشش تھی کہ وہ کوئی ایسی چیز تیار کرلے جو سب کو چونکا دے۔ اس وقت بھی وہ اپنا ٹیبلٹ ہاتھ میں لیے سرچ کرنے میں مصروف تھی۔ اپنی میڈ سے اس نے چائے لانے کا کہا تھا۔ ٹیبلٹ پر انگلی چلاتے، چلاتے وہ اٹھی اس کا ارادہ الماری کھولنے کا تھا کہ اچانک سامنے سے آتی ہوئی میڈ سے ٹکرا گئی۔ ٹیبلٹ اس کے ہاتھ سے گر گیا اور میڈ کے ہاتھ میں چائے چھلک گئی۔ ٹیبلٹ چونکہ صوفے پر گرا تھا اس لیے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

ایمن نے ناگواری سے دیکھا۔ کام والی کے پیچھے اس کے دو میلے کچیلے بچے چلے آرہے تھے۔

''اوہو...... ان کو کیا ساتھ لیے پھر رہی ہو؟'' اس نے کہا۔ ''اور ذرا صاف تو رکھا کرو۔'' اس نے ان کے میلے کپڑوں کو دیکھتے ہوئے کہا جو اس کی نفیس طبیعت پر گراں گزر رہے تھے۔

''رکھ دو چائے۔'' اس نے کہا۔

اور ٹیب پر وہی لنک کھولا جو پیچھے رہ گیا تھا۔ الماری کھولی، اس کا آدھا دھیان ٹیبل پر کھلی ہوئی تصویر پر تھا اور آدھا ادھ کھلی الماری پر...... اچانک اس کی نظر الماری پر اور انگلی ٹیب پر ٹھہر گئی۔

اسے ایک آئیڈیا آ گیا تھا۔

☆☆☆

''یہ دیکھو......'' فریال نے بڑے سے فریم سے ریپر اتارتے ہوئے کہا۔ خوشی، انبساط اور فخر سے اس کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔

''سُپرب۔'' (superb) بے ساختہ ایمن اور کرن کے منہ سے نکلا تھا۔

یہ ایک نہایت خوب صورت وال ہینگنگ تھی جو اسید کی پیدائش سے اب تک کے مختلف کپڑوں کے ٹکڑوں کو جوڑ کر بنائی گئی تھی۔ فریال نے ان کے پیٹرن اتنی خوب صورتی سے کاٹے تھے کہ ایمن اور کرن داد دیے بغیر نہیں رہ سکیں۔ درمیان میں اسید کی ایک نہایت کیوٹ سی تصویر بھی لگی تھی۔

''یہ تم اسید کے کمرے میں لگانا۔'' ایمن نے کہا۔

''ہاں...... exactly میں نے بھی یہی سوچا تھا۔'' فریال نے خوشی سے کہا۔

''واقعی فریال، بہت زبردست بنایا ہے۔'' ایمن اور کرن نے دل سے تعریف کی۔ فریال خوشی سے پھولی نہ سمائی۔

''اب تم دکھاؤ۔'' انہوں نے کرن کے لائے ہوئے بڑے، بڑے پیکٹس کو دیکھا۔

کرن نے بیڈ شیٹ، تکیے، کشن کور، کمفرٹر کا پورا سیٹ بنایا تھا۔ کشنز میں اس نے چھوٹے، چھوٹے اسٹف کھلونے بھی استعمال کیے تھے۔ کارٹونز کی جرسیوں سے کور بنائے تھے۔ کمفرٹر کو سندھی رلی کے پیٹرن میں بنایا تھا۔

سب چیزیں نہایت خوب صورت تھیں۔ فریال اور ایمن نے دل کھول کر تعریف کی۔

''تم اپنا تو بتاؤ۔'' فریال نے بے چینی سے ایمن سے پوچھا۔ وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ ایمن نے آخر کیا بنایا ہے۔

''ہاں ایمن دکھاؤ۔'' کرن نے بھی دلچسپی سے پوچھا۔

''وہ...... اصل میں......'' ایمن ذرا رک گئی۔

''ہیں......!'' فریال نے مصنوعی حیرت اور افسوس سے کہا۔ ''تم کچھ نہیں بنا سکیں...... سوسیڈ...... تم بتاتیں ہم ڈیٹ آگے کر دیتے۔'' اس نے شرارت سے آنکھیں نچائیں۔

اسی وقت ایمن کی میڈ چائے لے کر آئی۔ اس کے پیچھے اس کے دو بچے بھی تھے۔ فریال اور کرن نے یوں ہی سرسری انداز میں سے آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ یک دم انہیں کسی تبدیلی کا احساس ہوا۔

ایمن کی میڈ نہایت صاف ستھرا خوب صورت مشہور بوتیک کا سوٹ پہنے ہوئے تھی جو ایمن نے پچھلے دنوں کسی پارٹی میں پہنا تھا۔ اس کے دونوں بچے خوب صورت برانڈڈ کپڑے، جوتے موزے (یقیناً ایمن کے بچوں کے) تینوں کے چہرے چمک رہے تھے۔ فریال نے کرن کو دیکھا، کرن نے فریال کو...... پھر انہیں بات سمجھ آ گئی۔

''واؤ......'' فریال اپنے جذبات نہ چھپا سکی۔

کرن نے اپنا موبائل اٹھا کر میڈ اور اس کے بچوں کی تصویر کھینچی اور فریال کی اور اپنی بنائی ہوئی چیزوں کے ساتھ رکھ دی۔

ان تینوں کے چہرے پر جو مسکراہٹ تھی وہ سب سے زیادہ ''یادگار'' تھی۔

شعور

ریحانہ زیدی



اس چٹیل میدان میں چلتی یخ بستہ ہواؤں سے بچنے کے لیے اس نے عبایا کے اوپر خاصا موٹا سوئٹر پہنا ہوا تھا۔ ہاتھوں میں دستانے پہنے تھے۔ پیروں میں جاگرز کے اندر خاصے موٹے موزے تھے۔ کاٹن کا موٹا سا دوپٹا نماز کی طرح لپیٹا ہوا تھا پھر بھی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

''پتا نہیں کس نے مشورہ دیا تھا۔ یہاں پر کیمپس بنانے کا۔'' اس نے ساتھ چلتی ربیعہ سے کہا۔

''قسم لے لو میں نہیں دیا تھا۔'' ربیعہ حسبِ عادت مسخرے پن سے بولی۔

''کہاں جارہے ہیں آپ لوگ؟'' میڈم کوثر نے اپنی کورے ان کے برابر روک کر پوچھا۔
''السلام علیکم میڈم......'' سحاب نے جھک کر کہا۔
''میڈم ذرا اے سی ٹو تک جارہے تھے۔ ابھی تک ہماری مارک شیٹ درست ہوکر نہیں ملی ہے۔'' ربیعہ نے جواب دیا۔
''آؤ میں بھی مہران تک جارہی ہوں۔ راستے میں ڈراپ کردوں گی۔'' کوثر نے کہا تو دونوں لڑکیاں موقع غنیمت جان کر فوراً ہی بیٹھ گئیں۔
سحاب سے میڈم کی اچھی دوستی تھی۔
''سچ میڈم، اے سی ٹو کے چکر لگا، لگا کر ہم خود چکرا گئے ہیں۔'' ربیعہ روہانسی ہوکر بولی۔
''یقین کرو ہم بھی اتنے ہی چکر لگاتے تھے یہاں کے......اب تو اتنی سہولت ہے کہ رکشے چلنے لگے ہیں۔ ہمارے زمانے میں تو پوائنٹ کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔'' کوثر ہنس کر بولی۔
''میڈم آپ نے پڑھا بھی یہاں سے ہے اور اب پڑھا رہی ہیں...... پہلے میں اور اب میں کیا فرق ہوا ہے؟'' سحاب نے پوچھا۔
''کیمپس بھی وہی ہے......عمارتیں بھی جوں کی توں ہیں۔ طلبا بھی ویسے ہی ہیں......فرق صرف یہ ہے کہ پہلے زیادہ تر اسٹوڈنٹ کلاسوں میں ہوتے تھے اور آج کل زیادہ تر باہر گپیں مار رہے ہوتے ہیں۔ پہلے لڑکیاں بہت کم کسی سے کھلم کھلا بات کرتی تھیں اب تو لگتا ہے کسی کی پرواہی نہیں رہی۔'' میڈم نے چاروں طرف دیکھ کر کہا۔
سحاب نے دیکھا اس کی کلاس فیلو نورا کسی لڑکے کے ساتھ باتیں کرتی ہنستی ہوئی جارہی تھی۔
''اسے کیا ہوگیا...... یہ تو بہت ہی شریف گھرانے کی لڑکی ہے۔'' ربیعہ نے اسے یوں قہقہے لگاتے دیکھ کر کہا۔
''جی، جی آج کل سارے شریف گھرانوں کی لڑکیاں... یہی کچھ کرتی پھرتی ہیں۔ رہی سہی کسر موبائل نے پوری کردی ہے۔'' میڈم کا لہجہ کڑوا ہوگیا تھا۔
''ہاں میڈم، یہ سوچے بغیر ساری حدیں پھلانگ جاتی ہیں کہ قضا اور قدر کے فیصلے اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں۔ ضروری تو نہیں کہ اگر فریقین ایک دوسرے کو پسند کرتے ہوں تو اللہ کو بھی یہ ملاپ پسند ہو۔ وہ تو قادرِ مطلق ہے، وہ تو بہتر جانتا ہے کہ ہمارے لیے کیا بہتر ہے۔'' سحاب سخت مذہبی سوچ کی لڑکی تھی مگر اس کی بات سن کر میڈم کے سینے میں کوئی چیز چبھ گئی۔ اے سی ٹو کے راستے میں ڈراپ کر کے وہ مہران کی طرف جانے کے بجائے اپنے گھر کی طرف چل دی۔
طیب کامپلیکس کا یہ فلیٹ اس کے نام تھا۔ جب طیب کامپلیکس بن رہا تھا تب ہی بابا نے دونوں بیٹیوں کے نام ایک، ایک فلیٹ بک کروادیا تھا۔ بڑی باجی نے کینیڈا جانے سے پہلے فلیٹ کرایے پر اٹھادیا تھا۔ اور اس کی ذمے داری اس پر ہی تھی۔ وہ کرایہ لے کر بینک میں جمع کروادیتی تھی۔ اماں کے انتقال کے بعد اس نے چھوٹے بھائی کو فیملی کے ساتھ اپنے پاس بلالیا تھا......یوں اس کی تنہائی کافی حد تک کم ہوگئی تھی۔ مگر روح میں سناٹا بہت تھا......جو کسی حال کم ہونے میں نہ آتا تھا۔
''ارے آپ اتنی جلدی آگئیں۔'' چھوٹے بھائی کی بیوی نے پریشان ہوکر پوچھا۔
''ہاں نیلم کچھ طبیعت بحال نہیں ہے۔ کوئی آئے تو مجھے نہیں بتانا... میں سوؤں گی۔'' وہ کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے بولی
اس پر اکثر یہ دورہ پڑتا تھا جب روح کے سناٹے اس پر حاوی ہوجاتے تو وہ یوں ہی کمرا بند کر کے لیٹ جاتی اور آنکھیں بند کرلیتی۔
اماں جان ہمیشہ کی طرح تیز آواز میں بڑبڑاتی ہوئی اندر آئیں۔
''جسے دیکھو منہ اٹھائے چلا آتا ہے۔ نہ اپنا آگا دیکھتے ہیں نہ پیچھا دیکھتے ہیں۔ پیدائشی کنگلے ہیں...... پھر بھی آگئے رشتہ لے کر......تھڑوں میں بیٹھنے والے اللہ کی شان ہم سے رشتہ مانگ رہے ہیں۔ اے سب

کی نظریں اس کی نوکری اور فلیٹ پر ہیں...... سارے کا سارا کنبہ یہیں آن مرے گا......'' وہ سروتے سے چھالیا کترتے ہوئے بڑبڑا رہی تھیں۔

کوثر نے بہت گہری سانس لے کر اُن کو دیکھا۔ اسے پتا تھا کہ وسیم کے گھر والوں کا یہی حشر ہونا تھا۔ آثار بتا رہے تھے کہ اماں جان ٹھیک ٹھاک تواضع کر کے آئی ہیں ان کی۔ لاؤنج میں بٹھایا ہوگا اور وہیں سے رخصت کردیا ہوگا۔ اماں جان کو اپنے شاندار ڈرائنگ روم اور بقیہ کمروں کی سجاوٹ کا بڑا مان تھا۔ وہ اپنے سے مالی طور پر کمتر لوگوں کو بہت حقیر سمجھتی تھیں۔ صرف اپنے برابر والوں ہی سے ملتی تھیں۔ اب اس میں وسیم کا کیا قصور تھا کہ باپ، چچاؤں کے جھگڑے میں ان کے بیس کمروں والے تین منزلہ مکان کا بٹوارا ہو گیا...... اور ان کے حصے میں ایک چھوٹا سا مکان ہی مل پایا۔ وسیم سب سے بڑے تھے...... دو ماہ پہلے ان کی نوکری لگی تھی۔ اماں کو ان کی شادی کا چاؤ چڑھ گیا تو انہوں نے کوثر کا نام لے لیا...... کوثر کو انہوں نے یونیورسٹی آتے جاتے دیکھا تھا۔ اپنے کام سے کام رکھنے والی کوثر انہیں اچھی لگنے لگی۔

کوئی میٹنگ نہیں ہوئی، نہ ہی ملاقاتوں کا اہتمام ہوا پھر بھی شاید یہ وجود سے اٹھتی ہوئی محبت کی خوشبو تھی...... جو یہ لوگ ایک دوسرے کے نزدیک آگئے۔ یہ بھی اتفاق تھا کہ فائنل کرتے ہی دونوں کو یونیورسٹی میں جاب مل گئی۔ کوثر کو اپنے ڈیپارٹمنٹ میں اور وسیم کو مہران میں، لڑکے نوکری پر لگ جائیں تو مائیں خود بخود اِدھر اُدھر لڑکیاں دیکھنے لگتی ہیں۔

وسیم نے بہن کو کوثر کا بتایا تو یہ لوگ فوراً ہی وہاں پہنچ گئے مگر اماں جان نے ان کی جو عزت افزائی کی اس پر بہت دلگرفتہ ہو کر وہ واپس ہوئے۔

اگلے دن کوثر کی ہمت نہ ہوئی کہ وسیم کا سامنا کرے اور وسیم خود بھی اس کی طرف نہ آئے۔

☆☆☆

وقت آہستگی سے گزرتا رہا...... اماں جان زیادہ تر رشتے کے لیے آنے والوں کو ایسے ہی لتاڑتی تھیں، کوثر میں ان کے آگے بولنے کی ہمت نہیں تھی۔ پتا نہیں انہیں کیسا رشتہ چاہیے تھا...... رشتوں کو مسلسل ٹھکراتے، ٹھکراتے ایک دن وہ خود ہی چل دیں۔ ان کے آگے کوئی دم نہیں مارتا تھا، ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی بھائیوں نے گھر بیچ کر اپنا، اپنا ٹھکانا الگ کرلیا۔ چھوٹے بھائی نے بھی اپنا گھر لے لیا...... مگر کوثر نے اسے اپنے ساتھ رکھ لیا۔ گھر کرائے پر اٹھادیا۔ وسیم نے بھی شادی کرلی تھی۔ تین پیارے، پیارے بچے تھے۔ کوثر اب بھی ساری مشکلات وسیم ہی سے شیئر کرتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس کے لیے وسیم ہی بہترین راہنما تھے۔ وسیم نے بہت کوشش کی کہ کوثر کہیں شادی کرلے...... مگر اس نے منع کردیا۔

''کیا ضروری ہے سب کی شادی ہو...... اچھی بھلی تو گزر رہی ہے زندگی، اتنا خیال رکھنے والے بھائی، بھابی اور پیار کرنے والے بچے...... بس اتنا ہی کافی ہے۔'' اپنے ماضی پر اسے شدید دکھ تھا...... مگر بظاہر حال سے اس نے سمجھوتا کرلیا۔ اور ہر وقت اپنے کو مطمئن ظاہر کرتی رہتی۔

☆☆☆

سردیاں اپنی شدت پر تھیں کہ سندھی ٹوپی اور اجرک کا دن آ گیا۔ لگتا تھا عید کا اجتماع ہو...... ہر طرف سندھ کی ثقافت امڈی پڑ رہی تھی، فائنل والے زیادہ جوش و خروش دکھا رہے تھے۔ سحاب اور ان کا گروپ نت نئے ڈیزائن کے اجرک والے سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ انہوں نے آرٹس فیکلٹی کے کاریڈور سے جھانک کر دیکھا سب لڑکیاں دائرے میں بیٹھی تالیاں بجا، بجا کر ثقافتی گیت گا رہی تھیں۔

او ہو یہ تو زیادہ ہی جوش میں آ گئی ہیں۔'' پیچھے سے کسی نے کہا تو اُن سب نے پلٹ کر دیکھا...... یہ فواد تھا ...... ابھی اسی سال اس کا اپائنٹمنٹ ہوا تھا۔ ڈیپارٹمنٹ کا ذہین اسٹوڈنٹ تھا اس لیے فوراً ہی جاب مل گئی...... وضع قطع سے غریب گھر کا لگتا تھا۔

''میڈم آپ سے ایک بات کرنی تھی۔'' اس

نے کوثر سے کہا۔
''خیر تو ہے کیا بات ہے۔'' کوثر الجھ کر بولیں۔
''سحاب سے آپ کی بڑی دوستی ہے، میں اسے پروپوز کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ سر کھجا کر بولا۔
کوثر بری طرح اچھل پڑی۔ ایک اور وسیم بے عزت ہونے جا رہا تھا۔ وہ پندرہ سال پیچھے پہنچ گئی۔
''آپ نے جواب نہیں دیا۔'' اس نے میڈم کو سوچ میں غرق دیکھ کر پوچھا۔
''دیکھو فواد، یہ بڑے باپ کی بیٹی ہے، تم لوگ لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھتے ہو، ایسا نہ ہو بات ہلکی پڑ جائے۔'' وہ دکھ سے بولی۔
''ہاں یہ تو ہے۔'' اس نے دکھے دل سے کہا اور سر جھکا کر وہاں سے چلا گیا۔
کوثر کا دل دکھ گیا۔ وہ بھی اس کے پیچھے چلی آئی۔
''اب میرا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ تم بالکل ہی مایوس ہو جاؤ...... میں کوشش کر کے دیکھتی ہوں۔'' اس نے فواد کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر کہا۔
''جی......'' فواد بہت آہستہ سے بولا اور وہاں سے چلا گیا۔
کوثر کا دل کٹ گیا۔ پندرہ سال پرانی پوری وڈیو دماغ میں گھوم گئی۔ وہ کئی دن تک اداس رہی۔
''آپ نے پوچھا نہیں سحاب سے؟'' ایک دن فواد کاریڈور میں مل گیا۔
''اوہ سوری، میں بالکل بھول گئی تھی۔ آج ہی بات کرتی ہوں۔'' سحاب اپنے گروپ کے ساتھ شاید کینٹین میں تھی اس نے فون کر کے اسے بلایا۔
''خیریت تو ہے میڈم......؟'' وہ بھاگتی ہوئی اوپر آئی۔
''ہاں بیٹھو، تم سے ایک بات کرنی تھی۔'' اس نے فائل ایک طرف رکھ کر کہا۔
سحاب الجھ کر اسے دیکھنے لگی۔
''نئے لیکچرر فواد تمہیں پروپوز کرنا چاہتے ہیں مگر اپنے کم حیثیت ہونے کی وجہ سے ڈرتے ہیں۔ کہیں بے عزتی نہ ہو جائے۔'' اس نے سحاب کو غور سے دیکھ کر کہا۔
سحاب کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ وہ سر جھکا کر رہ گئی۔ کوثر سمجھ گئی کہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔
''تم نے جواب نہیں دیا۔'' اس نے پھر پوچھا۔
''میں کیا کہہ سکتی ہوں میڈم، طبقاتی فرق تو بہت ہے۔ پتا نہیں بابا مانیں گے بھی یا نہیں......'' بات کر کے وہ بے ساختہ رو دی۔ کوثر بھی اداس ہو گئی۔ بہت سارے گونگے لمحے گزر گئے۔
کوثر کو یاد آیا۔ اماں جان سے بے عزتی کے بعد وسیم بھی اسی طرح بلک بلک کر روئے تھے۔ وہ انہیں چپ بھی نہ کروا سکی تھی۔ شاید اب پھر وہی کہانی دُہرائی جانے والی تھی۔
''میں ایک دفعہ تمہارے بابا سے بات کرنا چاہتی ہوں۔'' انہوں نے کچھ سوچ کر سحاب سے کہا۔
''ٹرائی کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' سحاب نے سر ہلا کر کہا اور اپنی فائل اٹھا کر ڈیپارٹمنٹ سے باہر نکل گئی۔
ویک اینڈ پر وہ فون کر کے سحاب کے گھر پہنچ گئی۔ ڈیفنس میں بنا ہوا یہ لق و دق بنگلا، پورچ میں کھڑی تین شاندار کاریں...... اس کا دل چاہا کہ واپس چلی جائے مگر اسی وقت سحاب باہر نکل آئی۔
''آئیں میڈم۔'' اس نے بہت خوش دلی سے ویلکم کہا۔
مجبوراً اسے اندر جانا پڑا۔
ڈرائنگ روم کی آرائش دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی۔ لگ رہا تھا کہ بہت باذوق لوگوں کا گھر ہے، چھت پر لکڑی کے کام کی کارونگ لگی ہوئی تھی۔ جس کے اندر انرجی سیورز جل رہے تھے۔ بڑی حسین دودھیا روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ فرنیچر اگرچہ سادہ مگر قیمتی تھا اور اس کے اوپر رکھے ہوئے کشن پکار پکار کہہ رہے تھے کہ کوئی ہم سا ہو تو سامنے آئے۔
''میڈم آپ بیٹھیں، ذرا دیر لگے گی، پاپا واش

روم میں ہیں اور امی ذرا فون پر بات کر رہی ہیں جب تک ہم کافی پیتے ہیں۔'' وہ تھوڑی ہی دیر میں کافی لے کر آ گئی۔

کافی اتنی اچھی بنی ہوئی تھی کہ کوثر کو واقعی مزہ آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد سحاب کے پاپا اور امی آ گئے...... وہ دونوں بڑی پُر وقار شخصیت کے مالک تھے۔

''السلام علیکم...... بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر ......سحاب آپ کی بہت تعریف کرتی ہے۔'' سحاب کی امی نے اس سے ہاتھ ملا کر کہا۔ 'جب انہیں پتا چلے گا کہ میری آمد کا مقصد کیا ہے تو ہاتھ پکڑ کر باہر نکال دیں گی' اس نے دل میں سوچا۔ فلیش بیک میں اماں جان سامنے آ گئیں۔ چیختی چلّاتی ہوئی۔ اتنے میں نوکر بڑے پُر تکلف ناشتے کی ٹرالی لے کر آ گیا۔

''اوہ مائی گاڈ، اتنے اہتمام کی کیا ضرورت تھی۔'' اس نے پریشان ہو کر کہا...... وہ دراصل آنے والے لمحوں میں اپنے انجام سے خوفزدہ تھی۔

''آپ سحاب کی استاد ہیں اور ہم استادوں کی بہت قدر کرتے ہیں۔'' سحاب کے پاپا بولے۔

''فواد بھی تو ایک استاد ہے کیا پتا وہ بھی پسند آ جائے۔'' کوثر کو کچھ ڈھارس ہوئی۔

ڈھیر سارے گونگے لمحے گزر گئے۔

پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں کافی ٹائم ہو گیا...... کوثر کو گھر بھی جلدی جانا تھا، آج بھائی کے چھوٹے بیٹے کی سالگرہ تھی اس کے لیے کچھ خریدنا بھی تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود کوثر اپنے اندر ہمت نہیں پیدا کر پا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اصل موضوع پر کیسے آئے۔

''سحاب ماسٹرز کے بعد کیا کرے گی؟'' کوثر نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

''شادی کریں گے اس کی......'' سحاب کے والد ہنس کر بولے۔

''آپ نے کہیں ۔ نہیں کی ابھی؟'' کوثر تھوک نگل کر بولی۔

ھدایت یافتہ

ایمان جب انسان کے اندر اپنی جڑیں مضبوط کر لیتا ہے تو گناہ کرنا مشکل اور نیکی کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ دل نرم اور آنکھیں نم رہتی ہیں۔

ربِ کریم ہمیں ان ہدایت یافتہ لوگوں میں شامل فرما جو صراطِ مستقیم پر چلتے ہیں اور جو ہمیشہ تیرا شکر ادا کرتے ہیں۔

مرسلہ: نگینہ ضیا، کراچی

خوب صورت قول

انسان وہ غافل منصوبہ ساز ہے کہ وہ اپنی کُل حیات کی منصوبہ سازی میں اپنی موت کو شامل ہی نہیں کرتا۔

قول حضرت علی کرم اللہ وجہہ

پسند: آمنہ کیانی، آزاد کشمیر

اچھے لوگ

اچھے لوگ ان روشنیوں کے مانند ہوتے ہیں جو فاصلے کو کم تو نہیں کر سکتے مگر منزل آسان ضرور بنا دیتے ہیں۔

مرسلہ: نجم نیازی، ساہیوال

اپنوں کے لیے

ہر صبح دعا دینا فطرت ہے میری
ہر اِک کو خوش دیکھنا حسرت ہے میری

میں کسی کو یاد آؤں یا نہ آؤں
سب کو دعاؤں میں یاد رکھنا عادت ہے میری

از: شاہینہ یاور، کراچی

''طے تو نہیں کی...... مگر کئی پرو پوزلز ہیں، میرے بھائی امریکا میں ہیں۔ سب سے پہلا سوال انہوں نے ہی ڈالا ہے مگر ان کی امی اتنی دور بھیجنے پر راضی نہیں ہیں حالانکہ وہ لڑکا بذاتِ خود بہت اچھا ہے مگر ہماری بھابی صاحبہ مزاج کی بہت تیز ہیں۔ وہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے ابھی تک انہیں کوئی جواب نہیں دیا ہے...... مگر خیر ہے آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟'' انہوں نے بات مکمل کر کے کوثر سے پوچھا۔

سحاب اٹھ کر باہر چلی گئی تھی۔

''دراصل میرا ایک جونیئر کولیگ ہے۔ بہت شریف اور ذہین انسان...... ماسٹرز کرتے ہی اس کی کارکردگی کی وجہ سے اسے جاب مل گئی۔ بے شک وہ لوگ بہت ویل آف نہیں...... مگر وہ محنتی بہت ہے اور بہت جلد ترقی کر جائے گا۔'' کوثر نے ہمت کر کے کہہ ہی ڈالا اور پھر سحاب کے امی، پاپا کے تاثرات دیکھنے لگی۔

ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر بالکل اچانک ان کی نظریں پردے کے نیچے سے نظر آنے والے سحاب کے پیروں پر پڑ گئیں۔ ان کی سمجھ میں پوری کہانی آ گئی۔

''میرے خیال میں بیگم دیکھ لینے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔'' سحاب کے پاپا نے بیوی سے کہا۔

''جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' انہوں نے بھی تائید کی۔

''اچھا تو اب میں چلتی ہوں۔'' انہوں نے پیالی رکھ کر کہا۔ اسی دوران اتفاق سے وسیم کا فون آ گیا۔ وہ بیوی بچوں کے ساتھ کراچی جا رہے تھے۔ کوئی شادی تھی سسرال میں...... خدا حافظ کہنے کے لیے فون کیا تھا۔ جب وہ شہر سے باہر جاتا تو اسے ضرور بتا کر جاتے۔

کوثر باہر نکل آئی...... وہ اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ اسے لگا جیسے وہ جیت گئی ہو اور وسیم کو پالیا ہو۔ وہ بہت خوش تھی۔ گھر پہنچ کر بھی وہ بھائی کے بچوں کے ساتھ کھیلتی رہی۔

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر وہ ٹی وی دیکھنے بیٹھ گئی۔ اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ کوئی اجنبی نمبر تھا...... اس نے الجھ کر فون ریسیو کیا۔

''جی کون؟'' اس نے پوچھا۔

''دیکھیں ہم موٹر وے پولیس کے آفس سے بول رہے ہیں...... ہائی وے پر ایک ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ کوئی فیملی کراچی جا رہی تھی۔ سب لوگ بہت زخمی ہیں۔ جو صاحب گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے ان کی جیب سے جو موبائل نکلا ہے اس سے آخری کال آپ کو کی گئی تھی اس لیے ہم آپ سے رابطہ کر رہے ہیں...... پرس خون میں ڈوبا ہوا ہے جب صفائی کریں گے تو کچھ پتا چلے گا۔ آپ انہیں جانتی ہیں تو پلیز ہماری مدد کریں۔'' دوسری طرف سے دی جانے والی اطلاع پر وہ سن ہو کر رہ گئی اور بے ساختہ رو دی بھائی نے اس کے ہاتھ سے موبائل لے لیا۔

ان کی پوری بات سن کر بھائی نے وسیم کے متعلق ساری معلومات فراہم کر دیں۔

ان لوگوں کو اسپتال میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ وہ بھائی کو لے کر فوراً کراچی روانہ ہو گئی۔

سارے راستے کوثر کے آنسو نہ رکے...... اسپتال پہنچ کر ان لوگوں نے بڑا کربناک منظر دیکھا...... وسیم اور ان کی بیگم صفیہ بری طرح زخمی تھے اور ہوش میں نہیں تھے۔ تینوں بچے جنہیں معمولی چوٹیں آئی تھیں سہمے ہوئے ایک طرف بیٹھے تھے۔ اسے دیکھ کر روتے ہوئے اس سے لپٹ گئے۔ کوثر نے انہیں سینے سے لگا لیا پھر بہت ہمت کر کے اس نے وسیم کی بہنوں کو فون کیا۔ دونوں بہنیں کراچی ہی میں رہتی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں سب لوگ پہنچ چکے تھے۔ بہنوں نے کوشش کی کہ بچوں کو ساتھ لے جائیں مگر بچے اُن کے ساتھ جانے پر راضی نہ تھے، وہ کوثر ہی سے چپکے رہے۔ کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا تو وہ بچوں کو اپنے ساتھ لے آئی۔ وسیم اور صفیہ تقریباً ایک ماہ اسپتال میں رہے...... جب واپس آئے تو بہت لاغر ہو چکے تھے۔ صفیہ بالکل مفلوج ہو چکی تھی۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی متاثر ہوئی تھی۔ دماغی

حالت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ کوثر بچوں کو لے کر آ گئی تھی۔ بچے اپنے کام خود کر سکتے تھے۔ مگر وسیم بہت کمزور ہو چکے تھے اور صفیہ اٹھنے بیٹھنے کے لائق نہیں تھی۔ کوثر نے یہ ذمے داری خود ہی اٹھالی۔ یونیورسٹی کے بعد وسیم کے گھر جاکر وہ ماسی کی مدد سے سب کچھ سیٹ کر کے آجاتی تھی۔

کافی عرصے تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اسی دوران سحاب کے پاپا فواد کو دیکھ کر چلے گئے۔ کوثر سمجھی کہ بات شاید بن نہ سکے گی۔

مگر ایک شام اچانک ہی سحاب کے پاپا کا فون آگیا۔ انہیں یہ رشتہ منظور تھا۔

”آپ کی بڑی مہربانی کہ آپ نے میری بات رکھ لی۔“ کوثر واقعی تہِ دل سے ان کی شکر گزار تھی۔

”ہاں، ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ہماری بیٹی کو شاید فواد پسند ہیں۔ اسی لیے ہم نے اس رشتے پر سوچ بچار کی اگر فواد ہمارے معیار کے نہیں ہیں تو کیا ہوا...... ہم انہیں اپنے معیار کا بنالیں گے...... سونے پر اگر مٹی جم جائے تو اسے پھینک تھوڑی دیتے ہیں جھاڑ کر دوبارہ پہن لیتے ہیں۔“ انہوں نے آہستہ آہستہ کوثر کو بتایا۔

کوثر سوچ میں پڑ گئی۔ کتنا شعور تھا سحاب کے گھر والوں میں...... ایک اس کی اماں جان تھیں وہ ساری باتیں یاد کر کے کلس کر رہ گئی۔

اگلے دن کوثر نے یہ خوشخبری فواد کو سنائی تو سارے آداب بالائے طاق رکھ کر اس نے کوثر کا سر زور سے ہلا ڈالا۔

”ارے، ارے کیا کرتے ہو...... بالکل ہی باؤلے ہو گئے ہو کیا؟“ وہ چکراتا ہوا سر تھام کر بولی۔

”سوری میڈم، میں اپنے حواسوں میں نہ تھا۔“ خوشی اس کے انگ انگ سے ٹپک رہی تھی۔

اسی دن فواد کے گھر والے سحاب کے گھر پہنچ گئے۔ سحاب نے کوثر کو خاص طور پر بلوایا۔

ساری باتیں بہت آسانی سے طے ہو گئیں۔ کوثر اتنی خوش تھی کہ گھر آکر اس نے ساری بات وسیم کو بھی فون پر بتادی۔ ساری بات سن کر وسیم بہت زیادہ متاثر ہوئے ایک عجیب سی خواہش نے چپکے سے سر ابھارا۔

بہت سارے دنوں کی سوچ بچار کے ایک دن وہ کوثر کی غیر موجودگی میں اس کے بھائی کے پاس پہنچ گئے۔ اس کا مدعا سن کر کوثر کے بھائی تو بہت خوش ہوئے مگر بات جب کوثر تک پہنچی تو وہ ہتھے سے اکھڑ گئی۔

”باؤلے ہو گئے ہیں آپ وسیم...... یہ میری عمر ہے شادی کی۔“ وہ بپھر گئی۔

”آپا تم ابھی صرف چوالیس سال کی ہو...... بے شمار لڑکیاں اس عمر کی بیٹھی ہیں شادی کے انتظار میں......“ بھائی نے وسیم کی وکالت کی۔

”تو تم بھی گئے کام سے۔ میرا مذاق اڑانا چاہتے ہو، دنیا کیا، کیا باتیں بنائے گی یہ سوچا ہے تم نے۔“ وہ کسی حال میں ماننے کو تیار نہیں تھی۔ تھک ہار کر وسیم واپس چلا گیا۔ وہ کئی دن وسیم کے گھر نہ گئی۔ خود وسیم ہی ایک شام بچوں کو لے کر آ گئے۔

بچے آتے ہی اس سے لپٹ گئے۔

”آنی آپ اتنے دن کہاں تھیں؟ دیکھیں مونا نے اپنا ہاتھ جلالیا۔ میں سالن گرم کر رہا تھا تو ڈونگی الٹ گئی۔ ہم نے دوپہر کو کچھ بھی نہیں کھایا۔“ بڑا والا علی اس کی گود میں سر رکھ کر رو دیا۔

کوثر کچھ نہ بول سکی۔ اس کی آنکھ سے آنسو بہہ نکلے۔

”کوثر میں اپنے لیے کچھ نہیں چاہتا مگر خدارا ان بچوں پر رحم کرو...... یہ دو تین دن سے بہت ڈسٹرب ہیں۔ ان بچوں کا واسطہ دے کر تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ میری پیشکش قبول کر لو...... اگر نہیں تو پھر ہم سے ہمیشہ کے لیے ناتا توڑ لو...... اب کبھی میرے گھر نہیں آنا......“ وہ غصے میں بچوں کو لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ کوثر نے بہت خاموشی سے بچوں کے ہاتھ پکڑ کر سر جھکا دیا۔ اور پھر کچھ دن بعد فواد اور سحاب کی شادی پر مسٹر اینڈ مسز وسیم سب سے مبارک بادیں وصول کر رہے تھے۔



منی ناول

دیارِ صبح کے اجالوں میں

نایاب جیلانی

چوتھا حصہ

اماں اور بابا نے اپنے دونوں بڑے بیٹوں کو کبھی روکا نہیں تھا۔ نہ وہ ان کی ترقی اور کامیابی کی راہ میں رکاوٹ بننا چاہتے تھے لیکن جب بھی وہ دونوں چند دن چھٹیاں گزار کر واپس اپنے ٹھکانوں پر اڑنے کے لیے پر تولتے اماں چپکے، چپکے آنسو بہانے لگتی تھیں۔ فدا کی بیٹی میں ان کی جان تھی لیکن وہ دونوں زبردستی انہیں کبھی نہیں روکتے تھے۔

نہ اماں، بہوؤں کو زبردستی اپنے ساتھ باندھنے



کے حق میں تھیں کہ اسی بہانے ان کے بیٹے چھ، چھ مہینے بعد نہ سہی...... ایک، ایک مہینے بعد چکر لگا لیتے...... وہ اپنی تنہائی کے لالچ میں بہوؤں کا دل کیوں مارتیں؟ وہ تو خود چاہتی تھیں ان کے بیٹے اور بہویں ایک ساتھ خوش اور آباد نظر آئیں۔ چاہے جہاں بھی رہیں۔

لیکن جب، جب فدا اور صائم واپس جاتے تھے۔ گھر میں تنہائی اور اداسی گھیرا ڈال دیتی...... پورا گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا...... کشف اور فلک اپنے گھر کی تھیں۔ کبھی کبھار چکر لگاتیں...... اماں کے پاس پھولن دیوی ہوتی تھی۔

تب ہی ہادی نے دل میں پکا فیصلہ کیا تھا۔ وہ کبھی لومیرج نہیں کرے گا...... اور نہ ہی فدا، صائم کی طرح بیوی کو گلے کا ہار بنا کر رکھے گا۔ اور نہ ہی اماں بابا کو چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ اس کا کاروبار میں دل نہیں لگتا تھا۔ وہ بھی جاب کی خواہش رکھتا تھا۔ لیکن جاب کے لیے دوسرے شہر جانا پڑتا۔ اماں بابا سے دور رہنا پڑتا۔ اس نے اپنا من مار لیا تھا اور بابا کی سٹرس فیکٹری میں خود کو مصروف کر لیا۔

''جب بابا نے اس سے شادی کے بارے میں بات کی تب اس کے ذہن میں کسی کا خیال نہیں تھا۔ اس نے فرمانبرداری سے ان کی پسند پر سر جھکا دیا۔ اس امید کے ساتھ کہ بابا کبھی اس کے لیے غلط فیصلہ نہیں کریں گے۔ رشتہ پکا ہونے کے بعد بھی اس کے دل میں اسما کا خیال نہیں آیا تھا لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد اس کی ارینج ہونے والی شادی میں لومیرج کا جادو چڑھ گیا۔

لیکن تب ہوا گیا تھا۔

وہ کچھ عرصے پہلے والے واقعات پر نظر دوڑانا چاہتا ہی تھا جب بابا اور اماں نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ اماں کے آنسو پونچھتا خود بھی گلوگیر ہو گیا۔

''ہادی! تو ہمیں چھوڑ کر جا رہا تھا۔ اپنا وعدہ بھلا کر...... تو نے کہا تھا، ہمیں کبھی چھوڑ کر نہیں جائے گا۔'' اماں نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لیا تو ہادی کے آنسو چھلک پڑے۔

''میں کب آپ کو چھوڑ کر جانا چاہتا ہوں اماں! لیکن حالات مجھے اس موڑ پر لے آئے ہیں۔ میرا یہاں سے چلے جانا مناسب ہے۔ ورنہ میرا دل پھٹ جائے گا۔ میرا دم گھٹ جائے گا۔ اماں! میں اس ماحول میں اس لڑکی کے ہوتے ہوئے یہاں نہیں رہ سکتا۔'' وہ بے بسی کے احساس تلے دب کر کراہا تھا۔ اماں کے دل پر آرے سے چل پڑے اُن کی بھیگی آنکھیں جھر جھر بہنے لگیں۔

''ہادی، تجھے کیا ہو گیا ہے؟ میرے بچے...... تو ایسا تو نہیں تھا۔''

''مجھے آپ سب نے ایسا کر دیا ہے۔ میں اس لڑکی کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔'' ہادی نے ہونٹ کاٹتے ہوئے زہر بھرے لہجے میں کہا۔ ''سمجھ لیں، مجھے پسند نہیں آئی۔ میرا اس سے دل نہیں ملتا۔''

''وہ لڑکی تمہارے بابا کی پسند ہے۔ تمہی نے کہا تھا' ہادی! اپنے بابا کی پسند پہ اپنی پسند تک قربان کر دو گے پھر اب وہ دعویٰ کہاں گیا۔ فرض کرو تمہیں وہ لڑکی پسند نہیں آئی۔ لیکن تمہیں اپنے بابا کی عزت کا پاس رکھنا ہو گا۔'' اماں نے اس کے ہاتھ تھام کر کچھ عرصہ پہلے کی کہی بات یاد دلائی تو وہ بھربھری ریت کی طرح ڈھے گیا۔

''تم نے اس کے ساتھ وقت کتنا گزارا ہے؟ اگر ساتھ رہو گے، اسے جانو گے تو دل بھی مل جائیں گے۔ ستارے بھی مل جائیں گے۔'' بابا کو ان ماں بیٹے کی گفتگو میں مداخلت کرنا پڑی تھی۔

''بابا! وہ لڑکی ٹھیک نہیں۔'' اس نے لب بھینچ کر اذیت سے کہا تھا۔ وہ کیسے اسما کی ''چالوں'' کا انہیں بتاتا؟ جو کچھ وہ جانتا تھا بابا اس سے بے خبر تھے۔ وہ کس مصیبت میں پھنس چکا تھا۔ بابا کو کچھ بتا بھی نہیں سکتا؟ آخر کیسے بہت ساری گزری باتوں سے پردہ اٹھاتا۔ آخر کیسے اس سے راہ و رسم اور محبت کا قصہ سناتا؟

"اس میں کیا خرابی ہے؟ کیا اس کا کردار برا ہے؟ ان پڑھ ہے؟ لولی لنگڑی ہے؟" بابا کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔ ہادی کو ہونٹ کاٹتے ہوئے نفی میں سر ہلانا پڑا۔ تب ہی بابا کچھ دھیمے پڑے تھے۔

"میں نے یہ کب کہا۔"

"تو پھر......؟" انہوں نے گہرے اضطراب کو اندر دباتے ہوئے پوچھا۔ رات بھر سے ہادی نے انہیں "چکرا" دیا تھا۔ وہ اسما کی اسی بری طرح سے نفی کررہا تھا۔ جیسے اس کے سان وگمان میں نہیں تھا کہ اسما ہی اس کی سیج سجا کر بیٹھی ہوگی۔ ہادی کے انداز، رویے اضطراب اور حالات سے لگ رہا تھا وہ اسما کی جگہ کسی اور لڑکی کی توقع کررہا تھا۔ آخر کون لڑکی؟ جیسے اسما کو دیکھ کر ہادی کو شدید دھچکا پہنچا تھا۔

وہ اس کے خوابوں، خیالوں اور سپنوں میں بسنے والی اسما نہیں تھی۔

تو پھر وہ لڑکی کون تھی؟ جس کی ہادی کو "توقع" تھی۔

"ہادی! تم کہیں نہیں جاؤ گے...... میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی اگر تم یہاں سے، اپنے گھر سے نکل گئے...... تو دیکھنا، میرا مرا ہوا منہ بھی نصیب نہ ہوگا۔ جہاں تک اسما کی بات ہے تو تجھے اچھی لگے یا بری...... وہ ہمارے گھر کی عزت ہے، ہماری آبرو ہے...... اسے بیٹی اور بہو بنا کر لائے ہیں...... وہ ہمارے ساتھ رہے گی۔ عزت اور مان کے ساتھ...... اور تجھے بھی اسے قبول کرنا ہوگا...... یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ اگر منظور نہیں تو جاؤ، تمہارے لیے راہیں کھلی ہیں۔ اپنی من پسند زندگی گزارو اور جس سے مرضی شادی کرو...... لیکن ہمیشہ کے لیے ہمیں بھول جانا۔" اماں نے اپنا سینہ مسلتے ہوئے جھر جھر بہتی آنکھوں کو پونچھا...... اِدھر ہادی پہ ساتوں آسمان آگرے...... وہ ہکابکا اماں کی صورت دیکھتا رہ گیا......

یہ سب کیا تھا؟ اماں کیا کہہ رہی تھیں؟ وہ ان سے دور چلا جاتا؟ کہاں...... کدھر؟ اس کا دل بھر آیا۔ بابا نے لوہا گرم دیکھا تو مزید چوٹ لگاتے ہوئے گلوگیر آواز میں بولے۔

"اس سے بہتر تھا میں ہادی کو فدا اور صائم کی طرح کھلی چھوٹ دے دیتا۔ میری طرف سے کوئی پابندی بھی نہیں تھی۔ یہ چاہتا تو انکار کردیتا...... صائم اور فدا کی طرح اپنی پسند سے شادی کرتا۔ آج ہمیں اتنا ذلیل وخوار تو نہ ہونا پڑتا...... مجھے اپنے دوست خلیل کے سامنے شرمسار نہ ہونا پڑتا۔ آج ہادی ہمیں اس عدالت میں کھڑا نہ کرتا...... ہمیں یہ نہ کہتا۔ "میری زندگی برباد کردی ہے" میں اپنی معصوم بچی کا بھی مجرم ہوں۔ اپنے دوست کا بھی مجرم ہوں۔"

اسے اماں اور بابا کے آنسو اور لفظوں نے بے بس کر کے محبوس کرلیا تھا۔ وہ جکڑا گیا تھا۔ پابندِ سلاسل ہوا تھا۔ قید میں آگیا تھا۔ اس کا سارا اشتعال، تنفر، زہر، آگ ایک بےبسی نما ضبط کے گھیرے میں آگرے تھے۔ بابا کا ایک ہی پھندا اسے منہ کے بل گرانے کے لیے کافی تھا۔

"میں اسے صائم اور فدا کی طرح من مانی کرنے دیتا...... پھر یہ ہمیں اپنی زندگی برباد ہونے کا طعنہ نہ دیتا۔"

اس کے بعد...... سننے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ اس کا سر جھک گیا تھا۔ ہاں کہنے کے لیے کچھ ضرور تھا... اس نے سر اٹھا کر کہا۔ "آپ پنڈال میں چلیں۔ میں تیار ہو کر آتا ہوں۔" وہ بغیر ان کے پُرمسرت اور حیرت واستعجاب سے کھلے منہ کو دیکھے الٹے قدموں پلٹ گیا تھا۔ اماں اور بابا جیسے مارے خوشی و مسرت کے لمحہ بھر کے لیے بھونچکے رہ گئے تھے۔

انہیں گمان نہیں، یقین تھا۔ اگر اس نے ایک لمحے کے لیے سر جھکایا تھا تو سر کے ساتھ انا کو بھی جھکایا تھا۔ ضد کو بھی جھکایا تھا۔ اشتعال، غصے اور تنفر کو بھی جھکایا تھا۔ حتیٰ کہ اپنے دل کو بھی جھکایا تھا۔

☆☆☆

کوئٹہ میں یہ رات انتہائی سرد مگر برقی قمقموں سے بھی روشن تھی۔ ستاروں سے بھرا آسمان سایہ فگن تھا۔ اور

پنڈال میں رنگ و نور کا سیلاب اترا ہوا تھا۔ انتہائی خوب صورت اور بے فکرے چہرے، ہنستے کھلکھلاتے، بابا نے شہر بھر کی ساری کریم اکٹھی کررکھی تھی اور اتنی خواتین اور لڑکیاں تھیں جیسے پورے کا پورا شہر یہاں جمع ہو۔

بارات کے ساتھ اگرچہ رواج کے مطابق بس چندایک بزرگ خواتین تھیں جن میں ہادی کی اماں بیماری کے باعث جانہیں سکی تھیں۔ لیکن ولیمے میں ہر طرف لڑکیوں کے جھنڈ ہی جھنڈ دکھائی دے رہے تھے۔

اور اس پورے ہجوم میں اسما کے صرف دو ہی قریبی رشتے موجود تھے۔ بابا اور عاشر...... باقی لوگ کہاں تھے؟ اور کیوں نہیں آئے تھے؟

جیسے ہی اسے موقع ملا اس نے عاشر کو اسٹیج پر بلالیا تھا۔ وہ جو مارے باندھے کھڑے ہادی سے زبردستی ہم کلام تھا جلدی سے اوپر آگیا۔

''ماموں تو چلو اپاہج ہیں...... اتنا سفر نہیں کرسکتے...... مامی اور امی کہاں ہیں؟'' اس نے چھوٹتے ہی پوچھا تھا۔ اس کا دل مچل رہا تھا ان دونوں سے ملنے کو...... گوکہ مامی کا مزاج کچھ تیکھا تھا پھر بھی اسما کو ان سے بڑا پیار تھا۔ ان کی ساری ناپسندیدہ عادتوں کے باوجود...... اور امی میں تو جان بند تھی...... اس کی لاڈلی، پیاری بہنوں سے بڑھ کر عزیز کزن...... ہونے والی بھابی کتنے ہی رشتے امی سے بنتے تھے...... کزن، بہن، دوست، بھابی......

''مامی کی اماں کا ''دم آخر'' چل رہا ہے۔ ان کا جانا تو بنتا تھا۔ جاتے، جاتے اپنے گناہ معاف کروانے تھے مامی نے...... آخر نانی کو ستایا بھی تو بہت تھا ہوگا مامی نے۔ یہ امی کا جانا ابھی تک سمجھ نہیں آرہا ہے۔ نانی کی ''ہڑک'' اچانک بیدار ہوگئی۔ میں نے اتنا کہا بھی کہ ایک دن کی بات ہے۔ آج ولیمہ نمٹ جائے تو چلی جانا...... مگر نہ جی...... وہ امی ہی کیا جو کسی کی بات سن لے...... مامی کے ساتھ اڑنچھو ہوگئی...... ماموں تو آنہیں سکتے...... دعاؤں کے تحفے بھی بھجوائے ہیں...... اور ہاں یاد آیا...... گلناز کا بڑا دل مچل رہا تھا یہاں آنے کے لیے...... امی یا مامی ہوتیں ساتھ تو اس آٹے کی بوری کو گاڑی میں دھر لیتے...... لیکن ہم دو اکیلے مردوں کے ساتھ آنا اس کا مناسب نہیں تھا......''

عاشر نے اپنے ہی اسٹائل میں تفصیل بتائی تو اسما کا دل بجھ گیا۔ پھر نانی کے خیال سے وہ چپ کرگئی تھی۔ مامی کے لاکھ اختلافات تھے اپنے میکے والوں سے تاہم امی کو نانی سے بڑا پیار تھا۔ ہر چھٹیوں میں وہ ساہیوال پہنچی ہوتی تھی اور گلناز کے نام پر اسما کا واضح طور پر رنگ بدل گیا تھا۔ اس کے دل میں تنفر کی لہر اٹھی تھی۔

''تم نے اچھا کیا گلناز کو یہاں نہیں لائے۔''

عاشر اس کی بڑبڑاہٹ سن نہیں سکا تھا۔ تاہم اس نے اپنی بڑبڑاہٹ اسما کو ضرور سنائی تھی۔

''یہ ہادی بہت ''سڑیل'' لگتا ہے۔ اپنا ولیمہ ایسے اٹینڈ کررہا ہے جیسے کوئی گن پوائنٹ پہ اسے لایا ہو......'' عاشر کے بے لاگ تبصرے پر اسما کا دماغ گلناز سے ہٹ کر ہادی پہ اٹک گیا۔ واقعی عاشر ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ہادی مبارک بھی ایسے وصول کررہا تھا جیسے دوسروں پر احسان کررہا ہو...... حد تھی نخرے بازی کی۔

''تمہارے ساتھ تو ٹھیک ہے مسٹر اکڑو خان؟ پہلے تو ایسے نہیں تھا۔ خاصا خوش اخلاق اور کھولیا تھا۔'' عاشر، ہادی پہ نگاہ جما کر اسما کے کان میں گھسا...... اس کے دل میں کچھ اندیشے بھی گھر رہے تھے۔

اسما کا دل بری طرح سے گھبرا گیا۔ اس نے اثبات میں سرہلا کر عاشر کی تسلی کرانی چاہی تھی۔

جانے اسے یقین آیا تھا یا نہیں۔

تاہم تنہائی پاتے ہی جب جمگھٹا کم ہوا، رش چھٹا تو عاشر ایک مرتبہ پھر اس کے قریب بیٹھ گیا پھر اس نے اسما کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ایک چاہت، مان اور محبت بھرا احساس بخشتے ہوئے۔

''میں تمہارا بھائی ہی نہیں، بہن بھی ہوں، سہیلی بھی ہوں مجھ سے کچھ مت چھپانا...... ہر بات شیئر کرلینا۔ ہادی سے لڑائی ہو تو رونے کے لیے میرا کندھا حاضر ہے۔ اپنے گھر اور شوہر کی باتیں خود تک محدود

رکھنا۔ امی یا گلناز کو شریک مت کرنا۔ جو "راز" تمہارا بھائی سنبھال سکتا ہے کوئی اور نہیں...... صد شکر کہ ماں نہیں آئیں ورنہ تمہاری اتری ہوئی صورت کا افسانہ بنا لیتیں۔ آہستہ، آہستہ سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ ہادی تھوڑا "میں" والا لگتا ہے لیکن مجھے امید ہے تمہیں خوش رکھے گا۔ نئی جگہ پر دھیرے، دھیرے ایڈجسٹ ہوتے ہیں، مجھے لگتا ہے تم اچانک بھرے پُرے گھر میں آکر گھبرا گئی ہو۔ لیکن دیکھنا سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہادی کی پوری فیملی بہت نائس ہے۔" عاشر نے جس مان اور محبت سے اسے سمجھایا تھا اسما کا دل بھر آیا۔ وہ جان گئی تھی کہ ہادی کا اکھڑا رویہ عاشر کے دل میں خدشات جگا رہا تھا...... لیکن عاشر، اسما کے سامنے ذکر کر کے اس کا دل برا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

جب عاشر نے اس کا سر اپنے کندھے سے لگایا تو اسما کے آنسو خود بخود گرنے لگے۔ ضبط کے ٹانکے اُدھڑنے لگے۔

"بہنیں اپنے شوہروں کے ساتھ آباد ہوں تو بھائی تن کر زمین پر چلتے ہیں...... اگر برباد ہوں تو بھائیوں کے شانے ڈھلکتے ہیں۔ میں تمہیں سر جھکائے نہیں دیکھ سکتی عاشر! اس لیے جو میرے دل کے راز ہیں، وہ راز ہی رہیں گے۔ امی، گلناز یا تم تک نہیں جائیں گے۔ مجھے اپنوں کا مان رکھنا آتا ہے۔ مجھے عزتِ نفس کو سرنگوں کر کے اعتماد سے چلنا آتا ہے۔ مجھے ہادی کے ہر رویّے اور نفرت کے ہر احساس کے ساتھ جینا آتا ہے۔" اس کا دل بری طرح سے کرلا رہا تھا۔ اندر دل کی نگری میں صفِ ماتم بچھی تھی اور اسما بظاہر مسکرا، مسکرا کر اپنے باپ اور بھائی کو رخصت کر رہی تھی۔ آج کے بعد اپنی شخصیت پر ایک اور خول بھی چڑھانا تھا۔ خود پر ایک اور رنگ بھی لانا تھا...... شاید منافقت کا رنگ......

☆☆☆

یہاں کے رواج کے مکلاوے کی رسم نہیں تھی۔ سو اسما کو پنڈی نہ جانے کا اچھا بہانہ میسر آگیا تھا۔ پنڈی جاتی تو لازمی طور پر گلناز کا سامنا کرنا پڑتا۔ اور وہ گلناز کی صورت مر کر بھی دیکھنے کی روادار نہیں تھی۔

گھر سے بابا اور عاشر کے متواتر فون آتے اور وہ انہیں ڈھیر ساری مسکراہٹوں کے ساتھ مطمئن کر دیتی۔ چند ہی دنوں میں وہ اس گھر کے سب مکینوں میں گھل مل گئی تھی۔

اس کے اخلاق، ذہانت، مروت اور میٹھی طبیعت نے پورے گھرانے کو اس کا گرویدہ کر لیا تھا۔

عزہ اور زری کی خواہش تھی ان کے یہاں ہوتے ہی اسما کا کھیر میں ہاتھ ڈلوایا جائے تاکہ وہ بھی اس رسم کو انجوائے کر سکیں۔ اسما کو تو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ تو فارغ رہ، رہ کر بور ہو چکی تھی۔

یوں اماں کے "نہ" نہ کرنے اور اتنی جلدی اسما کو

کچن میں بھجوانے پر اعتراض کے باوجود اسما نے اماں کو منا لیا اور پہلی مرتبہ کھیر کے ساتھ، ساتھ بڑی پُرتکلف دعوت کا اہتمام بھی کر ڈالا۔

زعفرانی بریانی، ویجی ٹیبل فرائز، کدو کا رائتہ، چائنیز رول، کباب اور قورمہ...... فدا اور صائم سمیت گھر کے سب افراد دسترخوان پر ایسے جمع ہوئے جیسے عید کے دن اکٹھے ہوتے تھے۔ بہت عرصے بعد گھر سے اٹھتی اشتہا انگیز خوشبوؤں کی مہک ان سب کو کونوں کھدروں سے نکال کر دسترخوان پر لے آئی تھی۔

اور صائم پلیٹ میں چمچہ بجا بجا کر بڑی بے صبری سے اعلان کر رہا تھا۔

''ہم افریقہ کے قحط زدگان لگ رہے ہیں، ہمارے معدوں پر رحم کیا جائے۔''

''تم تو یوں ظاہر کر رہے ہو جیسے سالوں سے بھوکے ہو اور زندگی میں پہلی مرتبہ تمہیں کھانا مل رہا ہے۔'' عزہ نے لفظ چبا، چبا کر کہا۔

''گھر میں پکا انتہائی لذیذ کھانا پہلی مرتبہ مل رہا ہے سالوں بعد۔'' وہ بھی تو صائم تھا، دو بدو جواب دینے والا۔

''کیا پہلے گھاس کھاتے تھے؟'' عزہ نے خفگی سے پوچھا۔

''گھاس سے بھی نچلے درجے کی۔'' صائم نے مسکرا کر جتایا۔ عزہ چڑ کر رہ گئی تھی۔

''میرا بھیجا مت کھاؤ۔'' اس نے وارننگ دی۔

''تمہارا بھیجا کوئی کھانے والی چیز ہے؟'' صائم نے صاف مذاق اڑایا تھا۔

''ہر وقت چونچیں مت لڑایا کرو...... فٹافٹ آجاؤ بس......'' زری اور پھولن دیوی نے نفاست سے کھانا چن دیا تھا۔

''ہادی ابھی تک نہیں آیا؟'' اماں نے تخت پر بیٹھے، بیٹھے پوچھا۔

''نہیں، وہ آج کل قائداعظم کا قول نبھا رہا ہے۔'' فدا نے جواب دیا۔ وہ قورمے سے خوب انصاف کر رہا تھا۔ ساتھ، ساتھ اسما کی تعریفیں بھی جاری تھیں۔ صائم بریانی پر ہاتھ صاف کر رہا تھا۔ اسما مسکراتے ہوئے اماں کو تخت پر کھانا دینے لگی۔ انہوں نے کھانے کی خوشبو اور رنگت سے اندازہ لگا کر اس کی بے ساختہ تعریف کی تھی۔ پھر فدا کی بات پر یک دم چونکی بھی تھیں۔

''کون سا قول......؟'' ان کی آنکھوں میں حیرانی تھی۔

''وہی کام، کام اور صرف کام والا......'' صائم نے ہنس کر وضاحت کی تو اماں کو اس کی فکر لگ گئی۔

''ابھی تک فیکٹری میں ہے؟ دیکھو وقت کیا ہوا؟'' ان کی نظریں گھڑیال پر جم گئی تھیں۔

''سیزن کے دن ہیں اماں! کام کا بہت لوڈ چل رہا ہے، مال کے ٹرک پر ٹرک آ رہے ہیں، بابا بھی نہیں آتے ٹائم سے۔ بیٹے کے بجائے کبھی سرتاج کا بھی حال پوچھ لیا کریں...... ہادی کی فکر اب اسما کے سپرد کر دیں...... وہی اس کے آنے جانے کا حساب رکھے۔ آپ کو اس کام سے بھی آج سے ریٹائر کر دیا ہے۔ کیوں اسما! ٹھیک کہا ناں؟'' صائم نے اماں سے بات کرتے ہوئے اچانک اسے مخاطب کیا تو وہ گڑبڑا کر سر ہلا گئی۔

''اس کا پہننا اوڑھنا، کھانا، پینا تمہارے ذمے ہے۔ دیکھو کوتاہی ...... نہیں ہونی چاہیے۔ شکایت ملی تو کلاس لوں گا تمہاری۔'' فدا نے بھی اسے بے ساختہ چھیڑا تھا۔ اسما کچھ خفیف سی ہو گئی تھی۔ اب وہ انہیں کیا بتاتی؟ اس نے تو اتنے دنوں سے ہادی کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔

ویسے سے اگلی رات کو صائم اسے زبردستی کمرے میں چھوڑ گیا تھا۔ اس کے بعد سے ہادی رات کے دو پہر گزرنے کے بعد آتا تھا اور منہ اندھیرے چلا جاتا۔

جب وہ پہلی رات صائم کے زبردستی کرنے پر کمرے میں آیا تھا۔ تب بھی رات کے ایک بجے کا ٹائم تھا۔ اسما نیند میں گم تھی جب دستک کی آواز پر اٹھ

بیٹھی...... جلدی سے دوپٹا اوڑھ کر دروازہ کھولا تو سامنے صائم کھڑا تھا جو ہادی کو دھکیل کر اندر لایا...... دونوں بھائیوں میں شاید جھڑپ ہوئی تھی۔ ہادی کا منہ پھولا ہوا تھا، صائم نے اشارے سے اسما کو سمجھایا تھا۔

''قابو کرلو اسے، اب نہ بھاگنے دینا۔'' اسما اس کا اشارہ سمجھ گئی تھی لیکن اسے کیا بتاتی کہ اتنا بڑا جن اس کے قابو میں کہاں آئے گا۔

اس رات ہادی نے اسما کو واضح اور دوٹوک انداز میں جتادیا تھا۔

''میری مجبوری کو میری ناکامی مت سمجھنا۔ میں اپنے والدین کے لیے مجبور ہوگیا ہوں...... لیکن نہ تو میں تمہیں معاف کروں گا، نہ میں تمہیں اپناؤں گا۔ میرے پاس دھوکے باز اور غاصب لوگوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں...... میں خود فیئر ہوں، فیئر لوگوں کو پسند کرتا ہوں۔ تمہاری قسمت اچھی ہے، میرے والدین جیسے اچھے لوگ تمہاری پشت پناہی کررہے ہیں۔ ورنہ کوئی اور ہوتا تو تمہارا ٹھکانا کم ازکم یہاں نہ ہوتا۔ تم ویسے تو بڑی بے رحم ہو مگر مجھ پر ایک رحم ضرور کرنا۔ جتنا ہوسکے کم سے کم مجھے اپنی صورت دکھانا۔ میرے سامنے مت آیا کرنا۔ تمہیں دیکھ کر مجھے اپنے ''نقصان'' یاد آجاتے ہیں۔''

اس پورے خلاصے میں اسے واضح تنبیہ کی گئی تھی تاکہ وہ نہ تو ہادی کے معمولات میں مداخلت کرے نہ اس کی زندگی میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کرے...... تب سے لے کر اب تک وہ نہ صرف اپنے کمرے میں آرہا تھا بلکہ بستر پر بھی آرام سے قبضہ کرلیا تھا۔ ظاہر ہے ناراضی اسما سے تھی بستر سے تھوڑی تھی۔

اسما نے خود بخود اس کے لیے جگہ چھوڑ دی تھی۔ اور اپنا بستر کارپٹ پر منتقل کرلیا تھا۔ ہادی نے کسی بات کا نوٹس نہیں لیا۔ اس کی بلا سے وہ جہنم میں جاتی۔

وہ رات کو آتا اور صبح صادق سے پہلے نکل جاتا...... اسما ایسی صورتِ حال میں اس کا خیال کیسے رکھتی۔ لیکن آج نہ جانے کیا ہوا تھا۔ بابا، ہادی کو جلدی گھر لے آئے تھے۔ شاید کام ختم ہوگیا تھا۔ یوں لگ رہا

کاش

ایک دفعہ ایک انسان نے کوئل سے کہا۔ ''اگر تم کالی نہ ہوتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔''

پھر سمندر سے کہا۔ ''اگر تو کھارا نہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔''

پھر گلاب سے کہا۔ ''اگر تجھ پر کانٹے نہ ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا۔''

تب تینوں نے کہا۔ ''اے انسان! اگر تجھ میں دوسروں کے عیب ڈھونڈنے کی عادت نہ ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔''

مرسلہ: یاسمین اسرار، کمالیہ، ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ

تھا بابا، ہادی کو زبردستی لائے ہیں، اس کا انداز ہنوز اکھڑا اکھڑا تھا۔

اس کی حیران صورت دیکھ کر عزہ نے کان میں سرگوشی کی تھی۔

''میں نے بابا سے کہا تھا۔ ہادی کو لے کر گھر آئیں۔ یہ جو حلق تک ٹھونس ٹھونس کر سب کھا رہے ہیں، ان سے زیادہ ہادی اس دعوت کا حق دار تھا۔ آخر اسے پتا چلنا چاہیے اتنا لذیذ کھانا اس کی بیوی نے بنایا ہے۔''

عزہ کی سرگوشی پر اسما کا دل بھر آیا۔ یہ سب لوگ چن چن کر اسما کی خوبیاں ہادی کے سامنے بیان کرتے تھے تاکہ اس کا دل پسیج جائے اور وہ اسما کی خوبیوں کا معترف ہوجائے۔ ان سب کی کاوشیں اپنی جگہ لیکن اسما کو خیرات میں اِک نظرِ التفات کی طلب کبھی نہیں تھی۔

اس کے باوجود اس کارواں، رواں کان بن جاتا تھا۔ وہ جتنی انا کی ناک بلند کرتی، ہادی کے کہے الفاظ اس کی زیست کا حاصل بنتے جارہے تھے۔ وہ بھی اندر ہی اندر چاہنے لگی تھی کہ ہادی اپنے بھائی فدا اور صائم کی طرح اپنی بیوی کو سب کی نگاہ میں معتبر کرے، اس کے ہونے کا احساس کرے، اسے اپنی چاہت اور الفت کے ساتھ، ساتھ عزت سے سرفراز کرے...... ایک

مشرقی عورت ہونے کے ناتے اس کی خواہش بے جا نہیں تھی۔

اور اس صورتِ حال میں جب اسما، ہادی کو اپنا پہلا اور آخری جزیرہ مان چکی تھی۔ اپنی محبت، اپنے جذبے اور چاہت اس کے لیے وقف کر چکی تھی۔ وہ چاہتا تو پزیرائی بخش دیتا۔ چاہتا تو ٹھکرا دیتا...... اسما کو ہر حال میں اس کی خوشی قبول تھی۔ اس کا ساتھ قبول تھا۔ وہ اپنا تا یا نہ اپناتا۔

اور اس وقت اسی ہادی کی حیرت سے بھری آواز اسما کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی تو وہ ہاتھ مسلتے ہوئے حال میں لوٹ آئی تھی۔ ہادی کمرے میں پھیلی اشتہا انگیز خوشبو کو محسوس کرتا۔ دستر خوان پر رکھے رنگا رنگ لوازمات کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ ایک وقت میں اتنی ڈشز اس گھر میں تب پکائی جاتی تھیں جب کوئی مہمان آتا تھا ورنہ عرصہ دراز سے اس گھر میں ایک ہی رواج چلا آرہا تھا۔ دوپہر کا سالن ہی رات میں چلتا...... اماں بیماری کے باعث کچن سے ریٹائر تھیں۔ بھابیوں کو دونوں بھائی لے اڑے تھے۔ ویسے بھی کچن میں ان کے ''کمالات'' دیکھ کر یہی دعا کی جاتی کہ ان کے عتاب سے اللہ معدوں کو محفوظ ہی رکھے۔

پھولن دیوی جیسا تیسا کچا پکا بنا دیتی، ہادی، اماں اور بابا صبر شکر کے ساتھ کھا لیتے تھے۔ اماں، بابا بازاری کھانوں سے پرہیز کرتے تھے اور ہادی بھی ان کی وجہ سے گھر کے کھانے کو اولیت دیتا۔ چاہے کچا پکا ہی کیوں نہ ہوتا۔ اسے بھی اماں، بابا کے ساتھ کھانے کی عادت تھی۔ سو وہ بازار کے کھانوں سے پرہیز کرتا تھا۔

اور اس وقت لوازمات سے بھرا دستر خوان اس کی بھوک بڑھا رہا تھا۔ کھانے کی اشتہا اور اس کے بھائیوں کی معدہ بھرنے کی رفتار بتاتی تھی کہ کھانا رنگت اور خوشبو کے ساتھ، ساتھ بہت لذیذ بھی ہے۔

''کوئی مہمان آیا تھا کیا؟'' وہ اماں کے اصرار پر ہاتھ منہ دھو کر سیدھا دستر خوان پر آیا۔ اس کا مخاطب صائم تھا...... لیکن جواب عزہ نے دیا۔

''تم کھانا کھاؤ...... پھر بتاتے ہیں۔'' اس نے شوہر کو آنکھ سے اشارہ کر کے کچھ بولنے سے روکا تھا۔

''کشف اور فلک چلی گئیں......؟ ان کے سسرالی آئے تھے کیا؟''

''ہاں...... وہ چلی گئیں... تمہیں کون سا احساس ہے۔ تم نہ دن کو نظر آتے ہو نہ رات کو۔'' زری نے لگے ہاتھوں اس کی کلاس لینا چاہی۔ اسما جو ہادی کو دیکھ کر کچن میں چلی گئی تھی عزہ کے واپس گھسیٹ لانے پر اماں کے پاس تخت پر بیٹھ گئی۔ اس انداز میں کہ ہادی کی اس پر نگاہ نہ پڑپاتی۔ اسما کی خواہش تھی وہ آرام سے کھانا کھالیتا۔ اسے دیکھ کر اٹھ نہ جاتا مگر عزہ کو یہ بات کیسے سمجھائی جاتی۔ وہ اپنی مرضی چلاتی تھی۔

''یا تو دیوی جی کے ہاتھ میں لذت آگئی ہے یا پھر عزہ اور زری آج حیران کرنے پر تلی ہیں۔'' ہادی نے رغبت سے کھانا کھاتے ہوئے بے ساختہ چونک کر تعریف کی تھی۔

''ایک قیاس یہ بھی ہے کہ کسی ہوٹل سے خدمات حاصل نہ کی گئی ہوں۔'' ہادی نے مسکرا کر قورمے اور بریانی سے لطف اٹھایا تھا۔ اس کی خوشگوار آواز اسما کی سماعتوں کو اتنی بھلی لگ رہی تھی کہ اس کا دل چاہا...... ہادی بولتا رہے اور وہ سنتی رہے۔ بیچ میں کوئی اور آواز سنائی نہ دے۔ اس کا دل پسلیاں توڑ، توڑ کر باہر آرہا تھا۔

''اگر تمہارے سارے اندازے غلط ثابت ہوں تو کیا انعام دو گے؟'' صائم نے مسکرا کر مداخلت کی تھی۔

''میری طرف سے تمہارا سیکنڈ ہنی مون ٹکٹ فری۔'' ہادی اپنی جون میں لوٹ آیا تھا۔ مسکرا کر عزہ کو چھیڑتے ہوئے بولا۔

عزہ جیسے نہال ہو گئی تھی۔

''دیور ہو تو تمہارے جیسا...... میں واری جاؤں...... اب تمہارا وقت ہے، تم انجوائے کرو......'' عزہ نے بزرگوں کے سے انداز میں قربان ہوتے ہوئے کہا تو ہادی نے فوراً تصحیح کی۔

''یہ مہربانی تمہارے لیے تھوڑی ہے، میں نے

سیکنڈ ہنی مون کہا ہے، سیکنڈ وائف کے ساتھ۔'' ہادی کے اگلے الفاظ پر صائم کو اچھولگ گیا تھا۔ وہ کھانستا، کھانستا دُہرا ہوگیا تھا اور عزہ نے دور بیٹھے ہی چمچہ اٹھا کراس کی پشت پر دے مارا۔

''بہت خبیث ہو تم...... مجھ پر سوکن لاؤ گے؟'' عزہ کے بھڑ کنے پر صائم ہنس، ہنس کر بے حال ہوگیا تھا۔

''میں نہیں، تمہارا شوہر...... میری بات اس کے دل کو لگی ہے، دیکھو دانت کیسے باہر آرہے ہیں۔ بتیسی اندر ہی نہیں جارہی۔'' ہادی نے مزید اسے ستایا۔

''مشورے تو تمہارے ہیں ناں......'' عزہ نے اسے گھور کر دیکھا۔ ''خوابوں میں بھی مت سوچنا۔'' اس نے وارننگ دی۔

''ورنہ عزہ تمہارے خوابوں میں بھی دنگل مچا دے گی۔'' فدا نے صائم سے کہا۔

''خوابوں کے دھوکے میں تو کوئی نہیں آئے۔'' ہادی نے سر جھٹک کر کھانے کی طرف دوبارہ توجہ کی۔ صائم نے گلا کھنکھارا۔

''کوئی میری بھی تو رائے لے...... میں بھی تو دل رکھتا ہوں اور خواہش بھی......'' صائم، ہادی کو ایک دم یاسیت میں جکڑ لینے والے لمحے سے باہر نکال لایا تھا۔

''دوسری شادی کی خواہش......؟'' فدا نے پچکارتے ہوئے پوچھا تھا۔

''دیکھ لو عزہ! میرا بھائی تم سے گوڈے، گوڈے تنگ آچکا ہے۔'' ہادی نے عزہ کو مزید بتایا۔

''وہ تو تنگ نہیں...... لیکن تم لوگوں کی لگائی بجھائی کی وجہ سے ہوسکتا ہے۔'' عزہ نے غرّا کر کہا۔ صائم کے حوالے سے وہ بے پناہ پُچی تھی۔

''تم میرے شوہر کو مت ورغلاؤ......'' اس نے انگلی اٹھا کر غصے میں جتایا۔

''تمہارا شوہر کسی کے ورغلانے سے پھسلنے والا نہیں...... یہ تو آل ریڈی دوسروں کو ورغلا کر پھسلانے والا ہے۔'' ہادی نے صائم کی اچھی بھلی درگت بنائی۔

''تم پارٹی نہ بدلو۔ ورنہ میں بھی پارٹی بدل لوں گا۔'' صائم نے بھنا کر کہا تھا۔ اس کا اشارہ اسما کی طرف تھا۔

''میری حمایت کرو...... میری دوسری شادی پر غور و فکر کرو۔'' صائم نے ہادی کو چونکتے دیکھ کر اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

اسما اور زری ان کی تکرار کو انجوائے کررہی تھیں۔ اسما کی اچانک مدھری ہنسی بے قابو ہوئی تو ہادی کچھ چونک سا گیا۔ صائم نے اسے گردن موڑ کر ہنسی کی سمت کا تعین کرتے دیکھا تو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

''غور و فکر کرنے کے لیے کوئی اور چیز نہیں ......بس تمہارے ہی سر پر بار بار سہرا سجائیں۔'' ہادی نے تنک کر جواب دیا تھا۔

اس کے اعصاب ہولے، ہولے تن رہے تھے۔ وہ اسما کی موجودگی کو محسوس کرچکا تھا۔ گو کہ وہ قدرے فاصلے پر اماں کے پیچھے چھپ کر بیٹھی تھی پھر بھی ہادی کی تیز حسیات نے اس کی موجودگی کو پالیا تھا۔

''میں عزہ کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہونے دوں گا...... کرنل صاحب کی روح مجھے چین لینے نہ دے گی۔ یہ میں ہی تھا جس نے کرنل صاحب کے پاؤں پکڑ کر تمہارے لیے عزہ کا رشتہ مانگا تھا۔ ورنہ وہ تمہیں مونگ پھلی کا دانہ تک نہ دیتے۔ اپنے لان کا پھول توڑنے نہ دیتے تھے کجا کہ اپنی اتنی لمبی بیٹی کا ہاتھ پکڑا دیتے۔ میں نے ان کے ساتھ وعدہ کیا تھا، عزہ کی زیادتی بھی ہوئی تو بجائے عزہ سے باز پرس کرنے کے صائم کی درگت بناؤں گا۔ اس کی چھترول کروں گا۔ ضرورت پڑی تو عزہ سے بھی کرواؤں گا۔ تب کہیں جا کر میرے ارادوں سے تسلی پا کر انہوں نے عزہ کا رشتہ تمہیں دیا تھا۔ اس لیے میں عزہ کا حمایتی ہوں۔ وعدہ خلافی کروں گا تو کرنل صاحب کی روح مجھے خوابوں میں آکر ڈرائے گی۔ میں پہلے ہی ایک چڑیل کو بھگت رہا ہوں، کرنل صاحب کی بڈھی روح کو افورڈ نہیں کرسکتا۔'' ہادی نے کھانا کھا چکنے کے بعد منہ نیپکن سے صاف کیا اور انتہائی لذیذ کھیر کا ڈونگا اٹھا کر اسی میں

شروع ہوگیا۔ صائم نے اسے پینترا بدلے دیکھا تو فوراً آپے سے باہر ہوگیا۔
''تم عزہ کے حمایتی ہو اور میں اسما کا...... جو کچھ کھا چکے ہو...... اسے میں حلق سے نکال لوں گا...... فی الحال یہ کھیر کا ڈونگا میرے حوالے کرو...... اور اپنی عزہ سے گرما گرم جوشاندہ بنوا کر پیو...... یہ کھانا اور یہ کھیر میری بہن نے بنائی ہے۔'' صائم نے سینہ ٹھونک کر خباثت کا ثبوت دیتے ہوئے ڈونگا جھپٹنا چاہا تھا جسے ہادی نے ہاتھ پیچھے کرکے اس کی پہنچ سے دور کرلیا۔
''تمہاری بہن...... یعنی کشف نے؟'' وہ ایک الجھن میں گھرا پوچھ رہا تھا۔
''کشف کوکنگ میں ایسی ماسٹرز ہوتی ناں تو ہمارے بہنوئی گلریز کو خانساماں نہ رکھنا پڑتا۔'' صائم نے منہ بنا کر کہا۔
''تو پھر؟'' ہادی کا واضح طور پر رنگ متغیر ہوا تھا۔ ڈونگے پر اس کی گرفت ہلکی ہوگئی تھی۔
''پھر یہ کہ اس ''دعوتِ شیراز'' کا سہرا اسما کو جاتا ہے۔ آج عرصے بعد اتنا لذیذ اور مزیدار کھانا کھایا ہے۔ ترکی میں بھی تمہارے کھانوں کی بہت یاد آئے گی اسما! ویلڈن جیتی رہو...... ہمارے گھر کو تمہارے جیسی......'' صائم ایک ترنگ اور اپنائیت کے احساس تلے تشکرانہ اور تعریفانہ انداز میں اسما کا حوصلہ بڑھا رہا تھا جب اچانک ہادی نے بیچ میں مداخلت کرکے اس کے اگلے الفاظ کو اچک لیا۔
''ہمارے گھر کو تمہارے ہی جیسی ''باورچن'' کی ضرورت تھی۔'' اس کے الفاظ انتہائی تحقیرانہ انداز میں لبوں سے ادا ہوئے تھے اور اس نے کھیر کا ڈونگا پٹخنے کے سے انداز میں نیچے رکھا۔ اگر کھیر جمی ہوئی نہ ہوتی تو یقیناً دسترخوان پر الٹ کر اسے داغ دار کردیتی۔
ہادی اپنے لفظوں کے تیر پھینک کر دھپ، دھپ کرتا اٹھ کر غیظ کے عالم میں وہاں سے چلا گیا۔ باقی سب انگشت بدنداں رہ گئے۔ ہر کوئی اپنی نگاہ میں شرمندہ ہوگیا تھا۔
ماحول پہ ایک دم سکوت طاری ہوگیا تھا۔ اسما ایسے ندامت سے کھڑی تھی جیسے اس سارے معاملے میں اس کا قصور ہو۔
''ہادی کو ایسے ہی شغل لگانے کی عادت ہے۔'' بہت دیر بعد صائم نے ماحول پر چھائے سکوت کو کم کرتے ہوئے بڑے بھونڈے انداز میں کہا اور اپنی بات پر خود ہی مسکرا دیا۔ کچھ دیر بعد کمرے میں بھانت، بھانت کی بولیاں سنائی دینے لگیں۔ ہر کوئی اسما کی... حتی المقدور دل جوئی کرنے میں لگا ہوا تھا۔ اور اسما اتنے ضبط اور صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے جانے کس دشواری کے ساتھ لبوں پر کھینچ تان کے مسکراہٹ لے آئی تھی۔ کیونکہ ان لوگوں کے خلوص پر اسے ذرا... بھی شبہ نہیں تھا۔
وہ ان سب کو مطمئن کرنا چاہتی تھی۔ ہادی کے دیے گھاؤ میں یہ ایک معمولی اضافہ تھا۔ وہ تو ہادی کی اس سے زیادہ تکلیف دہ باتیں سہہ چکی تھی۔
ستم گر کو ستم دینے کی عادتی ہوتی ہے، وہ اپنی عادت پوری کررہا تھا۔ اسما اپنا ضبط اور محبت آزما رہی تھی۔ وہ محبت جو اسے ہادی عبدل زئی سے اچانک ہوگئی تھی۔ جب اس نے پہلی مرتبہ ہادی کی تصویر دیکھی تھی۔ وہ تصویر اس کی کتاب میں بھلا کس نے رکھی تھی؟ اسے یاد تھا، سب یاد تھا۔ اسما نے ڈھیروں آنسو اندر دھکیل کر کچھ عرصہ پہلے کا ایک منظر سوچا تھا۔

☆☆☆

وہ گرمیوں کے دن تھے بہت لمبے، پھیکے اور ویران پہر...... یونیورسٹی میں چھٹیاں ہوئیں تو وہ بھی ہاسٹل سے بوریا بستر باندھ کر گھر آگئی تھی۔ چھٹیوں کے بعد ایگزامز تھے اور پڑھائی کے معاملے میں وہ دنیا کی ہر چیز سے زیادہ حساس تھی۔
آج دوپہر کو بابا اسے ہاسٹل سے گھر لائے تھے اور وہ اسے چھوڑ کر دوبارہ اپنے آفس چلے گئے تھے۔
جب وہ گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو گھر کی حالت انتہائی گندگی کا شکار تھی۔ پورا صحن پتوں سے بھرا

ہوا تھا دیگر کوڑے کا ڈھیر الگ سے جمع تھا۔

اس کے ہاسٹل قیام کے دنوں میں گھر کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ جب وہ یہاں تھی تب ہر روز صبح پانچ بجے اٹھ کر پورا گھر شیشے کی طرح چمکانے کے بعد ناشتا بناتی اور پھر خود تیار ہو کر یونیورسٹی جاتی، جب وہ ناشتا میز پر لگا چکی ہوتی تب امی اور عاشر اٹھ کر آتے تھے۔ اسمارا تو یونیورسٹی بھی ان سب پر احسانِ عظیم کر کے جاتی تھی کجا جلدی اٹھ کر گھر کے کاموں میں دلچسپی لینا یا کچن کو سنبھالنا۔

ویسے بھی مامی اسمارا کو کچن کے قریب بھی نہیں جانے دیتی تھیں۔ انہیں اسمارا کے حسن کا ہر وقت احساس رہتا۔ چولھے کے قریب کھڑے ہونے سے اسمارا کی حساس اسکن متاثر ہوتی تھی۔ دھوپ میں کام کرنے سے رنگ جھلستا تھا۔ برتن دھونے سے ہاتھ کالے اور کھردرے ہوتے تھے۔ اور آٹا گوندھنے سے ناخن ٹوٹتے تھے۔ ویسے بھی مخروطی انگلیوں والے دودھیا ملائم ہاتھ کاموں کے لیے بنے کہاں تھے؟

اسمارا خود ابھی اپنے ہاتھوں پاؤں کی خوب صورتی پہ خاص توجہ دیتی، ہر وقت اس کے حسین ناخن نیل پالش سے رنگے نظر آتے۔ پھر ایسے نازک ہاتھ کام کیسے کر سکتے تھے۔ مامی نے اسمارا کو ہتھیلی کا چھالا بنا رکھا تھا۔ وہ اس کے ناز اٹھا، اٹھا کر نہیں تھکتی تھیں۔ وہ ان کی تھی بھی اکلوتی بیٹی اور اس گھر میں اسمارا کے سب لوگوں نے ہمیشہ ناز ہی اٹھائے تھے۔ اسما کے بابا سے لے کر عاشر تک...... اپنے والدین کی تو وہ بے حد لاڈلی تھی ہی...... اسما کے بابا بھی اسے بہت چاہتے تھے۔ اس کی ہر فرمائش کو بن کہے پورا کرتے...... اسما کو یاد تھا...... بچپن میں اسے سائیکل چلانے کا بہت شوق تھا۔ تب بابا اپنا یہ گھر تعمیر کروا رہے تھے۔ ان کے پاس... فی الحال اسما کی فرمائش پوری کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ لیکن جب اسمارا نے یہی خواہش بابا کے سامنے دہرائی تو بابا نے اگلی صبح نئی نکور سائیکل اسمارا کو لا دی تھی۔ تب پہلی مرتبہ اسما کا ننھا دل ٹوٹ سا گیا۔ بابا نے اس کی کیفیت کو نوٹ کر لیا تھا۔ تب انہوں نے آرام سے اسما کو سمجھایا۔

"امی کے پاپا معذور ہیں بیٹا! وہ کام نہیں کر سکتے تو اپنی بیٹی کی خواہشات بھی پوری نہیں کر سکتے۔ کل اسمارا، شکیل کو بہت تنگ کر رہی تھی۔ اور شکیل اس کے تنگ کرنے پر بے بسی سے رو پڑا تھا۔ میں وہاں سے نہ گزرتا تو مجھے پتا بھی نہیں چلتا۔ اس لیے میں نے اسمارا کی خواہش پوری کر دی۔ اگلے سال تمہاری سائیکل بھی آجائے گی۔"

بابا کے سمجھانے پر سدا کی صابر و شاکر اسما کو ساری بات سمجھ میں آگئی تھی پھر اس کے دل سے ملال بھی جاتا رہا تھا۔ جیسے، جیسے وہ بڑی ہوتی گئی اسے سب سمجھ میں آگیا۔ ماموں اور مامی ان کے گھر میں رہتے تھے۔ ماموں بیمار تھے۔ کام نہیں کر سکتے تھے۔ بابا نے ان تین افراد کا خرچہ بھی اٹھا رکھا تھا۔ اور اسمارا کو بھی عاشر اور اسما کے ساتھ مہنگے اسکول میں ڈالا تھا۔

ماموں کی دوائیاں، ان کے لیے الگ سے فروٹ، دودھ یہ سب بابا فراہم کرتے تھے۔ بابا اسٹیٹ بینک میں بہت اچھی پوسٹ پر تھے۔ جیسے ہی عاشر بڑا ہوا اس نے بھی بابا کے ساتھ، ساتھ اسمارا کا جی جان سے خیال رکھنا شروع کر دیا تھا۔ اسمارا کی ہر فرمائش پوری کرنا عاشر پر فرض تھا۔ وہ اپنی پاکٹ منی ساری کی ساری اسمارا پر خرچ کر دیتا تھا۔ حتیٰ کہ جب اپنے پیسے ختم ہو جاتے تو اسما کی منتیں کرتا۔ حالانکہ اسمارا کو الگ سے پاکٹ منی ملتی تھی۔

"امی کو فلم دکھانے لے کر جانا ہے۔ ٹکٹ کے پیسے نہیں...... پلیز ادھار دے دو۔" ایک دن عاشر اس کی گلک کو ہاتھ میں لے کر منت بھرے لہجے میں بولا۔

"پہلے والا ادھار تو واپس کیا نہیں۔" اسما نے نوٹس بناتے ہوئے اسے گھورا۔

"اکٹھا لوٹا دوں گا ناں......" وہ عاجزی سے کہتا۔

"وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔" اسما اسے مطلوبہ رقم نکال کر دے دیتی۔ اسمارا کے لیے اس کا دل بھی بہت

بڑا تھا۔ وہ اس کی خواہش پوری کروانے میں عاشر کی مدد کرتی تھی۔ یہ مالی معاونت ہمیشہ عاشر کے ساتھ، ساتھ رہی۔ اسمارا کو اضافی کپڑے چاہیے ہوتے۔ فرینڈز کو گفٹس دینا ہوتے، رات کے گیارہ بجے پزا کھانا ہوتا، سرما کے دسمبر میں آئس کریم کا دل کرتا۔ عاشر اس کی ایک آواز پر فوراً حاضر ہو جاتا۔ اسمارا اس لحاظ سے بہت خوش قسمت تھی جو اسے اتنی محبت بھری محبتیں میسر تھیں۔ ان کی پڑوسن گلناز اکثر دیوار سے لٹک کر کہتی۔

''اس حسینۂ عالم کو اتنا سر نہ چڑھاؤ، بعد میں پچھتاؤ گی۔ تمہاری بھابی بن کر تو تمہارے سر پر چڑھ کے ناچے گی۔'' گلناز، اسمارا کو دیے جانے والے پروٹوکول سے ایسے ہی جلتی تھی۔

اور پھر گرمیوں کے ان طویل دنوں میں جب اسما اچانک گھر آئی تو گھر کی حالت انتہائی خستہ تھی۔ وہ کندھے سے لٹکائے بیگ کو برآمدے میں رکھ کر اندر آئی تو مامی لاؤنج میں بیٹھی فون کان سے لگائے اونچی آواز میں جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھیں۔

''میری ہڈیوں میں تو دم نہیں...... نوکر کوئی رکھ کر نہیں دیتا۔ اتنی تنخواہیں کہاں سے لائیں۔ اسما بی بی کی پڑھائیاں ختم نہیں ہوتیں۔ گھر کوڑا دان بنا ہے تو بنا رہے۔'' مامی انتہائی بیزاری سے بول رہی تھیں۔

''امی کا تو نام مت لو...... میری پھول سی بچی گرمی میں کملا جاتی ہے۔ اب تو میں جیسا تیسا کر لیتی ہوں، ہاسٹل جانے سے پہلے اسما نے سارا گھر سنبھالا ہوا تھا۔ یہاں بھی اچھی بھلی پڑھائی چل رہی تھی۔ پکڑ کے ہاسٹل میں بھجوا دیا۔ میری تو مت ماری گئی ہے۔ کام ہیں کہ ختم نہیں ہوتے۔'' مامی کی بیزاری کا کوئی انت نہیں تھا۔

''عاشر کی نوکری لگتی ہے تو اسے صاف، صاف کہہ دوں گی۔ کسی کھانا پکانے والی عورت کا پکا بندوبست کرلے اور صفائی کے لیے الگ...... کپڑوں کے لیے الگ...... میری امی سے تو کچھ نہیں ہوتا۔'' انہوں نے اپنا اگلا پروگرام بھی نشر کر دیا تھا۔

''عاشر نے کیا ڈپٹی کمشنر لگ جانا تھا؟ حد ہے بھئی، مامی بھی ناں......''

''ارے، مجھے کوئی فکر نہیں...... خلیل بھائی نے امی کو ہتھیلی کا پھپھولا بنا رکھا ہے، اسما سے زیادہ میری بچی سے پیار کرتے ہیں۔ آخر ہونے والی اکلوتی بہو ہے۔ پھر عاشر تو امی کا دیوانہ ہے۔ ایسی دلہن تو اسے عمر بھر نہ ملے۔ سارے جہان کے صحرا چھان آئے۔'' مامی کا لہجہ بیٹی کی محبت میں ڈوب گیا تھا۔ عاشر کا دماغ خراب تھا۔ گھر کے چراغ کو چھوڑ کر صحراؤں کی خاک چھانتا...... اور صحراؤں سے ملتا کیا ہے؟ خالی گرم ریت......؟

''اسما کا رشتہ تو کر دیا۔ وہاں کوئٹہ میں...... خلیل بھائی کا پرانا دوست ہے کوئی۔ ہماری بلا سے...... اسما کا کانٹا بھی نکل جائے گا۔ پھر خالی گھر...... ساس، نہ نند...... میری امی تو راج کرے گی راج...... شوہر تو پور، پور دیوانہ ہے۔ کبھی کاموں کے لیے امی کو ڈانٹوں بھی تو عاشر بیچ میں کود آتا ہے کہ مامی اسے کچھ مت کہا کریں...... سر پر پڑے گی تو کر ہی لے گی۔'' عاشر کے حوالے سے مامی کو اطمینان ہی اطمینان تھا۔ مامی ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ عاشر، اسمارا کو پتا تک اٹھانے نہیں دیتا تھا۔ وہ کچن میں کبھی جاتی بھی تو ہاتھ جوڑ کر کہتا۔

''امی! اللہ کا واسطہ ہے باہر آجاؤ، تم الٹا کوئی نقصان کر آؤ گی۔ اسما کچن دیکھ لیتی ہے، تم نہ ہماری سات نسلوں کو ''وخت'' میں ڈال دینا ہاتھ پاؤں جلا کر۔''

اور اسمارا ایسے ہی تو عاشر کی محبت پر مغرور نہیں تھی...... اور برابر والے گھر سے گلناز کے کلسنے کی آواز آتی۔

''اس مہارانی کو ڈیکوریشن پیس بنا کر شوکیس میں سجا دو۔'' اور شاید گلناز ٹھیک کہتی تھی۔ اسمارا بس شوکیس میں سجانے والی چینی کی گڈی تھی۔ جسے دیکھ، دیکھ کر خوش ہوا جاتا تھا۔

اور اس وقت مامی کی جلی کٹی سن کر اسما نے گہری سانس کھینچی اور پھر پائپ لگا کر سارا گھر دھو ڈالا۔ مامی

کھٹکے کی آواز پر پلٹیں تو اسما کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی تھیں۔
''کہیں اس نے میری باتیں تو نہیں سن لیں؟'' پہلا خیال انہیں یہی آیا تھا۔ جسے انہوں نے جھٹک دیا۔
''اچھا ہے، سنتی ہے تو سنتی رہے۔'' انہوں نے اطمینان سے سوچا۔ پھر چادر لے کر کالونی کے وزٹ پر نکل گئی تھیں کیونکہ اب انہیں گھر کی فکر نہیں تھی۔ اسما جو آچکی تھی۔

پھر اسما پیپر کی تیاری کو بھاڑ میں جھونک کر کام سے لگ گئی۔ پہلے پورا گھر چمکایا پھر کھانا بنایا تب تک عاشر اور اسمارا بھی پہنچ چکے تھے۔
''ارے ...... میں کہوں، گھر میں اجالا کیوں ہے؟'' عاشر، اسما کو دیکھ کر کھل اٹھا تھا۔ اسی طرح اسمارا بھی نہال ہوگئی۔
''باہر دھوپ چمک رہی ہے اس لیے گھر میں اجالا ہے۔'' اسمارا نے عاشر کی بات کا جواب دیا تھا۔
''جی نہیں...... میری بہن کے دم سے اجالا ہے۔''
اسما ان کی باتوں پر مسکرا دی تھی۔ پھر سب نے انتہائی لذیذ کھانا کھایا تو عاشر کی زبان میں پھسر پھسر ہوئی۔
''ہم پتلی دال اور ساگو دانے کا شوربہ پی، پی کر تنگ آچکے تھے۔'' وہ اس کے کان میں گھس کر بلبلایا تھا۔ اسما کی ہنسی نکل گئی۔ جب وہ برتن سمیٹ کر اپنے کمرے میں آئی اور پڑھنے کے لیے کتاب کھولی تو اچانک کتاب سے ایک تصویر پھسل کر نیچے گر گئی تھی۔ اسما کا دل لمحہ بھر کے لیے بند سا ہوا۔ یہ تصویر کس کی تھی؟ اسما کو پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا دل گھبرا سا گیا۔ جیسے چوری پکڑی گئی ہو، تب ہی عاشر کھلکھلاتا ہوا اندر آیا تھا اور اس کے پیچھے اسمارا بھی......
''کہو، ہونے والے سرتاج کیسے لگے؟ ارے، چھپ، چھپ کر کیوں دیکھ رہی ہو؟ تمہاری اپنی چیز ہے کھل کر دیکھو۔'' عاشر نے اس کا کندھا تھپک کر تصویر ہاتھ سے پکڑ کر سامنے کی۔ جسے وہ جلدی میں الٹ کر رکھ چکی تھی۔

''میں نے کہا...... تمہیں تصویر دکھا دوں...... بعد میں شکوہ نہ کرو...... دولھا تو بھینگا تھا۔'' عاشر اسے زچ کرتے ہوئے مسکرایا۔
''بھینگا بھی ہوتا تو مجھے قبول تھا۔ کبھی نہ جتلاتی...... تم جانتے ہو۔'' اسما سنجیدگی سے بولی تھی۔ عاشر نے سر ہلا دیا۔
''ایسی ہوتی ہیں قناعت پسند مشرقی لڑکیاں......''
اب وہ اسمارا کو جتا رہا تھا۔ اس نے ناک بھوں چڑھا کر تصویر پکڑ لی تھی پھر تصویر کا بغور جائزہ لے کر نفی میں سر ہلانے لگی۔
''تم نے خواہ مخواہ اس کی خوب صورتی کا ڈھنڈورا پیٹا ہوا تھا۔ ایویں سا ہے بس، عام سا...... تم سے زیادہ اچھا تو نہیں۔'' اسمارا کا تبصرہ بھی اسمارا کی طرح عجیب تھا۔ آخر مامی کی بیٹی تھی۔ عاشر نے گھور کر اسے دیکھا۔
''خبردار، میرے بہنوئی کی شان میں گستاخی کی...... بڑا پیارا ہے مجھے بھی اور میری بہن کو بھی......'' وہ اسما کو چھیڑتے ہوئے ہنس رہا تھا۔
''رہنے بھی دو بس...... مجھے تو کہیں سے پیارا نہیں لگا۔'' اسمارا اس کی تصویر کو دو انگلیوں میں نزاکت سے پکڑے لہرا رہی تھی۔ عاشر نے جھپٹ کر اس سے تصویر اچک لی۔
''تمہیں پیارا لگنے کی ضرورت بھی نہیں...... جس کا ہے اسی کو پیارا لگے۔''
''ہونہہ......'' اسمارا کو غصہ آگیا۔ ''میں ایسوں ویسوں کو گھاس بھی نہیں ڈالتی۔''
''تم اپنی گھاس مجھ تک محدود رکھو...... میں بہت شوق سے گھاس چرتا ہوں۔'' عاشر نے اس کا غصہ ختم کیا لیکن اسمارا کا غصہ کم نہ ہوسکا تھا۔ رات تک وہ جان بوجھ کر ہادی کا ذکر کرتی رہی۔ بار، بار ہادی کی تصویر پر تبصرہ کرتی تھی۔ اس کا انداز سوچا ہوا سا تھا۔
''کوئٹہ کے لوگ اتنے اچھے نہیں ہوتے۔ یہ ہادی شکل سے اسمگلر لگتا ہے۔'' اسمارا کے کمنٹ پر سبزی

کاٹتی اسما کا دل دھک سے رہ جاتا۔

''خدا کا خوف کرو اسمی! اتنا مت دہلاؤ مجھے...... نازک سا دل ہے میرا۔''

''تم مانو یا نہ مانو...... نکلے گا یہ اسمگلر ہی...... پھوپا جی کو اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔'' اسمارا نے تفکر سے ہونٹ سکیڑے۔ اور اسما کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

''شریف سا لگتا ہے، تمہیں نہ جانے کیوں اسمگلر لگا۔'' اس نے بے پروائی سے دل کو مطمئن کرنا چاہا لیکن اسمارا۔ وہ بہت گہرائی میں جارہی تھی۔ بلکہ اسما کا دل دہلا رہی تھی۔ لیکن اس کی باتیں دل کو بھی لگ رہی تھیں۔

''اتنا شریف ہوتا تو اسے پورے کوئٹہ میں رشتہ نہ ملتا؟ وہاں اسے کسی نے لڑکی نہیں دی...... تبھی اتنی دور انکل نے رشتہ طے کیا...... تاکہ اس کے کرتوت ہم سے چھپے رہیں۔'' اسما بہت دور کی کوڑی لائی تھی۔

''کیا واقعی......؟'' اسما کا نازک سا دل ہول اٹھا...... اس پہلو پر اسما نے سوچا بھی نہیں تھا پھر یہ بھی تو بات تھی۔ آخر عبدل انکل کو اتنی معمولی سی اسما میں کیا نظر آیا تھا؟ ان کے و... بیٹے کے لیے رشتوں کا کال پڑ گیا تھا کیا؟

''مجھے تو یہی لگتا ہے، اب دیکھو ناں...... عاشر کے بقول ہادی بہت خوب صورت ہے تو پھر اتنے خوب صورت لڑکے کے لیے انکل کو لڑکی بھی تو ''ٹکر'' کی ڈھونڈنی چاہیے تھی ناں...... انہوں نے محض تم پر ''قناعت'' کیوں کرلی۔'' اسمارا انتہائی معصومیت سے کہہ رہی تھی۔ اس کے انداز میں اسما کا مذاق اڑانے والا کوئی تاثر نہیں تھا وہ ایک واضح حقیقت بیان کررہی تھی۔ یہ بات اسما بھی بہت مرتبہ سوچ چکی تھی۔ اس پہلو پر غور بھی کرچکی تھی۔ کیا ہادی جیسے لڑکے کے لیے انکل کو کوئی لڑکی نہیں ملی؟ وہ اتنی معمولی سی شکل کی اسما کو کیوں پسند کرگئے تھے؟ آخر کوئی تو بات ہوگی۔

''جہاں تک ہادی کی شرافت کا تعلق ہے تو اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔'' کچھ دیر بعد اسمارا نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا تھا۔ اسما اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔ اب کون سا نیا پہلو اجاگر کرنے والی تھی۔

''مطلب......؟'' اس کے انداز میں انتہائی اذیت ناک تاثر رچ گیا تھا۔

''دیکھو ناں یار! مجھے تو لگتا ہے ہادی کا کیریکٹر اتنا اسٹرونگ نہیں ہوگا۔ تبھی تو اسے ڈھنگ کی لڑکی نہیں ملی۔'' اسمارا نے بظاہر سادگی میں ایک مرتبہ پھر اس کی ذات کو پیسا تھا۔ ڈھنگ سے مراد یقیناً خوب صورت لڑکی کی طرف اشارہ تھا اور اسما کہیں سے بھی خوب صورت نہیں تھی۔

''انکل نے سوچا ہوگا۔ دور دراز کی لڑکی لاتا ہوں...... دبوسی، کم صورت، جواُن کے بیٹے ساتھ نباہ کرسکے۔'' اسمارا کا لہجہ بلا کا پُرسوچ مگر کٹیلا تھا وہ متواتر اس کی ذات پر اپنی سادگی میں حملے کررہی تھی۔

''لیکن انہیں یہ خبر نہیں تھی...... تم بلا کی پراعتماد لڑکی ہو۔ کہیں سے بھی دبنے والی نہیں...... لیکن ایک چیز میں وہ پھر بھی فائدہ مند رہے...... تم ان کے بیٹے کی پرسنالٹی کے سامنے پس منظر میں چلی جاؤ گی......'' اسمارا اس کی ہمدردی میں بار، بار اس کی کم روئی کو نشانہ بنارہی تھی۔ بالآخر اسما کو کہنا ہی پڑا۔

''میں اتنی بھی بری نہیں۔''

''ارے، میں نے یہ کب کہا...... تم تو میری جان ہو، ہمیں ہر چیز سے زیادہ پیاری ہو، میں تو ان لوگوں کی سوچ کا تجزیہ کررہی تھی۔'' اسمارا فوراً شرمندہ ہوکر معذرت کرنے لگی۔

''اچھا...... ماہرِ نفسیات صاحبہ! اب اس مسئلے کا کوئی حل ہے؟'' اسما نے اپنا سر دباتے ہوئے خفگی سے پوچھا۔ وہ اندر سے شدید پریشانی اور تفکر میں مبتلا ہوگئی تھی۔ اسمارا کی کوئی بھی بات جھٹلانے والی نہیں تھی۔

''ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے۔'' اسمارا نے بڑے مدبرانہ انداز میں کہا...... اس نازک سچویشن میں بھی اسما کو ہنسی آگئی تھی۔

''تو پھر کیا حل نکالا تم نے؟'' اب وہ اس کی

"سنجیدگی" کو انجوائے کر رہی تھی کیونکہ اسمارا بہت ہی کم معاملوں پر سنجیدہ ہوتی تھی۔

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو...... میں اس بندے کی شرافت کا کچا چٹھا کھول کر دکھاؤں گی تمہیں۔" اسمارا کے ارادے کو دیکھ کر اسما کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ اسے اندازہ تھا، اسمارا کو لمبی، لمبی چھوڑنے کی پرانی عادت ہے اور وہ ایسی ہی بے پرکیاں اڑانے میں ماہر تھی۔

"تم ہادی کو تو بخشنا بھئی......" اس نے ہاتھ جوڑے، اسمارا اس کے ہنسنے پر خفگی سے منہ پھلا کر رہ گئی۔

"ایک تو تمہاری مدد کرنا چاہ رہی ہوں اور دوسرے تم میرا مذاق اڑا رہی ہو۔" وہ دھپ، دھپ کرتی اٹھ کر جا چکی تھی اور اسما اُس کی باتوں پر دیر تک ہنستی رہی۔

☆☆☆

اسمارا نے دوسرے دن گلناز کو بھی ہادی کی تصویر دکھائی تھی۔ اس دن گلناز محض اسما کے لیے آ گئی۔ جب بھی اسما گھر آتی تھی گلناز کے بہت چکر لگتے تھے۔ اسما کے بغیر وہ کبھی یہاں جھانکتی تک نہیں تھی۔

اسمارا نے جب گلناز کو ہادی کی تصویر دکھائی تو گلناز خاصی متاثر نظر آئی تھی۔

"یہ تو بڑا ہینڈسم ہے...... تمہارے تو نصیب کھل گئے اسما......" گلناز کا تعریفی انداز بھی اپنا ہی تھا۔ وہ خاصی باریکی سے تصویر کا جائزہ لے رہی تھی۔

"تمہیں شکل سے کیسا لگتا ہے؟" اسمارا اب گلناز کی رائے لے رہی تھی۔ اسی طرح ہادی کی تصویر وہ باری، باری سب کو دکھا کر ان سب کے خیالات ہادی کے متعلق معلوم کر رہی تھی۔ یہ سب کوششیں اسما کے لیے تھیں۔ وہ اتنا تردد اسما کے لیے کر رہی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا۔ اس کی کوششیں انتہائی مخلصانہ تھیں اور اسے اسما سے بہت پیار بھی تھا۔

"شکل سے؟" گلناز نے تصویر کو نگاہ بھر، بھر کے دیکھا تھا۔ پھر اسے شرارت سوجھ گئی۔ ویسے بھی گلناز کی اسمارا سے نہیں بنتی تھی اور گلناز کبھی اسمارا کو

مجھ سے ملیے

مجھ سے ملیے، مجھے کہتے ہیں نخل سعدی آرائیں، 16 اگست 1992ء تاریخ کا یادگار دن جس دن ہم نے کائنات کو رونق بخشی۔ اسٹار ہے لیو (leo) مزاج گرم سرد، نارمل ہر طرح کا...... موسموں کی طرح اور کبھی سیاستدانوں کے دعوؤں کی طرح تبدیل ہوتا رہتا ہے...... لاڑ کی ٹھنڈی میٹھی فضاؤں کے باسی ہیں، وفا، دھرتی سے ہو یا انسانوں سے لازم سمجھتے ہیں، پسندیدہ رنگ، کوئی ایک نہیں۔ ہر کھانے، پینے کی ہر چیز پسند ہے، شاعری اور لکھنے پڑھنے کی شوقین ہوں، رائٹرز کی بھی ایک لمبی لسٹ ہے جو موسٹ فیورٹ ہیں موسٹ فیورٹ ناول ہیں ایمان، امید اور محبت، ٹھہرے پانی، خاک و خون شاعری میں وصی شاہ کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں موسٹ فیورٹ ہے، باذوق ہونے کے باوجود بارشوں سے کوئی دوستی نہیں، سرد راتیں، لمبی راتیں، مونگ پھلی، آئس کریم بہت پسند ہیں۔ شفاف دل کے لوگ دل سے اچھے لگتے ہیں۔ تعلیم ہو نہ ہو دل اچھے ہوں، ان لوگوں سے خوب بنتی ہے، بچپن میں ڈاکٹر وہ بھی آرمی ڈاکٹر بننے کا شوق تھا، جب تھوڑے بڑے ہوئے وکیل یا لیکچرار بننا چاہتے تھے مگر پھر ہوا یہ کہ گریجویٹ ہی بن سکے، امید پر دنیا قائم ہے کبھی نہ کبھی آج نہیں تو کل کچھ بن ہی جائیں گے، پاک فوج، کتابیں، رنگ دار پنسلیں کمزوری ہیں۔ بہت محبت ہے مجھے ان سے، اسلام، عورت، وردی، وفا اور وطن سے عشق ہے، قلم کی عظمت کا پاس مجھے بہت عزیز ہے، لفظوں میں زندگی نظر آتی ہے، اس لیے ان کا بہت خیال رکھتی ہوں، قرآن پاک کو ضابطہ حیات سمجھتی ہوں اگر اسے سمجھ لیا جائے تو ہر مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے کو بہتر سمجھتی ہوں، وہ جو بھی کم تلے ٹھیک کرتا ہے، اس کے ہر کام میں ہر مصلحت ہوتی ہے، میرا یقین ہے، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارک کا لفظ، لفظ میری رہبری ہے، اس لیے نہیں کہ میں مسلمان ہوں اس لیے کہ میں انسان ہوں، انسانیت کی سب سے بہترین مثال آقا مدنی ہیں، پاکیزہ سے تعلق تقریباً تین سال سے ہے اور اس عرصے میں مجھے سب سے زیادہ پسند آنے والی تحریریں ترک وفا، بنت حوا اور پارس ہیں، اقبال بانو کی تحریر دلہن میں لے کر جاؤں گا اور صائمہ اکرم کی جنجوعہ ہاؤس نے بھی بہت مزہ دیا، پاکیزہ کے توسط سے بہت سے لوگوں سے دوستی ہوئی۔ ایشل شادیان امینہ عندلیب آپی اور بہت سی بہنیں، جن کے پیار و خلوص کی قدردان ہوں، سب کے لیے دعاگو ہوں۔

خدا پاکیزہ کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ (آمین)

سیدھا جواب نہیں دیتی تھی۔ ان دونوں کی آپس میں ٹھنی رہتی تھی۔

''ہاں، ناں بتاؤ بھی۔'' اسمارا نے جھنجلا کر کہا۔

''شکل سے یہ بڑا ہی فلرٹ لگتا ہے۔'' گلناز نے لب بھینچ کر مسکراہٹ کو اپنے اندر دھکیلا۔

''اور اس کے علاوہ......؟'' اسمارا کی بے چینیوں کا کوئی شمار نہیں تھا۔ اسما نے دل ہی دل میں لاحول پڑھا پھر گلناز کو زور سے چٹکی کاٹی۔

''اس کے علاوہ غنڈہ بھی لگتا ہے۔'' گلناز مسکراہٹ کو لبوں میں گھونٹ کر انتہائی سنجیدگی سے بولی تھی۔

''کیا واقعی؟'' اسمارا نے ایک چیخ ماری۔

''سو فیصد......'' گلناز نے اسے اور بھی الو بنایا تو اسما کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

''بکواس مت کرو...... منہ توڑ دوں گی تمہارا...... اتنا معصوم ہادی تمہیں غنڈہ، بدمعاش اور فلرٹ لگتا ہے۔'' اسما نے گلناز کو دھموکا جڑا تھا۔ وہ کھل کر قہقہہ لگانے لگی۔

''ارے ابھی تو میں نے اسے آوارہ، سڑک چھاپ، جیب کترا بھی کہنا تھا۔'' گلناز نے اس کا بری طرح سے جی جلایا تھا۔ اسما اسے گھور گھور کر تھک چکی تھی۔ جبکہ اسمارا کسی گہری سوچ سے ابھر کر باہر آئی اس کے چہرے پر دبا، دبا سا جوش سرخی کے مانند بکھر رہا تھا۔

''میں بھی اسما کو یہی کہہ رہی تھی مگر یہ مانتی نہیں...... میں اسے منوا کر چھوڑوں گی۔ دیکھ لینا...... ساری شرافت کا بھرکس نکل جائے گا۔'' اب کہ اسمارا کا انداز کچھ عجیب سا تھا۔ اسما نے غور نہیں کیا۔ وہ چائے لینے چلی گئی تو اسمارا بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اسما جب چائے بنا کر لائی تو گلناز، ہادی کی تصویر پکڑے کچھ عجیب تاثرات کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ اسما کو اس کا دوبارہ سے ہادی کی تصویر پکڑ کر دیکھنا بہت عجیب لگا تھا۔

''کیوں بھئی، دل نہیں بھرا کیا......؟'' اسما کا انداز طنزیہ تھا...... اس نے گلناز کے ہاتھ سے تصویر جھپٹ لی پھر اندر اپنے کمرے میں سنبھال کر رکھ آئی۔

''دیکھنے کی چیز تھی یار! دیکھنے دیتی ناں؟'' گلناز نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''دوسروں کی چیزوں پر نگاہ نہیں رکھتے......'' اسما کا نہ چاہتے ہوئے بھی لہجہ طنزیہ ہو گیا تھا...... وہ گلناز کے سابقہ کارناموں پر چوٹ کر رہی تھی جو اسمارا کے توسط سے اس تک پہنچے تھے۔

''اپنی ہے کوئی نہیں...... پھر دوسروں کی چیزوں سے دل بہلانے میں کیا حرج ہے۔'' گلناز کا انداز بلا کا شرارتی تھا۔ اسما کو بہت ہی برا لگا۔

''ہر چیز اپنے وقت پر ملتی ہے...... دوسروں سے چھین کر اپنے دل کو سکون مہیا نہیں کرتے۔'' وہ اب بھی اسے چوٹ پر چوٹ لگا رہی تھی۔ اس کے پچھلے تمام ریکارڈ شدہ کارناموں پر جو اسمارا کی زبانی ہی سننی آئی تھی۔

''چھین لینے کا بھی اپنا ہی مزہ ہے...... ایسے کوئی پلیٹ میں رکھ کر تو نہیں دیتا...... جان جوکھم میں ڈال کر اپنے حصے کی خوشیاں حاصل کرنا پڑتی ہیں......'' گلناز کا انداز سراسر سنجیدگی سے خالی تھا۔

''دوسروں کے چراغ گل کر کے اپنے گھر کو روشن کرنا انسانیت کے زمرے میں آتا ہے؟'' اسما نے کھل کر اسے سنایا تو وہ گہری سانس کھینچ کر رہ گئی۔

''آج کل سب لوگ یہی کر رہے ہیں...... بائی داوے، تم حفظِ ماتقدم کے طور پر تو مجھے نہیں سنا رہیں اگر ایسی بات ہے تو جتنے بند باندھنا ہیں باندھ لو...... میں تمہارا ''ہیرو'' اڑا لوں گی۔'' گلناز نے اس کے سر پر گویا دھماکا کیا تھا۔

اسما کی زندگی خود اس کی نظر میں ایک تماشا بن کر رہ گئی تھی کہاں پر اور کس سے غلطی ہوئی جو وہ ان حالات کا شکار ہو رہی تھی...... کیا گلناز نے اسے واقعی دھوکا دیا تھا یا پھر...... آگے کیا ہوا جاننے کے لیے پڑھیے مئی کی نئی قسط

''توبہ ہے بھئی، دنیا میں اخلاق نام کی تو کوئی چیز باقی رہ ہی نہیں گئی...... اتنے کنجوس لوگ ہیں کہ حد نہیں...... توبہ......!'' کرن توبہ تلا کرتی کچن سے برآمد ہوئی اور گرما گرم پراٹھا شوہر کے آگے میز پر رکھ کر واپس بھی پلٹ گئی۔ اس کے شوہر حارث نے چونکنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے آواز لگائی۔

''کیا؟! اپنے شوہر کو کنجوس کہہ رہی ہو تم...... وہ بھی دن دیہاڑے... ارے میں نے کب کنجوسی کا مظاہرہ کیا بیگم صاحبہ!''

''اوفوہ! بھئی آپ کو تھوڑی کہا کنجوس...... دنیا بھری پڑی ہے ایسے لوگوں سے۔'' کرن چائے کے کپ میز پر رکھتے ہوئے خود بھی دھپ سے کرسی پر براجمان ہوئی تھی۔

''ہوا کیا... یہ تو بتادو اب؟'' حارث نے تھوڑا سیریس ہوتے ہوئے دریافت کرنا چاہا۔

''یہ ساتھ والوں کو ہی دیکھ لیں...... برابر میں گھر

اگر ایسا ہو جائے

ہالہ احمد



ہے...... ایک ماہ ہوتے کو آیا ہمیں یہاں شفٹ ہوئے مگر مجال ہے جو ایک بار بھی ملنے کی کوشش کی ہو...... انسان ہمسائیگی کے حقوق ہی نبھالیتا ہے کچھ...... مگر لگتا ہے انہیں یہ بھی گوارا نہیں۔'' کرن کے دل کے پھپولے خوب ہی پھوٹ رہے تھے۔

''اچھا...... آ...آ تو یہ بات ہے جناب۔''
حارث ذرا مسکرایا۔

''ہاں تو اور کیا...... بچوں کی آوازیں ہی آتی ہیں اکثر...... ابھی کل شام ہی انعم اور احمد مجھ سے ضد کررہے تھے کہ ماما ہم ساتھ والوں کے گھر چلے جائیں وہاں بچے کھیل رہے ہیں، ہم بھی ان کے ساتھ کھیلیں گے۔ میں نے سختی سے منع کردیا کہ کوئی ضرورت نہیں وہاں جانے کی۔ ہاں تو بھئی جب وہ لوگ ملنا پسند نہیں کرتے تو میں کیوں جانے دیتی اپنے بچوں؟''

''اچھا لیکن اب تو اتنا غصہ مت کرو یار...... جانے بھی دو...... نہیں ملتے تو نہ ملیں، تمہیں اتنا غصہ کرنے کی کیا ضرورت ہے آخر؟'' حارث نے بیوی کو ٹھنڈا کرنا چاہا۔

''ہاں مجھے کیا مگر مجھے صرف یہ برا لگا کہ یہاں آنے کے تین چار دن کے بعد میں نے بریانی بنائی تھی۔ ڈش بھر کر لوازمات سے سجا کر میں نے کام والی کے ہاتھ ان لوگوں کے گھر بھجوائی۔ حالانکہ فرض تو اُن لوگوں کا بنتا تھا کہ آکر ہمیں پوچھتے...... مگر میرا مقصد صرف یہ تھا کہ چلو ہمسائے ہیں، بنا کر ہی رکھنی چاہیے ناں...... اگر وہ اب تک نہیں ملنے آئے تو میں پہل کرلیتی ہوں، اب آج کے دن تک حساب لگالیں آپ...... ایک ماہ تو ہو ہی گیا ناں مگر ان لوگوں نے بھاپ تک نہیں نکالی منہ سے...... کوئی شکریہ نہیں کوئی سلام دعا نہیں اب خود بتائیں آپ یہ بداخلاقی اور کنجوسی کی انتہا ہے کہ نہیں؟'' کرن نے ساری کہانی بیان کرکے تائید طلب نگاہوں سے شوہر کی طرف دیکھا۔

''ہاں ہے تو...... مگر میں یہ کہہ رہا ہوں کہ چھوڑو اگر وہ نہیں ملنا چاہتے تو تم پریشان کیوں ہوتی ہو...... تمہیں کون سا فرصت ملتی ہے گھر اور بچوں کے بکھیڑوں سے۔''

''ہاں یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ...... اچھا آپ چائے پی لیں میں ذرا بچوں کو دیکھ لوں تیار ہوئے کہ نہیں...... کل بھی لیٹ ہوگئے تھے اسکول سے۔'' کرن نے بھی رام کہانی سمیٹی اور بچوں کے کمرے کی طرف بڑھی تو حارث نے بھی سکون کی سانس لی۔

حارث اور بچے ایک ساتھ ہی گھر سے نکلتے تھے۔ پہلے بچوں کو اُن کے اسکول ڈراپ کرکے پھر حارث خود اپنے آفس کی طرف روانہ ہوجاتا تھا۔ سو صبح کے ٹائم اچھی خاصی افراتفری مچی ہوتی تھی۔ تینوں کے گھر سے جانے کے بعد کرن سکون سے ٹی وی کے آگے جم کر اپنا ناشتا ختم کرتی تھی۔ آج بھی حارث، بچوں کو لے کر گھر سے نکلا تو کرن اپنا چائے کا کپ لے کر ٹی وی آن کرتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ذہن مگر صبح والی بات میں اٹکا ہوا تھا۔ جانے کیوں کرن کا غصہ کم ہی نہیں ہورہا تھا۔ وہ نئے سرے سے انہی لوگوں کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح ان لوگوں کو ان کی بے مروتی کا تھوڑا بہت احساس دلا سکے مگر اس کام کے لیے تو ان لوگوں سے آمنا سامنا ضروری تھا۔ ملے بنا کوئی بات کیسے کہی جاسکتی تھی بھلا؟ اب ان لوگوں کے خود سے آنے یا ملنے میں پہل کرنے کا تو کوئی مکان دور، دور تک نہیں تھا۔

''کیوں نہ میں خود ایک چکر لگا آؤں ان کی طرف...... باتوں، باتوں میں شرمندہ کرکے رکھ دوں گی...... تھوڑا احساس تو ہوا نہیں بھی۔'' یہ خیال جیسے ہی اس کے ذہن میں آیا وہ اس پر عمل کرنے کو بھی تیار ہوگئی۔ جلدی، جلدی چائے کا کپ خالی کرکے میز پر رکھا ٹی وی آف کیا اور اپنے کمرے میں آگئی۔ چہرہ تو صبح دھو ہی چکی تھی۔ بس ہلکی سی لپ اسٹک ہونٹوں پر پھیری بال پونی کی شکل میں قید کیے اور چادر اوڑھ کر اپنا پرس ہاتھوں میں دبایا اور کمرے سے باہر آگئی۔ گیٹ کی چابیاں پرس میں ڈالتے ہوئے وہ بہت پُر جوش ہورہی تھی۔ ایسی

تجربہ

پاکستانی محکمے نوکری کے لیے اتنا تجربہ مانگتے ہیں کہ اگر انہیں خلاباز astronaut بھرتی کرنا ہو تو ایسا بندہ رکھیں گے جو کم از کم دوبار چاند پر جا چکا ہو نیز مریخ پر بھی ایک سال تو ضرور گزارا ہو۔

خوب صورت زندگی

خوب صورت زندگی خود بخود نہیں خوب صورت بن جاتی بلکہ اس کی تعمیر روزانہ کے نیک اعمال اور پُرخلوص دعاؤں پر ہوتی ہے۔

اولڈ از گولڈ

پوتا: ''دادا جان آپ اپنے زمانے میں ٹیکنالوجی، اسمارٹ فون، انٹرنیٹ اور الیکٹرانک اشیا کے بغیر کیسے جیتے تھے؟''

دادا جان: ''بیٹا جیسے آج تم لوگ محبت، سچائی، وفا، خلوص اور انسانیت کے بغیر جیتے ہو اسی طرح ہم ان سب جدید ٹیکنالوجی کے بغیر زیادہ اچھا جیتے تھے۔''

از: صدف آصف، کراچی

بھاگ دوڑ میں بھی وہ اپنے ذہن میں مختلف جملے ترتیب دے رہی تھی۔ یہ بھی کہنا ہے، وہ بھی بولنا ہے۔ وغیرہ وغیرہ...... خیر اپنا گیٹ لاک کر کے اس نے ساتھ والوں کے گیٹ کی بیل بجائی۔ اندر سے کوئی آواز نہ آئی تو اس نے دوبارہ بیل دی۔ تین چار مرتبہ بیل دینے پر کسی کے کھانسنے کی آواز اس نے سنی۔

''شکر...... کسی نے زحمت تو کی گیٹ تک آنے کی...... بدتہذیب لوگ۔'' کرن نے بہ مشکل اپنا غصہ دبایا۔ اتنے میں گیٹ کھل گیا تھا۔ سامنے ایک ادھیڑ عمر بزرگ لاٹھی کا سہارا لیے کھڑے تھے۔ نظر شاید بہت زیادہ گر چکی تھی۔ وہ اپنی چنی منی آنکھوں کو پٹپٹاتے ہوئے کرن کو پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ کرن نے کھنکھارتے ہوئے سلام کیا اور بتایا کہ ساتھ والے گھر سے آئی ہوں۔ اب بزرگوار کے چہرے پر اطمینان نظر آیا انہوں نے کرن کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ اندر داخل ہوئی تو انہوں نے بڑی مشکل سے گیٹ بند کیا اور لاٹھی ٹیکتے ہوئے آہستہ، آہستہ اندر کی جانب بڑھے۔ کرن اُن کے پیچھے تھی۔ جب وہ ان کی ہمراہی میں اندر کمرے میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ ایک تخت پر تکیوں کا سہارا لیے ویسی ہی ایک ادھیڑ عمر بزرگ عورت لیٹی تھیں۔ کرن کو دیکھ کر انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر کمزوری کے باعث اٹھ نہ سکیں۔ کرن نے انہیں لیٹے رہنے کو کہا اور ان کے پاس ہی تخت پر بیٹھ گئی۔ ان بزرگ نے کپکپاتی ہوئی نحیف آواز میں خاتون کو بتایا کہ یہ لڑکی ساتھ والے گھر سے آئی ہے...... اب کرن نے بھی زبان کھولی۔

''خالہ جان! میں تو کتنے دن سے آنا چاہ رہی تھی مگر بچوں کی مصروفیت نے نکلنے ہی نہیں دیا۔ پھر آپ کی طرف سے بھی کوئی نہیں آیا تو میں سوچ رہی تھی کہ شاید آپ......'' کرن کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا بات کرے اب... بزرگ عورت شفیق انداز میں مسکرائیں اور اپنے شوہر ہی کی طرح کمزور سی آواز میں گویا ہوئیں۔

''ہاں بیٹی! اتنا تو پتا چل گیا تھا کہ برابر میں کوئی نئی فیملی آئی ہے مگر اب حال تمہارے سامنے ہے...... شوگر کے مرض نے بالکل ہی ختم کر کے رکھ دیا ہے مجھے...... روز بروز کمزوری بڑھتی جارہی ہے۔ بہت ہمت کر کے اٹھوں بھی تو آنکھوں کے آگے ایسا اندھیرا آتا ہے کہ گھبرا کر وہیں واپس بیٹھ جاتی ہوں...... اِدھر تمہارے خالو بھی جوڑوں کے مریض ہیں۔ شدید تکلیف، چلنا پھرنا محال...... پھر نظر بھی اتنی کمزور کہ دروازے تک جائیں تو میرا دل ہول، ہول جاتا ہے کہ کہیں گر گرا نہ جائیں خدانخواستہ مجھ میں تو خود اٹھنے کی ہمت نہیں، انہیں کیسے سنبھالوں گی۔'' کرن کی زبان پر تالے پڑ گئے تھے۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں کے مصداق وہ دل ہی دل میں سخت شرمندہ ہو رہی تھی۔

''اور خالہ جان آپ کے بچے؟''
''بس ایک بیٹی ہے ہماری...... رہتی تو دو چار گلیاں چھوڑ کر ہے مگر شوہر ذرا سخت مزاج ہے روز، روز یہاں آنے کی اجازت نہیں دیتا...... پھر بھی بیچاری تیسرے، چوتھے دن لڑ جھگڑ کر آ ہی جاتی ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے اپنے بچوں کو لے کر...... دو گھڑی رونق ہو جاتی ہے یہاں بھی...... ورنہ تو میں اپنی تکلیف سے اور تمہارے خالو اپنی تکلیف سے لڑتے ہی رہتے ہیں بس۔'' ان کے چہرے پر دکھ کے تاثرات واضح ہونے لگے تھے۔ شرمندگی اور ہمدردی کے ملے جلے جذبات کے باعث کرن کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔
''تو خالہ جان کھانے پکانے کا کیسے مینج کرتی ہیں آپ؟''
''ارے بیٹی اب اس عمر اور ان تکلیفوں کے ساتھ تو بس مجبور ہو کر رہ گئی ہوں...... بیٹی جب تیسرے چوتھے دن آتی ہے تو دو تین سالن بنا کر رکھ جاتی ہے۔ اس دن تازہ روٹی بھی نصیب ہو جاتی ہے ورنہ تو میں بڑی ہی مشکل سے صبح کے وقت چار روٹیاں ڈال کر رومال میں لپیٹ دیتی ہوں ایک، ایک روٹی دوپہر میں اور ایک، ایک رات میں چل جاتی ہے۔ صبح ناشتے میں تو بس جو مل جائے جیسا مل جائے پیٹ میں ڈال لیتے ہیں۔ بس بیٹی اللہ کے کام ہیں جتنی زندگی دے رہا ہے خوشی سے راضی ہیں ہم...... ورنہ تو کچھ باقی نہیں اب زندگی میں سوائے ان تکلیفوں کے۔''
کرن جو ان کی باتوں میں غرق تھی اسے پتا بھی نہ چل سکا کہ بابا جی بے حد مشکل سے چلتے ہوئے اس کے پاس آئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک جوس کا ڈبا تھا۔ کانپتے ہاتھوں سے انہوں نے وہ کرن کو پیش کیا اور آہستہ، آہستہ بتانے لگے کہ دکان ہے تو قریب مگر آہستہ چلنے کی وجہ سے اتنا ٹائم لگ گیا۔ وہ اس بات پر نادم تھے کہ کرن کب سے آئی بیٹھی ہے اور انہیں جوس لانے میں اتنی دیر ہو گئی...... کرن کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے...... اس نے بے اختیار کھڑے ہو کر اُن کے کانپتے ہوئے ہاتھ تھام لیے...... اور گلوگیر لہجے میں بولی۔
''مجھے پتا نہیں چل سکا خالو جان کب آپ گھر سے باہر نکلے...... ورنہ میں آپ کو بالکل نہ جانے دیتی۔ آپ جیسے پیارے بزرگوں کی خدمت کرنا، ان کا خیال رکھنا تو ہمارا فرض ہے کہ آپ ہماری خاطر تواضع کے لیے پریشان ہوں اور اس قدر تکلیف اٹھائیں۔''
''ارے نہیں میری بچی! پریشانی کیسی؟ میں نے کون سی دیگیں چڑھا دی ہیں تمہارے لیے؟ ہیں، آؤ یہاں بیٹھو میرے پاس۔'' خالہ جان نے کرن کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے پاس بٹھالیا۔ ''ہم دونوں تو بہت شرمندہ تھے بیٹی تم نے ایسی لذیذ بریانی بنا کر اتنے سلیقے سے بھجوائی اور ہم شکریہ کے کلمات بھی تم تک نہیں پہنچا سکے۔ ہاں ویسے ایک بات ہے...... بریانی اتنی اچھی بنائی تھی تم نے کہ اس دن میں بھی تمہارے خالو کی نظر بچا کر بدپرہیزی کر بیٹھی تھی۔ حالانکہ چاول سختی سے منع ہیں مجھے مگر میں رہ نہیں سکی...... تمہارے خالو سے یہی کہا کہ بس دو چمچے ہی منہ میں ڈالے ہیں میں نے اور سچ یہ ہے کہ ان سے زیادہ بریانی میں نے ہی کھائی تھی۔'' اتنا شفیق انداز، اتنی اپنائیت، کرن پانی، پانی تو ہو ہی چکی تھی۔ مگر اتنی سی دیر میں اس نے ایک عزم بھی کر لیا تھا۔ وہ خالہ جان کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔
''خالہ جان! آپ نے مجھے بیٹی کہا ہے، بیٹیوں کی بات ٹالی نہیں جاتی...... کچھ کہوں تو مان لیں گی آپ؟ خالو جان دیکھیے آپ انکار نہیں کریں گے پلیز......'' وہ دونوں بزرگ کچھ گھبرا سے گئے پتا نہیں کرن کیا کہنا چاہ رہی تھی۔
''اچھا بیٹی تم بولو تو سہی پھر دیکھتے ہیں۔'' دونوں سوالیہ نظروں سے کرن کی طرف دیکھ رہے تھے۔
''آپ کی وہ بیٹی تو اپنے سخت مزاج شوہر کی وجہ سے مجبور ہے... وہ روزانہ آپ کے پاس نہیں آسکتی، آپ کے کھانے پینے کا خیال نہیں رکھ سکتی...... مگر آپ کی یہ بیٹی بالکل مجبور نہیں ہے...... اور آپ کی اس بیٹی کا

شوہر بھی بہت اچھے مزاج کا ہے اور وہ بھی یہ سن کر بہت خوش ہوگا جو میں کہنے جارہی ہوں۔'' دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر بابا جی بولے۔

''تم کیا کہنا چاہتی ہو بیٹی کھل کر کہو......''

''تو پھر کھل کر کہنے والی بات یہ ہے کہ آج سے آپ کے کھانے پینے کا خیال رکھنے کی ذمّے داری میری ہے اور ایک بیٹی ہونے کے ناتے یہ ذمّے داری مجھ سے بہتر کوئی نہیں نبھا سکتا۔'' کرن نے اعلان کے سے انداز میں کہا تو دونوں بزرگ ٹپٹا سے گئے۔

''نہیں، نہیں بیٹی......نہیں یہ......''

''کوئی انکار نہیں چلے گا بس...... بالکل نہیں بولیں گے آپ دونوں اس معاملے میں......ورنہ آپ کی یہ بیٹی ناراض ہو جائے گی آپ سے۔'' کرن نے بڑے لاڈ سے کہا۔ دونوں کی آنکھیں جھلملا اٹھیں۔

''نہ بیٹی ناراض نہ ہو ہم سے۔''

''تو بس پھر طے ہوگیا، بھول جائیں آپ دونوں کھانے پکانے کی فکر کو......میری مرضی جو بھی میں پکاؤں اور کھلاؤں آپ کو......ٹھیک ہے ناں......'' کرن نے خوشی سے کہا تو دونوں مسکرا اٹھے۔

رات کو حارث اور بچے بھوک، بھوک کا شور مچارہے تھے۔ کرن کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ میز تقریباً تیار تھی۔

''ماما......روٹی!'' بچے آواز لگا رہے تھے...... کچن سے نکلتی کرن کے ہاتھوں میں روٹی کی جگہ ٹفن بکس دیکھ کر حارث اور بچے حیران رہ گئے۔ وہ ٹفن بکس حارث کو تھماتے ہوئے عجلت میں بولی۔

''جلدی سے یہ کھانا ساتھ والوں کے ہاں دے آئیں پلیز......میں اتنے میں تازہ روٹی بنا رہی ہوں۔ پھر ہم سب مل کر کھانا کھائیں گے۔''

''لیکن اس میں......'' کرن نے حارث کو بات مکمل نہیں کرنے دی۔

''ارے جلدی سے دے آئیں ناں، بچوں کو بھی بھوک لگی ہے......جائیں جلدی سے۔'' اس نے حارث کو تقریباً دھکیل ہی دیا تھا۔ دو منٹ میں حارث کھانا پہنچا کر واپس بھی آگیا تھا۔ سب نے مل کر کھانا کھایا، کھانے سے فراغت کے بعد بچے ٹی وی کے آگے بیٹھ گئے اور کرن برتن اور کچن سمیٹ کر حارث کے پاس آبیٹھی جو بچوں کا ساتھ دینے کی خاطر اُن کے ساتھ ان کا پسندیدہ پروگرام دیکھ رہا تھا۔ کرن کو آتا دیکھ کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوگیا اور بے صبری سے بولا۔

''بس اب جلدی سے بتادو کہ معاملہ کیا ہے، صبح تو تم بہت غصے میں تھیں...... پھر ایسا کیا ہوا ہے؟''

کرن نے جھٹ پٹ ساری روداد حارث کو سنادی۔

''حارث! ہم لوگ کبھی، کبھی بلاوجہ ہی کسی سے اتنے بدگمان ہو جاتے ہیں، یہ تک نہیں سوچتے کہ کوئی کتنا مجبور و بے بس ہوسکتا ہے۔ اور اگر کوئی کام ہماری منشا کے مطابق نہیں ہو رہا تو اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ بھی ہوسکتی ہے۔ خود سے فرض کر کے کسی کے لیے اتنا...... بدگمان ہو جانا بعض اوقات ہمیں بہت شرمندہ کر دیتا ہے اور اس شرمندگی کی تلافی کرنے کا موقع بھی تو اللہ تعالیٰ ہمیں دے دیتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ناں کہ ہمیں یہ موقع ملے ہی نہیں...... پھر ساری عمر کے لیے پچھتاوا ہمارا نصیب بن سکتا ہے اور پچھتاوؤں کے ساتھ زندہ رہنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ حارث! میں بہت خوش نصیب ہوں کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے یہ موقع دے دیا ہے۔ میں نے جتنا بھی ان لوگوں کے لیے برا سوچا ان کے لیے جو بھی غلط الفاظ منہ سے نکالے ان سب کے لیے میں نے اللہ تعالیٰ سے معافی تو مانگ ہی لی تھی اور اس نے مجھے معاف بھی کر دیا ہے تب ہی تو مجھے یہ موقع عطا کیا ہے کہ میں اپنی شرمندگی کا ازالہ ان بزرگوں کی یوں خدمت کر کے کرسکوں۔ میں بہت خوش ہوں حارث......میرے دل میں اطمینان اور سکون ہوگیا ہے اب اور میں آئندہ بھی بغیر وجہ جانے کسی کے لیے ایسے بدگمان بالکل نہیں ہوں گی۔'' اس کی باتیں سن کر حارث دلی طمانیت کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔



مکمل ناول

پکھیرو

میمونہ صدف

پیلی کوٹھی جس کی دیواروں سے آکاس بیلیں لپٹی پڑی تھیں۔ خون آشام ڈائن کے مانند...... در و دیوار سے بوسیدگی ٹپکتی اور پوری کوٹھی ہی مجسمۂ عفریت دکھتی۔ جوں، جوں آفتاب ڈوبنے لگتا، کوٹھی شمشان گھاٹ سا روپ اوڑھ لیتی اور دلخراش چیخوں سے گرد و نواح میں مقیم رہائشیوں کے کان پھٹنے لگتے...... ایسی چیخیں کہ خوف اور جھرجھری لیتے انگلیاں چبانے لگتے اور کبھی کبھار تو گویا خود کی ہی چیخیں نکل جاتیں، ہر روز



اوقاتِ مغرب ایسا ہی ہوتا۔

''نہ جانے کون ہے؟ کیسی تکلیف میں مبتلا ہے۔'' کوئی گھر سے نکل، نکل کر تاک جھانک کرتا مگر گھٹا ٹوپ اندھیرا کوٹھی کی آماجگاہ بنا ہوتا...... بندہ نہ بندے کی ذات...... ایسے میں کون اتنی ہمت دکھاتا کہ جا کر اتا پتا لے۔

''کوئی تو پتا کرو کون ہے اندر...... مسئلہ کیا ہے؟'' محلے کے بڑے مشاورتی بوڑھے، کمیٹی کے مانند جمع ہوتے مگر بات مشوروں تک ہی محدود رہ جاتی۔

''کیا خبر کوئی قیدی ہی ہو۔'' کوئی قیاس آرائی کرتا۔

''مالیخولیا کا مریض ہی نہ ہو۔'' سب سر ہلانے لگتے۔

الغرض جتنے منہ اتنی باتیں...... مگر ہمت نہ پڑی کہ جا کر گیٹ بجائیں اور معلوم کر سکیں۔

اس کوٹھی کے پہلے مالک کرنل یوحنا تھے جنہوں نے بیس سال قبل بڑے ارمانوں سے یہ کوٹھی بنوائی تھی...... پھر اپنے امریکا شفٹ ہونے سے قبل کس کے ہاتھوں اس کوٹھی کو اونے پونے فروخت کیا کوئی نہیں جانتا تھا۔ سال بھر تو خالی پڑی منہ چڑاتی رہی...... پھر تقریباً پانچ ماہ قبل ایک نوجوان چند کباڑ سا فرنیچر لے آیا تھا...... پھر ہر ماہ ایک آدھ بار کسی بھی محلے دار کو اس کی صورت دکھ ہی جاتی...... ایک آدھ بار تو کسی بڑے میاں نے سوال بھی کر ڈالا جب نوجوان چند تھیلے تھامے گیٹ کا تالا کھول کر اندر داخل ہو رہا تھا۔

''ارے میاں کون ہو...... کیا کرتے کراتے ہو، کون، کون رہتا ہے اس گھر میں؟''

اور جواباً نوجوان نے ایسے گھورا کہ بڑے میاں تو چپ سادھے اپنی راہ ہو لیے۔

پھر ہر شام قبل از مغرب اردگرد کے رہائشی عجیب خوفناک سی چیخیں سننے لگے۔ پہلے پہل بر ہا کے مانند راگ چھڑتا پھر آواز پھٹتی، پھٹتی چیخوں کا روپ دھار لیتی۔

''اسے کہو آئے آ جائے ناں۔'' دورانِ چیخ و پکار ایک ہی جملے کی گردان سننے کو ملتی۔

''او بڑی تکلیف ہے ناں...... بڑی تکلیف ہے۔'' اور سننے والوں میں ہمت نہ ہوتی کہ اشوک کے اس درخت کے پیچھے چھپی اس عمارت تک جائیں اور پوچھیں کہ کیا تکلیف ہے؟ کسے تکلیف ہے اور کتنی تکلیف ہے؟

''کسی پر آسیب آتا ہے...... ایسی ہولناک چیخیں بھوتوں کے اترنے پر نکلتی ہیں۔'' منچلے خوف سے کپکپا اٹھتے۔

''لگتا ہے کوئی گناہوں کی سزا کاٹ رہا ہے۔''

اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کون تھا اور کس گناہ کا مرتکب ہوا تھا...... کیوں چلاتا تھا اور عین مغرب سے پہلے ہی کیوں چلاتا تھا۔ وہ کسے بلاتا تھا اور وہ کون تھا جو آنے کا نام نہیں لیتا تھا...... جس کی راہ پچھلے چار ماہ سے کوئی تک رہا تھا۔

☆☆☆

جلیل قیوم کے دو ہی بچے تھے...... بڑا بیٹا عدیم اور اس سے تین سالہ چھوٹی بیٹی ہدیٰ......

پیشے کے اعتبار سے جلیل قیوم کلرک تھے اور شام کے وقت بچے بچیوں کو قرآن پاک پڑھاتے تھے۔ حد درجے ایماندار، سو آمدنی محدود اور اخراجات کہیں گنا زیادہ...... یہ ستر کی دہائی تھی۔ سادہ غذائیں، سادہ لوگ...... جفاکش، محنتی اور تندرست...... کئی، کئی میل پیدل چلنے والے، خالص غذاؤں کے دلدادہ...... کئی، کئی جگہوں پر دل مار کر بچتیں کرنے والے لوگ...... صاف گو اور ایماندار۔

سو جلیل قیوم بھی ایسے ہی سادہ سے تھے۔ مکان کچا تھا مگر آسودہ...... کئی میل پیدل چلتے تاکہ صحت اچھی رہے اور جو پیسہ بچ جائے اسے بچوں کے اسکول آنے جانے کے لیے تانگے والے کو دے دیتے...... خود وہ کلرک تھے، آٹھویں پاس مگر بچوں کو خوب، خوب پڑھانا چاہتے تھے تاہم رقیہ بیگم بیٹی کو بہت پڑھانے کے حق میں نہیں تھیں۔

''لڑکی ذات کو کالج بھیجنے کے حق میں، میں بالکل نہیں ہوں...... بڑا کھلا ماحول ہوتا ہے۔ لڑکی

ہے ذرا بھی غلط قدم اٹھالیا ناں تو ساری تربیت پر پانی پھر جائے گا۔'' وہ دور کی کوڑی لاتیں۔

''مجھے اپنی بچی اور تمہاری تربیت پر پورا اعتماد ہے عدیم کی ماں۔'' رقیہ بیگم کے خدشات انہیں پرانے وقتوں کے دقیانوسی خیالات کے سوا کچھ نہ لگتے۔

''آخر لڑکیوں نے چولھا چوکا ہی سنبھالنا ہوتا ہے پھر ساری پڑھائی آگ میں جھونک دیتی ہیں۔ وہی پیسہ جو ہدیٰ کی پڑھائی پر لگانا ہے عدیم کے لیے بچالیں...... آخر کو بیٹے کو ڈاکٹر بنانا ہے۔'' وہ شوہر کو عقل سکھاتیں۔

''بیٹا بھی ڈاکٹر بنے گا اور بیٹی بھی پڑھے گی۔'' وہ حتمی فیصلہ سنا دیتے...... وہ تابعدار.. بیوی تھیں سو خاموش ہو جاتیں۔ مڑ کر جواب دینے کا رواج نہیں تھا۔

رقیہ بیگم خالصتاً ان ماؤں میں سے تھیں جو بیٹوں کی بے جا حمایت اور بیٹیوں کی بے جا مخالفت پر آمادہ نظر آتی ہیں...... جس جگہ ممکن ہوتا وہ بیٹی کا حق چھین کر بیٹے کو دے دیتیں اور بیٹی بھی ایسی صابر کہ آگے سے چوں بھی نہ کرتی۔ مہینے میں ایک آدھ بار آدھا کلو گوشت پکنا عیاشی سمجھا جاتا... اس میں بھی رقیہ بیگم آلو کے قتلے ڈال دیتیں...... کھانا پکاتے ہوئے پہلے، پہلے تازہ پھلکے باپ اور بھائی کو دے دیے جاتے۔ خوب بوٹیوں سے بھری لبالب پلیٹ ننھی ہدیٰ روٹیوں کی چنگیر سمیت ان کے سامنے دھرتی۔ آخر میں بچ جانے والے آلوؤں کے چند قتلوں سمیت چھیچھڑے والی بوٹی اس کے آگے دھر دیتیں...... وہ منہ بنائی نوالے نگلتی۔

ایک بار اس نے امی سے سوال کیا تھا کہ وہ ہمیشہ ابو اور بھائی کو ہی اچھا کھانا کیوں دیتی ہیں...... امی نے پہلے پہل اسے گھورا پھر دھیمے لہجے میں سمجھانے لگیں۔

''ابو اور بھائی مرد ہیں...... مردوں کو باہر نکلنا ہوتا ہے، کام کرنا ہوتا ہے، مضبوط بننا پڑتا ہے اس کے لیے انہیں بہتر خوراک چاہیے ہوتی ہے۔ تبھی میں انہیں کھانے کا بہترین حصہ دیتی ہوں۔''

اور وہ ننھی آنکھوں کو جھپکے بغیر ماں کو سنتی رہتی......

بس کبھی کبھار سوچتی کہ وہ بھی پڑھنے جاتی ہے۔ پھر گھر آکر آرام کیے بغیر ماں کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی ہے۔ اکثر وہ بھی تھک جاتی ہے پھر اس کا بھی دل کرتا ہے کہ وہ اچھا کھانا کھا کر طاقتور بن جائے۔

امی نے تو گھر میں بکری بھی بھائی کے لیے پال رکھی تھی کہ اسے دودھ بے حد پسند تھا اور اس پسند کے پیچھے وہ دن میں کلو دودھ پی جاتا اور جو بچ جاتا امی وہ ابو کو دے دیتیں۔

''میرا حصہ......'' وہ روز امی سے مطالبہ کرتی اور روز ہی امی اسے چمکارتیں۔

''آج بھائی نے زیادہ دودھ پی لیا ہے...... تم کل پی لینا۔'' اور وہ ننھا سا سر تائید اًہلا دیتی۔

''کل دودھ پیوں گی میں۔'' روز وہ خود کو باور کرواتی...... مگر امی کا وہ کل کبھی کبھار ہی آتا...... شاید مہینے میں ایک آدھ بار وہ بھی تب جب بھائی کا من نہ کر رہا ہوتا اور وہ دودھ چھوڑ دیتا تب امی بچ جانے والا دودھ اسے دے دیتیں۔ اسے ابو، امی کی نسبت زیادہ پسند تھے۔ وہ ہمیشہ اس کی ضرورتوں سے متعلق سوال کیا کرتے، چلتے پھرتے اسے مخاطب کرتے رہتے۔

''کھانا کھالیا میری بیٹی نے؟''

''کچھ چاہیے تو نہیں ہے، میں بازار سے لا دوں گا۔''

''اسکول اچھا جا رہا ہے؟ کسی شے کی ضرورت تو نہیں؟''

اور وہ سر کبھی ہاں تو کبھی نہ میں ہلا کر باپ کو تسلی دیتی رہتی کہ اسے ہر طرح کا سکون حاصل ہے۔ کسی شے کی کمی نہیں...... اس کی ماں نے اسے یہی سکھایا تھا۔

''اپنے ابو کے سامنے کبھی کسی شے کا ذکر نہ کیا کر بیٹا...... جو چاہیے مجھے بتا، میں منگوا دوں گی۔'' وہ تو امی کی بات کا مان رکھ لیتی مگر امی کبھی اس کی بتائی ضرورتوں کا مان نہ رکھتیں۔ ان پُر پیچ جہتوں کو سمجھنے سے وہ قاصر تھی۔ اس کا ذہن ابھی بہت ننھا تھا۔

☆☆☆

بھائی ہمیشہ اس کے کھلونے جمع کر کے کباڑی والے کو بیچ کے اس سے پیسے لے آتا تھا اور اسے لارے لگاتا رہتا۔

"جب میں ڈاکٹر بن جاؤں گا تو پھر دیکھنا تجھے سب لے دوں گا جو چاہیے ہوگا سب۔"

"جو بھی کہوں گی؟" وہ حیرت سے آنکھیں پٹپٹاتی۔

"ہاں جو بھی...... جس چیز پر ہاتھ رکھے گی وہ سب۔"

اور کنچے جیسی آنکھوں میں ننھے جگنوؤں جیسے خواب ٹمٹمانے لگتے...... وہ خوشی، خوشی ان خوابوں کے پیچھے دوڑنے لگتی اور اپنے ٹوٹے پھوٹے کھلونے بھائی کو تھمادیتی جو وہ کوڑیوں کے مول بیچ کر چند ٹکوں پر خوش ہو جاتا...... یا ان کھلونوں کے بدلے دوسرے کھلونے خرید لیتا یا ان کھلونوں کو دوسروں سے بدلوا لاتا۔

"ابو کو مت بتانا......" وہ بھی امی کی طرح اسے باپ کے سامنے زبان بندی کی تلقین کرتا اور وہ آمناً صدقنا کہہ دیتی۔

جب بھائی مڈل اسکول میں جانے لگا تو ابو نے اسے شہر کے بڑے اسکول بھیجنے کی ٹھان لی...... اگر وہ اسے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے تو اسے اس عام سے اسکول سے اٹھا کر بڑے اسکول بھیجنا ضروری تھا۔ محدود دنیا سے نکال کر وہ اسے پوری دنیا کے سامنے کے لیے کھڑا کرنا چاہتے تھے۔

"کیوں ابو...... میں اس اسکول میں خوش ہوں۔" وہ اتنی دور گاڑی لگوا کر بڑے اسکول جانے کے حق میں نہیں تھا۔

"تجھے بڑا ڈاکٹر بننا ہے...... سو بڑے اسکول تو جانا پڑے گا ناں۔" رات آسمان تلے چارپائی پر لیٹے ابو ساتھ والی چارپائی پر لیٹے عدیم کو سمجھانے لگے۔

"بڑے اسکول کے خرچے بھی بڑے ہوتے ہیں۔" ابو ہنس پڑے تھے...... اُن کا بیٹا کیسی سیانی باتیں کر رہا تھا۔

"تو تیرا باپ سب خرچے پورے کرے گا ناں...... تو کیوں فکرمند ہوتا ہے۔"

"ابو میں چھوٹے اسکول میں رہ کر بھی محنت کر سکتا ہوں، ڈاکٹر بن سکتا ہوں، مجھے اپنے دوستوں سے الگ نہیں ہونا۔" ابو اس کی بات سمجھ نہیں پا رہے تھے۔

"اسکول پڑھنے جاتے ہیں پتر، سنگی یاری کے لیے نہیں۔ حالات اور جگہیں تو بدلتی رہتی ہیں اور اس کے مطابق انسان کو خود کو ڈھالنا ہوتا ہے اور انسان کی اچھی عادت ہے کہ وہ ہر طرح کے ماحول میں ڈھل جاتا ہے۔" ابو نے دانستہ گفتگو میں وقفہ دیا تھا۔

"بیٹا میں زیادہ نہیں پڑھ سکا مگر میں تجھے خوب سارا پڑھانا چاہتا ہوں۔ میں معمولی سا کلرک بن گیا مگر میرا پتر بڑا ڈاکٹر بنے گا۔ سب آگے پیچھے اسے سلام کریں گے، عزت دیں گے، میری طرح تھوڑا ہی ناں...... میرا خواب میرا پتر پورا کرے گا ناں!"

اور عدیم کچھ...... کچھ سمجھ گیا تھا۔

ابو بضد تھے کہ وہ ہدیٰ کو بھی اس اسکول بھیجیں گے جہاں عدیم جائے گا مگر رقیہ بیگم نے بڑے طریقے سے سمجھایا تھا کہ ابھی وہ اس قابل نہیں ہیں کہ دونوں بچوں کو یک دم بڑے اسکول بھیج دیں۔ ایسی صورت میں اخراجات بہت بڑھ جاتے تھے۔ بہتر یہی تھا کہ ابھی ہدیٰ کو اسی اسکول میں رہنے دیا جاتا اور مڈل کے بعد ہی اس کا اسکول تبدیل کیا جاتا۔ جیسے عدیم کا مڈل کے بعد تبدیل کیا گیا تھا۔

جلیل قیوم نے بیوی کے مشورے پر پہروں سوچا تھا اور پھر انہیں بیوی کی بات میں دم لگا...... سو انہوں نے خود سے ہدیٰ کو بٹھا کر سمجھایا تھا۔

"بھائی بڑی جماعت میں آگیا ہے ناں...... بڑا ہو گیا ہے سو اب اس کا اسکول تبدیل ہو جائے گا پھر جب ہدیٰ بڑی ہو جائے گی تو وہ بھی بڑے اسکول جائے گی۔"

"بھائی کے اسکول؟" وہ پُرجوشی سے پوچھنے لگی۔

"ہاں، بھائی کے اسکول۔" ان کے پیار بھرے لہجے کی لوچ ہی ہدیٰ کو پگھلانے کے لیے کافی تھی۔

پھر چند ماہ بعد بھائی بڑی گاڑی میں ڈھیر سارے بچوں کے ساتھ بڑے اسکول جانے لگا اور وہ تانگے پر بیٹھ کر چھوٹے اسکول...... وہ انہی جگنوؤں کو مٹھی میں دبائے خوش تھی جو اسے تھمائے گئے تھے۔

''تم کیوں بھائی والے اسکول نہیں جاتیں؟'' برابر والی ثریا اس سے پوچھ بیٹھی۔

''بھائی بڑا ہوگیا ہے ناں، میں ابھی چھوٹی ہوں۔ جب میں بڑی ہوجاؤں گی تو میں بھی بڑے اسکول جاؤں گی۔'' معصوم سی ہدیٰ کے معصومانہ دلائل......

ثریا خوب ہنسنے لگی......اس کا تمسخرانہ لہجہ ہدیٰ کو سخت چبھا۔

''اگر تو نے جانا ہوتا ناں ہدیٰ تو ابھی سے بھائی کے ساتھ جاتی۔ وہ بڑے اسکول چلا گیا اب بڑا آدمی بھی بن جائے گا اور تو، تو چھوٹے اسکول میں پڑھنے والی چھوٹی رہ جائے گی۔''

ہدیٰ کے دل میں انی کے مانند کچھ کھب گیا تھا۔

وہ اب امی سے روز پوچھنے لگی تھی کہ وہ کب بڑے اسکول جائے گی......اور امی روز ٹال دیتیں۔

''بہت جلد......جب تو بھی بھائی جتنی ہو جائے گی۔''

مگر ہدیٰ کو تسلی نہ ہوتی۔ یہ گوشت اور دودھ کی کبھی کبھار والی عیاشی جیسا نہ تھا۔ یہ روز گوشت کھانے اور روز دودھ پینے جیسا تھا اور ایسی عیاشی تو محض بھائی کرسکتا تھا، وہ نہیں......سو اسے خود بخود سمجھ آگیا تھا اور بہت جلد سمجھ آگیا تھا کہ وہ کبھی بڑے اسکول نہیں جا پائے گی۔

ہدیٰ نے سیکھ لیا تھا کہ اسے اسی چھوٹے اسکول میں رہ کر محنت کرنا تھی اور چھوٹے اسکول سے ہی بڑا آدمی بننا تھا......یہ زیادہ اعزاز کی بات ہوتی ہے سو وہ دن رات پڑھنے لگی، محنت کرنے لگی۔

اگلے امتحانوں میں وہ جماعت میں اول آئی تھی جبکہ عدیم بہت سی محنت کر کے بھی سوئم آیا تھا۔ اس کا دل برا ہوگیا تھا جبکہ ہدیٰ بے حد خوش تھی۔ وہ جیسے جی اٹھی تھی۔

''کہا بھی تھا ابو سے مجھے بڑے اسکول مت بھیجیں۔'' وہ رونے لگا۔ امی اسے ڈھارس دینے لگیں۔

''نہ میرا پتر! دیکھ تو بڑے اسکول میں پڑھتا ہے، وہاں کا ہر بچہ لائق ہے، تو ان بچوں میں سوئم آیا تو یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ ہدیٰ تو چھوٹے اسکول میں پڑھتی ہے کیا تو نہیں جانتا کہ وہاں رہ کر تیرا کوئی...مدمقابل ہی نہیں تھا۔ ہدیٰ کتنی کند ذہن ہے۔ جب وہ اول آگئی تو، تو سوچ باقی کتنے نکمے بچے ہوں گے۔''

امی کی بات سن کر عدیم کے آنسو تھم گئے اور چند خاکستری آنسو ہدیٰ کی آنکھ سے کہیں زیادہ دل سے بہے تھے۔

''میں کند ذہن ہوں۔'' وہ رات بھر لحاف میں چھپ کر روتی رہی تھی۔ بجائے اسے اول آنے پر شاباش ملتی۔ امی نے اس پر کند ذہن ہونے کا ٹھپا لگا دیا تھا۔

''امی ہمیشہ بھائی کی طرفداری کیوں کرتی ہیں...... ہر چیز بھائی کے لیے ہے اور میرے لیے؟ مجھے دینے کے لیے امی کے پاس ایک شاباش تک نہیں ہے۔ وہ میری کامیابی کو اتنا حقیر سمجھتی ہیں۔'' وہ رات بھر اسی غم میں گھلتی رہی۔

''میں کند ذہن نہیں ہوں امی جی...... بھلے مجھے بڑے اسکول نہ بھیجیں مگر مجھے کند ذہن تو مت بولیں۔ میں نے بڑی محنت سے اول پوزیشن حاصل کی ہے۔ میں کند ذہن نہیں ہوں۔ مجھے ذہین مت کہیں مگر مجھے کند ذہن بھی مت کہیں۔'' وہ رات بھر اپنی ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتی رہی تھی۔ روتی رہی تھی، خود سے بولتی رہی تھی۔

اس دن کے بعد سے وہ غیر مشروط محنت کرنے لگی......اسے اب خود کے لیے پڑھنا تھا۔ خوب سارا پڑھنا تھا۔

ابو اس کی محنت کو عزت کی نظر سے دیکھتے۔

''شاباش میری بچی......! بہت جان مارتی ہے۔''

ابو جی ٹھیک کہتے تھے......اس نے جان ماردی تھی۔

مڈل کے امتحانات میں شاندار کامیابی کے ساتھ اسے وظیفہ ملا تھا۔ ماہانہ تیس روپے...... اور تیس روپے اس کے لیے بہت بڑا خزانہ تھا۔ جس روز اسے اسکول میں پہلا وظیفہ ملا تھا، وہ پورا دن سارا راستہ اس نے خواب دیکھے، ان گنت خواب...... وہ یہ، یہ کرے گی، یہ وہ خریدے گی، جمع کرے گی، خرچ کرے گی۔

اور اس شام ہی اس کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے تھے جب امی نے اسے بلا کر یہ کہا تھا کہ وہ اپنا وظیفہ اپنے بھائی کو دے دے...... اس کا بھائی منہ بسورے ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ اسے بہن کا وظیفہ چاہیے تھا کیونکہ اپنا آٹھویں کا وظیفہ تو وہ کب کا خرچ کر چکا تھا اور دسویں جماعت کے وظیفے سے اس نے سائیکل خرید لی تھی۔

امی کی بات اس کے لیے ناقابلِ یقین تھی۔ اس کی خالص اپنی محنت کا ثمر کھائے کوئی اور...... وہ بت بنی امی کو دیکھتی رہ گئی جیسے روئے زمین پر اس کے سوا کوئی کام ہی نہ ہو۔

''تم تو میری پیاری بیٹی ہو ناں...... ماں کی بات نہیں مانو گی کیا؟ وظیفہ بھائی کو دے دو۔ اگلے ماہ نیا جوڑا بنوا دوں گی۔''

وہ جانتی بھی اور خوب جانتی تھی کہ وہ بیٹی تو ہے مگر پیاری نہیں...... اسے امی کی بات ماننا ہی تھی۔ اس نے یہی سیکھا تھا، یہی کیا تھا، اب بھی کرنا تھا اور آگے بھی کرنا تھا۔ وہ تو ہمیشہ کی طرح امی کی مان ہی جاتی تھی مگر امی کیا گیا وعدہ ہمیشہ بھلا دیتی تھیں۔ اس نے اندر سے لفافے میں ملفوف پیسے لا کر چار پائی پر پھینک دیے۔

''یہ لیں امی...... اپنے بیٹے کو دے دیں۔ اسے ہی مبارک ہوں یہ پیسے کیونکہ اب یہ میرے لیے مبارک ثابت نہیں ہو سکتے۔ جن پیسوں پر میری ماں کی نظر ہو، وہ روپیہ مجھے کیسے ہضم ہو سکتا ہے۔''

امی اس کی اس زبان درازی پر گنگ رہ گئی تھیں...... یہ پہلا موقع تھا کہ وہ ماں کے آگے اس انداز سے بولی تھی۔

''ہدیٰ یہ کون سا طریقہ ہے اپنی ماں سے بات کرنے کا۔'' انہوں نے گھرکا۔

''میں بھائی کی ماں سے بات کر رہی ہوں، مائیں بیٹوں کی ہی ہوتی ہیں امی، بیٹے ان کا مان ہوتے ہیں، بیٹیاں کچھ نہیں ہوتیں، اسی لیے بیٹیوں کا کوئی نہیں ہوتا، اس معاملے میں مائیں کتنی کائیاں ہوتی ہیں ناں...... خود کا مستقبل۔ بیٹوں کی صورت مضبوط کرنے کی حکمت عملی اپنائے رفتہ، رفتہ آگے بڑھتی ہیں...... وہ بیٹیوں کی طرف کبھی نہیں دیکھتیں کیونکہ انہیں ساتھ نہیں رہنا ہوتا۔''

وہ میٹرک کی بچی کیا کہہ رہی تھی اور کیسے کہہ رہی تھی...... امی گنگ بیٹھی کچھ بول ہی نہیں سکی تھیں۔ وہ ایسا سوچتی تھی انہیں معلوم نہیں تھا اور اسے بھی آج معلوم پڑ گیا تھا کہ یہ جو ابو، امی کو خاص طور سے ''عدیم کی ماں'' کہہ کر بلاتے ہیں۔ یہ کیوں بلاتے ہیں، وہ حقیقتاً عدیم ہی کی ماں تھیں۔

☆☆☆

بھائی کا ایڈمیشن لاہور کے بڑے میڈیکل کالج کنگ ایڈورڈ میں ہو گیا تھا اور وہ امی، ابو کا سر فخر سے بلند کر گیا تھا۔ امی سب کے سامنے اٹھتے بیٹھتے تذکرہ کرنا نہ بھولتیں کہ وہ مستقبل کے ڈاکٹر کی ماں ہیں اور ابو بھی پھولے نہ سماتے...... بھائی لاہور چلا گیا تھا۔ ہاسٹل میں رہنے لگا تھا۔ اس کے ڈھیروں خرچے تھے جو ابو اس محدود آمدن میں پورا کرتے۔ امی کمیٹیاں ڈال، ڈال کر ایک، ایک پائی جوڑتی تھیں تاکہ ان کے بیٹے کو کوئی دقت نہ ہو۔

اب گوشت، دودھ نام کی چند روزہ عیاشی بھی دو تین ماہ بعد تب ہوتی جب بھائی چھٹی پر گھر آتا۔ تب تو امی اسے دیسی گھی کی چوری کوٹ، کوٹ کر اپنے ہاتھوں سے کھلاتیں، وہ سوکھی روٹی چائے کے ساتھ کھا کر پیٹ بھر رہی ہوتی۔ وہ پیٹ بھرنے کے لیے کھاتی تھی...... بھائی کی طرح تنومند ہونے کے لیے نہیں۔

جب وہ کالج میں داخل ہوئی تو حسبِ معمول امی

نے مخالفت ہی کی تھی مگر ابو نے داخلہ دلوا ہی دیا۔

''جب وہ پڑھنے پر آمادہ ہے تو میں یا تو کیوں اس کی راہ کھوٹی کریں۔'' اس نے ابو کو امی سے کہنے سنا تھا۔

''میٹرک تک پڑھائی لڑکی ذات کے لیے بہت ہوتی ہے، یہی روپیہ عدیم کے لیے سنبھال رکھیں اور بیٹی کے جہیز کے لیے۔'' اس کا دل رج کر کھٹا ہو گیا تھا۔

''عدیم کا الگ سے حق ہے، ہم پر اور ہدیٰ کا الگ سے۔ جہیز بھی کر لیں گے۔'' ابو جس حق کی بات کر رہے تھے اس کے بارے میں اسے کبھی سکھایا ہی نہیں گیا تھا۔ اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ امی نے ان دونوں کی تربیت میں بھی بڑا فرق روا رکھا تھا۔ وہ خود پر بیٹی ہونے کا فردِ جرم عائد کرتی ہوئی خاموشی سے اپنے کمرے میں لوٹ آئی تھی۔

بیٹا اور بیٹی مساوی حیثیت رکھتے ہیں، یہ وہ کہانیاں تھیں جو پرانے وقتوں کی طرح پرانی ہو گئی تھیں...... کم از کم مشرقی معاشرے میں اس وقت تو کیا آج بھی بیٹوں کو بیٹیوں پر مقدم رکھا جاتا ہے اور یہ آج بھی گھر گھر کی کہانی ہے۔ یہ صرف اس وقت کے گھر کی کہانی نہیں تھی دیگر بیٹیوں کی طرح ہدیٰ بھی اس تخصیص کے ساتھ جینا سیکھ گئی تھی۔

☆☆☆

ایف اے کے بعد جب وہ بی اے میں داخل ہوئی تھی تبھی سے اس کے ایک دور رشتے آئے جن کے متعلق گھر میں چرچا ہونے لگا...... وہ چلتے پھرتے سن گن لیتی رہتی...... اسے ابھی شادی نہیں کرنا تھی...... وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے نوکری کرنا چاہتی تھی۔ اسے ثابت کرنا تھا کہ وہ کند ذہن نہیں ہے، وہ بہت کچھ کر سکتی ہے اور نوکری کرنا اس کے نزدیک بہت کچھ میں شامل تھا۔

مڈل کے وظیفے کے بعد وہ ثابت کر چکی تھی کہ وہ کند ذہن نہیں ہے اور بعد میں حاصل کردہ نمبروں سے بھی وہ خود کو منوا چکی تھی مگر ابھی خود کو منوانے کا ایک بڑا

مرحلہ باقی تھا۔
''مجھے ابھی شادی نہیں کرنی امی......'' وہ محض منمنائی تھی اور امی نے خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورا تھا۔ انہیں شروع سے اس کا جواب دینا نہیں بھاتا تھا۔
''بہت اچھا رشتہ ہے، انکار کی کوئی وجہ بھی تو ہو۔''
''میں پڑھنا چاہتی ہوں، تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہوں۔''
''میاں کے ہاں جا کر کر لینا ساری پڑھائیاں۔''
امی اس کی کسی بات کو خاطر میں نہیں لا رہی تھیں۔ وہ شاید چٹانوں سے ٹکریں مار، مار کر شگاف کرنے کی ذرا سی کوشش تھی۔ بے حد دشوار اور بالکل ناممکن سی۔
''مجھے پڑھائی مکمل کر کے نوکری بھی کرنی ہے امی۔'' وہ سر جھکائے مجرمانہ اعتراف کر رہی تھی۔ نوکری کی خواہش، تمنا، جرم عظیم۔
''ہوش میں تو ہو، کس لڑکی نے آج تک خاندان میں نوکری کی ہے جو تم کرو گی۔''
''خاندان میں تو کوئی ڈاکٹر بھی نہیں تھا پہلے، آپ نے بھائی کو ڈاکٹر نہیں بنایا پھر۔'' وہ ماں کے دوبدو تھی۔
''وہ خاندان کا پہلا ڈاکٹر ہے، اعزاز ہے ہمارے لیے۔ لائق فائق بیٹا ہے ہمارا۔'' اس نے زخم خوردہ نگاہوں سے ماں کو دیکھا...... بیٹا لائق فائق تھا، اعزاز تھا اور وہ......؟ وہ کیا تھی؟
''نالائق تو بیٹی بھی نہیں ہے آپ کی امی...... بس آپ کی نظروں میں ہی بے مول رہی۔''
''مجھے بحث پسند نہیں ہے، تمہارے ابو کو یہ رشتہ پسند ہے اور وہ آج کل میں انہیں ہاں کر دیں گے۔''
''ابو میری مرضی کے بغیر کیسے کر سکتے ہیں یہ سب۔'' وہ حد درجہ حیران تھی۔ اسے ماں سے بھلے شکوے تھے مگر باپ اسے ٹھنڈی میٹھی چھایا لگتا تھا۔ وہ ایسی امید باپ سے نہیں کر سکتی تھی۔ ابو نے تو ہمیشہ اس کا ساتھ دیا تھا...... اس کی پڑھائی کے سب سے بڑے حمایتی وہی تو تھے پھر اب......؟
''ہمارا کام تیری تربیت تھا، وہ ہم نے کر دی۔ جتنا پڑھانا تھا پڑھا بھی دیا...... اب تجھے تیرے گھر بھیجنا ہے تا کہ ہمارے سب فرائض ادا ہو جائیں۔''
''بس اتنے سے فرائض......صرف اتنے سے...... کیا بیٹیاں اتنا کم حق رکھتی ہیں کہ ماں، باپ کے فرائض اتنی جلدی بنٹ جاتے ہیں۔'' اس کے اندر سیال مادے میں نمکین پانی بھی دوڑنے لگا تھا۔ ہر، ہر سانس کے ساتھ۔
وہ روہانسی ہو گئی۔
''میں ابو سے ایک بار بات کرنا چاہتی ہوں۔''
اسے آخری حربہ یہی دکھا تھا۔
''ایسی باتیں بیٹیاں کیا اپنے منہ سے اپنے باپ سے کرتی ہیں؟'' اس کی ماں ٹھیک کہہ رہی تھی۔ جو بیٹی منہ سے اپنی روزمرہ کی ضروریات باپ سے کبھی آج تک نہیں کہہ سکی وہ اتنی بڑی بات کیسے اپنے باپ سے جا کر کر سکتی تھی بھلا؟
''ایسے مت کریں میرے ساتھ امی......'' اس نے ماں کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔
''میں تمہیں آگاہ کرنے آئی تھی بدبی......تم سے پوچھنے نہیں۔'' انہوں نے نخوت سے اس کے بندھے ہاتھ نظر انداز کر دیے تھے۔
''آپ ہمیشہ یہی تو کرتی آئی ہیں امی۔'' دونوں ہاتھ بے بسی سے پہلو میں گر گئے تھے۔
''تیرے باپ نے غلطی کی تجھے کالج بھیج کر...... بس یہی ثابت کرنا باقی رہ گیا تھا ناں...... جا کر دے ثابت کہ تیری پڑھائی نے تجھے زبان دراز بنا دیا ہے۔''
امی سے جب کچھ نہ بن پڑتا تھا تو وہ اسے پڑھائی کے طعنے دیتیں جو تازیانے کا وار ثابت ہوتے۔ امی وہ جیش تھیں جو مہرے کب اور کیسے کہاں بڑھانے ہیں خوب جانتی تھیں۔ اور وہ ایسا مہرہ جو جا بجا بس پٹنا جانتا تھا۔ جو گرد سے گھیرا جاتا اور بہ آسانی گھیرا جاتا ہے۔ شہ مات کے اس کھیل میں وہ ہمیشہ سے جہاں ہوتی تھی آج بھی وہیں تھی۔
''ٹھیک ہے امی...... میں ابو کو کبھی شرمندہ

نہیں کرنا چاہتی...... اگر بھائی ان کا اعزاز ہے تو ہدیٰ بھی ان کا افتخار بنے گی...... ہدیٰ ان کے طرب کا ذریعہ ہی بنے گی، کرب کا نہیں۔"

وہ باپ کی خاطر، باپ کی دل خواہ بن گئی۔ امی نے اس کی رضامندی اپنے طریقے سے ابو کے گوش گزار کردی اور ان کی دل دہی کے لیے بس اتنا ہی بہت تھا۔ اسے بلا کر براہِ راست پوچھا نہیں گیا تھا۔ اور اگر جو ابو ایسا کر لیتے تو وہ دمدمہ جس کی اونچی فصیلوں کے پیچھے وہ جا چھپی تھی۔ ابو کی زیرک نگاہوں کے آگے جما رہتا؟ کبھی نہیں......

"اسے بتایا تھا کہ وہ سسرال جا کر پڑھائی مکمل کر سکتی ہے؟" ابو نے امی سے ہی پوچھا تھا۔

"بتا دیا تھا۔" مگر امی نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اسے یہ سب کس طرح بتایا تھا۔

"اسے کوئی اعتراض......؟"

"کوئی اعتراض نہیں......" اور اس سے پہلے تک امی نے اس کا کون سا اعتراض ابو تک پہنچایا تھا جو وہ آج پہنچا دیتیں۔

سو یوں عمروں کے تفاوت کے باوجود ہدیٰ جلیل، ہمایوں فلک جو علاقے کا تھانے دار تھا کے ہمراہ بیاہ کر میاں چنوں چلی گئی۔ ایک فرمانبردار بیٹی کی گرد اور دھول چھوڑ کر جسے وقت کے ساتھ اڑ جانا تھا یا پھر کہیں بیٹھ جانا تھا۔

☆☆☆

بیٹی بیاہی نہیں تھی رقیہ بیگم نے 'دفنائی تھی......' سال بھر میں کبھی اس کی طرف نہ گئیں...... وہ بھی ایک آدھ بار ہی آئی تھی ملنے...... دور بیاہی بچیوں کے بس یہی مسائل تو ہوتے ہیں اوپر سے اس زمانے میں ابو کے گھر کوئی ٹیلی فون بھی نہیں تھا...... بس خط و کتابت کا دور تھا۔ امی ان پڑھ تھیں اور ابو کو بیٹی کو خط لکھتے لاج آتی...... سو اس کا رابطہ کٹ سا گیا تھا۔

عدیم کا آخری سال چل رہا تھا جب امی نے وچولن کے ذریعے رشتے دیکھنا شروع کیے...... لڑکی انہیں بیٹے کی ہم پلہ چاہیے تھی۔ اونچی لمبی اور اعلیٰ خاندان کی...... سو ہر دوسری لڑکی میں مین میخ نکال کر گھر لوٹ آتیں۔

انہی دنوں عدیم کے آخری سال کا نتیجہ بھی نکل آیا تھا اور وہ کامیاب ہو گیا تھا...... جلیل قیوم اور رقیہ بیگم تو گویا پورے خاندان کے لیے قابلِ محسود ہو گئے تھے۔

"ارے بس کردے عدیم کی ماں...... کتنی مٹھائی کھائے گی...... ذیابطیس کی مریضہ بن جائے گی۔" وہ رقیہ بیگم کو منہ بھرتے دیکھ کر ٹہوکا دینے لگے۔

"بن بھی گئی تو کیا ڈر...... میرا بیٹا ڈاکٹر بن گیا ہے...... ڈاکٹر کی ماں کو کب سے بیماریوں کی فکر ہونے لگی۔"

اور جلیل قیوم کا سینہ چوڑا ہونے لگتا...... محلے میں جہاں کہیں بھی نکلتے لوگ خوب، خوب مبارک باد دیتے اور وہ جی بھر کر وصولتے۔ رقیہ بیگم نے شکر پاروں کے ساتھ سوجی کا حلوا بنا کر محلے بھر میں بانٹا تھا...... اپنا عدیم انہیں عدیم المثال لگنے لگا...... اٹھتے بیٹھتے ہر ایک کے آگے اس کے گن گانے اور اس کی مداح سرائی میں لگی رہتیں۔

"میرے بیٹے جیسا کوئی قابل ہو تو بتاؤ؟" سب سر دھنتے، سنتے جاتے، خاص کر بیٹیوں والی مائیں خوب آگے پیچھے پھرنے لگیں۔

لڑکی ڈھونڈنے کی مہم اور بھی زوروں پر شروع کر دی گئی۔ آئے دن لڑکی دیکھی اور یہ جا وہ جا۔ بالآخر امیمہ نے انہیں اپنے کھانوں سے رام کر لیا...... امیمہ جو ایک چھوٹے سے صنعت کار کی بیٹی تھی۔ قد کاٹھ، نین نقش اور خاندان کے اعتبار سے انہیں اپنے عدیم کے لیے انتہائی موزوں لگی۔ سو میاں سمیت دو تین چکر ان کے در کے لگا کر گویا بات پکی کر دی گئی۔

"ابھی لڑکے کی نوکری نہیں ہے۔" اور رقیہ بیگم کو بڑا ہی برا لگا کہ ان کے راس المال کو کوئی ایسے کیسے کہہ سکتا ہے۔

''لڑکا ڈاکٹر ہے...... آج نہیں تو کل کہیں تو نوکری سے بھی لگ جائے گا اور پھر ابھی تو اس کی ہاؤس جاب چل رہی ہے۔'' خلیل قیوم صاحب نے تحمل سے سمجھایا تھا۔ تب امیمہ کے ابا کی سمجھ میں بات آئی ورنہ وہ دو جمع دو کرنے والے انسان تو بس اپنی بھاشا میں ہی سمجھتے تھے۔

''خود کیا ہے ان کی لڑکی...... محض ایف اے پاس۔'' سارے راستے رقیہ بیگم جلتی ابلتی رہیں۔ وہ دم بریدہ لومڑی کے مانند اچھل رہی تھیں اور میاں انہیں ٹھنڈا کر رہے تھے۔

''رشتے ناتے طے کرتے ہوئے اس قسم کے سوال جواب تو ہوتے ہی ہیں ناں عدیم کی ماں...... بس کرو غصہ تھوک دو۔'' مگر وہ دمادم اعتراض اٹھاتی گئیں جب تک غصہ ہوا نہ ہوگیا۔

بہر حال اگلی بار نئے نکور کپڑے پہنے، چپل چڑھائے، توباف باندھے وہ امیمہ کے ہاں بیٹھی اسے انگوٹھی پہنا رہی تھیں...... شادی ہدیٰ کے آنے تک مؤخر کردی گئی۔ وہ ان دنوں امید سے تھی سو جب تک فارغ نہ ہوجاتی عدیم کی شادی التوا کا شکار ہی رہنا تھی۔

چھ ماہ کے حمل کے ساقط ہوجانے کے بعد ہدیٰ خاموشی سے میکے چلی آئی تھی۔ تب شاید زندگی میں پہلی بار امی نے اس کی دلجوئی کی تھی۔ اسے گلے سے لگایا تھا' اس کے آنسو پونچھے تھے...... وہ بحیثیت بیٹی کبھی اس کا دکھ نہیں سمجھ سکیں مگر بحیثیت ماں وہ اس کے دکھ میں... نچی تھیں۔

پھر وہ جتنا وقت وہاں رہی اپنا غم بھول کر خوشی، خوشی بھائی کی شادی کی تیاریوں میں شامل رہی۔ امی نے اس کو ساتھ لگا کر امیمہ کی ساری خریداری کی تھی۔ تاہم امیمہ نے خاصی رقم پہلے ہی نکلوالی تھی کہ وہ لہنگا اور زیورات اپنی پسند کے بنوانا چاہتی تھی...... امی نے خوشی، خوشی وہ رقم ہونے والی بہو کے حوالے کی تھی۔ ہر ماں ہی شروع شروع میں بہت محبت سے بہو کے حوالے بیٹے کے ساتھ، ساتھ گھر کا انتظام و انصرام، قیمتی مال و متاع کرتی ہے اور بعد میں وہی بہو کھلنے لگتی ہے یا شاید کھلنے پر کھلتی ہے۔

نکاح نامے میں حق مہر بھی امیمہ کے والد صاحب نے اپنی مرضی کا لکھوایا تھا اور خلیل قیوم کو لگا تھا کہ بہت کچھ جو بڑی جدو جہد سے جمع کیا تھا سب چلا گیا...... امیمہ کی والدہ نے شرط بھی لکھوائی تھی کہ عدیم نوکری کی غرض سے جہاں کہیں بھی رہے گا، امیمہ اس کے ساتھ ہی جائے گی اور جلیل قیوم نے یہ شرط بھی منظور کرلی تھی...... جب انسان کی مت ماری جائے تو وہ تمام شرائط ہی آنکھیں موند کر ماننا جاتا ہے...... سو ان کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

عدیم کے نکاح کے فوراً بعد ہی اس کی نوکری اندرونِ سندھ کے بڑے اسپتال میں ہوگئی تھی سو وہ جانے سے قبل رخصتی کروا کر جانا چاہتا تھا اور یوں امیمہ رخصت ہوکر دو روز سسرال میں گزار کر میاں کے ساتھ سندھ کے شہر حیدر آباد چلی گئی تھی۔ شروع، شروع میں سب اچھا تھا پھر رفتہ، رفتہ سب بدلنے لگا۔

سمے کی چرخی گھومنے لگی۔ مہینوں بعد عدیم بیوی کے ہمراہ ایک دو روز کے لیے ملنے آتا تھا اور جب ماں شکوہ کناں ہوتی تو وہ کوفت زدہ سا انہیں سمجھاتا۔

''امی اتنی دور سے روز تو نہیں آیا جاتا ناں......''

امی افسردگی سے سر ہلا دیتیں، بہو کے قیام کے دوران میں وہ اس کے گھاڑ پن سے معترف ہوگئی تھیں۔

''جب ہم رشتہ دیکھنے آئے تب جو مرغ روسٹ اور کباب بنائے تھے وہ......؟''

اور وہ جواباً ہنس، ہنس کر لوٹ پوٹ ہوگئی تھی۔

''وہ...... وہ تو بازار سے منگوائے تھے آنٹی۔''

اور رقیہ بیگم کی سٹی گم ہوگئی۔ ان کے ہاں تو یہ تصور ہی نہیں تھا کہ کھانا کہیں باہر سے گھر بھی منگوایا جاتا ہے اور وہ تو اسے بہو کے ہاتھوں کا کمال گردان کر رشتہ پکا کر آئی تھیں...... صد افسوس۔

ان کی بہو میں سارے گن بس باتوں سے متعلق تھے...... اسے بات بڑھانے، بات بدلنے،

باتوں میں قند گھولنے اور باتوں کے جھاڑ باندھنے میں مہارت حاصل تھی۔ وہ جادو بنسی کی نگری سے تعلق رکھتی تھی جس میں ان کا بیٹا مقفل ہوگیا تھا۔ رام کلی کے اس سحر سے اب اسے کبھی واپس نہیں آنا تھا۔

شادی کے سال بعد عدیم نے حیدرآباد سے فون کر کے انہیں دادا، دادی بننے کی خوشخبری سنائی تھی۔ اور وہ دونوں بوڑھا، بوڑھی پوتے کو دیکھنے کے لیے تڑپ اٹھے تھے۔ خیر سے اب تو گھر میں فون لگ گیا تھا۔ جب دل کیا بات کرلی۔

''کب آؤ گے؟ ہم پوتے سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''آجائیں گے ابو جی...... ابھی ابراہیم چھوٹا ہے، کچھ بیمار بھی ہے، ایسے میں اس قدر طویل سفر سے صحت اور بگڑ گئی تو؟'' وہ دل مسوس کر رہ گئے...... نام بھی رکھ لیا۔ نہ صلاح نہ مشورہ......

''کہو تو ہم آجائیں؟'' امی نے ابو کے ہاتھ سے فون جھپٹ لیا۔

''بیٹا ہم آجاتے ہیں...... تم لوگ کہاں اتنا لمبا سفر کرو گے؟'' وہ بہو اور پوتے کو تکلیف دینے سے بہتر خود طویل سفر پر آمادہ تھیں۔

''ارے نہیں امی...... امیمہ کی امی اور بھابی آئی ہوئی ہیں...... میرا دو کمروں کا گھر ہے اتنی جگہ نہیں ہے، آپ لوگوں کو تنگی ہوگی۔'' بہو کے گھر والوں کے ہوتے وہ ان پڑھ ماں، باپ کو بلانا نہیں چاہتا تھا۔

امی مرجھا کر رہ گئی تھیں۔

پھر روز نہیں تو دو چار روز بعد وہ فون کر کے خیر خیریت پوچھ لیتے تھے۔ پہلے پہل تو عدیم سے بات ہوجاتی...... پھر بہو ہی سے بات ہو پاتی۔ بیٹا معروف ہوگیا تھا۔

''انکل عدیم نے پریکٹس بھی شروع کردی ہے۔ معروف ہوتے ہیں۔'' ابو سمجھ جاتے تھے کہ وہ زندگی کی دوڑ میں اشہب بنا دوڑ رہا ہے اور سرپٹ دوڑ رہا ہے...... اور برق رفتار گھوڑوں کی زندگی میں سست رو بوڑھوں کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔

☆☆☆

رقیہ بیگم آئے دن بیٹے کو یاد کرتی رہتیں اور جلیل قیوم انہیں دم دلاسے دے، دے کر تھک گئے تھے...... انہی دنوں انہیں ہدیٰ کی جانب سے بھی خوشخبری ملی۔

''شکر ہے دینے والے کا...... ایک طرف پوتا تو دوسری طرف نواسی...... بیٹے کو بیٹا ملا اور بیٹی کو بیٹی۔'' رقیہ بیگم دوپٹے کے پلو سے منہ ڈھانکے آنسو بہانے لگیں۔

''عدیم کی ماں خوشی کے موقع پر یوں ناشکری نہیں کیا کرتے...... اٹھ کر شکرانے کے نفل پڑھ لے۔ جس نے اولاد کی اولاد دکھادی اس کا بڑا حق بنتا ہے سجدہ کیے جانے کا۔''

''یہی تو رونا ہے کہ نہ پوتا دیکھنے کو ملا اور نہ نواسی......'' وہ روتے، روتے پھر سے چکی کے پاٹ چلانے لگیں۔

''مل جائیں گے دیکھنے کو بھی...... اولاد کی آنکھوں کو تو سکھ ہوگا ناں...... اپنی اولاد کو دیکھ کر...... بس ہم تو ان کے سکھ میں سکھی۔''

تبھی چوبی دروازے کا پٹ معیوب سی چرچراہٹ سے کھلا تو دونوں نے مڑ کر پیچھے دیکھا...... اس چلچلاتی دھوپ میں سامنے ہدیٰ گود میں بچی لیے سفری سامان ساتھ گھسیٹتے چلی آرہی تھی۔

''بسم اللہ میری دھی آگئی...... جی آیاں نوں۔'' خلیل قیوم ہیجان آمیزی سے آگے بڑھے اور بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ کر جلدی سے نواسی کو بانہوں میں بھرلیا۔

وہ امی سے ملتے ہی چارپائی پر ڈھے گئی تھی...... امی نے بھی پیڈسٹل فین کا رخ اس کی جانب موڑ دیا کہ پسینہ خشک ہوجائے۔

نانا نانی اب نواسی کو چومے جاتے تھے...... خون کا خون...... کشش ثقل سے بھی کہیں زیادہ کھینچتا ہے۔

''اکیلی کیسے آگئی اتنی دور سے بیٹی ......'' ابو کو یک دم احساس ہوا۔

''کس نے ساتھ آنا تھا اور؟'' آواز چھدری سی

تھی۔ اب کی بار امی بھی چونکیں۔

''ہمایوں کیوں نہ آیا ساتھ؟'' اکیلے کیسے بھیج دیا یوں بیوی اور چند گھنٹوں کی بچی کو؟''

اس نے چرخ کبود کی جانب دیکھا..... سخت تپتا سورج اس کے پور، پور سے رشحہ ٹپکا رہا تھا۔

''اسے نہ پہلے کوئی سروکار تھا نہ اب..... اور نہ کبھی ہوگا..... اب کبھی نہیں ہوگا.....'' امی کا ماتھا ٹھنکا تھا۔

''اس نے تجھے گھر سے نکالا ہے؟''

''نہیں..... زندگی سے۔'' وہ بڑبڑائی۔

''ظلم کرتا ہے تجھ پر ہدیٰ..... بتا مجھے؟ مارتا ہے؟ تو نے کبھی شکایت کیوں نہ کی۔ بتایا کیوں نہیں ہمیں.....؟'' امی کندھا جھنجوڑ رہی تھیں اور ابو ساکت سے بیٹھے تھے۔

''کہتا تھا کہ اگر بیٹی ہوئی تو طلاق دے دوں گا۔'' ہدیٰ مجسمے کے مانند بیٹھی تھی۔ صرف لب ہلتے تھے اور نبض چلتی تھی۔ باقی سب ساکن تھا۔

''ہونہہ..... پہلی بیٹی کی پیدائش پر کہاں ہوتی ہے طلاق.....؟ کون دیتا ہے طلاق؟'' امی نے غصے سے سر جھٹکا، پیر پٹخا۔

''پر اس نے تو مجھے دے دی امی۔'' اور امی اب کی بار ہل بھی نہ سکیں۔ وہاں سب ساکن تھا۔ صرف منی ہاتھ پیر چلا رہی تھی کیونکہ وہ اس قساوت سے انجان تھی جو اس کے باپ نے ان ماں بیٹی پر ڈھائی تھی۔

اس روز سے دونوں کو چپ لگ گئی تھی..... اولاد کا غم بھر بھری مٹی کے مانند ڈھا دیتا ہے۔ وہ بھی ڈھے گئے تھے۔ پوری کوشش کرتے کہ بیٹی کے سامنے معمول کے مطابق سب چلتا رہے اور بیٹی کی بھی یہی کوشش ہوتی کہ ماں، باپ کے سامنے ٹھیک سے رہے۔ مگر اندر ہی اندر دکھ ارہا تھا۔

''پوری زندگی کیسے کاٹے گی اب عدیم کے ابا..... کوئی رشتہ دیکھ کر بیاہ دیں اسے۔''

''بڑی غلطی ہوگئی عدیم کی ماں..... بیٹی کے معاملے میں ہم سے۔ جلد بازی کے فیصلے تو ابلیس کے ہوتے ہیں ناں اور یہ سراسر ابلیسی فیصلہ تھا۔ سو انجام بھی ویسا ہی نکلا..... بیٹی کے گناہ گار ہیں ہم۔'' وہ کف افسوس ملنے لگتے۔

''جو ہونا تھا ہوگیا..... آگے کا سوچیں۔ اب کیا کریں گے۔ کیا ہوگا اس کا..... کوئی معقول رشتہ دیکھ کر پھر سے بیاہ دیں میرا تو یہی مشورہ ہے۔'' وہ مستقبل کی اور متوجہ کرتیں اور خلیل ماضی حال کو تاسف سے دیکھنے لگتے۔

''ابھی تو عدت ختم ہونے میں کچھ وقت ہے..... پھر سوچتے ہیں۔'' اور غلام گردشوں میں بھٹکتی ہدیٰ پتھر کی ہوگئی..... پھر سے اسے کسی اور ہمایوں فلک کے سنگ رخصت ہونا تھا۔

''مجھے شادی نہیں کرنی ابو جی۔'' زندگی کا پہلا موقع..... پہلا انکار..... پہلا جواب..... جو وہ ابو کو براہ راست دے رہی تھی۔ امی انگشت بدنداں رہ گئیں..... مگر وہ اب پہلے والی ہدیٰ نہیں رہی تھی۔ طلاق یافتہ اور ایک بیٹی کی ماں تھی۔

''ہم ابھی تمہاری شادی کر بھی نہیں رہے بیٹا۔''

''مجھے کبھی شادی کرنی بھی نہیں ابو۔'' دوٹوک جواب۔

ابو نے توقف کے بعد اسے سمجھانا شروع کیا۔

''بیٹا تمہاری عمر ہی کیا ہے ابھی..... اور پھر لبابہ کے بارے میں سوچو اس کا کیا ہوگا۔''

''میں اپنی بیٹی کا ہی سوچ رہی ہوں ابو جی..... میری دوسری شادی کی صورت میں اس کا کیا مستقبل ہوگا؟ کوئی دوسرا مرد میرے پہلے شوہر کی بیٹی کو کیوں اپنائے گا۔ اب میں ماں ہوں اور میرا ہر فیصلہ ہر قدم میری بچی کے لیے ہوگا..... اور میری بیٹی کا مستقبل میری شادی ہرگز نہیں ہے۔''

''لیکن بیٹا.....'' اس نے ابو کی بات کاٹ دی۔

''ابو جی، مجھے کنویں سے نکال کر کھائی میں مت پھینکیں..... میں مزید گہرائی میں نہیں گرنا چاہتی..... پہلی بار میں اپنے نہیں تو اپنی اولاد کے حق کے لیے بول رہی ہوں، انکار مت کریں۔''

اور ابو اب کیسے کچھ بول سکتے تھے اور امی..... وہ

کیا بولتیں، کیا کہتیں؟

☆☆☆

حیات مستعار بس گزرتی چلی جا رہی تھی۔ عدیم کبھی، کبھی آتا زیادہ تر اکیلا ہی آتا تھا۔

''ابراہیم اسکول جانے لگا ہے، امیمہ مصروف رہتی ہے، لمبے سفر سے طبیعت بگڑ جاتی ہے، متلیاں کرتے سارا رستہ کٹتا ہے۔ سو ہر بار کیسے آئے؟''

''عدیم کی ماں! ہم نے بچوں کو غلط جگہ بیاہ دیا۔'' تب ابو چپکے، چپکے امی سے سرگوشیاں کرتے۔

''جہاں قسمت اور نصیب۔'' امی آہ بھرتیں۔

پھر اگلی بار جو وہ آیا تو اپنی غرض سے۔

''ابو جی جب وہ اس گھر میں رہ رہی ہے اور سارا خرچا بھی آپ کے سر ہے تو پھر جائداد میں بھلا کیا حصہ۔''

اور ابو کے تو سان و گمان میں بھی نہیں تھا جو وہ کہہ رہا تھا۔

''آپ کے پاس مجھے دینے کو چند گز زمین کا ٹکڑا ہی ہے اور اس پر ہدیٰ کا کیا حق؟''

''خبردار! وہ میری بیٹی ہے، ٹھیک اسی طرح جیسے تو میرا بیٹا ہے عدیم...... شریعت نے جتنا حق رکھا ہے اسے ملے گا۔'' ابو کو اس نے پہلی بار بھائی سے اس قدر غصے میں بات کرتے سنا تھا۔

وہ اندر لبابہ کو گود میں بٹھائے اسکول کا کام کروا رہی تھی...... ساتھ اپنے اسکول کے بچوں کے پرچے بھی چیک ہو رہے تھے...... اس نے عدت کے اختتام پر ہی قریبی اسکول میں چند سو کی نوکری کر لی تھی۔ باپ کی اونچی آواز سے رعشہ طاری ہو گیا...... رعد و برق کی سی سختی تھی ابو کے لہجے میں۔

''اسے جہیز دیا...... اب گھر میں رکھا ہے، خرچا اٹھا رہے ہیں اور اوپر سے جائداد میں حصہ بھی دیں گے؟'' وہ جو کہتا تھا کہ ڈاکٹر بن کر سب کچھ لے دوں گا...... ڈاکٹر بن کر بھی مانگنے ہی آیا تھا۔

''جہیز اپنے خون پسینے کی کمائی سے دیا...... جس چھت تلے وہ رہی ہے، اس کے باپ کی ہے...... اپنا اور اپنی بچی کا فقیرانہ خرچ وہ اپنی محنت سے اٹھا رہی ہے اور جائداد میں حصہ اسے اللہ نے تفویض کیا ہے۔''

''میرا حق نہ ماریں ابو جی۔'' وہی خود غرضانہ سوچ۔

''جتنا تیرا حق ہے وہ تجھے ملے گا......'' وہ بوڑھا وجود چھتر چھایا بنا کھڑا تھا اور وہ اندر بیٹھی روئے چلے جا رہی تھی...... کئی سال پہلے اس نے باپ کو تکلیف سے بچانے کے لیے پڑھائی چھوڑی تھی...... آج وہ ''کچھ اور'' چھوڑنے جا رہی تھی۔

''ابو جی......'' ابھی عدیم کی بات منہ میں ہی تھی کہ اس نے اچک لی۔

''ابو جی مجھے کوئی حصہ نہیں چاہیے...... میری زمین کا ٹکڑا بھی اسے دے دیں۔''

''مگر بیٹا......''

''اب وہ زمین مجھے کبھی راس نہیں آئے گی ابو جی...... جس پر اس کی نظر ہے...... زمین کا وہ چند گز ٹکڑا میری گور تو بن جائے گا، گھر نہیں۔''

وہ فاتح سا ابو کو دیکھنے لگا اور وہ زمین کا ٹکڑا اس کے منہ پر مار کر آ گئی تھی۔

''وہ ایسا نہیں تھا عدیم کے ابا...... یہ ضرور اس کی بیوی کی پڑھائی پٹی ہے۔ جب سے آئی ہے اسے ہم سے کاٹ دیا ہے۔ اب ساری جائداد ہڑپنا چاہتی ہے۔'' جب سے وہ ہو کر گیا تھا امی سارا، سارا دن روتی تھیں اور ابو...... وہ پہلے غصے سے پھنکارتے تھے پھر ملامت کا اظہار کرنے لگے اور اب ایک دم خاموش ہو گئے تھے۔ اور امی انہیں باور کرواتی رہتیں کہ ان کا بیٹا بے قصور ہے، سارا قصور بہو کا ہے۔

''آہ...... جو بھی ہے عدیم کی ماں اسے قطعاً بہن کی پروا نہیں ہے اور شاید ہماری بھی نہیں۔'' لہجہ شکستہ تھا۔

''میرا بیٹا اتنا برا نہیں ہے۔'' وہ بیٹے کی ماں تھیں، بیٹے کی حمایتی...... ہدیٰ خاموشی سے روٹیاں بنا رہی تھی...... اس نے دسترخوان چن دیا اور ماں، باپ کی طرف تکنے لگی۔ دو روز سے وہ نہ ٹھیک سے کھاتے تھے نہ پیتے...... بس غم کھاتے رہتے تھے۔

''اس بچی کا کیا مستقبل ہے اور اس کا......؟'' جلیل قیوم پہلے بیٹی کی جانب تکنے لگے اور پھر اس کی بیٹی کی جانب۔

''ابو جی آپ ہماری کیوں فکر کرتے ہیں، اللہ ہے ناں وہ سب سنبھال لیتا ہے۔''

''دیکھو عدیم کی ماں جو کام بیٹے کے کرنے کا ہے' وہ بیٹی کر رہی ہے...... اس عمر میں اب بیٹی ڈھارس بن رہی ہے۔'' ابو رونے لگے تھے۔

رقیہ بیگم جھٹ تڑپ اٹھیں، روٹی کا نوالہ وہیں چنگیر میں دھر دیا۔

''ایسے مت کہیں عدیم کے ابا...... میرا بیٹا برا نہیں ہے۔ نہ جانے اسے کیا ہو گیا؟ کیوں کیا اس نے ایسا......؟'' وہ ہنوز بے یقین تھیں۔

''اسے ہمیشہ سے ہی لینا سکھایا گیا ہے، سو اب وہ محض لینا ہی جانتا ہے۔ دینا نہیں...... انسان کی سیکھ ہی بالآخر عادت بن جاتی ہے۔'' وہ کھانا کھانے کے دوران ہی بڑے واجبی انداز میں نہایت عمیق بات کہہ گئی تھی۔ امی اس کی شکل تکتی رہ گئی تھیں۔

''صحیح کہا......اور عندالطلب اب اس کی حقیقت کھل گئی...... دوش ہماری تربیت کا ہے، عدیم کی ماں۔ ہم نے ہی ٹھیک سے پروان نہیں چڑھایا اسے...... اسے سکھانا چاہیے تھا کہ آج ہم اسے دے رہے ہیں، کل کو اسے لوٹانا ہے۔ ہم نے اسے لوٹانا نہیں سکھایا۔ ہم بھول گئے عدیم کی ماں اور اب وہ بھول گیا ہے۔'' بڑے دیالو تھے ابو بھی...... کیسے جھٹ سے سب قصور تسلیم کر کے اپنے کھاتے میں بھر لیا۔ اور پھر امی سے کچھ کھایا ہی نہیں گیا تھا۔

☆☆☆

عالم ناسوت کا سے بھی رواں اور پائیداری بھی...... وقت گزرنے لگا، کبھی لگتا تیزی سے اور کبھی لگتا سست روی سے۔

ابو جب بھی فون ملاتے، امیمہ سو بہانے گھڑ دیتی۔

''عدیم اسپتال گئے ہوئے ہیں، آپریشن ہے کوئی بہت اہم...... واپس آتے ہیں تو فون کریں گے۔'' پھر نہ جانے کیوں فون نہ آتا۔

''ڈاکٹرز کی کانفرنس ہے، کراچی گئے ہوئے ہیں، جس روز واپس آئیں گے میں کہوں گی آپ سے بات کر لیں۔'' اور یا تو عدیم اتنے ہفتوں واپس نہ آیا یا امیمہ کہنا بھول گئی۔ پھر جب اس نے عید، بقر عید پر بھی آنا چھوڑ دیا تو ابو، امی کو تسلی دینے لگے۔

''جب نیت نہ ہو تو یاد آنا نہ آنا برابر ہوتا ہے، عدیم کی ماں...... وہ فون یادداشت کی کمی کی وجہ سے نہیں کر پاتا...... ایسا نہیں ہے، اس کی نیت کھوٹی ہے۔''

''اسے وقت نہیں ملتا ہو گا، بڑا ڈاکٹر ہے ناں، بڑا مصروف رہتا ہو گا۔'' اور امی سدا کی بیٹے کی شیدا...... ان سے زیادہ وہ خود کو سمجھا رہی ہوتیں۔

''ایسی بھی کیا مصروفیات کہ عید پر آنا ہی بھول گیا...... چھٹی تو ہو گی ناں...... پھر کیوں نہیں آیا؟''

''عید پر بھی تو لوگ بیمار ہوتے ہیں ناں...... ڈاکٹروں کو کاہے کی چھٹی۔''

سو ابو اپنے موقف سے نہ ہٹتے اور امی اپنے...... پھر جب کبھی اس سے رابطہ ہوتا ابو رونے لگتے۔

''پتر ہم بوڑھے ہو گئے ہیں، بیمار ہیں، تجھے ڈاکٹر اس لیے بنایا تھا کہ ماں، باپ کو بیمار چھوڑ کر دوسروں کو شفا دے۔ واپس آجا پتر...... ہمیں ضرورت ہے تیری۔''

''واپس کیسے آجاؤں ابو جی...... یہاں نوکری ہے میری۔'' وہ زچ ہو جاتا...... ایک ہی بات کی تکرار سے دل اوب جاتا۔

''ٹرانسفر کرا لے ناں......'' اتنا آسان سا تو حل تھا جو ابو چٹکی بجاتے دے دیتے۔

''ٹرانسفر نہیں ہو سکتا...... اتنا آسان نہیں ہوتا یہ سب۔'' وہ اکتاہٹ آمیز لہجے میں جواب دیتا۔

''تو چھوڑ آ نوکری...... یہاں بہتیری نوکریاں ہیں۔''

''ایسا نہیں ہوتا...... آپ کو حالات نہیں

معلوم......" اور ابو ہزار طریقے بتاتے اور وہ ہزار دلیلیں دیتا سب کو رد کر دیتا۔

"تو آنا ہی نہیں چاہتا بوڑھے ماں، باپ کے پاس۔" ابو غصے سے اسے گھُرکتے۔

"ہاں ایسا ہی ہے...... آپ کو جو سمجھنا ہے سمجھ لیں۔" اور فون کھٹ سے رکھ دیا جاتا۔ ابو فون رکھ کر خوب روتے۔

"کیا کہتا ہے...... کیوں نہیں آنا چاہتا۔" رقیہ بیگم بھی ساتھ رونے لگتیں۔

"کہنا کیا ہے عدیم کی ماں...... اسے جو ملنا تھا ہم سے مل گیا...... اب بھلا وہ کیوں آنے لگا۔ یہاں زمین چاہیے تھی لے گیا، اب نہیں آئے گا۔"

تو امی اور زور و ں کا رونے لگتیں...... اور ابو ہنسنے لگتے۔

"تو روتی ہے، تجھے یہ تو پتا ہے کہ رونا ہے، مجھے تو سمجھ نہیں آتی روؤں یا ہنسوں......" اور وہ ہنستے، ہنستے پھر سے رونے لگتے۔

پھر آنے والے سارے دنوں میں ابو کبھی اسے یاد کر، کر کے ہنسنے لگتے اور کبھی رونے لگتے اور امی کو مخاطب کرتے۔

"اب تو مان جا نمامیے کہ تیرے بیٹے میں ہی کھوٹ تھا، بہو کا اتنا دوش نہیں...... جن بیٹوں میں ہی کھوٹ ہو وہاں آنے والیوں کو زیادہ محنت کیا کرنی۔" جواباً امی خاموش تھیں...... ان کے بودے دلائل بیٹے کے اطوار کے آگے شکست خوردہ تھے۔

☆☆☆

جب لبابہ آٹھویں جماعت میں گئی تو جلیل قیوم کی حالت ناروا ہوگئی اور وہ بستر پر پڑے، پڑے اسے بلاتے۔

"جب مر جاؤں گا تو آئے گا وہ......؟ اسے کہو آکر ایک بار مل جائے۔"

اور اس نے امی سے فون پر وعدہ کیا کہ وہ اگلے ہفتے ضرور چھٹی لے کر گھر آئے گا...... اس نے وعدہ ایفا کیا اور وہ آیا بھی مگر اس روز ابو کی سانس ساکن ہوگئی۔ خاموش آنکھوں سے محض آنسو گرنے لگے اور امی تو اس سے لپٹ، لپٹ کر روتی رہیں۔ اسے ابو کی ہر چھوٹی، بڑی بات بتاتی رہیں۔

"آخری وقت تک نظریں دروازے پر تھیں۔ منتظر ہی پتھرا گئیں۔"

بڑی خشمناک سی اسے مخاطب تک نہیں کیا...... وہ چار روز تک وہیں رہا تھا۔ سوئم کے بعد اجازت طلب کرنے امی کے کمرے تک آیا۔

"جا رہے ہو بیٹا۔" ماں نڈھال تھی۔

"کچھ چاہیے ہوا تو بتایئے گا امی۔" اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

"بیٹا چاہیے...... کہاں ملے گا؟"

اور وہ نظریں اٹھانا بھول گیا۔ امی غمگین سا مسکرا دیں۔

"جو مجھے چاہیے وہ تیرے بس میں کہاں بھلا...... تجھے میں نے یوں بھی کبھی دینا کہاں سکھایا تھا۔"

پھر وہ اجازت لے کر بیوی بچے سمیت لوٹ گیا تھا۔

امی، ابو کے بعد جیسے اکیلی پڑ گئی تھیں۔ چپ چاپ اور نڈھال...... تب ان کی نئی دوست بنی...... ان کی نواسی لبابہ...... وہ ماں سے زیادہ نانی سے چپکی رہتی...... اس کی ماں کو کم بولنے کی عادت تھی سو وہ ساری کہی سنی نانی سے کرنے لگی۔

"نانی، کیا امی بچپن سے ایسی ہیں؟" وہ سرگوشی میں نانی سے سوال کرتی مبادا کہیں ماں نہ سن لے۔

"کیسی......؟" نانی چونکیں۔

"ایسی چپ چاپ...... خاموش سی۔" اور امی نظریں بڑی پر جما دیتیں۔ یوں دیکھتیں جیسے پہلی، پہلی بار دیکھا ہو...... پھر انہیں احساس ہوتا کہ اس سے قبل کب انہوں نے بیٹی کو بغور دیکھا تھا انہیں یاد نہ تھا...... وہ ماضی میں کھوسی جاتیں پے در پے واقعات کی فلم سی چلنے لگتی۔ کیا کچھ نہ تھا ماضی کی چلتی ریل میں...... حق تلفی...... ناانصافی...... بیٹی کے آنسو اور ترستے ارمان اور بیٹے کی ہر خواہش کا احترام...... اور جب وہ ماضی سے حال میں سفر کر کے واپس آتیں تو ندامت کے آنسو اور

دکھ کے گھنیرے سائے.......بس......

احساس بھی عجب شے ہے......وقت پر کم، کم ہی ہوتا ہے، اس کا گشت تبھی ہوتا ہے جب وقت گزر جائے اور وقت گزر جانے کے بعد کا احساس پھر پچھتاوا اور ندامت ہوتا ہے مداوا نہیں۔

رقیہ بیگم کو رہ رہ کر احساس ستانے لگا کہ وہ بیٹے کی محبت میں بیٹی کا کہاں، کہاں حق غصب کرتی رہیں......وہ رونے لگتیں اور لبابہ خاموش کرانے لگتی۔ کبھی، کبھی وہ اسے گزشتہ آپ بیتی سنانے لگتیں...... کب، کب، کہاں، کہاں کیا ہوا تھا...... وہ سب...... اور وہ خاموشی سے نانی کا اعترافِ جرم سنتی جاتی۔

''مجھ سے بڑا گناہ ہوا بچی...... تیری ماں کی گناہ گار ہوں، وہ شاید ہی کبھی مجھے معاف کر پائے۔'' لبابہ انہیں خود سے لپٹا لیتی۔

''بیٹیاں بڑی اچھی ہوتی ہیں، بیاہ کر بھی اپنی روح میکے میں آباد چھوڑ جاتی ہیں جو اسی آنگن میں گھسن گھیریاں لیتی رہتی ہے...... ساتھ نبھانے والی، وفا دار۔'' کس موڑ پر آکر انہیں بیٹی کے مول معلوم ہوئے تھے۔

''پھر بھی مائیں بیٹوں سے کیوں زیادہ محبت کرتی ہیں نانی......'' لبابہ دور کاموں میں مصروف ماں کو نگاہوں میں سمو لیتی۔

''بیٹوں سے محبت زیادہ نہیں ہوتی، بس امیدیں زیادہ ہو جاتی ہیں۔'' وہ پھر سے کھو جاتیں۔ دونوں نانی نواسی گوئیوں کے مانند ساتھ، ساتھ بیٹھی دل ہلکا کرتی رہتیں اور ہدیٰ ان سے بے نیاز خاموشی سے اپنے کام نبٹاتی رہتی...... کبھی، کبھی لبابہ کو لگتا وہ عالمِ رویا میں جیتی تھیں جہاں ان کی پوری دنیا آباد تھی۔

سب کردار، کہانیاں، بھاگتے دوڑتے، جیتے جاگتے۔

☆☆☆

قلم مدار سے طومار میں فرجامِ زندگی رقم کرتا جا رہا تھا اور وہ ہمیشہ سے اسی فرض پر مامور رہا تھا۔ رقیہ بیگم اب ٹانگوں کے بجائے وہیل چیئر کے سہارے چلنے پھرنے لگیں...... لبابہ انہیں وہیل چیئر پر گھسیٹتی اندر باہر کرتی رہتی۔

کبھی سارا، سارا دن دروازے پر بیٹھی آنے جانے والوں کے چہرے تلاشتی رہتیں...... گمنام چہروں میں شناسا کھوجتیں۔

''لبابہ ماموں کو فون لگا دے۔ اسے کہہ مجھے صورت دکھا جائے۔''

ابھی دو ماہ قبل ہی تو وہ ہو کر گیا تھا۔ ماں کو ہزاروں مجبوریاں گنوا کر۔

''امی جی میری نوکری ہے، پرائیویٹ پریکٹس ہے، لمبی چھٹی نہیں لے سکتا میں۔ اوپر سے ابراہیم کی روز، روز کی سرگرمیاں...... ہاتھ سے نکل رہا ہے وہ...... بڑا دھیان رکھنا پڑتا ہے بیٹوں کا...... آئے دن ڈاکٹرز کی کانفرنس ہوتی ہے سو ملک سے باہر جانا ہوتا ہے۔ ایسے میں جلدی، جلدی چھٹی لے کر نہیں آسکتا میں۔''

''جلدی، جلدی فون بھی نہیں کر سکتا کیا؟'' امی اس کے چہرے کو نقش، نقش ازبر کرنے کی سعی میں لگی رہتیں۔

''وقت نہیں ملتا کبھی...... سمجھ لیں ناں امی...... میری مجبوری ہے۔'' اور وہ سب سمجھ جاتیں۔ کچھ وقت نہ ملتا اور کچھ بیوی سے اجازت...... سب ہی ساتھ، ساتھ تھا۔

''نانی...... بیل جاتی ہے اٹھاتے نہیں...... شاید کسی کانفرنس پر گئے ہوں گے۔'' اور رقیہ بیگم بند کلی کے مانند مرجھا جاتیں۔ پھر روز دروازے پر بیٹھی بیٹے کا انتظار کرتیں اور صبح سے شام ہو جاتی...... لبابہ انہیں مغرب کے قریب، قریب اندر لے آتی۔ تب وہ آسمان پر پرندوں کو غول در غول اڑان بھرتے ہوئے دیکھتیں اور دیکھتی چلی جاتیں...... ان کا وجود چرخِ پیر بن جاتا جہاں سے اڑان بھر کے جانے والا پکھیرو لوٹ کر نہ آتا تھا۔

''سب پرندے اندھیرا ہونے سے پہلے گھروں کو چلے جاتے ہیں...... میرا پکھیرو کیوں نہیں لوٹتا۔''

''ان پرندوں کو گھر کا راستہ یاد ہے نانی سو وہ لوٹ جاتے ہیں...... آپ کا بیٹا رستہ ہی بھول گیا تو کیسے لوٹے۔''

مغرب کا وقت امی کے لیے از حد اندوہ ناک ہوتا...... اس وقت روز کی بندھی آس مردہ ہو جاتی تھی اور انہیں لگتا کہ آس نہیں وہ خود مردہ ہو گئی ہوں جیسے...... اس وقت وہ روز اشکِ طفل بہاتیں اور پھر وہ دونوں مل کر بھی انہیں سنبھال نہ پاتی تھیں۔

''ابھی چند ہفتوں پہلے تو ماموں ہو کر گے ہیں نانی۔''

''چند ہفتوں۔'' نانی چونکیں...... ''نہ، نہ...... ڈھائی ماہ ہو گئے ہیں۔''

اب چونکنے کی باری لبابہ کی تھی...... نانی ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ اتنا ہی عرصہ گزر گیا تھا۔ بھلا انہیں اندازہ نہ ہوتا تو کیسے ہوتا۔

''تو اتنی محدود مدت میں ہی آپ بے قرار ہو گئیں؟'' نانی افسردہ سا مسکرا دیں۔

''اس عمر میں بے اعتباری ہر شے پر غالب آجاتی ہے ناں...... خاص طور سے زندگی سب سے بڑی فریب کار ہے۔ بس دل کرتا ہے کہ اولاد ہر دم آنکھوں کے سامنے رہے۔''

''ایسا کہاں ہوتا ہے نانی...... یہ دور اولاد کے عروج کا دور ہوتا ہے۔ وہ کہاں اپنے کام دھندے لپیٹ کر والدین کے لیے آتی ہے۔''

نانی بری طرح کھانسنے لگتیں۔

''ٹھیک کہا بچی...... کوئی اپنا عروج چھوڑ کر دوسروں کا زوال نبھاتے بھلا کیوں آئے؟''

لبابہ نانی کے جھریوں بھرے ہاتھوں کو تھام لیا اور آنکھوں سے لگا لیا۔

''تو پھر دل کو سمجھا کر رکھیں ناں...... اور جو رشتے پاس ہیں انہی میں خوش رہیں۔'' نانی نے اس کے مضبوط ہاتھوں کو چوم لیا۔

''میں اپنی بیٹی اور اس کی بیٹی سے خوش ہوں...... رضا مند ہوں، بس ایک خواہش ہے کہ ہدیٰ میری زیادتیوں کے لیے مجھے معاف کر دے۔''

اور باورچی خانے سے نکلتی ہدیٰ سانس لینا بھول گئی...... اس کی ماں اس سے معافی چاہتی تھی...... اسے وقتی غصہ ضرور تھا مگر وہ ماں سے حساب نہیں چاہتی تھی۔ کبھی نہیں...... وہ اسی وقت دوڑ کر اماں سے لپٹ گئی تھی۔

''میری اتنی اوقات کہاں ہے امی کہ میری ماں مجھ سے معافی مانگے...... وہ بہت معمولی باتیں تھیں امی، بھلا ان باتوں کی وجہ سے میں آپ سے خفا رہ سکتی ہوں۔''

''معمولی باتیں جمع ہو، ہو کر بڑی باتوں کا روپ دھار لیتی ہیں بیٹی...... وہی معمولی باتیں آج ان حالات...... کا پیش خیمہ بنی ہیں۔ مجھ سے تم دونوں کی پرورش میں کوتاہی ہوئی ہے اور رب کے ہاں تربیت میں...... ناانصافی کرنے والوں کی بھی ضرور پکڑ ہوگی...... جیسے دو بیویوں میں انصاف نہ کرنے والا شوہر مجرم ہوگا ٹھیک ویسے ہی دو اولادوں میں نا انصافی کرنے والے والدین بھی تو عاصی ہوں گے۔''

''میرا کوئی مجرم نہیں امی...... نہ آپ، نہ بھائی، نہ ابو......'' اور اس وقت وہ تینوں ایک دوسرے سے لپٹی رو رہی تھیں...... تین پیڑھیوں کے مشترکہ آنسو...... پھر جس روز لبابہ نے نانی کی ماموں سے فون پر بات کروائی اس دن بھی نانی بہت روئی تھیں سو اُن کی طبیعت بگڑ گئی...... پوری رات وہ اسپتال داخل رہی تھیں اور لبابہ ان کے پاس ٹھہری رہی۔ سرکاری اسپتال کی مخدوش حالت میں پڑی بڑے ڈاکٹر کی وہ ماں تھیں، اپنے بیٹے کی ڈاکٹری پر فخر تھا...... اب بھی فخر سے سب نرسوں کو بتا رہی تھیں کہ میرا بیٹا ڈاکٹر ہے۔ ساتھ کھڑی لبابہ کی آنکھیں سارا وقت نم ہی رہیں۔

دو روز اسپتال رہ کر نانی گھر آ گئیں اور جس روز گھر آئیں اسی روز پروانۂ اجل آ گیا۔

عدیم ماں کی وفات پر اپنی بیوی اور بیٹے کے ہمراہ عین جنازے کے وقت پہنچ گیا تھا...... سخت افسردہ اور پشیمان سا۔

''آپ کی ایک بڑی اچھی بات ہے ماموں کہ آپ کم از کم اپنے ماں، باپ کو کاندھا دینے آجاتے ہیں۔ ساری زندگی میں دینے والی واحد شے......'' لبابہ بجائے تعزیت کے بڑے نرم سے لہجے میں کہنے لگی۔

''تمہیں بڑوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔'' مامی کی تیوری چڑھ گئی۔ مگر لبابہ تو جیسے بہری بن گئی تھی۔

''میرے نانا آپ کا انتظار کرتے، کرتے چلے گئے......اور میری نانی بھی۔ جب اُن کے ہوتے ہوئے آپ انہیں سکھ دینے نہیں آتے تھے تو دنیا دکھاوے کے لیے اُن کے مرنے پر کیوں آجاتے ہیں۔''

''میں نوکری چھوڑ کر تو نہیں آسکتا تھا۔'' عدیم نے خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورا۔ وہ بالشت بھر لڑکی آخر کو تھی کون اس کا حساب کرنے والی۔

''اور جب نانا منتیں کرتے تھے کہ ٹرانسفر کروالو تو......وہ بھی آپ سے نہیں ہوتا تھا۔ صاف کہیں کہ آپ والدین کے قریب آنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ بات ترجیح کی ہوتی ہے اور والدین بھی آپ کی ترجیح میں شامل ہی نہیں رہے تھے۔''

''بس کرو لبابہ...... ان باتوں کا فائدہ کیا ہے؟'' ہدیٰ اسے ٹہوکا دینے لگی۔

''فائدے، نقصان کا مجھے نہیں پتا امی...... مگر کم از کم میرے دل کا بوجھ تو ہلکا ہوگا۔ اگر میں خاموش ہی رہی تو میرا دل پھٹ جائے گا۔'' اس نے ماں کی گرفت سے اپنا بازو چھڑایا۔

''اور آپ ماموں ایک بات یاد رکھیے گا کہ اللہ بہت حیا والا ہے۔ وہ والدین کے مجرم کو تب تک موت بھی نہیں بخشتا جب تک اس کے گناہوں کا بدلہ اسے دنیا میں ہی نہ دے، دے...... سو میں اس دن کا انتظار کروں گی۔'' ہدیٰ اسے خاموش کرواتی ہوئی بازو سے پکڑ کر گھسیٹ رہی تھی مگر وہ بولے چلی جارہی تھی۔ امیمہ اسے کینہ توز نظروں سے دیکھ رہی تھی اور ماموں پتھرائی ہوئی نظروں سے۔

''میں آپ کو بھی اس حال میں دیکھنے ضرور آؤں گی ڈاکٹر عدیم جلیل جس حال میں تڑپتے میں نے اپنے نانا، نانی کو دیکھا...... میں آؤں گی دیکھنے کہ جو ماں، باپ کو تڑپاتا ہے اسے اللہ کیسے تڑپاتا ہے...... میں ضرور آؤں گی وہ وقت دیکھنے۔'' وہ ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی۔

اور عدیم کتنی ہی دیر ان الفاظ کے سحرِ سامری میں گرفتار مورت بنا کھڑا رہا تھا۔

☆☆☆

وہ رقیہ بیگم کے جانے کے بعد بڑی خاموش ہوگئی تھی۔ بس چپ چاپ پڑھائی میں مگن رہتی یا ماں کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی، وہ جو نانی سے سوال کرتی تھی کہ کیا اس کی ماں ہمیشہ سے ایسی چپ چاپ رہتی آئی ہے، اپنے جواب تک پہنچ گئی تھی کہ انسان اکثر حالات کے تھپیڑے کھا، کھا کر خاموشی پر مجبور ہوجاتا ہے۔ جیسے وہ ہوگئی تھی کبھی کبھار بھولے بھٹکے جو ماں سے بات کرنے کے لیے وہ فون کرتا تھا اب وہ فون آنا بھی بند ہوگیا تھا۔

''امی ایک بات تو بتائیں......'' ایک روز وہ نانی کے تمام پرانے کاغذات نکال، نکال کر انہیں ترتیب وار رکھ رہی تھی۔ ان میں اس کے ماموں کی تعلیمی اسناد اور نتائج تھے۔ جنہیں اس کی نانی نے سینت، سینت کر متاعِ حیات کی طرح رکھا تھا۔ چند تصاویر تھیں جو ماموں کی ان کے دوستوں کے ہمراہ تھیں۔ وہ دھول صاف کر، کر کے انہیں سنبھال کر رکھتی جارہی تھی۔

''اگر میرا کوئی بھائی ہوتا تو آپ بھی اس کے اور میرے درمیان ایسا ہی سلوک روا رکھتیں جیسا نانی نے رکھا تھا؟'' ہدیٰ چونکی اور اسے دیکھتی چلی گئی۔

''کیا ہوا امی، ایسا مشکل سوال تو نہیں کیا......؟''

''کبھی نہیں......'' اس نے سختی سے لب بھینچ لیے۔

''وہ کیوں؟''

''بیٹیاں آبگینے سی نازک ہوتی ہیں، ان کا بڑا خیال رکھنا چاہیے۔ ان کی شخصیت کا جھول نسلوں کی شخصیت کا جھول ہے۔ آنے والی نسلوں کی آبیاری

میں محض ان کا جسم نہیں روح بھی خرچ ہوتی ہے...... کہیں ذرا سی بھی کمی پھر نسل در نسل چلتی ہے سو ایک بیٹی کی حق تلفی دراصل نسلوں کی حق تلفی ہے۔''

لبابہ محویت سے تکتی...... ماں کو سن رہی تھی۔

''اور اگر میں نہ پیدا ہوتی تو آپ کو طلاق نہ ہوتی ناں امی؟'' اور ہدیٰ آنسو پیتی سر جھکا کر پالک کترنے لگی۔

''رحمت کو ٹھکرانے والوں پر رحمان پھر بھی رحمت نہیں بھیجتا ناں۔'' اس کے لہجے کی آنچ سے ہدیٰ کا دل آنسوؤں کی صورت پگھلنے لگا۔

''کچھ لوگ قطعاً رحمت کے حقدار نہیں ہوتے...... ایسے لوگوں کو پھر دکھا دینا چاہیے کہ رحمت کسے کہتے ہیں۔'' اس نے غصے سے تمام سامان واپس صندوق میں پٹخ دیا۔

☆☆☆

وہ اپنے علاقے کے بہترین ڈاکٹرز میں شمار ہوتا تھا اور اس کے لیے جہاں اس نے خود بڑی پی آر بنائی تھی وہیں اس کے سسر کی پی آر کا بھی بڑا دخل تھا...... ترقی کے مواقع تو اسے ہاتھوں ہاتھ ملتے چلے گئے تھے۔ وہ لمبی ریس کا گھوڑا بن چکا تھا جسے بہت سارا دوڑنا تھا اور دور تک دوڑنا تھا۔

ایسے میں باپ کی ڈیمانڈ کہ وہ ٹرانسفر کروالے اسے سخت کوفت کا شکار کر دیتی...... وہ یہاں سیڑھی پکڑ، پکڑ کر اوپر چڑھنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہا تھا اور ابو اسے پکڑ کر نیچے کھینچنے کے درپے تھے۔

''خود تو ساری زندگی کلرک رہے ہیں اب بیٹے کو تو آگے بڑھنے دیں۔'' امیمہ بس اسی قسم کے جملے کستی رہتی تو عدیم اور کڑھتا۔

''اپنی زندگی تو گزار چکے ہیں...... ہمیں سکون سے جینے کیوں نہیں دیتے۔ کیا چاہتے ہیں کہ اپنا کیریئر، نوکری چھوڑ کر ہم اُن کے قدموں سے لگ کر بیٹھ جائیں۔''

اور اس کے انہی جملوں سے عدیم کی ذہن سازی ہوتی رہی تھی۔ پھر اس کے پاس یہی حربہ ہوتا کہ باپ کا فون آنے پر وہ بیوی سے کہہ دیتا کہ اسے فون نہ پکڑائے کچھ بھی کہہ دے۔ کوئی بھی بہانہ کر دے...... سو اس کی بیوی بہانے گھڑ لیتی اور وہ مڑ کر فون بھی نہ کرتا۔

''کیا کرنا ہے فون کر کے...... وہی شکوے شکایات، ٹرانسفر کروانے کی باتیں، رونا دھونا، بندہ تھکا ہارا آئے تو ایسی باتیں سننے کا کس کے پاس وقت ہوتا ہے یار۔''

وہ احتراز ہی برتتا رہا اور ابو انتظار کرتے، کرتے چلے گئے۔ ابو کی وفات پر اس کو ندامت، دکھ، پچھتاوا، سب کچھ تھا مگر وقت نے گرد جما دی تو سب دب گیا۔

وہ ماں کے ساتھ بھی کچھ، کچھ پہلے جیسا ہو گیا...... تاہم وہ اب ہفتے ڈیڑھ ہفتے بعد فون کر لیتا تھا، ہاں ماں کی جانب سے فون آتا تو بات کر لیتا...... آٹھ دس ماہ بعد گھر کا چکر بھی لگا جاتا تھا۔ کچھ اسے ماں کی دعاؤں کی بھی ضرورت پڑنے لگی تھی۔

''امی جی ابراہیم کے لیے ہدایت کی دعا کیا کریں...... اس کی پڑھائی میں دلچسپی ہے اور نہ ہی گھر میں...... نہ جانے کن سرگرمیوں میں مشغول رہتا ہے۔'' وہ اپنے بیٹے کے لیے فکر مند تھا اور امی اپنے بیٹے کے لیے۔

''پورا دن دعائیں ہی کرتی ہوں بیٹا...... اپنی اولاد کی ہدایت کے لیے بھی اور ان کی اولاد کی ہدایت کے لیے بھی...... پہلی دعا قبول ہو گئی تو دوسری خود بخود ہو جائے گی۔''

امی ایسی بات کر دیتی تھیں کہ وہ بولنے کے قابل ہی نہیں رہتا تھا۔ اس نے ایک آدھ بار امیمہ سے اس موضوع پر بات بھی کی تھی کہ انہیں امی کو اپنے ساتھ رکھ لینا چاہیے...... امیمہ بڑی ہوشیاری سے بات سنبھال لیتی تھی سو اب بھی یہی کیا۔

''ہاں عدیم...... کیوں نہیں، وہ آپ کی ماں ہیں...... پورا حق ہے اُن کا مگر پھر انہیں مسئلہ ہوگا...... آئے دن ہمارے باہر کے ٹور لگتے ہیں تو وہ پیچھے نوکروں کے رحم و کرم پر ہوں گی۔ پھر آئے دن ہماری

گیدڑ رنگ ہوتی ہیں۔ وہ پیچھے اکیلی رہ جائیں گی۔ وہاں کم از کم ان کی نواسی اور بیٹی ساتھ تو ہوتی ہیں ناں۔''

عدیم کو بیوی کی باتوں پر یوں بھی قلب الیقین تھا سو امی کو وہاں بلانے اور ساتھ رکھنے کا ارادہ منسوخ کر دیا گیا۔

وہ دولت کے چکر میں گھن چکر بنا ہوا تھا اور دوسری طرف اس کا اکلوتا بیٹا اور ہی چکروں میں پڑا تھا...... بہت چھوٹی عمر سے ہی اس نے پڑھائی میں عدم دلچسپی کا اظہار کر دیا تھا۔ امیمہ حیران رہ گئی تھی۔

''باپ کی ناک کٹواؤ گے؟ کچھ تو خدا کا خوف کرو، تمہارے باپ نے کتنے خواب دیکھ رکھے ہیں تمہارے حوالے سے ابراہیم...... بھلا پڑھائی نہیں کرو گے تو کیا کرو گے؟ کیا حیثیت ہو گی تمہاری۔''

''مما مجھے اتنی محنت کی ضرورت کیا ہے...... بابا کا اتنا بینک بیلنس ہے اسے میں نے ہی تو استعمال کرنا ہے۔'' اس نے بڑی بے پروائی سے شانے اچکائے تھے۔

اور امیمہ اس کے نادر خیالات پر حیران سے کہیں زیادہ پریشان ہو جاتی تھی۔

ابراہیم نے بڑی منتوں کے بعد ایف اے تک پڑھا تھا اور اس دوران بھی وہ بہت قابل اعتراض سرگرمیوں میں ملوث ہو گیا تھا۔ اس نے دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کرتے ہوئے سگریٹ اور گٹکا استعمال کرنا شروع کر دیا تھا...... وہ علاقۂ ممنوع میں بھی آنے جانے لگا تھا اور اس کی بہت سی لڑکیوں سے دوستی بھی ہو گئی تھی...... باپ کما کما کر جمع کرتا تھا اور بیٹا اڑاتا پھر رہا تھا۔ اور وہ خود کو کسی قسم کی جواب طلبی کا بھی روادار نہ سمجھتا۔

جب رقیہ بیگم چند روزہ علالت کے بعد داغِ مفارقت دے گئیں تب عدیم نے اپنی بھانجی کو خود پر ہسٹریائی انداز سے چلاتے سنا تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی کسی کو بھی خود پر اس انداز سے، ان الفاظ سے چلاتے نہیں دیکھا تھا...... وہ اسے جو کچھ بھی سنا رہی تھی وہ الفاظ بددعا سے بھی زیادہ شدید تھے۔

وہ جب سے واپس آیا تھا بہت دنوں تک ذہنی انتشار کا شکار رہا تھا...... لبابہ کے الفاظ اسے ثعبان کی طرح لپیٹ میں لیے ڈستے رہتے تھے۔ وہ خود کو سمجھاتا کہ وہ ماں، باپ کا نافرمان تھوڑا ہی تھا جو اسے کسی قسم کی شرمندگی ہے پھر اس کا دل ہی بیٹھنے لگتا۔

''جو کچھ تم نے کیا وہ حسنِ سلوک میں بھی تو نہیں آتا۔'' اور وہ پھر سے مضطرب ہو جاتا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی کارگردگی

متاثر ہونے لگی تھی۔ کیونکہ اس کا ذہن متاثر ہونے لگا تھا...... جس لمبی ریس کا گھوڑا بنا وہ دوڑ رہا تھا یک دم وہ اس سے باہر ہو گیا تھا...... اور یہ چیز اس کے لیے زیادہ تکلیف کا باعث بن رہی تھی۔ وہ نسیان کے عارضے میں مبتلا ہو چلا تھا اور کثرت سے باتیں بھولنے لگا تھا مگر اسے وہ سب باتیں ازبر تھیں جو اس کے والدین کے متعلق تھیں...... ابھی اس کی ریٹائرمنٹ کا وقت نہیں تھا مگر اس نے ریٹائرمنٹ لے لی تھی۔ جو سرکاری گھر انہیں اسپتال کی طرف سے ملا ہوا تھا وہ بھی چلا گیا تھا۔ ان کا اپنا گھر جو گجرات میں کرائے پر چڑھا ہوا تھا اب وہ حیدر آباد سے سیدھے اِدھر چلے آئے تھے...... اس گھر میں آئے ابھی انہیں سات ماہ ہی گزرے تھے کہ عدیم پر فالج کا اٹیک ہوا اور وہ مکمل طور پر بستر سے لگ گیا تھا۔ کھانا پینا اور ساری ذمے داری امیمہ پر آن پڑی تھی۔

انہی دنوں ابراہیم نے انہیں قریبی علاقے میں ایک بڑے سے بنگلے میں چند ضروری سامان سمیت یہ کہہ کر منتقل کر دیا کہ اسے گھر کی ضروری مرمت کروانی ہے...... ہر ہفتے دس دن بعد وہ سودا سلف ڈلوا جاتا اور پھر ایک روز وہ گھر کے کاغذات لے کر آیا تھا...... باپ سے دستخط کروانے۔

امیمہ دکھ سے گویا ڈھے ہی گئی۔

''ساری جائداد میری ہی تو ہے مما...... ابھی ہو یا بابا کے مرنے کے بعد...... مجھے ابھی ضرورت ہے تو اس میں کیا حرج ہے؟'' اس نے سفاکی کی انتہا کر دی تھی۔

''جب باپ گزر گیا تب بھلے آجانا اپنا حصہ وصول کرنے مگر ابھی وہ زندہ ہے۔''

''ہاں تو بابا نے کون سا دادا ابو کے گزرنے تک کا انتظار کیا تھا جو آپ مجھے انتظار کرنے کے لیے کہہ رہی ہیں۔'' اور امیمہ کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ وہ اپنا موزانہ اپنے باپ سے کر رہا تھا اور شاید ٹھیک کر رہا تھا...... اس کے باپ کی ہی منتقل وارثت تو تھی جس کا حوالہ وہ دے رہا تھا۔

''میں شادی کر رہا ہوں مما اور مجھے گھر اپنے نام کروانا ہے...... مجھے بھی تو آگے جواب دہ ہونا ہے کہ میرے پلے کچھ تو ہے، کنگلا نہیں ہوں میں۔''

وہ دوسرا صدمہ تھا جس نے واقعتاً امیمہ کو گرا دیا تھا۔ بائیں جانب ایک ٹیس سی اٹھی تھی۔

''تم خود سے شادی کر رہے ہو...... بتایا نہ پوچھا...... ہمارے کتنے ارمان تھے بیٹا...... ان سب کا کیا؟''

''آپ نے اپنی زندگی گزار لی ہے مما، میرے ارمان آپ کے نزدیک اہم ہونے چاہئیں نہ کہ اپنے۔'' اور کم و بیش اسی قسم کے الفاظ وہ اپنے ساس، سسر کے لیے بولتی تھی جو آج بیٹا اس کے منہ پر مار رہا تھا۔

''ہمیں ساتھ بھی نہیں رکھو گے؟'' آخری امید...... امید سے کیا سوال اس نے تلخی سے ماں کی صورت تکی۔

''آپ نے اپنے ساس، سسر کو اپنے ساتھ رکھا تھا؟'' وہ جواب نہیں تھا، وہ ان طمانچوں کا جواب تھا جو وہ ماضی میں اپنے ساس، سسر کے منہ پر مارتی رہی تھی۔

''جانے دو، اسے امیمہ...... اس کا قصور نہیں۔ گندم کی بوائی پر خوشہ بھی گندم کا ہی نکلتا ہے۔'' اس وقت سامنے ان کا بیٹا نہیں قدرت کا وہ مجسمہ کھڑا تھا جس کی چابی کسی اور کے ہاتھ میں تھی اور وہ وہی کہتا جاتا تھا جو اس سے کہلوایا جا رہا تھا۔ عدیم جلیل نے دستخط بھی کر دیے اور اسے اجازت بھی دے ڈالی۔

☆☆☆

''اسے کہو آئے...... آجائے۔'' وہ ہر روز مغرب سے پہلے چیخنے لگتا۔

''او بڑی تکلیف ہے، بڑی تکلیف ہے۔'' نہ جانے کیوں روز اس وقت اندر الاؤ روشن ہو جاتا...... بے حد اضطراری کیفیت میں، ٹیڑھے منہ سے وہ چلّانے لگتا۔

''وہ نہیں فون اٹھاتا...... تو کیا کروں میں؟'' امیمہ بے بسی سے شوہر کے منہ سے ٹپکتی رال صاف کرتی۔

''بڑی تکلیف ہے۔'' وہ سینہ مسلنے لگتا۔

اور ان دونوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ روزانہ اس وقت عدیم جلیل کی تکلیف کیوں بڑھ جاتی تھی۔

''وہ کہتا ہے کہ میں نافرمان اولاد نہیں ہوں، بس میری اپنی زندگی ہے جو میں اپنے طریقے سے جینا چاہتا ہوں۔''

اور عدیم جلیل روتے، روتے ہنسنے لگتا......

''کم بخت ٹھیک ہی کہتا ہے۔ اس کا باپ بھی یہی کہتا تھا۔'' اس کے منہ سے نکلے الفاظ امیمہ بہ مشکل سمجھ پاتی۔ وہ پھر سے رونے لگتا۔

اب وہ مہینے میں ایک بار آتا اور ضروری سامان ڈلوا کر جاتا۔

''اسے فون کرو امیمہ...... اسے کہو کے آجائے...... اب تو آجائے...... بڑی تکلیف ہے۔''

''کہہ چکی ہوں، نہیں آتا وہ۔'' امیمہ سر تھام لیتی۔

''میں ابراہیم کی بات نہیں کر رہا۔''

''تو پھر......؟'' امیمہ چونکی۔

''میں اس کی بات کر رہا ہوں جو کہتی تھی کہ وہ آئے گی...... ضرور آئے گی یہ دیکھنے کہ والدین کو تڑپانے والے کو اللہ کیسے تڑپاتا ہے...... اسے کہو اب آجائے...... آکر دیکھ لے۔''

اور اس وقت امیمہ ساکت پتلیوں سے شوہر کو دیکھتی رہ گئی۔

پھر امیمہ نے بہت فون کیے مگر وہ ٹال جاتی کہ آئے گی مگر نہیں آتی تھی۔ عدیم جلیل اب ابراہیم کے بجائے اس کا منتظر رہنے لگا۔ امیمہ نے فون پر اس کی بہت منتیں کی تھیں۔

''اسے کہو کہ مجھے آکر دعا دے دے...... بڑی تکلیف ہے۔ ایک بار آجائے...... بس ایک بار...... وہ نہیں آئے گی تو مجھے موت کیسے آئے گی۔''

پھر ایک روز وہ آگئی...... اپنی ماں کے ساتھ، بانجھ نظروں سے اسے دیکھنے...... دل دریدہ کرنے۔

''دیکھو مجھے...... میں عفریت کی مثال، قابلِ تنفر...... ابو الہول سا خوفناک...... میں سورما...... میں

وفادار کون

ضروری نہیں کہ آپ کا کتا ہی وفادار نکلے...... ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ آپ کا وفادار بھی کتا نکل آتا ہے۔

از: سائرہ، راول پنڈی

پاپی......'' وہ چلاتے اور سینہ کوبی کرنے لگا۔

وہ خاموش رہی۔

''ہدیٰ تم اپنی زمین کا ٹکڑا لے لو...... میرا بھی لے لو، بس اسے کہو کہ مجھے دعا دے دے، مجھے سکون مل جائے گا۔'' ہدیٰ اکلوتے بھائی کو اس حال میں دیکھ کر رونے لگی۔

''میں اپنی نانی کے مانند بے مول دعائیں دیتی ہوں ماموں۔'' بے تاثر آنکھیں تا حال ان کے وجود پر گڑی تھیں...... چھیدتی ہوئی۔

''کیا بہ یہ میری ماں کا بڑا لاڈلا تھا...... اسے دعا دے دے، اپنی بددعا سے بدل دے۔'' ہدیٰ نے بیٹی کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

''امی......'' اس نے لپک کر ماں کے تھام لیے۔

''میری کیا اوقات کہ میں بددعا یا دعا دوں کسی کو۔'' اب کے وہ رو رہی تھی۔ ''یہ مکافاتِ عمل ہے، دنیا کی سب خطاؤں کی سزا رب آخرت پر اٹھا رکھتا ہے۔ سوائے والدین کے ساتھ ناروا سلوک کے...... ایسا مجرم دنیا کی سزا بھی پاتا ہے اور آخرت کی بھی...... یہ قانونِ فطرت ہے امی۔ میری بددعا نہیں۔'' اس نے نمناک نظروں سے ماموں کو دیکھا جس کے سینے سے چرخی کی گھرر گھرر سی آواز اٹھتی تھی گویا پورا کارخانہ چل رہا ہو۔

''بولیں کیا دعا دوں میں آپ کو...... اگر میری دعا سے سکون ملنے والا ہے تو میں بخل نہیں کروں گی۔ جھولی بھر بھر کر دوں گی۔ میری ماں نے مجھے دینا سکھایا ہے۔''

''دعائے قضا کر دے۔'' عدیم جلیل رونے لگا۔

اور وہ اپنی جگہ سے ہلنے کے قابل تک نہیں رہی تھی۔
"میں دعا کی بات کر رہی ہوں۔ آپ بددعا کا کیوں کہہ رہے ہیں؟" کتنے جتنوں سے وہ بولی تھی۔
وہ ہنسنے لگے۔ اور پھر رونے لگے۔
"میں بھی دعا کا ہی کہہ رہا ہوں۔"
وہ اٹھ کر اُن کے بستر کی پائنتی پر ٹک گئی۔
"جانتے ہیں ماموں وہ دونوں جاتے، جاتے بھی آپ کو نواز کر ہی گئے اور آپ جانے کے لیے بھی مانگنے آ گئے۔" اس کے آنسو گالوں سے بہتے ہوئے عدیم جلیل کے ہاتھوں پر ٹپکنے لگے تو انہیں سکون سا ملنے لگا...... پوتر پانی...... گناہوں کو دھونے والا...... بشر کو مصفیٰ کرنے والا۔
"نانا ابو کی آنکھیں بند ہونے سے پہلے آپ کو تکتی رہیں اور پھر نانی امی کو کہنے لگے......" عدیم کی ماں بیٹے سے کہنا پھول پھینکتے ہاتھ کبھی کانٹے نہیں چبھوتے...... پدر گل بار ہوتا ہے۔ فرزند کے لیے خار نہیں چاہ سکتا...... ولدِ عدیم نے سب کہا سنا معاف کیا۔"
اور عدیم زار زار رونے لگا...... یہ سب تو ہدیٰ بھی نہیں جانتی تھی جو لبابہ بتا رہی تھی۔ وہ کیا، کیا سینے میں دفن کیے جی رہی تھی۔
"اور جب نانی پرندوں کو دیکھتی تھیں تو آپ کو یاد کرتی تھیں کہ میرا پکھیرو اڑ گیا...... وہ کہتی تھیں کہ ماں، باپ بچے کو اڑنا چگنا خود سکھاتے ہیں...... تاکہ وہ خود مختار ہو سکے...... پھر ایک دن آتا ہے جب بچہ پُھر سے اڑ جاتا ہے...... صحیح بات ہے اڑے گا نہیں تو کھائے گا کہاں سے...... رزق تو تلاش کرنا ہی ہوتا ہے بس آشیانہ نہیں بھولنا چاہیے......" اس نے دونوں ہاتھوں کی پشت سے اپنے گال رگڑے...... عدیم جلیل تو یہ بھی نہ کر سکا۔
"جب میں اسپتال میں تھی اُن کے ساتھ تو انہوں نے مجھے پاس بٹھا کر کہا تھا کہ تم میری وصیت کی امین ہو...... میرے بیٹے کو کہنا کہ دنیا کے لیے تو تیری ماں نے ہڈیاں نچوڑ کر بھی تجھے دے دیں، اگلے جہاں کے لیے بھی وراثت تیرے سپرد کرتی ہوں...... میرے بیٹے تجھے لینا آتا تھا اور ماں کو دینا...... سو میں وراثت میں تیرے لیے بخشش چھوڑے جا رہی ہوں...... تیری یہ وراثت تجھے اگلے جہاں میں بھی کامیاب کرے گی جیسے دنیا میں تو کامیابی ہی سمیٹتا رہا بالکل ویسے ہی۔"
اور ہدیٰ اپنے ماں، باپ کی اس امین کو اشک بار آنکھوں سے دیکھے چلی گئی۔
"ماموں، بڑی قسمت والے ہیں امی اور جن کی قسمت میں والدین کے آخری لمحات کی دعائیں اور بخشش آ جائے انہیں کون سی بددعا لگتی ہے پھر۔"
وہ زور، زور سے ہنسنے لگی۔ اپنے نانا کی یہی ادا اسے کچوکے لگاتی تھی۔ ہنس، ہنس کر رونا اور رو، رو کر ہنسنا...... اور سامنے بستر پر پڑا نیم مردہ وجود بھی یہی کر رہا تھا۔
"اب آپ کو بھی سمجھ نہیں آ رہی ناں ماموں کہ پہلے ہنسیں یا پھر پہلے روئیں...... نانا کو بھی سمجھ نہیں لگتی تھی۔" وہ اٹھ کر ماں کے برابر آ کر کھڑی ہو گئی۔
"میری دعا ہے کہ اللہ آپ کے لیے آسانی پیدا کرے۔" وہ بددعا ہی اِک دعا تھی...... عدیم جلیل زور، زور سے ہنسنے لگا۔ امیمہ اور ہدیٰ ساتھ لپٹ کر رونے لگیں اور لبابہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔
سامنے کھلے دروازے سے سفید لباس میں ملبوس کافوری خوشبو میں لپٹے امی، ابو انہیں وا کیے چلے آئے تھے...... وہ اپنے وجود کو ہلکا بہت ہلکا محسوس کرنے لگا...... پرندے کے پر سا ہلکا...... پروا کے سنگ ڈولتا ہوا...... امی کے آنچل سے لپٹا ہوا...... یہ کیا ہو رہا تھا۔؟ کیوں ہو رہا تھا؟ ایسا سرور...... کیسا سرور تھا وہ؟ اس نے امی، ابو کی جانب دیکھا۔ وہ مسرور سے اس کے ساتھ کے خواہاں تھے۔ اب اسے کہیں اور نہیں جانا تھا۔ اسے اپنے ماں باپ کے سنگ رہنا تھا...... ہمیشہ، دائمی...... وہ پُرسکون ہو گیا...... اور وہ سکون کیا تھا...... ہاں سکون...... اٹل...... ابدی سکون......



شمع ہدایت

اختر شجاعت

امر بالمعروف و نہی عن المنکر ...... حکم الٰہی

تمام تعریفیں اللہ رب العزت کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے جو ہر مخلوق کا خالق، ہر چیز کا مالک، وارث کوئی چیز اس کے علم سے پوشیدہ نہیں وہ ہر چیز پر حاوی اور ہر چیز پر نگہبان ہے۔

اے اللہ! تو یہی ہے کہ تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں جو ایک اکیلا یکتا و یگانہ ہے...... تو ہی وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی بخشنے والا...... معاف کرنے والا، مغفرت کرنے والا نہیں...... تو کریم اور دائم و جاوید ہے...... تو جمال و بزرگی اور عظمت و ستائش والا ہے۔ اے اللہ......! ہماری مدد فرما...... کہ ہم بے ہودہ باتوں کی طرف کان نہ لگائیں۔ فضول چیزوں کی طرف نگاہیں نہ اٹھائیں...... کہ اور نہ حرام کی طرف ہاتھ بڑھائیں...... نہ امر ممنوع کی طرف پیش قدمی کریں اور نہ تیری حلال کی ہوئی چیزوں کے علاوہ ہمارے شکم قبول کریں...... اور نہ تیری بیان کی ہوئی باتوں کے سوا ہماری زبانیں گویا ہوں...... صرف ان چیزوں کے بجالانے کا بار اٹھائیں جو تیرے ثواب سے قریب کریں اور صرف ان کاموں کو انجام دیں جو تیرے عذاب سے بچالے جائیں...... پھر ان تمام اعمال کو ریاکاروں کی ریاکاری اور شہرت پسندوں کی شہرت پسندی سے پاک کردے اس طرح کہ تیرے علاوہ کسی کو ان میں شریک نہ کریں اور تیرے سوا کسی سے کوئی مطلب نہ رکھیں۔

اے اللہ! نبی کریمؐ ...... پر اور ان کی آل پر ان کے اصحاب پر رحمت نازل فرما...... آمین۔

آج کا موضوع ”امر بالمعروف و نہی عن المنکر......“ ہے جس کے معنی ہیں۔ ”بھلائی کا حکم دینا اور برائی سے منع کرنا۔“

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو تخلیق کرنے کے بعد انسان کو کامل بنانے کے لیے اس کی ہدایت و رہنمائی کے لیے پیغمبر اور رسول بھیجے کہ وہ لوگوں کو اللہ کی طرف بلائیں، نیکی کی تلقین کریں اور برائی سے روکیں...... پھر حضور اکرمؐ ...... پر نبوت کو ختم فرمایا...... اور پھر امر بالمعروف کا یہ منصب اپنے محبوب رسولؐ کی امت کے سپرد کیا کہ مسلمان اس اہم فریضہ کو انجام دیں۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دین کا مرکزی نقطہ ہے...... اسی نقطے کی تشریح کے لیے انبیائے کرام نے اللہ تعالیٰ کے احکامات اس کے بندوں تک پہنچائے اور جب انبیائے کرام کی بعثت کا سلسلہ منقطع ہوا تو اس فریضے کی ذمے داری اولیا اللہ و صدیقین و صالحین کے سپرد ہوئی، اسلامی زندگی میں اس بات کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ اگر اس سے بے توجہی اور غفلت برتی جائے لوگ نہ اس کا علم حاصل کریں اور نہ اسے عملی حیثیت دیں تو نبوت کے مقاصد ہی فوت ہوجائیں۔ دین کی بنیادیں کمزور پڑجائیں، معاشرے کی رگوں میں سستی، گمراہی، جہالت اور بگاڑ پھیل جائے، نظام معاشرت لاقانونیت اور انارکی کے سامنے بے بس ہوجائے...... اللہ کے بندے ہلاکت میں مبتلا ہوں اور یہ احساس ہی جاتا رہے کہ ہمارے قدم گمراہی کی طرف بڑھ رہے ہیں...... افسوس صد افسوس! ہمارے اندیشے حقیقت بن چکے ہیں۔ اس بنیادی شعبے کا علم بھی مٹ گیا ہے اور عمل بھی آخری سانس لے کر رخصت ہوچکا ہے...... نہ اس کی حقیقت کا وجود ہے نہ اس کا نام و نشان باقی ہے۔ دلوں نے مخلوق کی قید اختیار کرلی ہے اور خالق کی قید سے نکل چکے ہیں...... اپنے ہی جیسے انسانوں کی

مدافعت کرنا ان لوگوں کا شیوہ بن چکا ہے۔ جنہیں انبیا کی وراثت ملی لیکن وہ اس کے اہل ثابت نہ ہوسکے یہ لوگ خواہشاتِ نفس کی اتباع میں جانوروں سے سبقت لے جانے میں مصروف ہیں۔ روئے زمین پر ایسا مخلص اور سچا پکا انسان ڈھونڈے نہیں ملتا جو اللہ تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی اور خالقِ کائنات کے احکام کی بجا آوری میں ملامت کے تیروں اور طعن و تشنیع کے خنجروں کی پروانہ کرے...... جو لوگ اس خلا کو پُر کریں گے وہ بلاشبہ اجر عظیم کے مستحق ہوں گے۔ ارشاد باریِ تعالیٰ ہے کہ ''لوگوں کی ہدایت کے لیے تمہیں بہترین امت بنا کر پیدا کیا گیا۔'' اس آیت میں دوسری امتوں سے افضلیت اور برتری بیان کی گئی ہے...... اس امت کی کچھ ہستیاں بہت زیادہ کمال کی مالک ہیں، مثلاً صحابہ کرامؓ جو ہر لحاظ سے ممتاز ہیں...... فرمانِ الٰہی ہے کہ ''تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔'' اس آیت کے چند الفاظ سے ظاہر ہے کہ یہ امت دوسری اُمتوں سے ممتاز اس لیے ہے کہ اس کے افراد نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں اور اللہ پر ایمان رکھتے ہیں...... اگر اس نے ان صفات کو چھوڑ دیا تو ان کی افضلیت ختم ہوجائے گی۔

خود پروردگار کو اس بات کا کتنا اہتمام ہے...... ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''تم لوگوں میں ایک ایسی جماعت ضرور ہونی چاہیے جو خیر کی طرف بلائے، اچھائیوں کی تلقین کرے اور برائیوں سے منع کرے وہی لوگ کامیاب ہیں۔'' (سورۂ آل عمران)

دوسری جگہ ارشاد ہے...... ''تم لوگ بہترین امت ہو معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو۔'' (سورۂ آل عمران)

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے اوصاف بیان کیے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ ''مومن معروف کا حکم کرنے والے اور منکر سے روکنے والے ہیں۔'' اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی ایک قوم کے بارے میں جس پر اللہ نے لعنت کی تھی اس کے اوصاف بیان کرتے ہوئے ذکر فرمایا کہ ''وہ لوگ برائیوں سے نہیں روکتے تھے یعنی وہ آپس میں ایک دوسرے کو منع نہیں کرتے تھے۔'' (سورۂ مائدہ)

نبی اکرمؐ...... نے فرمایا...... بے شک پہلا عیب جو بنی اسرائیل میں واقع ہوا تھا وہ یہ تھا کہ ایک آدمی اپنے دوسرے بھائی کو گناہ کرتے دیکھتا تو اس کو منع کرتا تھا اس کے بعد وہ وقت آیا کہ انہوں نے منع کرنا چھوڑ دیا یہ سوچ کر کہ کل کو یہ خود بھی اس گناہ میں اسی کی طرح مبتلا ہوگا اور اس گناہ گار کا ہم پیالہ وہم نوالہ ہوگا...... لہٰذا اللہ نے ان کے دلوں کو ایک دوسرے پر ماردیا...... (یعنی سب کو ایک جیسا کردیا)

☆☆☆

بنی اسرائیل کے کافروں پر حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کی زبانی لعنت کی گئی ہے اس وجہ سے وہ نافرمانیاں کرتے تھے اور حد سے آگے بڑھ جاتے تھے۔ ایک دوسرے کو برے کاموں سے جو وہ کرتے تھے روکتے نہ تھے۔ یقیناً وہ بہت برا (عمل) تھا۔ ان میں سے بہت سے لوگوں کو آپ دیکھیں گے کہ وہ کافروں سے دوستیاں کرتے ہیں اور جو کچھ انہوں نے اپنے لیے آگے بھیج رکھا ہے وہ بہت برا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے ناراض ہوا اور وہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے اگر انہیں اللہ تعالیٰ پر اور نبی پر اور جو نازل کیا گیا ہے اس پر ایمان ہوتا تو یہ کفار سے دوستیاں نہ کرتے لیکن ان میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں۔'' (سورۂ مائدہ 78 تا 81) حضور اقدسؐ کا فرمان ہے کہ ''تم میں سے جو کوئی برائی کو دیکھے اسے چاہیے کہ بازو کی قوت سے اسے ختم کردے اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے اس کا رد کردے اگر اس کی بھی طاقت نہیں تو دل سے برائی کو برا جانے یہ اہلِ ایمان کا کمزور ترین فعل ہے۔''

بعض علما کا فرمان ہے قوت سے برائی کا خاتمہ کرنا حکمرانوں کی ذمے داری ہے، زبان سے علما کی اور دل سے عوام کی...... بعض کا قول ہے جو بھی اس پر قادر ہو اس پر لازم آتا ہے کہ اسے بدل دے۔

فرمانِ الٰہی ہے کہ...... ''نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے سے تعاون کرو...... مگر برائی اور ظلم میں تعاون نہ کرو۔''

ایک حدیث قدسی ہے کہ جب کسی نے میری سنت

کی خلاف ورزی کرنے والے کو ڈانٹ پلائی اللہ اس کا دل ایمان سے بھر دے گا جو ایسے شخص کی توہین کرے گا اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن بے خوف کر دے گا اور جس نے نیکی کا حکم دیا اور برائی سے روکا وہ زمین پر اللہ تعالیٰ، کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خلیفہ ہے۔ حضرت حذیفہؓ کا قول ہے کہ عنقریب ایک ایسا وقت آنے والا ہے جب لوگوں کو نیکی کا حکم دینے والے اور برائیوں سے روکنے والے شخص کی نسبت گدھے کا مُردار زیادہ پسند ہوگا......

حضرت موسیٰؑ نے عرض کیا...... اے پروردگار! جو اپنے بھائی کو نیکی کی دعوت دے اور برائی سے روکے اس کا اجر کیا ہے......؟ فرمایا...... میں اس کی بات یعنی ہر کلمہ پر سال کی عبادت لکھ دیتا ہوں اور میری رحمت کو اسے جہنم میں جلانے پر شرم محسوس ہوگی۔

☆☆☆

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے کہ ”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے سنا...... زمانے کے آخر میں کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو کم عمر اور کم عقل ہوں گے، باتیں بہت اچھی بتائیں گے لیکن ایمان ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا، وہ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے نکل جاتا ہے۔“

☆☆☆

امر بالمعروف کے پانچ ضروری آداب ہیں۔

1۔ علم...... اس کے لیے سند یافتہ عالم ہونا ضروری نہیں...... کتابوں کے مطالعے سے بھی علم حاصل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اہلِ علم و تقویٰ کی صحبت حصولِ علم کا بہترین ذریعہ ہے۔ جتنا آپ کو علم ہے اتنا دوسرے اسلامی بھائیوں تک پہنچائیں...... سارے مسلمان ہی مبلغ ہیں...... سب پر فرض ہے کہ اچھی باتوں کی تلقین کریں اور بری باتوں سے روکیں۔

2۔ اللہ کی رضا...... اور دین کی سربلندی کے لیے امر بالمعروف کرے...... اس میں اپنی کوئی غرض شامل نہ ہو۔

3۔ نیکی کی دعوت...... نرمی اور خوش اخلاقی سے دیں۔

4۔ صبر و تحمل...... نیکی کی دعوت دینے والا صابر و بُردبار ہو۔

5۔ جو بات کہے اس پر عمل کرنے والا ہو...... یعنی باعمل ہو تو اس کی بات جلد اثر کرتی ہے۔

حضرت ابو الدرداءؓ سے روایت ہے کہ ”تم نیکی کا حکم دیتے رہو ورنہ تم پر ظالم حکمران مسلط کر دیے جائیں گے جو نہ تمہارے بچوں پر رحم کریں گے اور نہ تمہارے بزرگوں کا احترام کریں گے۔ تمہارے بزرگوں کی نہ التجا قبول ہوگی نہ درخواست منظور ہوگی، وہ مدد مانگیں گے نہ مدد دی جائے گی اور معافی مانگنے پر نہ انہیں معاف کیا جائے گا......

ارشاد نبویؐ ہے کہ ”رب تعالیٰ نے ایک بستی پر عذاب نازل کیا۔ جس میں اٹھارہ ہزار نیک افراد تھے...... جن کے اعمال انبیاء جیسے تھے۔ میں نے پوچھا یہ کیوں؟ اس لیے کہ وہ اللہ کی نافرمانی کے سلسلے میں نہ کسی کو برا سمجھتے تھے اور نہ ہی نیکی کا حکم دیتے اور نہ ہی برائیوں سے کسی کو روکتے تھے۔

حضرت ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا مشرکین سے جہاد کے علاوہ بھی کوئی اور جہاد ہے؟ فرمایا...... ہاں اے ابوبکرؓ --- اللہ کی زمین پر ہیں جو شہدا سے افضل ہیں۔ جو زندہ ہیں انہیں روزی ملتی ہے، یہ زمین پر چل رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ملائکہ میں ان پر فخر کرتا ہے، ان کے لیے جنت سجائی جاتی ہے۔

سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے عرض کیا...... وہ کون لوگ ہیں؟ آپؐ نے فرمایا۔ نیکی کا حکم کرنے والے اور برائی سے روکنے والے...... اللہ کی خاطر محبت کرنے والے اور اللہ کی خاطر دشمنی رکھنے والے...... پھر فرمایا...... اس ذات کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے...... ایسا شخص جنت کے شہدا کے مکانوں سے بھی بلند تر مکان میں ہوگا...... جس کے یاقوت اور زمرد کے تین صد (سو) دروازے ہوں گے...... ہر دروازہ منور ہوگا...... اس کی پاکدامن عورت سے شادی ہوگی جب وہ حور کی طرف متوجہ ہوگا تو وہ بتلائے گی اے شخص تو نے فلاں دن فلاں وقت اللہ کا ذکر کیا اور نیکی کی طرف رغبت کا حکم دیا...... اور برائی سے منع کیا اس بنا پر ہر حور اس کا اعلیٰ مقام بتلائے گی۔

☆☆☆

ایک جگہ نبی کریمؐ کا ارشاد مبارک ہے کہ ''نہیں پاک اور مقدس ہوسکتی کوئی امت جو اپنے ضعیف کے لیے اپنے طاقتور سے اس کا حق نہیں لیتی حالانکہ وہ مظلوم کوئی زیادتی نہیں کرتا۔''

آج کل یہ خوبی سمجھی جاتی ہے کہ آدمی صلح کُل رہے...... جس جگہ جائے ویسی ہی بات کہے اسی کو کمال اور وسعتِ اخلاق سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے بلکہ جہاں امر بالمعروف وغیرہ قطعاً مفید نہ ہو ممکن ہے صرف سکوت کی گنجائش نکل آئے...... (نہ کہ ہاں میں ہاں ملانے کی) لیکن جہاں مفید ہوسکتا ہے مثلاً اپنی اولاد، اپنے ماتحت، اپنے دست نگر لوگوں میں...... وہاں کسی طرح بھی سکوت کمالِ اخلاق نہیں بلکہ سکوت (خاموشی) کرنے والا شرعاً و عرفاً خود مجرم ہے۔

حضور اقدسؐ نے قسم کھا کر یہ ارشاد فرمایا...... ''تم لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو ورنہ اللہ جل جلالہ اپنا عذاب تم پر مسلط کردیں گے پھر تم دعا بھی مانگو گے تو قبول نہ ہوگی۔''

ارشاد نبویؐ ہے ''جب میری امت دنیا کو بڑی چیز سمجھنے لگے گی تو اسلام کی ہیبت و وقعت اس کے قلوب سے نکل جائے گی اور جب امر بالمعروف نہی عن المنکر کو چھوڑ بیٹھے گی تو وحی کی برکات سے محروم ہوجائے گی اور جب آپس میں گالی گلوچ اختیار کرے گی تو اللہ جل شانہ کی نگاہ سے گر جائے گی۔''

جو مسلمان آخرت کو اپنا نصب العین بنالیتا ہے اللہ پاک اس کے دل کو غنی فرمادیتے ہیں اور دنیا ذلیل ہو کر اس کے پاس آتی ہے اور جو شخص دنیا کو نصب العین قرار دیتا ہے پریشانیوں میں مبتلا ہوتا ہے اور دنیا میں جتنا حصہ مقدر ہوچکا ہے اس سے زیادہ ملتا ہی نہیں۔

☆☆☆

روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا...... اے موسیٰ (علیہ السلام) کیا تم نے میری خاطر عمل کیا؟ آپ نے جواباً کہا۔ یا اللہ......! میں نے تیرے لیے نمازیں پڑھیں، روزے رکھے، صدقات دیے، تیری خاطر سجدہ ریز ہوا، تیری حمد کی...... تیری کتاب کو پڑھا اور تیرا ذکر کرتا رہا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا...... ''اے موسیٰ! نماز تیری دلیل، روزہ تیرے لیے جنت ہے، صدقہ تیرے لیے سایہ، تسبیح تیرے لیے جنت کا سایہ فگن درخت...... ذکر کرنا تیرے لیے نور ہے...... حضرت موسیٰ فرماتے ہیں۔ ''اے میرے رب! اب مجھے بتلا وہ کون سا عمل ہے جو تیرے لیے کروں؟'' پھر ارشاد ہوا...... ''کیا تو نے کبھی میری خاطر کسی سے دوستی اور میری خاطر کسی سے دشمنی رکھی......'' اس پر حضرت موسیٰ سمجھ گئے کہ اللہ کی خاطر محبت اور اللہ کے لیے دشمنی رکھنا سب سے اچھا عمل ہے۔

حضرت ابوعبیدہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا۔ یا رسول اللہ! اللہ کی بارگاہ میں کون سا شہید افضل ہے...... فرمایا...... وہ جو ظالم حکمران کے پاس گیا اور اسے نیکی کا حکم دیا اور برائی سے روکا اور اسی پاداش میں وہ قتل ہوا...... اگر قتل نہ ہوا زندہ رہا تو اس کے گناہ نہ لکھے جائیں گے...... حضرت حسن بصریؒ کا ارشاد ہے کہ حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ میری امت میں سب سے افضل شہید وہ شخص ہے جو کسی ظالم کے پاس گیا اسے نیکی کا حکم دیا اور برائی سے روکا اس پر اسے قتل کردیا گیا...... اس شہید کا جنت میں مقام حضرت حمزہؓ اور حضرت جعفرؓ کے درمیان ہوگا۔

☆☆☆

اللہ تعالیٰ نے حضرت یوشعؑ بن نونؑ کو وحی فرمائی...... میں تمہاری امت کے چالیس ہزار نیکوں اور ساٹھ ہزار بروں کو ہلاک کرنے والا ہوں...... آپ نے عرض کیا...... کہ نیکوں کا کیا قصور......؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا...... انہوں نے میرے دشمنوں کو دشمن نہ سمجھا، یہ ان کے ساتھ ملاپ رکھتے تھے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ہم نے کہا...... یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! کیا ہمیں نیکی کا اس وقت حکم کرنا چاہیے جب ہم مکمل طور پر نیکیوں پر عمل پیرا ہوں اور برائیوں سے بھی اس وقت روکنا چاہیے جب ہم مکمل طور پر برائیوں سے کنارہ کش ہوجائیں؟ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا...... تم نیکیوں کا حکم دیتے رہو اگرچہ تم مکمل طور پر عمل نہ کرسکو تم برائیوں سے روکتے رہو چاہے تم تمام وکمال اس سے کنارہ کش نہ رہ سکو۔

☆☆☆

حضرت امام مالکؒ نے اپنی تمام زندگی امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں بسر کی...... بستر مرگ پر بھی اس اہم فریضہ کو نہ بھولے...... اور آخری وقت میں بھی امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر زور دیا...... چنانچہ آپؒ کے آخری حکمات نقل کرتے ہوئے حضرت یحییٰ بن یحییٰ صمھودیؒ فرماتے ہیں...... اس کے بعد حضرت امام مالکؒ نے ایک روایت بیان کی...... کہ کسی شخص کو نماز کے مسائل بتانا روئے زمین کی تمام دولت کو صدقہ کرنے سے بہتر ہے...... اور کسی شخص کی دینی الجھن دور کرنا...... سو حج سے افضل ہے اور ابنِ شہاب زہریؒ کی روایت سے بتایا کہ کسی شخص کو دینی مشورہ دینا سو غزوات میں جہاد کرنے سے بہتر ہے۔

حضرت یحییٰ بن یحییٰ فرماتے ہیں کہ اس گفتگو کے بعد حضرت امام مالکؒ نے کوئی بات نہیں کی اور اپنی جان، جانِ آفرین کے سپرد کردی۔ حضرت سلیم بن منصورؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد منصور بن عمار کو خواب میں دیکھا تو پوچھا...... اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا......؟ تو انہوں نے کہا کہ میرے رب نے مجھ پر کرم کرنے کے بعد مجھ سے فرمایا...... اے بد عمل بڈھے......! تجھ کو معلوم ہے کہ میں نے تجھے کیوں بخش دیا؟ میں نے کہا...... نہیں اے میرے معبود...... تو میرے رب نے ارشاد فرمایا...... کہ تو نے ایک اجتماع میں اپنے رقت انگیز بیان سے حاضرین کو رُلا دیا تھا...... اور اس بیان میں میرا ایک ایسا بندہ بھی تھا جو تمام عمر کبھی میرے خوف سے نہیں رویا تھا...... مگر تیرا بیان سن کر وہ رونے لگا...... تو میں نے اس بندے کی گریہ وزاری پر رحم فرما کر اس کو اور تمام شرکائے اجتماع کو بخش دیا اسی لیے تیری بھی مغفرت ہوگئی۔

☆☆☆

خلیفہؒ بغداد منصور کے دور میں حکومت میں قاضی سوار بن عبداللہؒ بصرہ کے قاضی تھے۔ کچھ لوگوں نے دربارِ خلافت میں چغلی کھائی کہ قاضی صاحب لوگوں کی شخصیت سے متاثر ہو کر فیصلہ دیا کرتے ہیں...... خلیفہ منصورؒ نے آپ کو دربارِ خلافت میں جواب دہی کے لیے طلب کیا...... قاضی صاحب جیسے ہی منصور کے دربار میں داخل ہوئے تو خلیفہ منصور کو ایک دم چھینک آگئی...... قاضی صاحب نے منصور کی چھینک پر ''یرحمک اللہ'' نہیں کہا...... تب خلیفہ منصور نے ڈانٹ کر پوچھا کہ آپ نے میری چھینک پر یرحمک اللہ کیوں نہیں کہا......؟ قاضی صاحب نے برجستہ جواب دیا۔ ''اس لیے نہیں کہا کہ آپ نے الحمدللہ نہیں کہا......'' خلیفہ منصور نے کہا کہ ''میں نے دل میں الحمدللہ کہہ لیا تھا۔'' قاضی صاحب نے کہا ''بس سمجھ لیں کہ میں نے بھی دل میں یرحمک اللہ کہہ دیا۔'' خلیفہ منصور قاضی سوارؒ کی بے خوفی اور حاضر جوابی سے بے حد متاثر ہوا اور کہا کہ ''آپ جائیں اور اپنے عہدہ پر برقرار رہیے...... جب آپ مجھ سے مرعوب نہیں ہوئے اور میری ہاں میں ہاں نہیں ملائی تو پھر مجھے یقین ہے کہ آپ کسی کی شخصیت سے مرعوب نہیں ہو سکتے اور ہرگز، ہرگز کسی کا منہ دیکھ کر یا کسی کے دباؤ سے کوئی غلط فیصلہ نہیں کر سکتے۔''

☆☆☆

ایک مرتبہ حضرت سیدنا ابن سماکؒ خلیفہ بغداد ہارون رشید کے دربار میں تشریف لے گئے...... ایک دم ہارون رشید کو پیاس لگی...... اور اس نے پانی طلب کیا...... خادم نے پانی کا گلاس ہارون رشید کے ہاتھ میں دیا...... تو حضرت سماکؒ نے فرمایا...... ''عالی جاہ! ذرا ٹھہر جائیں اور مجھے بتائیں کہ اگر پیاس کے وقت نہیں پانی نہ ملے اور آپ پیاس سے بے قرار ہو جائیں تو یہ ایک گلاس پانی آپ کتنی قیمت دے کر خریدیں گے؟'' ہارون رشید نے جواب دیا کہ ''آدھی سلطنت دے کر......'' پھر حضرت ابنِ سماکؒ نے پوچھا کہ ''اگر یہ پانی آپ کے پیٹ میں پہنچ جائے اور آپ کا پیشاب بند ہو جائے اور یہ پانی آپ کے بدن سے نہ نکل سکے تو آپ اس کے علاج پر کتنی رقم خرچ کردیں گے؟'' ہارون رشید نے کہا کہ ''پوری سلطنت......'' یہ سن کر حضرت ابنِ سماکؒ نے فرمایا...... ''اے امیر المومنین......! وہ سلطنت جس کی قیمت ایک گلاس پانی اور اس کا پیشاب ہو وہ بھلا اس قابل ہے کہ اس کی رغبت کی جائے اور اس پر گھمنڈ کیا جائے۔''

سیدنا ابن سماکؒ کے ان کلمات کو سن کر ہارون رشید رونے لگے...... اور کچھ جواب نہیں دیا۔

حضرت سیدنا انس بن مالکؓ فرماتے ہیں...... کہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا......

''کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو بھلائی کے پھیلانے کا اور برائی کو روکنے کا ذریعہ ہوتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو برائی کے پھیلانے کا اور بھلائی میں رکاوٹ کا ذریعہ ہوتے ہیں سو مبارک ہے ان لوگوں کے لیے جنہیں اللہ تعالیٰ نے خیر کے پھیلنے کا ذریعہ بنایا......اور ہلاکت ہے ان لوگوں کے لیے جو برائی پھیلنے کا سبب ہو گئے۔''

☆☆☆

سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتے کو حکم دیا کہ فلاں شہر کو زیروزبر کردو...... فرشتے نے عرض کی...... الٰہی! فلاں شخص جس نے کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی گناہ نہیں کیا ہے۔ وہ بھی اس شہر میں موجود ہے...... اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جاؤ ایسا ہی کرو کہ اس شخص نے کبھی دوسروں کے گناہوں پر ناگواری کا اظہار نہیں کیا۔

حضرت سیدنا ابو امامہؓ فرماتے ہیں کہ ''اس امت میں سے بعض لوگ قیامت کو بندر اور خنزیر کی شکل میں اٹھیں گے کیونکہ وہ نافرمانوں سے میل جول رکھتے ہیں اور ان کو روکتے نہیں...... حالانکہ وہ انہیں روکنے کی قدرت رکھتے ہیں......'' اس روایت کو نقل کرنے کے بعد حضرت عبدالوہاب شعرانیؒ فرماتے ہیں...... میں کہتا ہوں جب نافرمانوں سے مخالطت (میل جول) کرنے والوں کا یہ حال ہو حالانکہ وہ خود غافل نہیں ہیں تو ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جن کے اعضا گناہ سے نہیں رکتے...... ہم اللہ تعالیٰ سے اس کی مہربانی طلب کرتے ہیں۔ حضرت سیدنا حسن بصریؒ سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ جس شخص نے اپنے دین کی حفاظت کے لیے ایک علاقے سے دوسرے علاقے ہجرت کی خواہ ایک بالشت ہی سفر کیا ہو تو اس نے جنت اپنے لیے لازم کرلی اور وہ حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ہوگا۔'' کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی عراق سے شام کی طرف ہجرت کی تھی۔

فقیہہ ابو اللیث سمرقندیؒ فرماتے ہیں کہ سرکار مدینہ نے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی تھی تو جو شخص ایسی جگہ میں ہو جہاں گناہ ہوتے ہیں اور وہ وہاں سے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے نکل آیا تو اس نے حضرت سیدنا ابراہیمؑ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت پر عمل کیا...... لہٰذا جنت میں ان عظیم ہستیوں کا پڑوس نصیب ہوگا۔

حضرت سیدنا اویس قرنیؒ فرماتے ہیں...... مومن کا حق پر ہونا اس کے لیے دنیا میں کوئی دوست نہیں چھوڑتا اور جب بھی کوئی شخص لوگوں کو نیک بات کی ہدایت کرتا ہے اور برائی سے روکتا ہے تو دنیا دار لوگ اس پر بڑی بڑی تہمتیں لگا کر اس کی عزت خراب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

آج کل اگر کسی کی اصلاح کی بات کی جائے تو بعض اوقات جواب ملتا ہے۔ ''میاں تم اپنی کرو......'' ایسا جواب نہایت ہی مذموم (برا) ہے اور گناہ پر بڑی دلیری ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ ایک بڑا گناہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کو بطور نصیحت کہے کہ تو اللہ تعالیٰ سے ڈر تو برائی کرنے والا جواب دے کہ تو اپنے آپ کو سنبھال۔

والیٔ مصر احمد بن طولون بڑا ہی سفاک اور خوں ریز بادشاہ تھا...... مگر اس کے باوجود اس کو مقدمات میں ظالم و مظلوم کے درمیان عدل کرنے کا بڑا جذبہ موجود تھا......

ایک دن اس کا بیٹا عباس ایک گانے والی عورت کے ساتھ چلا جارہا تھا...... اور اس کا غلام ہاتھ میں ستار لیے جارہا تھا...... ایک عالم باعمل نے جو یہ منظر دیکھا تو ایک دم نیکی کی دعوت پیش کرنے کا عظیم جذبہ سینے میں بیدار ہوگیا...... انتہائی غصے سے بے قرار ہوکر دوڑ پڑے اور غلام کے ہاتھ سے ستار چھین کر زمین پر اس طرح پٹخ دیا کہ وہ چور، چور ہوکر بکھر گیا...... عباس نے غضب ناک ہو کر اپنے باپ احمد بن طولون کی کچہری میں اس عالم پر مقدمہ دائر کردیا...... جب یہ عالم صاحب کچہری میں داخل ہوئے تو احمد بن طولون نے سوال کیا...... کیا واقعی تم نے ستار توڑا ہے؟ آپؒ نے فرمایا...... جی ہاں، تب احمد بن طولون نے غصے سے کہا کہ کیا تم کو علم تھا کہ وہ ستار کس کا ہے؟ آپؒ نے فرمایا...... جی ہاں وہ آپ کے فرزند عباس کا تھا...... احمد بن طولون نے پوچھا کہ پھر بھی تم نے

میرے اعزاز کا کچھ بھی خیال نہیں رکھا...... عالم صاحب نے نہایت ہی بے خوفی کے ساتھ جواب دیا۔ عالی جاہ! یہ کیونکر ممکن ہوسکتا ہے کہ میں ایک گناہ ہوتے ہوئے دیکھوں اور آپ کے اعزاز کے خوف سے خاموش رہوں جبکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ''اور مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائی سے منع کریں۔''

اور آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ یعنی خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے۔''

ان محترم عالم صاحب کی بات سن کر احمد بن طولون کا غصہ ایک دم ٹھنڈا ہوگیا...... تب اس نے کہا کہ میں آپ کو مجاز بناتا ہوں کہ آپؒ پورے شہر میں جو بات بھی خلافِ شرع دیکھیں اس کو برباد اور تہس نہس کردیں، میں آپ کو اس کا اختیار دیتا ہوں۔

☆☆☆

حضرت سیدنا امام مالکؒ زبردست عاشقِ رسول ہوئے ہیں...... ایک بار خلیفہ بغداد منصور مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہوا اور حضرت امام مالکؒ سے گفتگو کرتے ہوئے اس کی آواز کچھ بلند ہوگئی...... جس پر حضرت امام مالکؒ نے ڈانٹ کر فرمایا۔

اے منصور......! اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ......''اے ایمان والو......! اپنی آوازیں اونچی نہ کرو...... اس نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز سے اور نہ ان سے اونچی آواز سے بات کرو جیسے آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے تمام اعمال اکارت جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔''

''اے خلیفہ! نبی کریمؐ کا ادب واحترام اب بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ ظاہری حیاتِ مبارکہ میں تھا۔''

گورنر مروان بن الحکم روضہ اقدس کے پاس حاضر ہوا تو یہ دیکھا کہ ایک شخص قبر انور سے چمٹا ہوا پڑا ہے...... مروان نے اس کی گردن پکڑ کر اٹھایا اور کہا کہ ''اے شخص! تجھے کچھ خبر ہے کہ تو کیا کررہا ہے؟'' تو اس شخص نے سر اٹھا کر جواب دیا کہ ''ہاں! میں خوب جانتا ہوں کہ میں کیا کررہا ہوں اے مروان! میں مٹی اور پتھر کے پاس نہیں آیا ہوں...... بلکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دربار میں حاضر ہوں۔ اے مروان! جب پرہیز گار لوگ حاکم بنیں تو رونے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن جب نااہل لوگ دین کے والی بنیں تو رونا چاہیے۔'' مروان یہ گرم، گرم جملے سن کر خاموشی کے ساتھ چلا گیا...... یہ بزرگ جنہوں نے گورنر مروان کو ڈانٹ دیا تھا جلیل القدر صحابی حضرت ابوایوب انصاریؓ تھے۔

اوپر کی دونوں حکایتوں سے یہ بات واضح ہے کہ حضرت امام مالکؒ، خلیفہ ابوجعفر منصور عباسی کے جاہ و جلال اور رعب سے بالکل مرعوب نہیں ہوئے اور دربار رسولؐ میں ادب کی کمی دیکھ کر تڑپ گئے اور منصور کو ڈانٹ کر چپ کروادیا...... اسی طرح حضرت ابوایوب انصاریؓ پر بھی بنوامیہ کے ظالم گورنر کی ہیبت کا اثر نہ ہوا اور آپؓ نے اس کے منہ پر بے باکی سے کلمہ حق کہہ کر جھنجوڑ ڈالا...... ان دونوں بزرگوں کے اسوۂ حسنہ میں ہم سب کے لیے درس ہے کہ کلمۂ حق کہنے اور علی الاعلان نیکی کی دعوت دینے سے کسی گورنر یا بادشاہ کا خوف دامن گیر نہیں ہونا چاہیے۔

☆☆☆

حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی قانونی حدود توڑنے والے ہیں اور جو لوگ ان کو دیکھ کر مداہنت (خوشامد، سستی، نفاق) والے ہیں...... یعنی باوجود قدرت کے ان کو گناہ سے نہیں روکتے۔ ان دونوں طبقوں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی بحری جہاز کے دو طبقے ہوں اور نیچے کے طبقے والے اوپر آکر اپنی ضروریات کے لیے پانی لیتے ہوں جس سے اوپر والے تکلیف محسوس کریں...... نیچے والے یہ دیکھ کر یہ صورت اختیار کریں کہ نچلے حصے میں سوراخ کرکے اس سے اپنے لیے پانی حاصل کریں ادھر کے لوگ ان کی حرکت کو دیکھیں اور منع نہ کریں تو ظاہر ہے کہ پانی پوری کشتی میں بھر جائے گا اور جب نیچے والے غرق ہوں گے تو اوپر والے بھی ڈوبنے سے نہیں بچیں گے۔

ان احادیث مبارکہ سے بھی دعوت الی اللہ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہمیت واضح ہوجاتی ہے تو ہر مومن کا فرض بنتا ہے کہ وہ لوگوں کو نیکی کا راستہ بتائے

اور برائی سے روکے اور پیارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کی باتیں دوسروں تک پہنچائے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ ''میری طرف سے پہنچاؤ اگرچہ ایک آیت ہو۔''

☆☆☆

ایک بزرگ ایک قسائی سے اپنی بلی کے واسطے چھیچھڑے لے جایا کرتے تھے۔ ایک روز آپؒ نے اس قسائی کو کسی برے کام پر ملامت کی تو قسائی نے کہا...... حضرت آپ بلی کے چھیچھڑے لینے کے لیے بھی تو آئیں گے...... ان بزرگ نے جواب دیا...... میں تجھے نصیحت کرنے کے لیے اس وقت آیا ہوں جب بلی کو گھر سے نکال دیا ہے...... ایک شخص نے ایک عورت کو پکڑ کر چھری کھینچی تھی کہ اسے مار ڈالے کسی کو جرأت نہ تھی کہ اس کے پاس جا کر عورت کو چھڑائے...... اتفاقاً حضرت بشر حافیؒ اُدھر سے گزرے آپؒ نے اس شخص کے پاس جا کر کندھے سے کندھا ملایا...... وہ شخص فوراً بیہوش ہو کر گر پڑا...... اور اس کے بدن سے پسینہ جاری ہوگیا...... عورت گرفت سے چھوٹ کر بھاگ گئی...... وہ شخص جب ہوش میں آیا تو لوگوں نے پوچھا کہ تجھ پر کیا گزری...... کہا کہ اتنا یاد ہے کہ ایک شخص میرے پاس آیا اور اپنا بدن میرے بدن سے ملا کر آہستہ سے کہا کہ حق تعالیٰ دیکھتا ہے کہ تو کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ اس بات کی ہیبت سے میں گر پڑا...... لوگوں نے کہا کہ وہ حضرت بشر حافیؒ تھے...... اس نے کہا کہ اب اس ندامت کے ساتھ میں ان کے سامنے کس طرح جاؤں تھوڑی دیر بعد اس کو بخار چڑھا اور سات روز بہت بے چینی میں گزارنے کے بعد مر گیا۔

☆☆☆

چند باتوں کا خیال کرنے کی شدید ضرورت ہے کہ جب کسی کو نیکی کی دعوت دیں یعنی بھلائی کی تلقین کریں تو اس کے ساتھ محبت سے پیش آئیں اور گناہ کرتے دیکھ کر اسے بہت نرمی سے سمجھائیں۔ سختی سے نہ جھڑکیں ورنہ الٹا ضد پیدا ہوگی...... اگر کوئی غلطی کردے تو سب کے سامنے ہرگز نہ ٹوکیں بلکہ تنہائی میں نصیحت کریں۔ لوگوں کو ان کی نفسیات کے مطابق محبت بھرے لہجے میں سمجھائیں۔ مگر آج انتہائی دکھ کا مقام ہے کہ ہم اپنے معاشرے پر نظر ڈالیں تو ہمیں گناہوں کی کثرت نظر آتی ہے، لوگ ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے ہوتے ہیں اور دوسرے دلچسپی سے سن رہے ہوتے ہیں...... دو مسلمان لڑ رہے ہوتے ہیں کوئی انہیں منع نہیں کرتا...... بسوں میں، ہوٹلوں میں گھروں میں دھوم دھام سے فلمی گانے چل رہے ہوتے ہیں، فالتو کھیل تماشوں میں وقت ضائع کیا جارہا ہوتا ہے...... کیا ہم نے اسے دیکھ کر برا جانا؟ اگر اولاد ایک دن کی اسکول، کالج سے چھٹی کرے تو ہم سخت برہم ہوتے ہیں لیکن اگر وہ ایک وقت نماز قضا کردے تو کیا ہم اس پر غصہ کرتے ہیں؟

نہیں، افسوس صد افسوس...... ہم اپنے اہلِ خانہ کو اپنے گھر کے افراد کو نیکی کی ترغیب نہیں دے رہے جبکہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے تنبیہہ فرمائی ہے کہ ''اے ایمان والو! اس آگ سے بچو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔'' (سورۂ بقرہ 24)

انتہائی دکھ کی بات ہے کہ آج عزت تو اس کی ہے جو لوگوں کی ہاں میں ہاں ملائے اور شریف تو وہی سمجھا جاتا ہے جو دوسروں کو گناہ کرنے دیا کرے اور ان کی چاپلوسی کرتا پھرے...... آج بہت نیک صورت لوگ ایسے ملیں گے جو مالدار فاسقوں کی تعریف کرتے نہیں تھکتے...... بلکہ گناہوں تک میں ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں...... کاش ان کو اللہ کی ناراضی کا احساس ہو...... اور وہ ایسا کرنے سے باز رہیں۔

ہمیں اس اہم فریضے کا احساس ہونا چاہیے...... اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے نیکی میں تعاون کریں اور برائیاں روکنے کے لیے ایک دوسرے کی مدد کریں...... تب ہی معاشرے سے برائیوں کا خاتمہ ہوگا...... اور ہم صحیح معنوں میں امت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بن سکیں گے...... اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

نوٹ: اپنے اس مضمون کی تیاری میں، میں نے جن بے حد قابلِ احترام ہستیوں کی کتب سے مضامین منتخب کیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اجرِ عظیم عطا فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔

پاکیزہ بحیثیت سنگی ساتھی

شائستہ زریں

قارئینِ کرام! اوائل بچپن ہی سے کتابوں اور رسائل کو گھر کے ماحول کا حصہ پایا۔ امی نے بھی کتاب دوستی کی اہمیت واضح کر دی تھی جو دل و دماغ میں ثبت ہو گئی۔ امی کے لیے خواتین کے رسائل بھی باقاعدگی سے آتے تھے۔ اسکول کی طالبہ تھی جب میں نے پہلی مرتبہ خواتین کے لیے شائع ہونے والا پہلا ماہنامہ پاکیزہ دیکھا پھر اسے پڑھا تو بہت اچھا لگا اتنا اچھا کہ اُس کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا جسے فوری تھام لیا گیا۔ پاکیزہ پڑھنے سے پاکیزہ میں لکھنے تک کے سفر میں اس ہمنشیں کی ہر ادا دلنشیں ٹھہری۔ بحیثیت سنگی ساتھی پاکیزہ کو انتہائی کھرا اور دوستی کے تمام تقاضے نباہنے والا پایا۔ اپنے رویّوں میں لچک رکھنے والے۔ بُرے بھلے کی پہچان کرانے والے، کوتاہیوں پر محبانہ سرزنش کرنے والے اور باعزت محبت دینے والے اس ساتھی کے لیے یہی کہا جا سکتا ہے کہ

تم نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے

اپریل ۲۰۰۸ء ''میری ہمجولیاں'' میں انجم باجی نے پاکیزہ سے اپنی وابستگی کے حوالے سے لکھا تھا کہ ''دوستی کے ناتے ہوں، محبت کے واسطے ہوں یا احساس کے قرینے، دل دل سے یوں بندھ جاتا ہے۔ جیسے اس کے بغیر گزارہ بھی نہ ہو۔ پاکیزہ کے اس پلیٹ فارم پر بلاشبہ میں نے بہت محبت پائی ہے۔ مجھے اپنی یہ سب ہمجولیاں (مصنفات اور پاکیزہ بہنیں) دل سے عزیز ہیں اور میں اُن کی بے حد قدر کرتی ہوں۔ بے شک مجھ سے عمر میں بڑی ہوں یا چھوٹی ہوں مگر میری ساتھی ہیں جو اپنے دل کی ہر بات مجھ سے کر لیتی ہیں اور میں اُن سے۔''

اور یہی ماہنامہ پاکیزہ کا طرۂ امتیاز ہے کہ دوستانہ فضا میں کام کرنے کا اپنا لطف ہے۔ اپنائیت کا جو احساس انجم باجی سے پہلی ٹیلیفونک ملاقات میں ہُوا آج بھی برقرار ہے۔ کل ہی میری بھتیجی جویریہ پوچھ رہی تھی۔ پھپھو! یہ انجم باجی آپ کی کون ہیں؟ جذبوں کو لفظوں میں سمجھانا اس وقت بھی بہت مشکل لگا اور اب بھی یہ سطور رقم کرتے ہوئے مجھے یہی لگ رہا ہے کہ میں حق ادا ہی نہیں کر پا رہی۔ عذرا باجی بہت محبت سے بات کرتی ہیں انٹرویو کے سلسلے میں رہنمائی بھی حسبِ موقع متانت اور شرارت سے کرتی ہیں۔ نزہت اصغر اخلاص اور محبت کے خمیر سے گندھی ہوئی ہیں۔ آمنہ حماد کم گو ضرور ہیں لیکن کبھی مل کر اجنبیت کا احساس نہیں ہُوا۔ پاکیزہ ان سب سے ہے اور یہ پاکیزہ سے ہیں اور ہم ان سے ہیں۔ خوب ہے یہ مثلث بھی۔

نزہت اصغر نے سالگرہ نمبر کے سروے کے لیے ''پاکیزہ کو بحیثیت سنگی ساتھی کیسا پایا؟'' کا مشورہ دیا تو ہمیں ساتھی کی صحبت کی سوجھی اور پل بھر میں سوال بھی مرتب ہو گیا کہ پاکیزہ کو بحیثیت سنگی ساتھی کیسا... پایا؟ اور اس کی صحبت کا کیا اثر قبول کیا؟ اور ہم نے دوستی کی سالگرہ کا اہتمام سروے کی صورت کر لیا۔

کلثوم جہاں

امی سخت بیمار تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ اپنی زندگی ہی میں بیٹیوں کو بیاہ دیں۔ یوں بی اے کا امتحان دیتے ہی میری شادی ہو گئی تھی۔ اس لیے مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع نہیں مل سکا۔ میرے شوہر ایئر فورس میں تھے۔ اُن کی پوسٹنگ دوسرے شہر میں ہو گئی تھی۔ امی کا بھی جلد



کلثوم جہاں

ہی انتقال ہو گیا تھا۔ تب میں نے پاکیزہ پڑھنا شروع کیا۔ جس نے واقعی میرے لیے ایسے سنگی ساتھی کا کردار ادا کیا۔ جس نے میری تنہائی بھی دور کی اور اس کی سبق آموز کہانیاں میرے لیے رہنما بھی ثابت ہوئیں۔ گھریلو انتظام، طور طریقے، گھرداری اور سسرال میں رہنے کی تربیت کے ساتھ، ساتھ انسانوں کو پرکھنے کا سلیقہ بھی سیکھا۔ پاکیزہ نے ایک ماں کی... طرح زندگی کو بنانے سنوارنے میں اہم کردار ادا کیا لیکن مجھے اپنی اس سکھی سے شکایت ہے کہ

جن سے بے لوث محبت کا ہو رشتہ قائم
اُن سے رنجش بھی بجا صاحب من ہوتی ہے

افسانوں میں پہلے تربیت کا جو ہنر نظر آتا تھا اس میں اب تھوڑی سی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس جانب توجہ دیں۔ مجھے خوشی ہے کہ میری بیٹیاں بھی اسی ذوق شوق سے پاکیزہ سے ساتھ نباہ رہی ہیں۔ برسوں بیت گئے سفر میں ہوں یا گھر میں، آج تک پاکیزہ میرے ساتھ، ساتھ سفر کر رہا ہے۔

نیر رانی شفق

پاکیزہ کو بحیثیت ساتھی میں نے بہت ہی مہربان مہکتا چہکتا پایا...... میری تنہائیوں کو بانٹنے اور خوبصورت انداز میں مہکانے والا اور میرے قلم کو روانی عطا کرنے اور بہت سے لکھاریوں سے رابطہ جوڑنے والا پایا ہے۔

پاکیزہ کے توسط سے بہت سے دوست اور چاہنے والے ملے، ایک دوست عذرا رسول جن کی محبت نے مجھے حوصلہ بخشا تھا وہ شاید مجھے بھول چکی ہیں یا پھر وقت کی کمی......

پاکیزہ کی صحبت سے مجھے خواتین کے دکھوں اور نفسیات کا بہت گہرائی سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ پاکیزہ کی ہم سفری نے میرے قلم کے سفر کو آسان بنا دیا۔ شکریہ پاکیزہ

غزالہ عزیز

ماہنامہ پاکیزہ اپنے نام کی طرح عرصہ دراز سے اپنے قارئین کے دلوں پر راج کرتے ہوئے نہایت صاف ستھرا، با مقصد، تفریحی اور اصلاحی ادب فراہم کر رہا ہے۔ پاکیزہ صرف میری سہیلی ہی نہیں بلکہ ہمارے ملک کے کونے، کونے میں پاکیزہ پڑھنے والی بہنوں کی سنگی ساتھی ہے، جس سے وہ اپنے دکھ سکھ اور کامیابیاں شیئر کرتی ہیں۔ میں نے پاکیزہ کے ساتھ اپنی وابستگی میں اسے اپنا بہترین ساتھی پایا جس نے قلم کے سفر میں میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی کے ساتھ ایک اچھی سچی سہیلی کا پُرخلوص ساتھ نبھایا ہے۔ صحبت انسان کی پہچان بھی کہلاتی ہے اور پاکیزہ ہم سب خواتین کی پہچان



غزالہ عزیز

ہے جس کی صحبت میں زندگی جینے کا قرینہ سیکھا ہے۔

نزہت جبیں ضیا

جب سے ہوش سنبھالا ہے امی اور بڑی بہنوں کو پاکیزہ پڑھتے دیکھا۔ بڑا تجسس ہوتا تھا اس میں کیا لکھا ہے جو اتنے شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ پھر سب سے نظر بچا کر چھپ، چھپ کر پڑھنا شروع کیا۔ اس وقت میں بہت چھوٹی تھی ایک سلسلہ ہوتا تھا ''معصوم باتیں'' وہ پڑھ کر اچھا لگتا تھا۔ پاکیزہ کا اور میرا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کسی بھی قسم کے ذہنی اضطراب میں پاکیزہ نے ایک سہیلی کی طرح میرا ساتھ نبھایا ہے۔ ہمیشہ دین کی باتیں میری رہنمائی کا ذریعہ بنتی ہیں۔ آج کل ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی اور اختر شجاعت کے سلسلے میری روحانی



نزہت جبیں ضیا

تسکین کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ جنہیں پڑھ کر میرے تفکرات، مسائل اور پریشانیوں میں کمی آجاتی ہے۔ پاکیزہ ایسا ساتھی ہے جس سے میں نے مثبت باتیں ہی سیکھی ہیں اور جس کی وجہ سے مجھے مزید پیاری، پیاری سہیلیاں ملی ہیں۔

ظل شاہین

ماہنامہ پاکیزہ خلوت وجلوت کا ساتھی تو رہا ہے ساتھ، ساتھ پاکیزہ نام ہے ایک خاندان کا۔ جس کے سربراہ معراج بھائی اور عذرا باجی ہیں۔ اپنائیت اور محبت کا سمبل عذرا باجی اور شفقتوں کا پیکر انجم باجی جنہوں نے اس خاندان کے تمام افراد یعنی لکھاری اور قاری کو اپنے خلوص ومحبت کی زنجیر میں قید کیا ہوا ہے۔
نزہت اصغر کی میزبانی بھی مزہ دیتی ہے۔ اداریہ اور بہنوں کی محفل میں انجم باجی کی ناصحانہ گفتگو، اختر شجاعت کی شمع ہدایت اس کے ساتھ، ساتھ روحانی مشوروں نے کردار اور زندگی پر مثبت اثرات ڈالے ہیں۔ آنٹی ذکیہ کی تحریریں دینی ودنیاوی زندگی کو اعلیٰ اخلاقی اقدار کے حوالے سے ہمیں تحریک دیتی ہیں۔ دو دہائی سے زیادہ عرصے پر محیط پاکیزہ کی دوستی پر مجھے بہت ناز ہے۔

اُمِ ایمان قاضی

ماہنامہ پاکیزہ میرے لیے بہترین ساتھی ہی نہیں بلکہ میرے لیے بہت کچھ ہے۔ پاکیزہ کا دوسرا نام انجم انصار ہے۔ جب سے میری زندگی میں یہ دونوں شامل ہوئے ہیں میری زندگی میں بہت سی مثبت تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ اگر ایک دوست کی خوبیاں میں نے پاکیزہ میں پائی ہیں تو ایک رہنما کی خصوصیت بھی...... میرے اندر لکھنے کی صلاحیت کا احساس مجھے پاکیزہ ہی نے دیا اور پھر انجم آپا نے میرے لکھنے کی صلاحیت کو جلا بخش کر اس احساس کو حقیقت کا رنگ دیا۔

فاخرہ گل

اپنے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی گھر میں اپنے اردگرد نازیہ باجی کا منگوایا ہوا جو پہلا ڈائجسٹ دیکھا وہ ماہنامہ پاکیزہ تھا۔ میرے لیے پاکیزہ کا مقام اور محبت یہاں اٹلی میں رہ کر بھی بچپن کی سہیلی جیسا ہے۔ انجم آنٹی کی پُرخلوص محبت اور حوصلہ افزائی کرنے کا اپنائیت بھرا انداز، عذرا باجی کا محبت بھرا بے تکلفانہ اور دوستانہ انداز، بناوٹ سے پاک لہجہ بالکل ایسا ہے جیسے اپنے ہی گھر کے کسی فرد سے بات ہورہی ہے۔ میں نے دونوں کو دل سے بہت قریب

پایا۔حقیقت سے بہت قریب پاکیزہ کی تحریریں اُستاد کا درجہ رکھتی ہیں۔پاکیزہ کسی ایسے دوست کا کردار ادا کرتا ہے جو کبھی بھٹکنے نہیں دیتا۔ایسا دوست جس نے نہایت محبت سے مجھے قلم تھمایا۔میری تحریروں کو سراہا اور میری حوصلہ افزائی کی۔

بسمہ آصف

منفرد، دلچسپ اور بامقصد۔مصنفات اور بہت سی سماجی وثقافتی شخصیات پاکیزہ کی بزم میں آتی ہیں تو بہت لطف آتا ہے اُن سے ملاقات کر کے۔افسانے اور جلترنگ پڑھ کر انسانی نفسیات سمجھنے اور سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔بہنوں کی محفل میں خطوط کے جواب سے پہلے انجم باجی کی پاکیزہ بہنوں سے براہِ راست گفتگو مجھے بہت اچھی لگتی ہے کہ ایک ایسی سہیلی کا کردار ادا کرتی



بسمہ آصف

ہے جو دکھ سکھ کی ساتھی بھی ہے اور رہنما بھی۔پاکیزہ کے ذریعے سیکھی جانے والی دین و دنیا کی تمام باتوں کو میں نے اپنی زندگی میں اختیار کیا۔

سنبل ملک اعوان

میں جب بھی کبھی روئی، ہنسی، خوش ہوئی ہر موقع پر پاکیزہ نے ایک گہری سہیلی کی طرح میرا ساتھ دیا ہے۔میری زندگی میں کئی نشیب و فراز آئے ایسے میں پاکیزہ کی تحریریں میرے لیے مشعلِ راہ بنی رہیں۔مجھے حوصلہ دیا۔پاکیزہ میں شائع ہوتے والی دعاؤں نے مجھے نا اُمیدی سے نکالا۔لوگوں کے رویّوں سے پریشان ہوئی تو پاکیزہ کی تحریروں نے مجھے مثبت سوچ کا تحفہ دے کر راہ دکھائی اور اس مشکل گھڑی میں کلامِ الٰہی پڑھنے کی ترغیب دی۔رشتوں کی قدر کرنا اور نباہنا، اخلاقی اقدار کی پاسداری پاکیزہ کی صحبت ہی کا تو اثر ہے۔

سنجیدہ ارشد

ہر قبیلے، طبقے اور خاندانی رسم و رواج میں جکڑی خواتین کا ترجمان پاکیزہ اپنی مثال آپ ہے۔عرصۂ دراز سے پاکیزہ سے دوستی کا رشتہ قائم ہے۔پاکیزہ کے سنگ، سنگ میں نے تفریح کی ہے تو بہت سادہ پیرائے میں اُلجھنوں کا حل بھی اس نے بتایا ہے۔پاکیزہ ایک رسالہ نہیں گھر کا ایک فرد لگتا ہے اور یہی اس کا کمال ہے۔بہنوں کی محفل ہم پڑھتے ہیں تو خود کو اس محفل میں موجود پاتے ہیں۔روحانی مشورے ہوں یا حسن و صحت کے۔ہمارے معاشرتی اور گھریلو مسائل کا احاطہ کرتے اور اُن کا حل بتاتے پاکیزہ کے ناول اور افسانے کیسی اچھی رہنمائی کرتے ہیں ایسے میں پاکیزہ کسی سہیلی سے کم



سنجیدہ ارشد

نہیں لگتا جو میرے کئی مسائل کے حل میں فوری تعاون کرتا ہے۔ یہ ہے میری سکھی کا کمال۔

آر جے شہزادی اسما حسین

پاکیزہ سے مجھے بیک وقت ماں کا پیار، بہن کا دُلار اور بھائی کا مان ملا ہے۔ اور یہ تمام رشتے دوستی ہی کے تو ہوتے ہیں یہ میری ایسی سکھی ہے جو کبھی جلترنگ کی صورت میری اُداسی دور کرتی ہے تو کبھی دین کی باتیں بتا کر میرے علم میں اضافہ کرتی



آر جے شہزادی اسما حسین

ہے۔ محبتوں سے بھرپور بہنوں کی محفل نے میری طبیعت میں شامل ملنساری اور اخلاص کو مزید نکھار دیا پاکیزہ ڈائری میرے لیے کسی سوغات سے کم نہیں۔ افسانے و ناول کوئی نہ کوئی سبق دے جاتے ہیں۔ انٹرویوز اور سروے بھی رہنمائی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ پاکیزہ کے فیشن کے صفحات جدید فیشن کے مطابق کپڑوں کی ڈیزائننگ کرنے میں میرا بہت ساتھ دیتے تھے اور میں کسی راز دار سہیلی کی طرح اس سے مشورہ لیتی تھی، میری سہیلی کی وہ چنچل ادا کہاں چلی گئی؟ کیا مجھے اپنی سکھی کا وہ کھویا ہُوا رنگ روپ واپس مل سکتا ہے؟ مجھے اس کی بہت یاد آتی ہے۔

☆☆☆

عزیز سکھیو!

بہنوں کے تاثرات پڑھ کر ہمیں اپریل ۲۰۱۰ء کے سالگرہ نمبر میں شائع ہونے والا عذرا باجی کا پیغام یاد آ گیا کہ

”میری یہ دلی خواہش ہے کہ پاکیزہ کی تحریریں دلوں کو سنوارنے کے ساتھ، ساتھ ذہنوں کو سنوارنے کا کام بھی کریں۔ پاکیزہ یقیناً آپ کا اپنا پرچہ ہے۔ پاکیزہ کی مدیرہ انجم انصار آپ کی اپنی بہن جیسی ہی ہیں جنہوں نے آپ کو اور پاکیزہ کو ایک مالا کی صورت میں جوڑ رکھا ہے۔ اس لیے محبت کا رشتہ سب سے بڑا ہے۔ جو ہر رشتے کے لیے ضروری ہے۔ میری یہ دلی تمنا ہے کہ ہم پاکیزہ کی تحریروں کے ذریعے نفرت کی ہر دیوار گرا دیں اور ہر طرف سے محبت کے چشمے پھوٹیں۔“

بلاشبہ پاکیزہ کی مدیران ہوں یا تحریریں، محبت اور روشنی کی سفیر ہیں اور سفارت کی یہ بڑی اور اہم ذمے داری نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے رہی ہیں۔ انکساری شخصیت کا حسن بھی ہے اور محبت کی اساس بھی اور یہ انمول نعمت پاکیزہ گھرانے کا اعزاز بھی ہے اور افتخار بھی۔ بغیر ملے، بنا دیکھے سب ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں ایسے شریک ہوتے ہیں جیسے برسوں کی شناسائی ہو اور محض سروے کی شرکا ہی نہیں بلکہ اپنے سنگی ساتھی پاکیزہ سے محبت کی سوغات پانے والی دیگر پاکیزہ بہنیں بھی اس محبت کی معترف ہیں۔

ایک ایسے اچھے، سچے اور مخلص ساتھی کی تمام خوبیاں پاکیزہ میں موجود ہیں جو اپنی ذات میں انجمن ہو۔ گویا بہت حسین ہے میری سکھی کی ہر ادا،

اس پُرمسرت موقع پر اپنی اور تمام پاکیزہ بہنوں کی جانب سے یہی کہوں گی کہ

تمہیں مبارک ہو پاکیزہ اپنی سالگرہ
میری دعا ہے کہ تم سب سے لاجواب رہو
خدا کرے کہ ترقی کرو بہت زیادہ
محبتوں سے مہکتی ہُوئی کتاب رہو

(آمین)

☆☆☆

ذرا سا گھوم لوں میں

عظمیٰ آفاق



عذرا رسول، عظمیٰ آفاق کی کتاب کا ربن کھولتے ہوئے انجم انصار کے ساتھ

مبارک ہو بھئی، ہم بھی صاحبِ کتاب ہو گئے۔ کوئی مذاق ہے؟ چھوٹی سی عظمیٰ اور اتنا بڑا کام......! بس جی، جب اللہ کا کرم ہو تو کیا ہو نہیں سکتا۔ کتاب آنے کی خوشی مجھے ایسے ہی لگی تھی کہ جب میرا بیٹا یا بیٹی پیدا ہوئے تھے۔ ماں کے منصب پر فائز ہوئی تھی۔ اب تو سب کو اپنا تعارف بھی میں ایسے ہی کراتی ہوں۔

میرا نام عظمیٰ آفاق

چار بچے اور ایک کتاب

جب کتاب میرے ہاتھوں میں آئی تو پہلے تو مجھے یقین ہی نہیں آیا۔ اسی یقین اور بے یقینی کی کیفیت سے جب باہر نکلی تو تب سے ہواؤں میں اُڑ رہی ہوں۔ کئی دفعہ پڑھ چکی ہوں مگر ہر دفعہ پڑھ کر تشنگی سی رہ جاتی ہے۔ رات کو بھی اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر سو رہی ہوں کہ اگر رات کو پڑھنے کا دل چاہا تو دیر نہ لگے۔

''اچھا ہے امی نے تکیے کے نیچے اپنی کتاب رکھ لی ہے۔ اب انہیں ڈراؤنے خواب نہیں آئیں گے۔'' میرے بچے ہنس، ہنس کر ایک دوسرے سے مخاطب تھے۔

"ظاہر ہے، ہے ہی اتنی مزاحیہ اور مزیدار......"
یہ میری بیٹی اجیہ کی رائے تھی۔

چونکہ امی اور آپ کی باجی انجم انصار آسٹریلیا یاترا پر تھیں تو اس کتاب کی منہ دکھائی بھی کسی کو نہیں کروائی تھی۔ مجھے اپنی امی کا انتظار تھا کہ جب وہ آئیں گی تبھی ایک پارٹی کروں گی (چونکہ سب اصرار بھی کر رہے تھے)

امی خیر سے واپس آئیں تو دل میں پھر اپنی کتاب کی منہ دکھائی کی دعوت (جسے عرفِ عام میں تقریبِ رونمائی کہتے ہیں) رکھنے کا خیال کود کود کر واپس آگیا۔

یوں پانچ فروری کے دن میں نے اپنے گھر میں ایک چھوٹی سی پارٹی ارینج کر ہی ڈالی۔ جو شروع میں تو بہت چھوٹی سی ہی شروع ہوئی تھی بعد میں اس کی نوعیت تھوڑی سی موٹی بھی ہوگئی (جس کے تمام مہمان پاکیزہ کے تھے اور مہمانِ خصوصی بھی پاکیزہ کی روحِ رواں آنٹی عذرا رسول تھیں...... اور میری خوشی دیدنی تھی) گھر کی صفائی، دھلائی دو تین دن پہلے سے ہی شروع ہوگئی تھی۔ سب بچوں کو گھر پر چیزیں پھیلانے کی سختی سے ممانعت کی جا چکی تھی۔ ہر چیز اپنی جگہ پر تھی۔ دو تین دن پہلے سے ہی ہماری حالت اپنے ہی گھر میں کسی مہمان کی سی ہوگئی تھی جو کہ کسی کے گھر جا کر کیسا بندھا بیٹھا رہتا ہے۔ ہم اپنے ہی گھر میں کچھ اجنبی ہوگئے تھے، نہ صوفے پر رکھ کر کھانا کھا رہے تھے، نہ کوئی بچہ اپنے جوتے اچھال رہا تھا بلکہ اسکول سے آنے کے بعد بھی موزے، جوتے کے اندر رکھے جا رہے تھے (ہے ناں تعجب کی بات)

امی ایک دن پہلے ہی میرے گھر آگئی تھیں۔ دعوت کا ٹائم شام چار بجے کا تھا جبکہ میں صبح کے چار سے ہی جاگی بیٹھی تھی۔

مہمانوں میں سارے ہی ادبی دنیا کی چمکتی دمکتی کہکشائیں میرے گھر میں اترنے والی تھیں۔ اس لیے میں صبح سے ہی کافی خوش اور پُرجوش تھی۔ شام کی چائے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس لیے میں نے اپنی میڈ کو خاص تاکید کی تھی کہ تمام چیزیں گھر پر ہی تیار ہوں۔ (جس میں دو ڈشیں میں نے بھی بنائی تھیں، میں اچھی خاصی کوکنگ کر لیتی ہوں مگر ایک دفعہ جو کھا کر جاتا ہے دوبارہ اس ڈش کی فرمائش ہی نہیں کرتا، اصل میں ایک ہی دفعہ میں اس کا دل اس ڈش سے شاید اتنا بھر جاتا ہوگا...... کہ دوسری دفعہ کی حسرت ہی نہیں رہتی ہوگی...... میں بناتی ہی اتنا مزیدار ہوں یا پھر......)

شام ساڑھے چار سے مہمانوں کی آمد کا سلسلہ



دائیں سے عقیلہ حق، تسنیم ماپارا، عذرا رسول، یاسمین رشید، امبر (عظمیٰ آفاق کی نند) اور کرن شاہد

شروع ہوگیا تھا جو کہ وقفے وقفے سے جاری تھا۔ مہمانوں میں محترمہ عذرا رسول، تسنیم ماپارا، یاسمین رشید، شگفتہ شفیق، اختر شجاعت، رضوانہ پرنس، رفعت سراج، عطیہ عمر، عقیلہ حق، ریڈیو پاکستان سے وابستہ سیمارضا اپنی ٹیم کے ساتھ موجود تھیں۔ سب بہت محبت اور خوشی کا اظہار کررہے تھے۔ سب ایک دوسرے سے مل رہے تھے، ذکیہ بلگرامی اپنی ناسازیٔ طبیعت کی وجہ سے نہ آسکیں جس کا مجھے بہت افسوس تھا مگر پھر بھی



تقریب میں شریک رفعت سراج خوشگوار موڈ میں

انہوں نے اپنی بہو بسمہ کو بھیجا جس کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ بسمہ بہت ہی پیاری ہیں، بالکل سمپل اور معصوم...... بہت سادگی سے بات کرتی ہیں......

میں نے انہیں بتایا کہ ذکیہ آنٹی کی وجہ سے میں نے دو دفعہ قرآن پاک ختم کیا ہے۔ الحمدللہ (ایک جمعرات سے دوسری جمعرات تک پڑھنے والا) شگفتہ شفیق چونکہ شاعرہ ہیں تو ان کی مصروفیات مشاعروں کے حوالے سے رہتی ہیں۔ اس دن بھی انہیں کسی مشاعرے میں جانا تھا مگر پھر بھی وہ وقت نکال کر آئیں اور سب سے پہلے جانے والوں میں سے تھیں۔

شگفتہ جی آپ کا بہت شکریہ...... مگر مجھے افسوس رہا کہ آپ نے میرے ہاتھ کا مزیدار دم کا قیمہ نہیں کھایا۔

میری نند امبر اس تقریب کے لیے بطورِ خاص دبئی سے آئی تھی۔

جب سب مہمانوں کی آمد ہوگئی جن میں میری بہت فیورٹ ڈاکٹر ممتاز ضیا بھی شامل تھیں تو تقریب کا باقاعدہ آغاز کیا گیا۔ چونکہ یہ روایتی کسی کتاب کی تقریبِ رونمائی تو تھی نہیں...... یہ آپ کی چہیتی اور لاڈلی عظمٰی کی کتاب کی منہ دکھائی تھی تو اس کا آغاز بھی حمد اور نعت کے چند اشعار سے کیا گیا......اس محفل پر لعنت دی گئی ہے جس محفل میں اللہ اور اس کے رسول حضرت محمدؐ کا نام نہ لیا گیا ہو...... حمد اور نعت پڑھنے کی سعادت میرے حصے میں آئی۔ دورانِ تقریب ہمیں پیاری سی نزہت اصغر بھی جوائن کر چکی تھیں۔

چونکہ ریڈیو اور FM107 کے نمائندے بھی کوریج کررہے تھے۔ اسی لیے ان کے کہنے پر میں نے اپنی کتاب سے دو مضامین بھی سننے والوں کی خدمت میں پیش کیے۔ جسے پسند بھی کیا گیا چونکہ تالیاں تو تھوڑی دیر بجی تھیں۔

ریڈیو پاکستان کے نمائندے تمام رائٹرز سے ان کے خیالات ریکارڈ کررہے تھے۔ کتاب کے حوالے سے ان سب کی رائے لی جارہی تھی، میری تحریر پر رائے لی جارہی تھی اور میں دل میں دعا کررہی تھی کہ یا میرے مالک یہ سب اچھا، اچھا بولیں...... چونکہ سب میرے نئے گھر میں پہلی دفعہ آئے تھے تو اسی وجہ سے سب خوشی اور مسرت کی ملی جلی کیفیت میں تھے۔

عذرا آنٹی اور امی کی موجودگی میں سب رائٹرز کے ہمراہ عذرا آنٹی نے کتاب کا ربن کھول کر اس کی منہ دکھائی سب کو کروائی۔ ماشاء اللہ عذرا آنٹی کتنی پیاری لگ رہی تھیں...... اس کی گواہ تصاویر ہیں....

"سفرناموں کی دنیا میں ایک حسین اضافہ، عظمٰی آفاق" عذرا آنٹی نے مجھے مبارکباد دیتے ہوئے یہ جملے کہے جو میں



دائیں سے انجم انصار، عقیلہ حق، عظمیٰ آفاق، رضوانہ پرنس، شگفتہ شفیق، تسنیم ماپارا، یسمارضا اور مہمانِ خصوصی عذرا رسول

نے فوراً گود لے لیے...... اور اسے کبھی نہیں اتاروں گی......(عذرا آنٹی، آپ کی دعائیں اور کھلے دل سے تعریف......آپ کی شخصیت کا خوب صورت حصہ)

امی کی خوشی دیدنی تھی، ہمیں ان پر فخر ہے کہ وہ ہماری والدہ ہیں، شاید ان کو اس وقت مجھ پر تھوڑا، تھوڑا ناز تو ضرور ہورہا ہوگا۔(یہ میرا اپنا خیال ہے)

عذرا آنٹی آف وائٹ سوٹ پر اورنج سلک کا دوپٹا لیے جو قرینے سے سر پر جما ہوا تھا کافی ڈیسنٹ لگ رہی تھیں۔

امی، یعنی آپ کی باجی انجم انصار لائٹ پنک کلر کے شیفون کے سوٹ میں ملبوس تھیں، چونکہ ابھی ایک ہفتہ پہلے ہی وہ آسٹریلیا سے واپس آئی ہیں تو سب کو وہ فریش لگ رہی تھیں۔

''بھئی صرف میں نے وہاں آرام کیا ہے، میرے بیٹے اور بہو (عمیر اور ثمینہ) نے میرا بہت خیال رکھا......کافی جگہ گھومے پھرے......'' امی کسی سے کہہ رہی تھیں۔

''تو پھر آپ کا آسٹریلیا کا سفرنامہ کب پاکیزہ کی زینت بنے گا......؟'' شگفتہ شفیق امی سے پوچھ رہی تھیں۔

''انشاء اللہ بہت جلد۔'' امی ہنستے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ رضوانہ پرنس اورنج رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھیں اور پیاری سی لگ رہی تھیں۔

شاید آج کل فیشن کلر اورنج ہے۔ زیادہ تر خواتین اورنج میں ملبوس تھیں۔ چلو شکر ہے میں نے یلو کلر پہنا ہے اورنج اور یلو آپس میں بہنیں ہوتی ہیں، میں دل کو تسلی الگ دے رہی تھی۔

رفعت سراج اپنی بیٹی کے ساتھ تشریف لائی تھیں۔ ان کی بیٹی بھی ان کی طرح بہت پُرکشش ہے۔ رفعت سراج نے بھی بڑے بھرپور انداز میں میرے طرزِ تحریر کو سراہا......(واؤ) عقیلہ حق بلیک اور میرون کامبینیشن سوٹ میں ملبوس تھیں۔ کافی رعب دار شخصیت کی مالک ہیں، انگلیاں ان کی دس ہیں مگر ہاتھ میں انگوٹھیاں وہ بیس پہنے ہوئے تھیں وہ بھی ڈائمنڈ کی، (ہوئیں ناں رعب دار) گلے میں آیت قرآنی کا لاکٹ پہنے ہوئے تھیں جو کہ مجھے ذاتی طور پر بہت پسند بھی ہے اور اس آیت کے پڑھنے سے میرے ایسے

رکے ہوئے کام ہوئے ہیں جن کا کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا ...... اس کو آپ ہر وقت پڑھ سکتے ہیں چاہے پاکی ہو یا ناپاکی وہ آیت یہ ہے۔

حسبنا اللہ ونعم الوکیل (عقیلہ آپ بہت کیوٹ ہیں اور ہنس مکھ بھی) ناسازیِ طبیعت کے باوجود ڈاکٹر ممتاز ضیا کافی دور سے تقریب میں شرکت کے لیے آئیں۔

تسنیم ماپارا تو خیر ہماری پڑوسن ہوگئی ہیں۔ کافی محبت کی خاتون ہیں۔ ان سے بات کرو تو ہمیشہ ایسا لگتا ہے جیسے کسی بہت اپنے سے مل رہے ہوں۔ ہمیشہ پوزیٹو فیلنگ آتی ہے۔ آپ کی غزل کا آئٹم رہ گیا..... انشاء اللہ جلد ہی آپ سے ایک بار مسکرادو ضرور سنیں گے۔ عطیہ عمر اور ان کے شوہر عمر فاروق دونوں میاں بیوی مثالی ہیں۔ آپ اپنی کوئی بھی پریشانی ان سے شیئر کرسکتے ہیں اور اس کا حل وہ دونوں منٹوں میں نکال دیتے ہیں۔ چونکہ اُن کا ہوٹلوں کا بزنس بھی ہے تو کبھی بھی کوئی ورکنگ اسٹاف کی ضرورت ہوتی ہے تو فوراً عطیہ جی کو فون کرتی ہوں۔ گھنٹوں میں عملہ گھر میں موجود۔ چاہے ڈرائیور ہو، چوکیدار ہو یا کوئی دوسرے ملازمین۔...اور اگر نہ بھی ارینج کرسکیں تو کسی نہ کسی طرح کوشش ضرور کرتے ہیں۔ اب ایسے ہی تو نہیں ہم ان کو اور عمر بھائی کو اپنی سہیلی کہتے۔

سیما رضا ریڈیو پاکستان سے تعلق کے ساتھ ایک منفرد لب ولہجے کی شاعرہ، میزبان اور پروگرام پروڈیوسر بھی ہیں۔ میں نے ان کو کبھی بھی کسی کے خلاف بولتے تو کیا سوچتے ہوئے بھی نہیں دیکھا..... مشکل میں بھی آسانی تلاش کرنا جانتی ہیں..... سیما باجی، بہت شکریہ..... آپ کا اور آپ کی ٹیم کے آنے کا......

اختر شجاعت خال، خال ہی کسی تقریب میں دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن میری خوش نصیبی کہ وہ میرے ہاں بہت محبت سے نہ صرف آئیں بلکہ ہر چیز کو سراہنے میں پہلی تھیں...... (آنٹی آپ کی محبت بھری دعائیں واقعی دل کو ایک طمانیت سی دیتی ہیں)

''ہماری بچی ہو تم، کیسے نہیں آتے ہم، جب میں تم سے سب سے پہلی دفعہ ملی تو تم اس وقت آٹھویں یا ساتویں میں تھیں۔ اب دیکھو تمہاری بیٹی فرسٹ ائیر میں ہے ماشاء اللہ......'' اختر شجاعت محبت سے کہہ رہی تھیں۔

سب مجھے اور اجیہ کو چھوٹی بڑی بہنیں کہہ رہے تھے۔ ماشاء اللہ مجھ سے بھی بہت لمبی ہوگئی ہے۔

نزہت اصغر کے آنے کی مجھے بہت خوشی ہوئی۔ چونکہ پاکیزہ آفس کی چھٹی ہونے کی وجہ سے ان کی بھی چھٹی تھی مگر پھر بھی بطورِ خاص وہ آئیں...... گرے اور پنک سوٹ میں ملبوس نزہت جی ہمیشہ کی طرح سوبر سی لگیں۔ آپ نے میرا اور میرے نئے گھر کا صدقہ اتارا...... اس میں مجھے بڑا اپناپن سا لگا..... یاسمین رشید چونکہ امی کی خاص دوست ہیں اس لیے میرے لیے بھی وہ قابلِ احترام ہیں...... ہمیشہ محبت سے ملتی ہیں اور تقریب میں بھی وہ محبتیں لٹانے موجود تھیں۔ (آپ کا لہجہ تو ریشم جیسا ہے اور آپ ہنستے ہوئے بھی بہت پیاری لگتی ہیں) پاکیزہ کی قاری صدف جاوید اپنی بیٹیوں کے ساتھ آئی تھیں۔ صدف بھابی حال ہی میں عمرے کی ادائیگی سے واپس آئی ہیں۔ آپ کو بہت مبارک ہو...... (اسی شب ان کے ہاں ڈنر بھی تھا...... اس کے باوجود آپ نے شرکت کی...... شکریہ) پاکیزہ کی ایک اور قاری بہن کرن شاہد بھی تقریب کی رونق میں اضافہ کرنے موجود تھیں۔

رفعت سراج سے ملاقات ہورہی ہے، مجھے لگتا ہے کہ میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں...... کرن، رفعت سراج کے ساتھ مستقل تصاویر بنوارہی تھیں۔ (لگتا تھا دو بچھڑے ہوئے ملے ہیں)

میرے شوہر آفاق نے پروفیشنل فوٹو گرافر کا انتظام کروادیا تھا جو تھوڑی، تھوڑی دیر بعد آکر باجی اِدھر دیکھیں، باجی اُدھر دیکھیں کہہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد میرا ماتھا ٹھنکا کہ یہ تو میرا بل کہاں سے کہاں پہنچادے گا۔

''بھائی میرے خیال سے کافی تصاویر ہوگئیں۔ اب رہنے دیجیے......'' میں نے اسے پیار سے سمجھادیا کہ



اب رہنے دو ورنہ اپنے بل کی خیر مناؤ.... (یہ خیر دوسری بات ہے کہ اس کے بعد وہ بچوں کی تصویریں بنانے لگا)

میری میڈ کوثر نے مجھے اشارہ دیا کہ ناشتے کی ٹیبل سیٹ ہو چکی ہے تو پھر میں نے بھی سب کو ناشتے کے لیے ٹیبل پر آنے کے لیے بلانا شروع کر دیا۔

ناشتے میں تھوڑی سی چیزیں تھیں مگر جو بھی تھیں وہ گھر کی ہی بنی ہوئی تھیں...... چونکہ مجھے خود بھی گھر کی چیزیں پسند ہیں اس لیے میری کوشش ہوتی ہے کہ میرے گھر آنے والے مہمان بھی میرے گھر کے ذائقے سے لطف اندوز ہوں۔

اب تو مہمانوں سے پوچھنا پڑے گا کہ وہ لطف اندوز ہوئے یا مجبور......

بظاہر تو سب خوش ہی لگ رہے تھے۔ (واللہ اعلم) ناشتے کے بعد چائے کا دور چلا...... باتوں ہی باتوں میں گھر کی صفائی اور خوب صورتی کی بات نکلی...... سب نے کہا کہ عظمٰی ماشاء اللہ تمہارا گھر بہت صاف اور خوب صورت ہے۔ (ماشاء اللہ)

میں نے دل میں سوچا کہ دو دن پہلے دیکھتیں تو... گھر کے بارے میں رائے جو آج دے رہی ہیں بدل چکی ہوتی۔ ان سے کیا کہتی ہمیں خود اپنا گھر اپنا نہیں لگ رہا...... اتنی صفائی، اتنی صفائی کہ گھبراہٹ ہو رہی ہے۔

خیر جی...... تھوڑی دیر بعد ہی سب مہمانوں نے اجازت چاہنی شروع کر دی...... اتنی پیاری محفل جس میں اتنے سارے ستارے چمک رہے ہوں کیسے اپنے اختتام کو پہنچ گئی کہ پتا ہی نہیں چلا...... رخ چوہدری آپ نہیں آئیں پر آپ کی معذرت میں نے قبول کر لی...... پر اگلی دفعہ ایسا نہیں ہوگا کیونکہ آپ مجھے بہت عزیز ہیں، بہت سی بہنوں کو میں بلانا بھول گئی...... جس میں ہما بیگ سرِ فہرست ہیں، اس کی بھی معذرت ...... آخر میں، میں اپنی تمام رائٹرز کی انتہائی شکر گزار ہوں کہ وہ مرے بلاوے پر تشریف لائیں اور میری خوشی میں آکر میری مسرتوں میں اضافہ کر دیا ان تمام رائٹرز سے دلی معذرت ایک بار مزید جن کو میں نہ بلا سکی...... سب قاری بہنوں کو خاص تاکید ہے کہ میری کتاب خریدیں، اپنی دوستوں کو خرید کر دیں، مسجد کے باہر بٹوائیں کیونکہ اگر آپ خریدیں گے نہیں تو وہ بکے گی کیسے؟ اللہ آپ کو اس کی جزائے خیر دے گا۔ (آمین) میری کتاب جو کہ سفر نامہ ہے پڑھ کر بتائیں کہ کیسی لگی؟ کوئی خامی ہو تو وہ بھی بتائیں...... تا کہ آئندہ وہ غلطی نہ ہو اور کیا ایک نئے سفر کے لیے کمر کسوں...... کیا خیال ہے......؟

☆☆☆

وہ آئے بزم میں......

نزہت اصغر





پُر اثر تحریروں کی خالق ......
حساس موضوعات کو قلم بند
کرنے کی ماہر معروف تحریر نگار
شیریں حیدر سے خوب صورت گفتگو

قارئینِ محترم! بعد سلام و دعا...... عرض ہے کہ اس مرتبہ سالگرہ نمبر میں آپ کی یہ خوب صورت بزم ہم نے مٹھاس بھری زبان، شہد آگیں لہجہ اور پُر لطف گفتگو کی حامل افسانہ نگار، ناولٹ و ناول نگار اور سب سے بڑھ کر روزمرہ کے مسائل کو قلم کی نوک سے اجاگر کرتی کالم نگار محترمہ شیریں حیدر کی پُر تنوع شخصیت کی آمد سے سجائی ہے۔ ان کا نام بھی خوب صورت ہے اور کام اس سے بھی بڑھ کر کہ مجھے تعارفی کلمات چننے میں مشکل

پیش آرہی تھی۔ بہر حال پاکیزہ کی اس بزم کی برکت نے یہ مشکل آسان کردی ہے تو جناب ہماری آج کی مہمان سے ابتدائی تعارف تو آپ نے حاصل کر ہی لیا ......اب ان کا احوال تحریر اور راز ہائے شخصیت جاننے کے لیے سوالات کا آغاز کر ہی دیتے ہیں، جی شیریں حیدر صاحبہ ہماری اس بزم میں خوش آمدید..... اور پاکیزہ کی سالگرہ آپ کو بھی مبارک ہو......

پاکیزہ ✧......سب پہلے تو بہت شکریہ کہ آپ نے اپنی گوناگوں مصروفیات سے وقت نکالا اور ہمیں میزبانی کا شرف بخشا...... یہاں آنے پر آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

شیریں حیدر ❖...... پہلے تو ادارۂ پاکیزہ کے تمام اراکین، مصنفات اور قارئین کو میری جانب سے پاکیزہ کی سالگرہ کی بے حد مبارک باد اور آپ کا از حد شکریہ نزہت جی، میں بہت مشکور ہوں کہ آپ نے انٹرویو کے لیے میرا انتخاب کیا، ابھی تو میں سمجھ رہی تھی کہ میری باری بہت سے بڑے ناموں کے بعد آئے گی۔

پاکیزہ ✧...... آپ بھی تو انہی بڑے ناموں میں سے ایک ہیں خیر! ہمارے قارئین شیریں حیدر کے شیریں کلام سے تو خوب واقف ہیں۔ اب شیریں لہجہ بھی اس انٹرویو کے ذریعے جان لیں گے کیوں ٹھیک کہانا......!

شیریں حیدر ❖...... ذرہ نوازی ہے آپ کی، اللہ کا خاص کرم ہے اور میرے پڑھنے والوں کی محبت کہ انہیں میری تلخ باتوں میں بھی شیرینی کی چاشنی محسوس ہوتی ہے۔

پاکیزہ ✧...... شیریں کی لفظی شیرینیوں کی بات کریں تو کب احساس ہوا کہ آپ میں ایک رائٹر پنپ رہا ہے؟

شیریں حیدر ❖...... بڑا اداکاراؤں والا جواب ہوگا اگر میں کہوں کہ بچپن سے ہی......لیکن حقیقت یہی ہے کہ میں نے اس عمر سے کچھ نہ کچھ لکھنا شروع کر دیا تھا جس عمر میں احساس بھی نہ تھا کہ لکھنا تخلیق کی ایک صورت ہے اور یہ کوئی صلاحیت ہے...... آج کل کے دور میں تو مائیں بچوں کی ایک، ایک چیز کو کسی اہم دستاویز کی طرح سنبھال کر رکھتی ہیں مگر ہمارے زمانے کی ماؤں کو اس میں کچھ اہم نہ دکھتا تھا، اس لیے میرے بہت بچپن کی نظمیں، چھوٹی، چھوٹی کہانیاں اور پیروڈیز وغیرہ کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ اسکول اور کالج کے میگزین سے تحریک ملی، ڈائریوں میں لکھی تحریروں کو مرتب کیا تو جرمنی کے قیام کی یادداشتوں کو پہلی بار ہفتہ وار نوائے وقت میں لکھا اور پھر اس کی کتاب مرتب کی...... ''رنگِ مغرب ہے جداگانہ'' کے نام سے...... اور پاکیزہ میں میری پہلی تحریر...... فروری 2000ء میں 'ویلنٹائن ڈے' کے نام سے شائع ہوئی۔

پاکیزہ ✧......ہاں پہلی تحریر کے حوالے سے پوچھ رہی ہوں کہ گھر والوں کے اور دوست احباب کے کیا تاثرات ہوئے؟

شیریں حیدر ❖......میری تحریروں کو گھر والے، دوست احباب اور خاندان کے تقریباً سبھی لوگ پڑھتے ہیں، تبصرے اور تنقید بھی کرتے ہیں۔ وہی سب میرے ناصح ہیں، وہی نقاد اور میری تحریروں کا آج جو رنگ ہے وہ سب انہی لوگوں کی وجہ سے ہے۔ تاثرات تو آپ میرے پوچھتیں جسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ کہانی چھپ گئی تھی اور اس سے اگلے مہینے اپنی کہانی پر اپنی پیاری، پیاری بہنوں کے تبصروں اور پسندیدگی نے میرا سیروں خون بڑھا دیا۔ میں اپنی تبصرہ نگار بہنوں کی رائے کو بھی بہت اہمیت دیتی ہوں، ان کی تعریف اور تنقید ہمیں بنانے میں بہت مددگار ہوتی ہے، میں اپنے لکھنے کے اولین سالوں میں دوسروں کی رائے کو بہت اہم سمجھتی تھی ڈاکٹر ممتاز ضیا ہمیشہ میری کہانیوں پر تبصرہ کرتیں، یقین مانیں کہ کسی وقت مجھے محسوس ہوتا کہ وہ مجھے پسند نہیں کرتیں لیکن اپنے کراچی میں قیام کے دوران خوش قسمتی سے میری ان سے ملاقات ہوئی اور مجھے اندازہ ہوا کہ وہ میری فقط اچھی نقاد ہی نہیں بلکہ وہ میری تحریروں کی مداح بھی ہیں، اس کے بعد ان سے

دوستی کا وہ رشتہ قائم ہوا جو آج تک قائم ہے۔ (واہ بہت خوب)

پاکیزہ ✧......کیا اس وقت اندازہ تھا کہ آپ اتنی بڑی رائٹر اور ایک مشہور کالم نگار بنیں گی؟

شیریں حیدر ✤...... کچھ بننا میرا خواب تھا نزہت جی...... میرے والد صاحب مرحوم کی خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں...... عام نہیں کوئی بہت مشہور ڈاکٹر، وہ میں نہ بن سکی کچھ وجوہات کی بنا پر مگر میں نے اپنے والد صاحب کا نام روشن کرنے کا تہیہ کیا تھا، میرے اندر ایک یقین ہمیشہ سے بسیرا کیے ہوئے تھا کہ میں زندگی میں جو کچھ بھی کروں گی وہ میری کامیابی کا ڈنکا بجا دے گا...... میں نے عزم کیا مگر کبھی زعم نہیں کیا، یہ سب میرے اللہ کی دین ہے مگر میں جانتی ہوں کہ میری تحریر میں کچھ ہے، میں کہانیاں لکھتی نہیں، مجھ سے کہانیاں کوئی طاقت لکھواتی ہے، سرزد ہو جاتی ہیں، میں اپنی کہانیاں پڑھتی ہوں تو مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ سب کچھ میں نے ہی لکھا ہے۔ زندگی کے ہر معاملے میں، ہر کام میں باریکی سے اور دل لگا کر کام کرنے کی عادت ہے، اس لیے تسلی نہیں ہوتی کہ کام صحیح ہوا ہے، پاکیزہ میں چھپنے والی میری پہلی کہانی اشاعت سے چار سال پہلے لکھی تھی میں نے مگر جب بھی اسے کہیں بھجوانے کا سوچتی تو رک جاتی کہ جانے اس قابل بھی ہے کہ نہیں! پاکیزہ میں انجم جی نے بھرپور حوصلہ افزائی کی اور سمجھیں کہ وہ میری زندگی کا ایک ایسا سنگِ میل ہے جہاں سے انجم جی نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی راہنمائی میں مجھے بہت آگے تک چلایا۔ (یہ تو ہے اچھا راہنما راہیں آسان کر دیتا ہے)

پاکیزہ ✧......آپ کی کاوشیں کتابی شکل میں کب آئیں؟ خود خیال آیا یا کسی اور نے اس جانب توجہ دلائی؟

شیریں حیدر ✤......اس سوال کے جواب میں پھر انجم جی کا نام آئے گا، 2005ء میں میرے شوہر کا کراچی میں تبادلہ ہوا، میرے لیے کراچی کا تبادلہ ہونا میری بہت خوش قسمتی ثابت ہوا، ادارۂ جاسوسی ڈائجسٹ کے وہ سارے نام جنہیں ہم ڈائجسٹوں میں چھپا ہوا دیکھتے تھے، ان سب لوگوں سے ملاقات، کئی تقریبات اور تین سال کا بھرپور ساتھ میری تحریروں کو نئی جہتیں دیتا چلا گیا، میں نے ان تین سالوں میں بہت لکھا، سب سے پہلے انجم جی نے ہی یہ خیال پیش کیا کہ مجھے اپنی تحریروں کو کتابی شکل میں چھپوانا چاہیے، صرف یہیں تک نہیں، انگلی پکڑ کر ساتھ، ساتھ لے کر چلیں اور میری تحریروں کو کتابی شکل میں چھپوانے میں اہم کردار ادا کیا، اس کے ساتھ، ساتھ اہم نام ہے ڈاکٹر خدیجہ کا، جنہوں نے ویلکم بک پورٹ سے میری پہلی دو کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں میری اتنی بھرپور مدد کی کہ میں بلا مبالغہ کہہ سکتی ہوں کہ اگر وہ نہ ہوتیں تو میری کوئی کتاب نہ چھپتی۔

پاکیزہ ✧......آپ نے پاکیزہ اور دلکش میں بہت لکھا......کبھی ہمارے دیگر پرچے سسپنس، جاسوسی یا سرگزشت میں لکھنے کا خیال نہیں آیا؟

شیریں حیدر ✤......بالکل آتا ہے ایسا خیال، جی چاہتا ہے کہ میں ہر ماہ اتنا لکھوں کہ جہاں جہاں ممکن ہو میری کہانیاں چھپیں مگر گزشتہ تین چار برس لکھنے کے حوالے سے میرے سب سے سست سال رہے ہیں، غمِ روزگار اور پھر 2014ء کے اوائل میں میرے والد صاحب کی وفات نے تو جیسے میرے قلم کو بانجھ کر دیا تھا، مجھ سے سات آٹھ ماہ کچھ لکھا ہی نہیں گیا...... بہ مشکل اپنا ہفتہ وار کالم لکھ پاتی تھی۔ ایک دو تحریریں میں نے دوسرے رسالوں کے لیے لکھی ہیں، اس کے علاوہ میں فوجی ماہنامے 'ہلال' میں بھی لکھتی ہوں، کبھی کبھار 'اطراف' کے لیے معاشرتی مسائل پر کہانیاں لکھتی ہوں۔

پاکیزہ ✧......ایک بات جو خصوصیت سے نوٹ کی جاتی ہے کہ آپ فرسٹ پرسن یعنی واحد صیغہ متکلم میں لکھتی ہیں، ایسا کیوں ہے؟

شیریں حیدر ✤......محترمہ نور الہدیٰ شاہ...... سے میری پہلی ملاقات ہوئی، کراچی میں قیام کے



ماہنامہ دلکش کی ایک تقریب میں (دائیں سے) شیریں حیدر، عذرا رسول اور نزہت اصغر

دوران ہی جب میں چینل 'ہم' کے مارننگ شو میں انٹرویو کے لیے گئی تھی تو اس وقت وہ وہاں ڈراما سیکشن کی انچارج تھیں، مجھ سے مل کر انہوں نے یہی بات کہی کہ واحد متکلم کے طور پر لکھنا ایک انتہائی مشکل اندازِ تحریر ہے اور ایسا لکھنے والا بہترین ڈراما رائٹر ہو سکتا ہے، اس طرف توجہ دو...... مگر یقین کریں نزہت جی، میں جب کہانی لکھنا شروع کرتی ہوں تو میں اپنی کہانی کو اوڑھ لیتی ہوں، اس کا کوئی ایک کردار (زنانہ یا مردانہ) بن کر میں باقی کرداروں کے بیچ میں گھوم، گھوم کر انہیں دریافت کرتی ہوں، کہانی لکھنے کے دوران میں اسی کردار کی زندگی جیتی ہوں، مجھے وہ کہانی لکھنا مشکل لگتا ہے جس میں میں خود موجود نہ ہوں۔ (چلیں آپ کی وضاحت مان لیتے ہیں مگر شاید ہر دفعہ نہیں)

پاکیزہ ✧...... اس سے آپ بیتی کا اسٹائل جھلکتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

شیریں حیدر ❖...... جس طرح اداکار ہر کردار کو اپنے اوپر طاری کر کے اس میں بہترین پرفارمنس دے سکتا ہے اسی طرح لکھاری کسی دوسرے کی کہانی کو اسی وقت بہترین طریقے سے لکھ سکتا ہے جب وہ کرداروں میں ڈھل کر انہیں محسوس کرے، ان کی طرح سوچے اور انہی کی زبان میں بات کرے۔ میری ایک کہانی پاکیزہ میں چھپی تھی، 'میرے اندازے صحیح لیکن'...... اس میں میں نے مردوں کی نفسیات کو ایک مرد بن کر ہی واضح کیا تھا، اس کی تعریف سن، سن کر یقین نہیں آتا تھا کہ واقعی ایسا ہے، میں نے اس کہانی کو خود بارہا پڑھا اور مجھے خود یقین نہ آیا کہ ایسا لکھا ہے میں نے۔

پاکیزہ ✧...... آپ کا طرزِ تحریر کبھی، کبھی کافی بولڈ بھی ہو جاتا ہے اس بارے میں کیا کہیں گی؟

شیریں حیدر ❖...... کوشش کرتی ہوں پیاری کہ ایسا نہ ہو کہ ہماری تحریریں ہر طبقے کے لوگ پڑھتے ہیں اور ہر عمر کی لڑکیاں اور عورتیں بھی مگر بعض موضوعات پر

کچھ نہ کچھ وضاحت لازم ہو جاتی ہے، میرا پاکیزہ میں چھپنے والا حالیہ ناول 'زندگی خاک نہ تھی' میں نے ایک بہت حساس موضوع پر لکھا ہے مگر کوشش کی ہے کہ.... بے باکی نہ سرزد ہو، ممکن ہے کہ میں اپنی کوشش میں کامیاب رہی ہوں لیکن اگر آپ ہمارے ہاں ٹیلی وژن پر دیکھیں تو اس کے مقابلے میں میری تحریروں میں پھر بھی کچھ کم بے باکی ہے مگر میں آپ کی بات کو ذہن میں رکھوں گی اور اگر میرے قارئین کو لگتا ہے کہ میں.... بے باکی سے لکھتی ہوں تو میں کوشش کروں گی کہ ایسا آئندہ بالکل نہ ہو، ہاں جہاں اس سے مفر ممکن نہ ہو، وہاں قارئین کو کچھ گنجائش نکالنا پڑے گی۔

پاکیزہ ✧......ذاتی طور پر آپ کو کیسی کہانیاں لکھنا پسند ہیں؟

شیریں حیدر ❖...... مجھے متوسط طبقے کے حقیقی مسائل پر کہانیاں، ناول اور آرٹیکل...... سب کچھ لکھنا پسند ہے، کہانی کا وجود رہ بھی یہیں گیا ہے نزہت جی، ان کے ہاں مسائل کی ورائٹی ہے، میاں بیوی کے، بچوں کے، گھروں کے، ملازمتوں کے، خاندانوں کے...... یہی تو طبقہ ہے جو زندگی کی اصل دوڑ میں شریک ہے، جہاں سانس لینی بھی جدوجہد ہے۔ کوشش کرتی ہوں کہ پڑھنے والوں کو تفریح بھی ملے، موڈ بھی اچھا ہو جائے...... مگر زندگی کی حقیقتیں اتنی تلخ ہیں کہ انہیں اپنے نام کی کوٹنگ کر کے بھی میں میٹھا نہیں کر سکتی، اس لیے میرے زیادہ تر اختتام رنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ کبھی مزاح بہت لکھا کرتی تھی...... شاید زندگی کے مسائل اور دوسروں کے مسائل پر نظر کم تھی، اب نہیں لکھا جاتا مزاح...... (ویسے مزاح لکھنے سے بھی تو معاشرے میں سدھار آسکتا ہے)

پاکیزہ ✧......اب تک کی اپنی ادبی کاوشوں سے کتنی مطمئن ہیں؟

شیریں حیدر ❖...... جہاں سمجھا کہ مطمئن ہو گئی ہوں تو پھر مزید لکھنے کا جواز ختم ہو جائے گا، جب تک سر ہے اور سر میں سودا ہے...... ہاتھ میں قلم ہے اور قلم میں دم ہے، تب تک تو لکھتی رہوں گی انشاء اللہ۔ جب خیالات ختم ہو گئے، نئی کہانیوں کے نت نئے آئیڈیاز نہ رہے تو کام ختم ہو جائے گا اور اطمینان بھی آ جائے گا۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ اسی طرح چھپتا ہے، حرف بہ حرف...... کالم ہو یا کہانی، ایک کہانی میں نے عمر بھر میں ایسی لکھی کہ جس کے کچھ حصے انجم جی نے مجھے واپس بھیجے کہ انہیں حذف کر دوں، بولڈ ہونے کی وجہ سے...... آپ مطمئن ہیں، میرے قارئین مطمئن ہیں تو یہی میرا اطمینان ہے۔ (اللہ آپ کے قلم کو رواں رکھے۔ آمین!)

پاکیزہ ✧......آپ نے افسانہ، ناولٹ، ناول اور کالم نگاری سبھی پر طبع آزمائی کی...... کیا چیز لکھنے میں لطف محسوس کرتی ہیں؟

شیریں حیدر ❖......کالم...... ایک دو گھنٹے میں کام ہو جاتا ہے، ہفتے میں ایک بار، اس ہفتے جس مسئلے پر سوچتی رہتی ہوں، اسے جمعے کے دن سطحِ قرطاس پر بکھیرتی ہوں اور وہ اتوار کو چھپ جاتا ہے...... اسی دن لوگوں کی رائے ای میل سے مل جاتی ہے، لوگوں سے بلا واسطہ رابطہ رہتا ہے، لوگ اپنے مسائل بتاتے ہیں کہ ان پر لکھیں، انہیں یقین ہوتا ہے کہ قلمکار کے ذریعے ان کا مسئلہ شنوائی حاصل کر لے گا۔ اس سلسلے میں مجھے ایک واقعہ اور ایک بہت پیاری شخصیت کی یاد آ گئی قمر علی عباسی صاحب کی...... اللہ ان کے درجات بلند کرے (آمین) عذرا جی نے ادارہ جاسوسی کی طرف سے انہیں دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا اور مجھے بھی اعزاز بخشا کہ میں چند لکھاریوں کے ساتھ اس کھانے میں شریک ہوئی، میں عذرا جی کے دفتر میں داخل ہوئی عین دیے گئے وقت کے مطابق، تھوڑی دیر میں قمر علی عباسی مرحوم اور نیلو جی تشریف لائے، عذرا جی نے سب کا باری، باری تعارف کروایا۔ ''شیریں حیدر!'' عذرا جی نے میرا نام لیا۔ ''آپ کو تو میں امریکا میں بھی ہر روز صبح سویرے یاد کرتا ہوں!'' آداب کے بعد انہوں نے مجھ سے فرمایا تو میں شرمندہ سی ہوئی،



بھری محفل میں راز کی بات کہہ دی..... حالانکہ ان سے میری اس روز قطعی پہلی ملاقات تھی، میرے چہرے پر سوالیہ کیفیت اور حیرت کا لیپ دیکھ کر بولے..... "ارے بھئی آپ نے ایک کالم نہیں لکھا تھا پانی کے زیاں کے بارے میں..... اگر ہم برش کرتے وقت پانی کے نل کو کھلا نہ رکھیں تو اتنا پانی بچایا جا سکتا ہے..... تو ہر روز برش کرنے کے لیے پانی کھولتا ہوں، برش گیلا کرتا ہوں، آپ کو یاد کرتا ہوں اور نل بند کر دیتا ہوں، جب تک دوبارہ پانی کی ضرورت نہ پڑے۔" قمر علی عباسی صاحب کہنے لگے..... یہ ہوتا ہے تحریر کا اثر اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والا اصل اطمینان۔
(واہ بہت خوب)

پاکیزہ ✧..... اپنے آس پاس کے کردار کس حد تک متاثر کرتے ہیں کہ فوراً کہانی میں لے آنے کو دل چاہے؟

شیریں حیدر ❖..... میں لوگوں کو پڑھتی رہتی ہوں، انہیں گہری نظر سے دیکھتی ہوں، ان کی بات اور اوقات، چال ڈھال اور شخصیت کے خفیہ گوشے..... پھر انہیں اپنے ذہن کے نہاں خانوں میں محفوظ کر لیتی ہوں، جب ضرورت پڑتی ہے تو کھنگالتی ہوں کہ اس کردار پر کون سا شخص فٹ بیٹھتا ہے۔ پھر اسے کہانی کا حصہ بنا لیتی ہوں۔ کوئی بھی کہانی فوری اور جلدی، جلدی نہیں لکھتی، بہت دن سوچتی ہوں، جب لگتا ہے کہ اس سے زیادہ بوجھ دماغ نہیں اٹھا سکتا تو پھر اسے نذرِ قارئین کرتی ہوں۔ (نئی لکھاری بہنیں یہ باتیں ضرور نوٹ کریں)

پاکیزہ ✧..... کلاسیکی ادب (انگریزی یا اردو) کس حد تک پڑھا، کیا بولڈنیس کا عنصر وہاں سے لیا؟

شیریں حیدر ❖..... کلاسیکی ادب میں انگریزی اور تھوڑا سا روسی ادب کو پڑھا، اردو ادب میں سب کو پڑھا کہ اردو ادب میرا نصابی مضمون تھا، کورس کی کتابوں کے علاوہ بھی سبھی کو پڑھا۔ بولڈنیس جو اس زمانے میں ممتاز مفتی، عصمت چغتائی، منٹو اور ہاجرہ مسرور جیسے لکھاریوں میں تھی، اس وقت اور زمانے کے لحاظ سے وہ بہت کافی تھی، آج کل کے زمانے میں میرے جتنا بولڈ یا ممکن ہے کہ اس سے بولڈ بھی لکھا جا رہا ہو۔

پاکیزہ ✧..... ہم عصروں میں کس سے متاثر ہیں؟ یعنی کن، کن کی تحریریں پسند ہیں؟

شیریں حیدر ❖..... میں نے ہم عصروں میں بھی سب کو پڑھا ہے اور باقاعدگی سے پڑھتی رہتی ہوں، کوئی بھی لکھاری اس وقت تک لکھ نہیں سکتا جب تک کہ اسے اپنے زمانے کی نبض کا علم نہ ہو، دوسرے کیا اور کن موضوعات پر لکھ رہے ہیں، پڑھنے والے کیا پڑھنا چاہ رہے ہیں، سب کچھ مدِنظر رکھنا پڑتا ہے۔ کچھ نام لکھوں گی تو بہت سے نام لکھنا رہ جائیں گے اور کئی لوگوں کی دل آزاری ہو گی..... میں نے

بانو قدسیہ صاحبہ اور بشریٰ رحمٰن کو اس وقت بہت شوق سے پڑھا جب میں نے ابھی افسانہ لکھنا بھی شروع نہیں کیا تھا، وہ میری ہم عصر نہیں ہیں، میرے لیے بڑی معتبر ہیں۔ ہم عصروں میں، میں نے عمیرہ احمد کا لکھا ایک، ایک لفظ پڑھا ہے اور ان کی ہر کتاب میں خود کو تحفتاً دیتی ہوں...... طنز و مزاح میں انجم جی کا کوئی ثانی نہیں، ناہید سلطانہ اختر بہت منجھی ہوئی لکھاری ہیں، میں ہر نئی پرانی لکھاری کو پڑھتی ہوں اور اپنی بہنوں کے تبصروں کو بھی۔ (بے شک مطالعہ ہی تحریر نگاری سکھاتا ہے)

پاکیزہ ✧...... مرد رائٹرز اور خواتین رائٹرز کی تحریروں میں کیا فرق نمایاں لگتا ہے؟

شیریں حیدر ❖...... جتنا فرق مرد اور عورت کی ساخت اور سوچ میں ہوتا ہے اتنا ہی فرق ان کی تحریر میں بھی ہوتا ہے...... عصرِ حاضر میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مرد کم اور عورتیں زیادہ لکھ رہی ہیں، مردوں کے پاس ایک وسیع دنیا ہے، عورتیں عموماً گھریلو مسائل پر لکھ رہی ہیں...... ورنہ دنیا کے ہر موضوع پر عورتوں نے بھی لکھا ہے اور مردوں کے بارے میں بھی ایسا لکھا ہے کہ مرد خود بھی پڑھ کر حیران رہ جائیں۔

پاکیزہ ✧...... آپ کی تحریریں پسند کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے، اپنی پزیرائی پر کیسا محسوس کرتی ہیں؟

شیریں حیدر ❖...... میں کیا اور میری اوقات کیا، جو کچھ ہے وہ سب میرے اللہ کا کرم ہے نزہت جی، اب بھی لگتا ہے کہ بہت کچھ لکھنے کو باقی ہے، بہت کچھ سیکھنے کو باقی ہے، بہت سے موضوعات کو زیرِ قلم لانا باقی ہے، دیکھیں زندگی جتنی مہلت دے۔ (ضرور لکھیں پاکیزہ کے صفحات حاضر ہیں)

پاکیزہ ✧...... ڈراما نگاری کی طرف دھیان نہیں گیا؟

شیریں حیدر ❖...... ڈراما نگاری کی طرف دھیان اس لیے نہیں جاتا کہ میں نے کبھی اس طرح کہانی یا ناول لکھنے کا بھی نہیں سوچا تھا، انجم جی نے جب پہلی بار مجھ سے کہا کہ میں ناول لکھنے کا سوچوں تو میں گھبرا گئی، اتنے کردار، اتنی طویل کہانی کیسے سنبھالوں گی مگر اُن کے کہنے پر ''اِک کسک مسلسل'' لکھا، فقط چار قسطوں کا ناول...... مگر اس کی اتنی پزیرائی ہوئی کہ آج تک لوگ 'نور بی بی' کے کردار کو نہیں بھولے اور وہ ناول 'شیریں حیدر' کی پہچان بن گیا۔ محترمہ نور الہدیٰ شاہ نے مجھے ترغیب دی، صرف ترغیب نہیں بلکہ انہوں نے مجھے باقاعدہ کلاسیں دیں، مجھے بتایا کہ ڈراما لکھنے کے لوازمات کیا ہیں، میں نے جو دو ٹیلی فلمیں لکھی ہیں وہ انہی کی تحریک پر لکھیں...... عمیرہ احمد سے بھی رابطہ رہا ہے، صائمہ اکرم سے بھی، ان کا بھی خیال ہے کہ میں ڈراما لکھ سکتی ہوں اور مجھے ڈراما لکھنا چاہیے۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ جیسے میں خود کے ساتھ زبردستی کر رہی ہوں۔ مجھے خود ڈراما دیکھنے سے زیادہ کہانی پڑھنا پسند ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ ڈراما آپ کے اس تخیل سے بہت مختلف ہوتا ہے جو آپ کہانی پڑھتے ہوئے خود قائم کرتے ہیں۔ (یہ تو صحیح بات ہے ہر قاری اپنا الگ تخیل تخلیق کرتا ہے)

پاکیزہ ✧...... آپ نے فوجی ماحول میں رہتے ہوئے فوجی کرداروں پر زیادہ نہیں لکھا کیوں؟

شیریں حیدر ❖...... اِک کسک مسلسل، برف پر کھلتے گلاب، میرے اندازے صحیح لیکن، م سے محبت، خوشیوں کی لو، کچے دھاگے اعتبار کے، وطن کی مٹی گواہ رہنا...... ابھی اتنے ہی نام یاد آ رہے ہیں، سب فوج کے پس منظر میں لکھے گئے ناول اور ناولٹ ہیں، ہاں میں نے اس طرح نہیں لکھا جس طرح ساجدہ حبیب صاحبہ نے لکھا، وہ ایک legend ہیں اور فوجی پس منظر میں لکھی گئی ان کی کہانیوں کا رنگ ہی نرالا ہے۔ میں نے فوج پر اس انداز سے نہیں لکھا، کچھ مجبوریاں...... البتہ میرے کافی کردار فوجی رہے ہیں، اس کے علاوہ کالمز میں بھی فوج پر لکھتی ہوں اور ماہنامہ ہلال میں بھی فوجی زندگی پر لکھتی ہوں، کچھ فوج





کی پابندیاں ایسی ہوتی ہیں کہ خیال سے لکھنا پڑتا ہے، ہماری وہ لکھاری جو فوج کو نہیں جانتیں اور فوج کے بارے میں لکھتی ہیں، ان کے ہیرو وردی پہن کر چھٹی پر گھر بھی آ جاتے ہیں جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا، افسانہ اور کہانی لکھتے ہوئے یہ خیال ضرور رکھنا پڑتا ہے کہ کہانی مصنوعی نہ لگے، میں تو ویسے بھی کہانی گھڑ نہیں سکتی اس لیے حقیقت سے کہانیاں اخذ کرتی ہوں۔ (یہ تو ہے کسی بھی پروفیشنل...... کردار کو لکھنے کے لیے مکمل مشاہدہ اور معلومات ہونی چاہئیں)

پاکیزہ ✧......زندگی کی ترجیحات بدلتی رہتی ہیں۔آج کل کیا ترجیح سرِفہرست ہے؟

شیریں حیدر ❖...... آج کل میں اپنی دونوں ماؤں کو وقت دینے کی کوشش کرتی ہوں، اپنے والد صاحب کی وفات کے بعد میں اپنی ماں کو بہت تنہا پاتی ہوں، اسی طرح میری ساس امی ہیں جو کہ ہماری اہم ذمے داری ہیں، وہ علیل ہیں اوران کی دیکھ بھال کی خاطر میں نے اپنی ملازمت بھی چھوڑی ہے، خدمت اور گھرداری آج کل اولین ترجیح ہے۔ (بے شک یہ بھی عبادت ہے)

پاکیزہ ✧......سوال کچھ عجیب تو نہیں لگے کیونکہ ہم عورتوں کی زندگی میں تو شوہر، بچے، گھر، رشتے داریاں انہی ترجیحات سے فہرست پُر رہتی ہے آپ کا کیا خیال ہے؟ انہی سب کے بیچ اپنے شوق کی تکمیل میں کیا، کیا مراحل درپیش ہوئے؟ شروع سے آخر مختصراً

بتادیں؟

شیریں حیدر ❖...... سوال قطعی عجیب نہیں لگے، ہر عورت کی طرح میری زندگی میں بھی اولین ترجیحات میں میرا گھر اور میرا خاندان ہے، جس طرح اپنے فرائض اور ملازمت میں سے انتخاب کرنا پڑا تو میں نے ملازمت چھوڑ دی، اگر مجھے لکھنے اور خاندان میں انتخاب کرنا پڑے تو شاید میں ایک لمحے کے لیے بھی نہ سوچوں، لاکھ تکلیف دہ سہی...... مگر میرا عشق یعنی لکھنا میرے فرائض سے بڑھ کر تو نہیں ہو سکتا! ویسے میرا لکھنا بھی میرے لیے فرض ہی ہے نزہت جی! جب گھر، بچوں، خاندان اور ملازمت کے تقاضوں نے مہلت نہ دی تو سب سے زیادہ لکھنا ہی متاثر ہوتا رہا ہے۔

پاکیزہ ✧...... آپ کے بچوں میں یہ شوق کس حد تک پایا جاتا ہے؟

شیریں حیدر ❖...... میرے بچوں میں سے میرے بیٹے عبداللہ گوہر میں کچھ جراثیم پائے جاتے ہیں، اردو میں تو بچوں نے ماں کا نام ہی ڈبویا ہے، وہ انگریزی میں لکھتا ہے مگر ابھی اس کے لکھے میں تسلسل اور روانی کا فقدان ہے، امید ہے کہ اس نے سلسلہ جاری رکھا تو نام کمائے گا انشاء اللہ! (جی بالکل)

پاکیزہ ✧...... شوہر نامدار کس حد تک معاون و مددگار رہے؟

شیریں حیدر ❖...... میکے میں میرے والد صاحب (مرحوم) اور سسرال میں میرے شوہر...... (اللہ انہیں سلامت رکھے، آمین!) ان دونوں کی حوصلہ افزائی، فخر، مدد اور تعاون نے میرے لیے راہیں آسان کیں۔ فوجیوں کی بیویوں کے لیے لکھنے پر کئی طرح کی پابندیاں ہوتی ہیں جو بہت سی لکھاریوں کو پنپنے ہی نہیں دیتیں، اس سلسلے میں جہاں مدد کی ضرورت پڑی، میرے شوہر میرے لیے موجود تھے، میری کہانیاں پڑھتے ہیں، حالانکہ انہیں اردو پڑھنے کا ویسے کوئی شوق نہیں ہے۔ میری کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں بھی انہوں نے ہر طرح کا تعاون کیا۔ (ماشاء اللہ)

پاکیزہ ✧...... ایسے میں بھائی اور دیگر رشتے داروں کے کیا تاثرات ہوتے ہیں؟

شیریں حیدر ❖...... میرے بھائی میرا سب لکھا نہیں پڑھتے، ان کی وقت کی کمی کی مجبوریاں ان کا بہترین جواب ہوتی ہیں، ہاں وہ جو کچھ پڑھتے ہیں اس پر تبصرہ ضرور کرتے ہیں، البتہ میرے کالم میرے تینوں بھائی بھی پڑھتے ہیں اور خاندان کے دیگر افراد بھی، اپنی، اپنی فیس بک پر شیئر کرتے ہیں اور جو کالم انہیں پسند آتے ہیں ان کا لنک وہ اپنے دوستوں کو بھی بھجواتے ہیں، میرے والد صاحب میری کہانیوں کے سب سے پہلے قاری اور مداح ہوتے تھے، میری کہانی پڑھ کر وہ فوراً کال کر کے تبصرہ کرتے تھے، اب میرے خاندان میں میری کہانیوں کی سب سے بڑی مداح میری والدہ محترمہ اور میری بہت پیاری بھابی حمیرا ہیں، ان کی لگن اور تبصرے مجھے حوصلہ دیتے ہیں۔ (بہت خوب! حوصلہ افزائی کا سلسلہ گھر سے ہی شروع ہوتا ہے۔)

پاکیزہ ✧...... آپ نے اپنے بچوں کی تربیت میں کس پہلو کو مدِنظر رکھا؟

شیریں حیدر ❖...... ہاتھ کی دس انگلیوں پر گن کر دس اوصاف نزہت جی، میری ہی نہیں بلکہ سب کی اولاد کی تربیت کا سارا نچوڑ ہیں...... سچ اور حق کا ساتھ دینا، انصاف کرنا اور ناانصافی کرنے والے کو غلط کہنا، سچ بولنا، امانت میں خیانت نہ کرنا اور چوری سے گریز کرنا، کسی کو کسی طرح کا بھی دھوکا نہ دینا اور پرائے پھڈے میں ٹانگ نہ اڑانا، وعدے کی پابندی کرنا، اپنے جسم کی ظاہری اور باطنی صفائی رکھنا، زندگی کے ہر دور میں محنت کرنا، ہر چھوٹے بڑے کی عزت نفس کا خیال کرنا، اپنی غلطی کو تسلیم کرنا اور اسے پھر نہ دُہرانا، رشتوں میں لحاظ اور احترام ملحوظ رکھنا۔ مذہب کی تعلیم اور ملک سے محبت کے درس کے علاوہ یہی اقدار ہیں

جن سے ہر اچھے انسان کے کردار کی تخلیق ہوتی ہے۔ (یہ بھر پور سبق ہے جناب سب کے لیئے خود اپنی اور اپنی اولاد کی تربیت کا)

پاکیزہ ✧......آج کی ان خواتین سے کیا کہیں گی جو ہر چیز کا الزام میڈیا اور زمانے پر ڈال کر بری الذمہ ہونا چاہتی ہیں؟

شیریں حیدر ❖......میڈیا پر ذمے داری تو ہم اسی لیے ڈالتے ہیں ناں کہ ہمارے پاس وقت نہیں رہا، اولاد کی تعلیم و تربیت کی ذمے داری ہم نے خود ہی میڈیا پر ڈال دی ہے، روتے ہوئے بچے ہوں تو ہم انہیں کارٹون لگا کر بٹھا دیتے ہیں، کبھی بیٹھ کر ان کارٹونوں کی گفتگو سنیں جو وقت کے ساتھ بچے سمجھنے لگتے ہیں۔انہیں کھانا کھلانا ہو تو ٹی وی کے سامنے بٹھا کر ان کی توجہ اس طرف لگا کر ان کے منہ میں نوالے ٹھونستی ہوئی مائیں، کہیں جانا ہو تو انہیں ٹیلی وژن دیکھنے یا کمپیوٹر استعمال کرنے کی اجازت دے کر ماں باپ گھر سے چلے جاتے ہیں، یہ سوچے بغیر کہ ان کے بچے ان کی غیر موجودگی میں اس آزادی سے کس، کس طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں، خود ہم نے میڈیا کو ان کی دوسری ماں بنا دیا ہے تو پھر شکایت کیسی اور گلہ کیا!(بالکل سچ کہا آپ نے)

پاکیزہ ✧......اپنے لڑکپن میں آپ کیسی لڑکی تھیں......آج کی لڑکی میں کیا فرق نظر آتا ہے؟

شیریں حیدر ❖......اِک کسک مسلسل کی نور بی بی ... سلسلے دل کے کی مہک، ہم سے محبت کی بیلا جیسی! میں اپنے بچپن اور لڑکپن میں بھی بہت ذہین، ہونہار، فرمانبردار، بہادر اور بولڈ تھی، اب بھی ہوں (اپنے منہ میاں مٹھو نہ سمجھیے گا)......میرے والد صاحب نے مجھے کبھی بیٹی نہیں کہا، وہ ہمیشہ مجھے اپنا بیٹا کہتے تھے، میں کیڑے مکوڑوں سے بھی نہیں ڈرتی تھی نہ اب ڈرتی ہوں۔میں نے کبھی کسی سے اپنے کسی کام کے لیے مدد نہیں مانگی، مجھے ہمیشہ دوسروں کی مدد کر کے خوشی ہوتی ہے۔میں بہت خود مختار رہی ہوں اور اب بھی ہوں شاید، اپنے سارے کام اب بھی خود کرتی ہوں، اپنے شوہر کے اہم ترین عہدے کے باوصف (گھر میں ملازمین کی فوج ہوتے ہوئے) بھی میں نے اپنے کام کرنے میں کبھی عار سمجھا نہ سستی کی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد اگر ہمارے پاس ملازم نہ بھی ہو تو مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔اب بھی میں ایسی ہی ہوں، عمر کے ساتھ طبیعت میں ٹھہراؤ آ گیا ہے (بصد کوشش) مگر جہاں کچھ غلط ہوتا ہے میں برداشت نہیں کر سکتی خواہ وہ ائر پورٹ ہو، سڑک، اسپتال، اسکول، بازار یا گھر...... باقی آج کی لڑکیوں سے میں اپنا موازنہ کبھی نہیں کرتی، سب کچھ ہم سب دیکھ ہی رہے ہیں۔

پاکیزہ ✧......اچھا آپ کالم نگاری میں کیا چیز بیان کرنے کی کوشش کرتی ہیں، طنزیہ انداز میں مسائل کا بیان یا اُن کے حل کی طرف بھی پیش رفت......؟

شیریں حیدر ❖...... کچھ عرصہ پہلے تک کالم کا میڈیم بہت محدود تھا اور اس میں بہت کم اصناف اور موضوعات کی گنجائش تھی، آج کے قلمکاروں اور کالم نگاروں نے اس کا دامن بہت وسیع کر دیا ہے، میں نے کالم نگاری میں خود ہر ایک صنف کو استعمال کیا ہے...... میں نے نظم کی صورت بھی کالم لکھے ہیں...... سنجیدہ، تلخ، طنزیہ، مزاحیہ، رزمیہ، کہانی کے انداز میں اور نصیحت آموز بھی۔مسائل کو واضح کر کے لکھنا کہ حکام بالا تک کچھ نہ کچھ پیغام ضرور پہنچے، کالموں میں بھی میں عام آدمی کی روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے مسائل کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتی ہوں اور جہاں ممکن ہو ان کا آسان حل بھی...جو حکومت کر سکتی ہے یا ہم خود بھی......!(بے شک کالم نگار بھی ایک کردار ساز اور معاشرہ ساز ہے اور وہ اپنے تئیں کوشش کر رہا ہے)

پاکیزہ ✧......کیا کہانیاں لکھنے سے تسلی اور اطمینان نہیں ہو رہا تھا جو کالم نگاری کی طرف بھی آئیں؟

شیریں حیدر ❖...... اپنے اردگرد کی دنیا میں

مسائل دیکھ کر دل کڑھتا تھا، باقی سب لوگوں کی طرح ہم بھی اپنے گھروں میں بیٹھ کر ان کی بابت بات کرتے اور یہ سوچ کر رہ جاتے کہ ان کا کوئی حل نہیں ہے...... یہ بڑا بے حسی والا رویہ لگتا تھا مجھے اور سوچتی تھی کہ اس سے بڑھ کر کچھ ہونا چاہیے، دو ایک بار ان مسائل کے بارے میں لکھا، وہ چھپ گیا، لوگوں کی رائے ای میل پر ملی تو اندازہ ہوا کہ میرے اس انداز سے تحریر کیے گئے مضامین لوگوں کو پسند آتے ہیں کیونکہ میں نے عام فہم انداز میں اور عام آدمی کے بارے میں عموماً لکھا ہے...... کالم میں میں مذہب، لسانیت، سیاست اور فرقہ واریت کے موضوعات سے اجتناب کرتی ہوں اور کوشش ہوتی ہے کہ جہاں کہیں بھی میری آواز پہنچے تو کسی دل پر اثر بھی ہو۔ ڈائجسٹ میں لکھی گئی تحریریں اگر ہزاروں یا لاکھوں افراد پڑھتے ہیں تو کالم یقیناً کروڑوں کی تعداد میں پڑھا جاتا ہے...... اخبار سے بھی اور انٹرنیٹ پر بھی...... تین سال تک خبریں میں لکھا اور اب ساڑھے پانچ برس سے ایکسپریس میں ہر اتوار کو کالم لکھتی ہوں۔ (اللہ زورِ قلم اور زیادہ کرے)

پاکیزہ ✧...... آپ کو بسیار نویس اور زود نویس بھی کہا جاسکتا ہے...... اس کے لیے مطالعے کی کتنی اہمیت اور ضرورت ہوتی ہے؟

شیریں حیدر ❖...... لکھنے کے لیے مطالعے کی اہمیت ایسی ہے جیسی کہ جسم میں ریڑھ کی ہڈی کی، میں پڑھتی ہوں تا کہ میرا ذہن بھی کھلے اور دوسروں کو پڑھ کر کہانیوں کے نئے موضوعات بھی مل جاتے ہیں، بسیار نویس...... میں نے 2000ء سے لے کر آج تک 56 کہانیاں اور ناولٹ، دو منی ناول (دو اقساط پر مبنی، میں کسی کی بیٹی نہیں اور تتلی)، دو ناول (اک کسک مسلسل، چار اقساط اور سلسلے دل کے، تین اقساط) دو طویل ناول (امر بیل، 19 اقساط اور شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں، 13 اقساط) جو سال بھر سے زیادہ چلے اور حال ہی میں ختم ہونے والا ناول، (زندگی خاک نہ تھی) جو چھ ماہ میں مکمل ہوا، یہ اعداد و شمار میری دیگر ڈائجسٹ، پاکیزہ اور دلکش میں چھپنے والی تمام تحریروں کے ہیں، میں نہیں سمجھتی کہ وہ بہت زیادہ ہے اور میں جلدی، جلدی بھی نہیں لکھتی نزہت جی، لکھنے پر موجی من آ جائے تو ایک سال ایسا بھی تھا جب میں نے ہر ماہ پاکیزہ میں نئی کہانی دی اور ایسے وقت بھی آئے (2005ء، 2012ء، 2013ء، 2014ء) کہ پورے برس میں بہ مشکل دو یا تین کہانیاں لکھ پائی اور شائع ہوئیں۔ (گڈ! آپ نے پورے اعداد و شمار دیے)

پاکیزہ ✧...... چلیں کچھ ذاتی مشاغل پر بھی بات ہو جائے...... تحریری مصروفیت کے علاوہ اور کیا کرتی ہیں؟

شیریں حیدر ❖...... مصروفیات...... بہت سی ہیں، میں فارغ نہیں بیٹھ سکتی، ہر وقت کچھ نہ کچھ کر رہی ہوتی ہوں، مجھے فارغ بیٹھنے سے بخار ہونے لگتا ہے...... پڑھتی ہوں، جو بھی مل جائے، قرآن پاک کو اپنے لیے زندگی کے ہر معاملے میں راہنما سمجھتی ہوں اس لیے اس کی تفسیر پڑھتی ہوں جب بھی توفیق اور واجب احترام میسر ہو، اس کے علاوہ بہت سے ڈائجسٹ، نئے اور پرانے لکھاریوں کی کتابیں...... سلائی کر لیتی ہوں، کھانا پکانا، کڑھائی، کروشیہ، بُنائی وغیرہ...... پہلے بہت کرتی تھی اب کم، چند برس پہلے دونوں ہاتھوں کو سُن رہنے کی شکایت رہنے لگی، CTS کے باعث دونوں ہاتھوں کا آپریشن ہوا تو بہت سے مشاغل ترک کرنا پڑے، لکھتی اب کمپیوٹر پر ہوں اور کھانا پکانا جاری رکھے ہوئے ہوں، باقی کام جو پہلے جنونیوں کی طرح کرتی تھی وہ اب بوقت انتہائی ضرورت تک آ گئے ہیں۔ (اللہ آپ کے فن و ہنر اور صحت کو سلامت رکھے۔ آمین!)

پاکیزہ ✧...... من پسند ذائقہ، خوشبو، رنگ، لباس، پھول، موسم، تفریح گاہ کے بارے میں بھی کچھ بتائیں؟

شیریں حیدر ❖...... ایک سوال میں سات سوال



لپیٹ لیے آپ نے نزہت جی، بہت سادہ خوراک ہوں، جو حلال اور اچھا پکا ہوا مل جائے کھا لیتی ہوں، سبزیاں بھی، گوشت اور دالیں بھی، کچھ بھی ناپسند نہیں اور یہی بات بچوں کو بھی سکھائی کہ رزق پر نکتہ چینی کرنے سے اللہ تعالیٰ رزق کم کر دیتے ہیں۔ پھولوں سے بنے ہوئے اچھے پرفیوم پسند ہیں، مختلف اوقات میں مختلف پرفیوم پسند اور زیرِ استعمال رہے ہیں، تاہم Ralph کی Romance اور Issey Miyake ،Mambo کی L'eau D'issey اور Narcisco Rodriguez آج کل پسند اور زیرِ استعمال ہیں۔ رنگ سفید اور گلابی پسند ہے مگر سارے رنگ پہن لیتی ہوں، لال، اورنج اور جامنی کے علاوہ۔ لباس میں اپنا قمیص، شلوار یا پاجامہ، پھولوں میں گلاب کا پھول، موسم گرمیوں کا، لمبے لمبے دن اور چھوٹی چھوٹی راتیں، کام کرنے کو زیادہ وقت مل جاتا ہے۔ تفریح کے لیے پہاڑوں اور ساحلوں پر جانا پسند ہے، اللہ تعالیٰ نے زندگی میں بہت مواقع دیے ہیں اور اس سلسلے میں کوئی حسرت نہیں رہی۔ (شکر الحمد للہ)

پاکیزہ ✧......اپنے چھوٹوں کو اکثر کیا نصیحت کرتی ہیں؟

شیریں حیدر ❖......اپنے ملک سے محبت کریں، بڑوں کا احترام کریں، مطالعے کی عادت کو اپنائیں، زندگی میں کوئی شارٹ کٹ نہ ڈھونڈیں۔

پاکیزہ ✧......دوستی یاری، رفاقت، پیار، محبت، انسیت، اپنائیت اور رواداری یہ سب ایک ہی جذبے کے عکس ہیں؟ ان سب کی موجودگی اپنے آس پاس کس حد تک اور کن رشتوں میں پاتی ہیں؟

شیریں حیدر ❖......اللہ کا مجھ پر بڑا خاص کرم ہے، اس نے مجھے بہت نوازا ہے اور میں رشتوں اور دوستیوں کے معاملے میں بہت امیر ہوں، اپنے پیاروں سے محبت اور احترام کا رشتہ ہے اور یہ باہمی ہے۔ راز میں ہر ایک سے شیئر نہیں کرتی، یہ زندگی کا ایک سنہرا اصول ہے کہ جو بات آپ کے اپنے پیٹ میں نہیں رہ سکی اور آپ نے کسی اور سے کہہ دی، دوسرا اس کو راز نہیں رکھ سکتا، دوست اور رشتے بہت ہیں مگر محرمِ راز دو ایک ہی ہیں۔ (بہت خوب)

پاکیزہ ✧......اچھا عشق و محبت سے بھرپور خالص رومانوی کہانی آپ نے کم کم لکھی کیوں؟

شیریں حیدر ❖......بہت لوگ لکھ رہے ہیں

ناں اس موضوع پر...... مجھے حقیقتوں پر کہانیاں لکھنا اچھا لگتا ہے، اپنے اردگرد پھیلی ہوئی کہانیاں میری توجہ اپنی طرف کھینچتی ہیں...... اور بقول فیض، اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا...... میں رشتوں پر کہانیاں لکھتی ہوں اور محبت ہر رشتے کی بنیاد ہے۔ (صحیح کہا)

پاکیزہ ✧......چلیں اپنا پسندیدہ شعر تو سنائیں یا کچھ گنگنادیں جو اکثر اکیلے میں لبوں سے پھسل جاتا ہو؟

شیریں حیدر ❖......بہت سارے شعر پسند ہیں، کوئی کسی شاعر کا کوئی کسی کا، کوئی ایک شعر اس میں سے منتخب کرنا بہت مشکل ہے، غالب کا ایک شعر فی الفور ذہن میں آ گیا ہے۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا میرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے

پاکیزہ ✧......ٹی وی بینی کی کس حد تک شوقین ہیں؟ کیا دیکھنا پسند کرتی ہیں۔

شیریں حیدر ❖......بہت کم ٹی وی دیکھتی ہوں، تنہا بھی ہوں تو ترجیح ہوتی ہے کہ کچھ پڑھ لوں، کسی اور نے آن کر رکھا ہو تو جو بھی چل رہا ہو، دیکھ لیتی ہوں۔

پاکیزہ ✧......آخری پاکستانی فلم کب اور کون سی دیکھی؟

شیریں حیدر ❖......آج کل اچھی پاکستانی فلمیں بن رہی ہیں اور اس لیے بھی کہ ہمیں اپنی فلموں کو پروموٹ کرنا چاہیے، میں عموماً ہر نئی پاکستانی فلم دیکھتی ہوں، حال ہی میں 'جوانی پھر نہیں آنی' دیکھی ہے۔ (ارے واہ! ویسے ہمارے آج کے بچوں کو تو پرانے اداکاروں کا معلوم ہی نہیں...... کم از کم آج کی فلموں سے یہ آگاہی تو ہو جائے گی)

پاکیزہ ✧......کبھی کسی اسٹیج ڈرامے یا کنسرٹ میں جانے کا موقع ملا؟ کیا ایسی تفریح عام ہونی چاہیے؟

شیریں حیدر ❖......ہاں، بہت دفعہ بیرونِ ملک بھی اور پاکستان میں بھی اسٹیج، تھیٹر اور کنسرٹ دیکھنے کا شوق ہوا...... ہمیں اسٹیج کے لیے ابھی بہت میچور ہونا ہے، ہمارے ہاں اسٹیج پر فحاشی کو پسند کیا جاتا ہے اور عموماً اداکاراؤں پر ہوٹنگ اور فقرے بازی کی جاتی ہے، بیرونِ ملک لوگ تعلیم یافتہ ہیں اور پرفارمرز پر ہوٹنگ نہیں کرتے، ہمیں انور مقصود جیسے لکھاریوں کے اسٹیج ڈراموں جیسے ڈرامے عام کرنا چاہئیں مگر اس کے لیے بھی ایک مخصوص طبقہ ہے جن کی ذہنی اُپج اتنی ہے۔ (یہ بات تو ہے)

پاکیزہ ✧......ہوٹلنگ کس حد تک کرتی ہیں؟ نت نئے ذائقوں کو explore کرنے کا شوق کس حد تک ہے؟

شیریں حیدر ❖......جب بچے آئے ہوں تو باہر کھانا کھانے کے لیے جانا اچھا لگتا ہے مگر کچھ عرصے سے جو حالات اچھے، اچھے ریسٹورانوں کے بھی بن رہے ہیں اس کے بعد دل نہیں چاہتا...... ویسے زندگی اس انداز کی گزری ہے کہ گھر پر کھانا، کھانا ٹریٹ لگتا تھا۔ مجھے پاکستانی کھانوں کے علاوہ "دیسی چائنیز" پسند ہے، اصل چائنیز کھانا بڑے دل گردے کا کام ہے۔

پاکیزہ ✧......خود بھی کوکنگ کرتی ہیں تو کیا، کیا بناتی ہیں؟

شیریں حیدر ❖......ہر طرح کا کھانا بنا لیتی ہوں، دعوتوں کے لیے بھی اور معمول کا بھی...... دال، سبزی وغیرہ۔ جب بچے پاس تھے تو ان کے لیے نت نئے کھانے، بیکنگ وغیرہ سب کچھ کیا ہے۔ (ویسے شیریں، ہم نے بھی آپ کے ہاتھ کے ذائقے چکھے ہوئے ہیں)

پاکیزہ ✧......پاکیزہ سے تعلق جڑنے کی کہانی بھی ضرور بتائیے؟

شیریں حیدر ❖......ہاہ! کیا یاد کروا دیا نزہت جی، پاکستان میں تھے تو جہاں تبادلہ ہوتا، وہاں کی لائبریری میں چند ماہ میں چاٹ دیا کرتی اور پھر انتظار شروع ہو جاتا کہ کہیں اور تبادلہ ہو تو نئی لائبریری دریافت کی جائے۔ 1995ء میں لندن گئی تو وہاں کی لائبریری میں انگریزی کتب تو بہت تھیں مگر اردو پڑھنے کا چسکا پورا نہ ہوتا تھا، ساؤتھ ہال کی ایک دکان میں پہلی بار میں نے پاکیزہ دیکھا اور خرید لیا، جتنے نئے

پرانے شمارے ان کے پاس موجود تھے لے لیے، اس کے بعد سے آج تک پاکیزہ پڑھنے کا ناغہ نہیں ہوا...... پہلی تحریر پاکستان واپس آنے کے بعد 2000ء میں بھجوائی اور ساتھ ہی اپنا رابطہ نمبر...... انجم جی کی خوش آمدید کی کال آئی، انہوں نے مزید لکھنے کو کہا اور وہ دن اور آج کا دن...... پندرہ برس!

پاکیزہ ✧......اب پاکیزہ میں مزید کیا دیکھنا چاہتی ہیں؟

شیریں حیدر ✤...... مجھے لگتا ہے کہ ہماری نئی نسل اردو کلاسیک سے ناآشنا ہے، اگر ہر ماہ ایک تحریر کلاسیکی ادب سے ہو، منٹو، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، ممتاز مفتی، بانو قدسیہ، اشفاق احمد، احمد ندیم قاسمی اور اس سے بھی پیچھے چلے جائیں، قدیم کلاسیکی ادب میں، ڈپٹی نذیر احمد سے شروع کرکے۔ (تجویز قابلِ غور ہے)

پاکیزہ ✧......اپنی ہم عصر رائٹرز سے کیا کہنا چاہیں گی؟

شیریں حیدر ✤...... مجھے اپنی ہم عصر لکھاریوں کی جو چیز بہت کھٹکتی ہے وہ ان کا انگریزی زبان کے الفاظ کا تحریر میں کثرت سے اور بسا اوقات بے جا استعمال ہے، میں اس سے دانستہ گریز کرتی ہوں۔ اردو کا ذخیرۂ الفاظ بہت وسیع ہے، کسی سے زبانی بات کروں تو کہتی ہیں کیا ہم روزمرہ بول چال میں انگریزی الفاظ کا استعمال نہیں کرتے؟ بجا ہے مگر آپ کی آج کی تحریریں مستقبل میں اردو زبان کی تاریخ مرتب کرنے کو استعمال ہوں گی تو اس وقت کے نقاد کہیں گے کہ اردو زبان کا ذخیرۂ الفاظ اتنا محدود تھا کہ اس میں انگریزی کے اکثر الفاظ استعمال ہوتے تھے۔ مجھے بھی انگریزی زبان پر عبور ہے اور بولنے میں مجھے اردو سے زیادہ انگریزی میں بات کرنا سہل لگتا ہے اور کچھ اپنی پیشہ ورانہ ضرورت کے باعث عادت بھی ہوگئی ہے مگر میں اپنی تحریر میں بصد کوشش انگریزی الفاظ لکھنے سے گریز کرتی ہوں۔ (اصل میں لکھاری کو دستور کی کتب اور لغت کو بھی اپنے مطالعے میں رکھنا چاہیے اپنے اساتذہ کی تحریر کو سمجھنے کے لیے یہ معاون ثابت ہوتی ہیں مگر کیا کریں اس طرف دھیان ہی نہیں دیا جاتا)

دوسری اہم بات یہ ہے کہ جس موضوع، ملک، مذہب، معاشرت یا طبقے کے لوگوں کے بارے میں آپ کا ذاتی مشاہدہ مکمل نہ ہو، اس موضوع پر مت لکھیں، کئی لکھاری سنی سنائی باتوں پر اپنی کہانی کی بنیاد رکھتی ہیں، اس سے کہانی کمزور ہو جاتی ہے۔ (آہم م...... یہ بات تو ہے)

پاکیزہ ✧......آپ ہمارے قارئین سے بھی ضرور مخاطب ہوں...... ان کے لیے کوئی پیغام کوئی خوشگوار بات؟

شیریں حیدر ✤...... ''ہم اس ملک کے باسی ہیں جہاں جوتے شوکیسوں اور شیشوں کی بنی ہوئی بڑی دکانوں میں بکتے ہیں اور کتابیں فٹ پاتھوں پر......'' واہ کیا حقیقت ہے، کسی ڈیزائنر کا دس ہزار کا لان کا جوڑا اور پانچ ہزار کی اس کی نقل بیچنا اس ملک میں آسان ہے مگر دو چار سو روپے کی کتاب بیچنا مشکل، (یہ المیہ ہے شیریں) قارئین بہنوں سے یہی کہنا ہے کہ اپنی تربیت کے لیے خود کو کتابیں تحفتاً دیں، ہر ماہ نہیں تو کم از کم سال یا چھ مہینے میں اپنے لیے کوئی نہ کوئی کتاب ضرور خریدیں۔ آپ پڑھتے ہیں تو ہم لکھتے ہیں، ہمارا مقصد زندگی کے بارے میں کہانیاں لکھنا اور معاشرے کی اصلاح میں اپنا کردار ادا کرنا ہے، آپ ان کہانیوں کو پڑھ کر ان کرداروں جیسے بنیں جنہیں آپ پسند کریں نہ کہ منفی کرداروں جیسے بنیں (جنہیں عبرت کے لیے لکھا جاتا ہے) سیکھنے کا عمل عمر بھر جاری رہتا ہے۔ (آپ کی بات سے ہم بھی سو فیصد متفق ہیں شیریں کسی کی سالگرہوں اور کامیابیوں پر کتابیں تحفے میں دینے کا رواج ڈالنا چاہیے)

پاکیزہ ✧......اب جلدی سے یہ بھی بتا دیں...... اس بزم میں آنا کیسا لگا...... ویسے ہمیں تو تھوڑی تشنگی رہ گئی ہے، چلیں مزید باتیں آئندہ سہی آپ کا کیا خیال ہے؟

شیریں حیدر ❖......میں انتہائی مشکور ہوں نزہت جی، آپ کی اور پاکیزہ کے پورے کنبے کی کہ جنہوں نے مجھے اس قابل سمجھا اور اپنی قاری بہنوں کا کہ انہوں نے مجھے اتنی دیر برداشت کیا، میں آپ کے سوالوں سے مطمئن ہوں، آپ نے تقریباً ہر پہلو کا احاطہ کیا ہے، مجھے کسی قسم کی تشنگی محسوس نہیں ہوئی۔ (بہت نوازش)

آخر میں کچھ کہنا چاہوں گی اپنے حالیہ ناول، ''زندگی خاک نہ تھی'' کے حوالے سے...... میرے اس ناول نے پاکیزہ کی قاری بہنوں میں پسندیدگی کی سند پائی، میں سب کی انتہائی مشکور ہوں مگر سب سے بڑھ کر میرے لیے عذرا جی کی کال تھی جو اس ناول کی تیسری قسط شائع ہونے پر آئی، لگ بھگ پچیس منٹ کی کال میں انہوں نے میرے اس ناول کے لیے اپنی انتہائی پسندیدگی کا اظہار کیا اور تفصیل سے اس موضوع پر بات کی، ان کی حوصلہ افزائی ہمارے لیے بجھتے ہوئے چراغوں میں تیل کا کام دیتی ہے، آپ کی عظمت ہے عذرا جی کہ آپ نے اتنی تفصیل سے مجھ سے بات کرنے کو وقت نکالا۔ انجم جی ہمیشہ کال کر کے کہانی بھجوانے کا شکریہ ادا کرتی ہیں، تعریف کرتی ہیں دل کھول کر اور اس سے آئندہ لکھنے کی تحریک پیدا ہوتی ہے، یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انہوں نے ہم عام لکھنے والوں کو خاص بنانے میں بہت دل جمعی سے کام کیا ہے، ان کی محبت، خلوص اور بے ریا راہنمائی سے ہمیں حوصلہ ملتا ہے اور اپنی غلطیوں کی درستی کا موقع بھی۔

میرا حالیہ ناول اختتام پذیر ہوا، بہت سی قاری بہنوں کو اس کا انجام پسند آیا تو بہت کو اس پر اعتراضات بھی ہوئے ہوں گے مگر یقین کریں میں کہانی بُن سکتی ہوں، گھڑ نہیں سکتی، حقائق پر لکھتی ہوں، تلخ بھی ہوں تو انہیں تبدیل نہیں کر سکتی کیونکہ انسانی حقیقی رویے اور ردِعمل ویسے نہیں ہوتے جیسا کہ قارئین دیکھنا چاہتے ہیں یا جیسا تخیل کر بیٹھتے ہیں، جن لوگوں کو لگتا ہے کہ کہانی کا انجام منطقی نہیں ہے، حنا کا رویہ ٹھیک نہیں، وہ خود کو حنا کی جگہ پر رکھ کر سوچ لیں۔ آپ ایک وفادار اور دیانت دار بیوی ہوں، آپ میں کوئی جسمانی نقص ہو نہ کمی پھر بھی آپ کا شوہر قانع نہ ہو، نہ صرف دوسری عورتوں سے تعلق رکھتا ہو بلکہ مسلسل دھوکا دے...... ڈھٹائی سے اپنی روش پر قائم رہے اور سب سے بڑھ کر جو کچھ اس نے اپنی بیٹیوں کی عمر (age) کی سالی کے ساتھ کیا، کیا اس کے بعد وہ اس قدر آسانی سے معافی پا جاتا؟ حنا اسے کوشش کر کے معاف کر بھی دے تو کیا حنا وہ سب کچھ بھول سکتی ہے؟ کیا دانیال کی بیٹیاں اپنے باپ کو دل سے ویسا پیار کر سکتی ہیں جیسا کہ اس وقت تھا جب تک انہیں باپ کے کرتوتوں کا علم نہ تھا؟ کیا فاطش کبھی باپ کو اپنی خالہ کا خون معاف کر سکتی ہے؟

امید ہے کہ میری قاری بہنوں کو میرے ناول سے متعلق یہ وضاحت کافی محسوس ہوگی مگر اس کے علاوہ کوئی سوال اٹھتا ہے تو براہ مہربانی میری فیس بک پر اپنا سوال ضرور پوسٹ کریں۔

☆☆☆

جی قارئین! اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا...... ہمیں تو شیریں حیدر کا یہ انٹرویو کر کے بہت مزہ آیا...... شیریں نے بہت جامع، مکمل اور بھرپور جواب دیے...... سوالات تو بے شمار ہو سکتے تھے مگر شیریں نے انہی سوالات کے جوابات اتنے تفصیلی اور درست دیے ہیں کہ خود ہمیں پڑھتے ہوئے بہت لطف آیا۔ خدا کرے شیریں کا قلم ایسے ہی رواں رہے (الٰہی آمین) اب اسی دعا کے ساتھ اجازت طلب کرتے ہیں کہ خوش رہیے اور خوش رکھیے...... اور دوسروں کی خوشی دیکھنے کا حوصلہ پیدا کیجیے اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

جنوں کے راستے یوں تو کٹھن سے لگتے ہیں
مگر یہ راستے منزل تلک نکلتے ہیں
زمانہ ہر قدم پہ راہ روکنے والا
عزائم پختہ ہوں جن کے وہ کب بھٹکتے ہیں





بہنوں کی محفل

مدیرہ

☆ عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ......!

☆ حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا......

☆ الحمد للہ پاکیزہ اپنے چوالیسویں سال میں داخل ہوگیا ہے۔ (ماشاء اللہ) آپ سب کو پاکیزہ کی سالگرہ مبارک ہو جیسا کہ آپ سب جانتے ہی ہیں کہ ہمارے ہاں معاشرتی موضوعات پر تحریریں شائع ہوتی ہیں جن کا محور انسان ہی ہے۔ ہماری ہمیشہ یہ دلی خواہش ہوتی ہے ہماری تحریریں محبتوں کو فروغ دیں اور نفرتوں کا زوال ہو...... ہم جانتے ہیں کہ نفرت، جہالت، تعصب اور بدتہذیبی ہمیشہ ہنگاموں اور تنازعوں کا پرچار کرتی ہے...... ایک ایسا معاشرہ جہاں سب آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت سے رہنے کے بجائے ایک دوسرے کے سامنے نفرت سے تنے کھڑے ہوں اور ایک دوسرے کو کاٹ کھانے کو آتے ہوں تو وہاں نہ محبت پنپ سکتی ہے اور نہ وہاں کے لوگ...... اگر ہم آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے معاشرے کو بہتر بنانے کی سعی خود کرنی ہوگی...... ایک اچھا ادب سب سے پہلے ایک دوسرے کی عزت کرنے کا درس دیتا ہے...... ادب کبھی ظالم کا ساتھی نہیں رہا ہے، وہ ہمیشہ عدل کا ساتھ دیتا ہے...... وہ ہمیشہ عادل کا ساتھ دیتا ہے...... جس طرح سچائی ادب کا خمیر ہے اسی طرح محبت ادب کی روح ہے...... تو آیئے پاکیزہ کے اس قافلے میں آپ بھی شامل ہو جائیں...... اور روشنی کا علم ہاتھ میں لے کر چلیں۔ اور ادب کی دنیا کو خیر کی روشنی سے مزین کریں۔ (آمین)

محترمہ عذرا رسول کا پیغام

پیاری بہنو! آپ سب کو پاکیزہ کی سالگرہ مبارک ہو، جیسے کہ کہا جاتا ہے پاکیزہ ادب اپنے عہد کی بنیادی اقدار، واقعات اور معاملات کو اپنا موضوع بناتا ہے اور اس کے ساتھ وہ دوسرے عصری تقاضوں کو بھی اس انداز میں سمیٹتا ہے کہ وہ پڑھنے والوں کو نہ صرف عام فہم لگیں بلکہ انہیں راستہ بھی دکھائیں۔ ادب قوموں کی شناخت اور ان کی پہچان ہے اسی طرح ماہنامہ پاکیزہ کی تحریریں بھی ہماری پہچان ہیں۔ یہ اللہ کا فضل و کرم ہے کہ ہمارے ہاں شائع ہونے والی تحریریں پڑھ کر بہت سے لوگوں کو آگاہی ہوتی ہے۔ اکثر ہمارے پاس اس قسم کے خطوط بھی آتے ہیں کہ فلاں افسانہ تو ہو بہو میری کہانی تھا...... اور مجھے فیصلہ کرنے میں مدد ملی...... یا فلاں تحریر نے میرا گھر ٹوٹنے سے بچالیا...... وغیرہ...... ہماری تمام مصنفات جس عرق ریزی سے اور محبت سے پاکیزہ کے لیے بطور خاص لکھا کرتی ہیں...... اس کے لیے ان کا شکریہ ادا کرنا واقعی مشکل کام ہے۔ اور میں کسی ایک کا یا چند کا نام بھی نہیں لے سکتی کہ ماشاء اللہ سب ہی ایک سے بڑھ کر ایک ہیں...... مگر میں اپنے رسالے کی کیپٹن انجم انصار کے لیے ضرور کہوں گی کہ انہوں نے جس محبت سے اپنی مصنفات اور اپنی قارئین بہنوں کی مالا بنائی ہوئی ہے کہ واقعی رشک آتا ہے...... کہ سب ایک دوسرے سے ایسے جڑے نظر آتے ہیں کہ خونی رشتوں میں بھی شاید ایسی اور اتنی محبت نہ ہو...... اور آپ کی باجی کی ذمے داری کی مثال دوں کہ وہ اس سال ڈیڑھ ماہ کے لیے آسٹریلیا گئیں۔ تو اپنا سارا کام کر کے گئیں...... ماشا اللہ! پیاری بہنو! ہمیں اپنا یہ سفر محبت اور خلوص کے ساتھ طے کرنا ہے اور پاکیزہ کو بہت آگے لے کر جانا ہے...... اللہ تعالیٰ آپ کو ہمت، توانائی، خلوص اور سچائی کی دولت سے مالا مال کرے...... کہ سچ کا سفر ہمیشہ خوب صورت ہوا کرتا ہے۔ (کیا خیال ہے)

☆☆☆

☆ پیاری بہنو! یوں تو یہ ہر عام شخص میں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور ہوتی ہے...... مگر قلم کار کبھی عام شخصیت نہیں کہلاتا، وہ ہمیشہ خاص ہوتا ہے اور خاص رہتا ہے کہ لکھنے کی صلاحیت اللہ کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے اور یہ ایک بہت بڑی عنایت ہے رب کریم کی جانب سے۔ جس کا جتنا بھی شکر کیا جائے وہ کم ہوگا...... آپ نے دیکھا ہی ہوگا کہ لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو کر بھی چند سطریں بہ مشکل لکھ پاتے ہیں اور بعض سے تو خط تک نہیں لکھا جاتا اور آپ نے ایسا بھی دیکھا ہوگا کہ جب لوگ بولنے پر آئیں تو کسی طور چپ ہونے میں نہیں آتے اور اگر ان سے کہا جائے کہ جو کچھ تم نے بولا ہے وہ لکھ کر بھی دے دو تو وہ کہیں گے کہ لکھنا ان کے لیے مشکل ہے جبکہ قلم کاروں کے لیے لکھنا مشکل ہی نہیں ہوتا وہ لفظوں میں جیسے جان ڈال دیا کرتے ہیں اور ان کے لفظوں کے پھولوں سے لوگ مسحور ہوئے جاتے ہیں۔ ہماری زندگی میں لفظوں کی کتنی اہمیت ہوتی ہے...... اس بات کا اندازہ آپ اس حقیقت سے بھی لگا سکتے ہیں...... اگر ہمارے لفظ کسی کے زخموں کے لیے مرہم بن جائیں یا کسی کے ٹوٹے ہوئے دل کو سی دیں تو لکھنے والے کی شخصیت معالج کی سی ہو جاتی ہے اگر ہمارے لفظ کسی کی تنہائی کا مداوا بن جائیں تو لکھنے والے کی شخصیت ایک دوست اور ساتھی کی بھی ہو جاتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے لیے ہماری تمام مصنفات صرف خاص ہی نہیں بلکہ خاص الخاص ہیں...... جو آپ سب کی دوست بھی ہیں اور معالج بھی......

ہماری سینئر مصنفات تو ہیں ہی ہماری آن بان اور شان مگر ہماری نئی مصنفات بھی ہمارا مان ہیں کہ انہوں نے اپنے لفظوں کے پھولوں کو سجانے کے لیے ہمارے پاکیزہ کا انتخاب کیا۔

ہم اپنی تبصرہ نگار بہنوں کے ساتھ، ساتھ اپنے ان قارئین کے بھی بے حد مشکور ہیں جو بذریعہ فون ہم سے رابطے میں رہتے ہیں اور اپنی آرا اور تجاویز سے آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ ہماری یہ دلی تمنا ہے کہ ماہنامہ پاکیزہ میں شائع ہونے والی ہر تحریر کسی کی بھی دل آزردگی کا سبب نہ بنے...... بلکہ آگاہی کے چراغ روشن کرنے کے ساتھ، ساتھ خوشیاں بھی بڑھانے میں مدد معاون ہو کہ کسی کی پریشانی ختم کرنے کی کوشش بھی کرنا...... اللہ کی خوشنودی کا سبب بن سکتا ہے...... اور یہی پاکیزہ کا مشن ہے۔

اب آیئے دعاؤں کی پھولوں کی چادریں لے کر اپنی جدا ہونے والی باا ثر مصنفات اور شاعرات کو خراج تحسین پیش کریں۔ یہ ادارہ پاکیزہ کی برسوں سے روایت ہے کہ اپنے قلم کاروں کو کسی لمحے نہ بھولا جائے اور نہ ہی بھلانے دیا جائے تو اب آپ صرف ایک بار سورۂ فاتحہ اور صرف تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر ان کی مغفرت کے لیے ضرور دعا کریں۔ یہ ان کا ہم پر حق ہے کہ بے شک وہ ہم میں نہیں ہیں مگر اپنی تحریروں میں وہ ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

☆ رضیہ بٹ، خالدہ اسد، نسیم السحر قریشی، فاطمہ شہناز مرتضیٰ، عظمت عزمی، ایم سلطانہ فخر، شازیہ چوہدری، بلقیس ظفر، ایم کے صوفیہ، مسز طلعت تحسین، چاندنی عمران، ظفرانہ عباس، ناظمہ طالب، شگفتہ کنول، پروین شاکر، لبنیٰ عروج، وحیدہ نسیم، تحسین فاطمہ ترمذی، گوہر سلطانہ منظمی، اطرو بہ نایاب، عطیہ بانو، فرزانہ سلیم، فرحانہ ناز ملک۔

میں تہ دل سے اپنے معاونین کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جن کی معاونت میرے لیے ایک سکون و طمانیت کا بھی درجہ رکھتی ہے۔ جن میں نزہت اصغر بڑی محنت اور مستعدی کے ساتھ کام کرتی ہیں اور اس سال ان کے لیے ہوئے مصنفات کے انٹرویوز ہمارے قارئین نے بے حد پسند کیے...... آمنہ حماد بھی بڑی محنتی معاونہ ہیں جو بے حد شوق کے ساتھ ہر کام کیا کرتی ہیں اور کوئی بھی بات پوچھنے اور مشورہ کرنے میں کبھی عار محسوس نہیں کرتیں۔ میں جناب شہزاد صاحب کا بھی شکریہ ادا کروں گی کہ آفس کے معاملات میں میری مدد کرتے ہیں۔ شکریہ حمید صاحب کا بھی ادا کروں گی جو آفس سے روزانہ میٹر لے کر میرے گھر آتے ہیں اور مجھ سے لے کر باحفاظت آفس پہنچاتے ہیں۔



آیئے اب سرگرمیوں پر نظر ڈالنے سے پہلے صرف ایک بار درودِ ابراہیمی پڑھتے ہیں جو ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین بار آیت کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالم اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ ہر دلعزیز مصنفہ رضوانہ پرنس کی نئی کتاب، اک نئے موڑ پر کے سلسلے کی ایک تقریب مقامی





بینکوئٹ، کراچی میں ہوئی جس کی صدارت دوست محمد فیضی نے کی اور مہمان خصوصی نیلوفر عباسی تھیں۔ اس تقریب میں جن مصنفات اور مہمانوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ان کے نام یہ ہیں۔ محترمہ عذرا رسول، محترمہ منزہ سہام مرزا جناب دوست محمد فیضی، محترمہ نیلوفر عباسی، رضوانہ کی دیورانی، رخشی اور ثانی (رضوانہ کی کزن) مصنفہ غزالہ رشید، مصنفہ و شاعرہ، ناہید فاطمہ حسنین، شاعرہ شگفتہ شفیق، چینل جیو کی نیوز اینکر بھی...... اور آپ کی باجی انجم انصار۔ نظامت کے فرائض بڑی خوب صورتی کے ساتھ سیما رضا ردا نے انجام دیے۔ اس ایونٹ کی دلکشی کی انچارج معروف ڈیکوریٹر شگفتہ تھیں جو رضوانہ کی کزن بھی ہیں۔ اس تقریب میں بطور خاص شرکت کرنے کے لیے رضوانہ پرنس کے بھائی شاہین لندن سے آئے تھے...... دیگر معروف مصنفات میں سائرہ غلام نبی، سیما مناف، رخ چوہدری، ناہید چوہدری شامل تھیں...... اس تقریب میں رضوانہ پرنس کے فیملی ممبرز نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ (ماشاء اللہ اور بے حد مبارک باد)

☆ معروف صداکارہ، اداکارہ اور مصنفہ نیلوفر عباسی ان دنوں امریکا سے کراچی آئی ہوئی ہیں یہاں ان کا قیام مارچ کے آخر تک رہے گا۔ (خوش آمدید)

✖ معروف سرجن ڈاکٹر جمال الدین اور شازیہ جمال الدین نے گلشن، کراچی میں اپنی نئی کوٹھی میں شفٹ ہونے پر اپنے عزیز و اقارب کو ایک پر تکلف عشائیہ دیا۔ (بے حد مبارک باد)

✖ ہماری پیاری مصنفہ ام ایمان قاضی، کوٹ چھٹہ ان دنوں اپنا افسانوں اور ناولٹ کا مجموعہ ترتیب دے رہی ہیں، جو جلد کتابی شکل میں شائع ہوگا۔ (انشاء اللہ)

✖ مصنفہ شمیم فضل خالق، پشاور اپنی نئی کوٹھی میں شفٹ ہوگئی ہیں۔ (بے حد مبارک باد)

✖ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار مسز شمع حسین، کینیڈا سے پہلے لاہور اور پھر کراچی آئیں، دوران قیام ان کی بڑی پوتی کی سالگرہ کی تقریب بھی ہوئی۔ (بے حد مبارک باد اور دلی معذرت قبول کرو کہ میں تمہاری اس تقریب میں شرکت نہیں کرسکی۔

✖ پاکیزہ کی تبصرہ نگار اور مصنفہ نوشین ساجد کا بیٹا پڑھنے کے لیے کوریا چلا گیا ہے۔ (ماشاء اللہ)

✖ ماہر تعلیم اور پاکیزہ کی مصنفہ مسز افتخار شوق، میاں چنوں نے یوم خواتین کے حوالے سے اپنی زیر نگرانی میاں چنوں میں ایک بہت خوب صورت اور پر اثر پروگرام ترتیب دیا۔ (بے حد مبارکاں)

✖ مصنفہ ثریا انجم، کراچی، کینیڈا گئی ہیں وہاں ان کا قیام پانچ ماہ رہے گا۔ (انشاء اللہ)

✖ پاکیزہ کی مستقل قاری ناہید، آئرلینڈ کے ہاں ایک پیارا سا پوتا ہوا ہے۔ (بے حد مبارک باد)

✖ پاکیزہ کی شاعرہ حیا ترمذی، کاغان ایک اخبار کے لیے کالم لکھ رہی ہیں۔

✖ پاکیزہ کی شاعرہ ایڈووکیٹ سعدیہ ہما شیخ، سرگودھا کی ذہین ترین بیٹی حور عین نے انٹرنیشنل کینگرو فیسٹول میں ہمیشہ کی طرح اس سال بھی میڈل حاصل کیا ہے۔ (ماشاء اللہ اور بے حد مبارکاں) سعدیہ ہما کے حوالے سے دوسری خوش خبری یہ ہے کہ ان کے شعری مجموعے وصل میں تشنگی کا دوسرا ایڈیشن بھی آگیا ہے۔ جو ہر شہر کے اردو بازار میں دستیاب ہے۔ (مبارک باد)

✖ مصنفہ لبنیٰ اعظمی آفاق سعید کا پہلا پُرمزاح سفرنامہ ذرا سا گھوم لوں میں کتابی شکل میں شائع ہوگیا ہے۔ جس میں تین ملکوں کے سفرنامے شامل ہیں۔ اس دلچسپ کتاب کی قیمت صرف تین سو روپے ہے۔ جس کو منگوانے کے لیے آپ القریش پبلی کیشنز سرکلر روڈ چوک اردو بازار، لاہور سے رابطہ کرسکتی ہیں۔ جن کے فون نمبرز یہ ہیں۔
(042.37652546)۔(042.37668958)(021.36964779)

✖ کمالیہ کی نابغہ رانا، پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار جواب ڈاکٹر بن چکی ہیں کی شادی گزشتہ دنوں انجام پائی جس میں پاکیزہ کی تبصرہ نگار ساجدہ ظفر، نایاب کرن صدیقی، یاسمین اسرار، ایمن رانی نے شرکت کی نابغہ رانا کی بارات اسلام آباد سے آئی تھی اور ان کے دولھا بھی ڈاکٹر ہیں۔ (ماشاء اللہ، مبارکاں)

* پاکیزہ کی تبصرہ نگار فریدہ سجاد، کراچی کے ہاں ایک پیارا سا پوتا ہوا ہے جس کا نام محمد عثمان رکھا گیا ہے۔ (آپ کو اور اسامہ کو بہت بہت مبارک باد)

سالگرہ مبارک ہو

* رفاقت جاوید، اسلام آباد، مصباح رضا سعید، فیصل آباد۔
* سنبل ملک اعوان، لاہور۔
* شمیم ناز صدیقی، کراچی۔
* منور شہزادی، گوجرانوالہ۔
* شازیہ جمال الدین، کراچی۔
* شازیہ محبوب، کراچی۔
* ممتاز خانم، کراچی۔
* تابندہ جبیں، کراچی۔

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

* پاکیزہ کی مستقل قاری ڈاکٹر میمونہ غوری، کراچی بیمار ہیں۔
* مصنفہ نزہت اصغر کے شوہر بستر علالت پر ہیں۔
* پاکیزہ کی مستقل قاری شیریں ظفر، کراچی ہنوز بے حد بیمار ہیں۔
* پاکیزہ کی شاعرہ فریدہ جاوید فری، لاہور ان دنوں بیمار ہیں۔
* میری نند عذرا پروین کے پیر میں فریکچر ہوگیا ہے، جس کی سرجری بھی ہوئی ہے۔
* پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار ذکیہ ایوب، کراچی کی آنکھ کا آپریشن ہوا ہے۔
* پاکیزہ کی مستقل قاری عذرا ثمینہ کے شوہر کو حلق کا کینسر ہوگیا ہے۔
* پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار شگفتہ ناصر، فیصل آباد علیل ہیں۔
* پاکیزہ کی مستقل قاری عذرا بی بی، راولپنڈی بیمار ہیں۔
* پاکیزہ کی مستقل قاری سبین فیصل کی والدہ ان دنوں بہت بیمار ہیں اور ان کو شوگر بھی بہت بڑھی ہوئی ہے۔ واضح رہے ان دنوں وہ عدت میں بھی ہیں۔
* پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ نگینہ ضیاء بخش، کراچی کی طبیعت ناساز ہے۔
* پاکیزہ کی نئی تبصرہ نگار اسما جمشید ڈیرہ اسماعیل خان کی چچی ثریا نواز اور دوست کرن ناز سخت بیمار ہیں۔
* ہم سب کی لاڈلی اور مستقل تبصرہ نگار امینہ عندلیب، سلانوالی اس ماہ پھر شدید بیمار ہیں۔



انتقالِ پُرملال

* مصنفہ یمنیٰ احمد کی نعت خواں، بہن حنا عروج انتقال کر گئیں۔ مرحومہ بی اے کی طالبہ تھی۔
* مصنفہ شاعرہ ناہید فاطمہ حسنین، کراچی کے بہنوئی سید اطہر طارق انتقال کر گئے۔
* شاعرہ یاسمین کنول، پسرور کی والدہ گزشتہ دنوں انتقال کر گئیں۔
* مصنفہ بشریٰ گوندل، کوٹ مومن کے والد چل بسے۔
* پاکیزہ کی مستقل قاری سعدیہ سلیم، سڈنی کی والدہ کا انتقال ہوگیا ہے۔
* پاکیزہ کی مستقل قاری عصمت، اوکاڑہ کی چھوٹی بہن امریکا میں انتقال کر گئیں۔
* پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار مصباح رضا سعید، فیصل آباد کے ابو جی کی اس ماہ برسی ہے۔
* پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار ناہید بنت نور، واہ سیمنٹ ورکس کے بھائی کی اس ماہ برسی ہے۔
* اس ماہ آپ کی باجی انجم انصار کی والدہ امت النفیس اور والد انصار حسین صدیقی کی برسی ہے۔



نوٹ: تمام مرحومین کی مغفرت کی دعا کے ساتھ صرف تین مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھ کر ان کے درجات کی بلندی کے لیے دعا کریں۔

☆☆☆

اور یہ پہلی رائے...... ہم سب کی بے حد میٹھے لہجے والی مصنفہ **نیلوفر عباسی**، کراچی سے۔

سب سے پہلے عذرا آپ کو اور انجم تمہیں پاکیزہ کی سالگرہ کی بے حد مبارک باد...... تم دونوں نے مجھے رائٹر بنایا۔ اور میں نے پاکیزہ میں لکھا اور پھر میری بھی کتاب آئی۔ اس لیے میں جب بھی امریکا سے کراچی آتی ہوں سب سے پہلے عذرا کو فون کرتی ہوں، معلوم ہوا کہ اس شام عظمیٰ آفاق کی کتاب کی تقریب ہو رہی ہے، عذرا نے مجھے بھی اپنے ساتھ چلنے کو کہا اور میں عظمیٰ کے گھر ضرور چلی جاتی مگر اس دن سفر کی تکان اتنی تھی کہ چاہتے ہوئے بھی میں نہ جا سکی...... مگر عظمیٰ تمہاری کتاب میرے پاس آ چکی ہے۔ پڑھ کر جلد تم سے رابطہ کروں گی۔ مارچ کا شمارہ میں نے کراچی میں اپنے قیام کے دوران ہی پڑھ ڈالا۔ ہر تحریر بے حد اچھی لگی۔ ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا بہت اچھی لگی۔ سارے ناول ہی اچھے جا رہے ہیں مگر انجم تم نے ایک نئے موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور بڑے اچھے انداز میں اپنا ناول شروع کیا ہے...... تفصیلی رائے نیویارک جا کر دوں گی۔" (پیاری نیلوفر ہم نے آپ کو مصنفہ نہیں بنایا آپ پہلے ہی سے ایک اچھی رائٹر تھیں۔ ہم تو آپ سے صرف یہ کہیں گے کہ آپ کے لکھنے میں وقفہ نہیں آنا چاہیے۔ کبھی کبھی کوئی آپ بیتی ہی ہمیں لکھ بھیجا کریں۔ بے شک شوبز کے حوالے سے ہی اس سے ہمارے قارئین کو بھی یقیناً دلچسپی ہوگی۔)

نفیسہ آرا، راس الخیمہ سے۔ "پیاری انجم باجی کو بے حد خلوص بھرا سلام...... خیر سے آپ واپس آ گئی ہیں اور جناب مجھے حاضر ہوئے بھی کئی ماہ سے زیادہ ہو گئے ویسے مطالعہ تو باقاعدگی سے کرتی ہوں۔ پاکیزہ میں نئے سلسلے اور مختلف لوگوں سے انٹرویوز کے صفحات بڑھائیں۔ قاری بہنوں کے لیے زیادہ صفحات رکھیں۔ کہانیاں تو سب اچھی جا رہی ہیں۔ اب نگہت سیما کے ناول کو اینڈ ہونا چاہیے۔ میرا خیال ہے ان کی جگہ رفعت سراج کی کہانی لگے گی۔ عمیرہ احمد کو آئے بہت دن ہو گئے آپ ہر دفعہ تسلی دیتی ہیں۔ وہ نئی کہانی کب دے رہی ہیں۔ میری ارسال کردہ کھانے کی ترکیبیں لگانے کا شکریہ...... آج کل دبئی میں بھی بہت اچھا موسم ہو رہا ہے۔ میں وہاں ہونے والی کسی پاکستانی تقریب کا احوال بھیج سکتی ہوں؟ اس کے علاوہ بہت لڑکیاں ہیں جو پاکیزہ میں کسی طرح اپنا نام لانا چاہتی ہیں تو وہ کیا بھیج سکتی ہیں؟ ضرور بتائیں۔ اب تو پاکیزہ کی سالگرہ بھی آنے والی ہوگی، ہماری طرف سے ڈھیروں مبارک باد۔" (تبصرے کا شکریہ آپ ضرور بھیجیں)

سمیرا احمد فاروق، کراچی سے۔ "سب سے پہلے تو میری بیٹی سعدیہ فاروق کی شادی کا احوال لگانے کا شکریہ سب نے ہی اسے بہت پسند کیا تھا یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہے کہ پاکیزہ نے اسے جگہ دی۔ ویسے تو تمام رائٹرز ہی اچھا لکھ رہی ہیں مگر نایاب جیلانی بہت لمبا اور بے حد جزئیات کے ساتھ لکھ رہی ہیں جو گراں گزر رہا ہے۔ بار، بار وہ ماضی دہراتی ہیں۔ نئی رائٹرز بھی اچھا لکھ رہی ہیں۔ رفاقت جاوید نے جگمگاتا ستارہ بہت خوب صورت کہانی لکھی بہت اچھا موضوع اور بیان تھا اور سب سے آخر میں بہنوں کی محفل کی بات کروں گی جو آپ بہت خوب صورت سجاتی ہیں کہ سب بہنیں کور ہو جاتی ہیں۔ بہترین پرچہ مرتب کرنے پر مبارک باد۔ افسر سلطانہ کا انٹرویو بہت اچھا لگا، ان کے بارے میں جاننے کی خواہش عرصے سے تھی۔ ہاں در ثمن بلال کا ناول بہت اچھا لگا اور انہوں نے لڑکیوں کے بارے میں بڑے کھل کر بتایا ہے...... اس سے بہت سے لوگوں کو سیکھنے کے لیے سبق ہے۔ انجم آپ کا ناول ماشاء اللہ بہت اچھا جا رہا ہے اور دونوں اقساط بہت تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ اور پڑھ کر مزہ آ رہا ہے۔ ذکیہ بلگرامی کی تحریر تو ہیرے میں تولنے کے برابر ہے۔ پڑھ کر بہت اچھا لگ رہا ہے۔ ڈاکٹر ممتاز ضیا کے خط کے بارے میں یہی کہنا ہے کہ وہ ہمارے دل کی بھی آواز ہوتا ہے۔" (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

ڈاکٹر ممتاز ضیا، کراچی سے۔ "مجھے کچھ کہنا ہے کہ میں نے جو مشورہ دیا ہے کاش بہنیں اس پر عمل کریں ورنہ آج کل تو لوگ تواضع اور مہمانداری سے الرجک ہیں اور مل بیٹھنے سے بھی دور بھاگتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول کی باتیں ایمان افروز ہیں۔ ذکیہ کا روحانی سفر اپنے اندر جذب کر لیتا ہے ان کی خوش قسمتی پر رشک آتا ہے اللہ تعالیٰ سب کو ہدایت

دے آمین۔ اظہارِ وفا میں قارئین کے صبر کا امتحان جاری ہے۔ یار غار میں اس طرح پیغام محبت کسی کو دینا ہم نے پہلی دفعہ ہی پڑھا۔ کھوئے کھوئے لمحے توجہ حاصل کر رہی ہے۔ گم شدہ محبت دلچسپ انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔ اب دیکھیں صبا اور ندیم خان کا ساتھ کیا رنگ لاتا ہے۔ انجم کہیں اتنے دن بعد پڑھنا اچھا لگ رہا ہے۔ نفیسہ سعید اور نادیہ احمد کی تحریریں گوارا تھیں، نایاب جیلانی کی یہ قسط بھی دلچسپ اور جاندار ہے۔ شیریں حیدر کے کمال اللہ دتا نے تو کمال ہی کر دیا، یہ ہمارے معاشرے کی تلخ حقیقتیں ہیں جمیل جیسے لوگوں کو سبق حاصل کرنا چاہیے۔ محبت کے گلاب پڑھ کر عجیب لگا ایسا لگتا ہے کہ بس ان لوگوں کو صرف ایک ہی مریض کو دیکھنا ہوتا ہے۔ درثمن بلال عشق کے عجب کھیل تو دکھا ہی رہی ہیں مگر کچھ زیادہ ہی بولڈ انداز میں ...... عقیلہ حق کا سود و زیاں سبق آموز ناول ہے۔ اندازِ بیاں بھی اثر کرنے والا ہے۔ اختر شجاعت نے نفس پر بہت عمدہ انداز میں لکھا۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ آمین، افسر سلطانہ سے ملاقات اچھی رہی اور اللہ تعالیٰ ان کو پی ایچ ڈی کی دوڑ میں شاندار کامیابی عطا کرے۔ (آمین) دیگر سلسلے بھی اچھے ہیں۔ (شکریہ) بہنوں کی محفل کی باری ہے اب...... آسٹریلیا سے بخیریت واپسی مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ ایسی خوشیاں آپ کو عطا کرتا رہے، آمین۔ وہ جن بہنوں کو خوشیاں ملی انہیں بہت مبارک ہو، عطیہ عمر کو صحت یابی مبارک اور شائستہ اعجاز کو بیٹی کی شادی مبارک ...... اور اب کچھ ذرا سا گھوم لوں میں کے بارے میں پیاری عظمیٰ کی اس کتاب کی تقریب رونمائی نے ہمیں تو خوب ہی گھمایا فاصلے کی دوری، ٹریفک بلاک اور گھر ڈھونڈنے کے مسائل سے نمٹ کر تقریباً کراچی سے حیدر آباد تک کا سفر طے کر کے ہم وہاں پہنچ گئے مگر اس باادب محفل میں پہنچ کر ساری کوفت دور ہو گئی۔ عظمیٰ، آسمانِ ادب کا ابھرتا ہوا ستارہ ہیں۔ ان کی تحریر کی بے ساختگی، کھرا پن اور لطیف طنز بہت مزہ دیتا ہے اپنے مخصوص انداز میں انہوں نے کچھ پیراگراف اپنی کتاب کے پڑھ کر بھی سنائے جس سے لطف اور بھی دوبالا ہو گیا از راہِ محبت انہوں نے اپنی کتاب بھی ہمیں دی جسے ہم خوب مزے لے لے کر پڑھ رہے ہیں۔ کبھی کبھی تو خطوطِ غالب کا سا مزہ آتا ہے۔ اپنی پیاری مصنفات اور پیاری عذرا سے مل کر بھی بہت، بہت اچھا لگا۔ عذرا کے انٹرویو کی خوشخبری دی شکریہ انتظار ہے۔" (اور آپ کا یہ انتظار جلد پورا بھی ہوگا ...... ہے ناں عذرا)

✵ ذکیہ ایوب، کراچی سے۔ "بہار نمبر مل گیا ہے، اداریے میں بہت اچھی بات پڑھنے کو ملی۔ قربتوں کے پھول تو جب ہی کھلتے ہیں جب دلوں میں وسعت ہو۔ تم تو لکھ کر اپنا فرض ادا کر رہی ہو جزاک اللہ...... بچوں نے آج کل پڑھنے پر پابندی لگائی ہوئی ہے کہ نظر کا مسئلہ ہے مگر پھر بھی سب سے پہلے تمہارا ناول پڑھا...... بہت اچھا لگا...... شہلا اور کریم کی نوک جھونک اچھی لگی۔ نایاب اور شمیم فضل خالق کی تحریریں بھی بہت پسند آئیں۔ میرا اندازہ درست نکلا میں نے بھی عظمیٰ کے بارے میں صحیح سوچا تھا کہ وہ ٹی وی کی صبح کی نشریات کی میزبان بننے والی ہیں...... میری آنکھ کا آپریشن ہونے والا ہے۔ بہنیں میرے لیے ضرور دعا کریں کہ میری آنکھ کی روشنی سلامت رہے۔" (تبصرے کا شکریہ، انشاء اللہ آپ کی آنکھ کا آپریشن بھی کامیاب رہے گا)



✵ فریدہ سجاد، کراچی سے۔ "ان دنوں اپنے بچوں کی خوشیوں میں خوش ہوں...... اور انشاء اللہ اپنے بیٹے طلحہ کے پاس کینیڈا جانے کا بھی پروگرام ہے کہ اسے وہاں ڈگری ملنے والی ہوگی مگر اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود آپ کا نیا ناول گم شدہ محبت پڑھا اور بہت انجوائے کیا۔ آپ کو بہت مبارک ہو۔" (آپ کو بھی اپنے بچوں سے وابستہ تمام خوشیاں مبارک ہوں)

✉ نسرین ناز، ثریا بیگم، راحت فردوس، مسز مدثر اور شہلا، کراچی۔ آپ سب خواتین اور دیگر بھی بہت سی خواتین جن کے فونز روزانہ میرے پاس آتے ہیں کہ وہ ذکیہ بلگرامی سے ملنا چاہتی ہیں۔ آپ سب سے میں یہی کہنا چاہتی ہوں کہ آپ محترمہ ذکیہ بلگرامی سے ان کے ای میل پر براہِ راست رابطہ کیجیے...... اور اگر وہ آپ سے ملنے کا ٹائم دے رہی ہیں تو آپ ان سے ضرور ملیے۔ ای میل ایڈریس ان کے مضمون کے اختتام پر ہم شائع کرتے ہیں اگر ذکیہ بلگرامی آپ سے ملنا چاہیں گی تو وہ کہہ دیں گی کہ آ جایئے کہ ان کی طبیعت جب ٹھیک ہوتی ہے تو وہ مل سکتی ہیں۔

✵ تسنیم منیر علوی۔ دبئی سے۔ "آپ کے ناول کا شدت سے انتظار تھا۔ مگر ہائے ری قسمت یہاں فروری کا شمارہ لاکھ کوششوں کے بعد بھی دستیاب نہ ہو سکا۔ آج بڑی مشکل سے مارچ کا شمارہ حاصل







کرنے میں کامیابی نصیب ہوئی پھر ظاہر ہے نام آپ کا ہو اور ہم نظر انداز کر دیں ایسا تو ہو سکتا نہیں۔ پہلی قسط ''قضا'' ہونے کے باوجود ہم نے دوسری قسط سے ہی کہانی کا سرا پکڑ لیا۔ یعنی دوسری کڑی کو پہلی ہی سمجھ کر دل میں اتار لیا۔ بہت ہی عمدہ اور لطیف پیرائے میں کہانی راہ پکڑ رہی ہے۔ آگے چل کر ان شاء اللہ سرپٹ دوڑ رہی ہوگی...... سائرہ رضا کا خط پڑھ کر خوشی ہوئی، ہم بھی اسی درسگاہ کے طالب علم رہے ہیں اب اس فہرست میں سیما سراج، تسنیم منیر کو شامل کریں۔ شیریں حیدر کا افسانہ ایک حساس موضوع پر لکھی تحریر تھی۔ شیریں ہمیشہ بہت اسٹرونگ موضوع پر قلم اٹھاتی ہیں۔ قاری تادیر اس کے زیر اثر رہتا ہے۔ عقیلہ حق ہماری پیاری لکھاری ہیں خوب جم کر لکھتی ہیں۔ اگر انسان تھوڑے پر ہی قناعت کرلے تو آگے چل کر کامیابی قدم چومتی ہے بس ذرا صبر اور انتظار کی ضرورت ہے جس کا اظہار ''سود و زیاں'' میں کیا گیا ہے۔ نادیہ احمد کی کہانی دل کو لگی۔ پیغام ہے ان بڑوں اور بزرگوں کے نام جو بچپن میں رشتے جوڑ دیتے ہیں۔ نبیلہ نازش کا افسانہ...... حیات انسانی پر کسی بھی چیز کا بے دریغ استعمال منفی اثرات مرتب کرتا ہے۔ کھلاڑی فاسٹ بولر، ٹینس اور آج کل کا ''سونامی'' موبائل کا...... اف الٰہی توبہ۔ نہ اپنی خبر نہ اطراف کی...... نتیجہ...... نظر، ہاتھ، کندھے، کمر، سارے اعضا کے کس بل نکل گئے ہیں۔ بچہ، بچہ چشمہ لگائے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکا ہے۔ اسی لیے اللہ نے اعتدال پسندی کو پسند فرمایا ہے۔ کہانی بڑی اچھی چل رہی تھی مگر آخری موڑ پر آ کر ایک عام افسانہ بن کر رہ گئی۔ ''افسر سلطانہ'' صاحبہ عرصے کے بعد انٹرویو کی صورت میں نظر آئیں۔ سوالات بڑے جاندار تھے اور جوابات اس سے بھی شاندار...... اب یقیناً افسانہ لے کر بھی جلوہ گر ہوں گی (ان شاء اللہ) اور تمام سلسلے بھی بہت کامیابی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

☆ ام ایمان قاضی، کوٹ چھٹہ سے۔ ''اس دفعہ ذکیہ آپا کی یادوں کی مالا انتہائی حیرت انگیز اور دل چھو لینے والی تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کو شفائے کاملہ عطا فرمائے، (آمین) اعتبار وفا میں اس بار کہانی تھوڑی کھل کر سامنے آئی۔ مگر سیما آپا! اس کو اور زیادہ تیز کریں اور ماضی ایک یا دو اقساط میں پورا ہی کھول دیں۔ شمیم فضل خالق کا ہلکا پھلکا سا افسانہ اچھا تھا دوستی کے خوب صورت رنگوں سے سجا۔ انجم آپا! اس بار آپ کی قسط پہلی قسط سے زیادہ جاندار رہی۔ ندیم کو صبا کے مقابل لے آئیں آپ تو گم شدہ محبت کیا ہوگا؟ یہ تو آگے چل کر پتا چلے گا۔ نفیسہ سعید نے اپنے افسانے میں اچھا سبق سکھایا کہ بغیر سوچے سمجھے دوسروں پر کمنٹس پاس کرنا آسان ہوتا ہے مگر اسی جگہ پر آپ خود کھڑے ہو جائیں جہاں پہلے کوئی اور تھا تو انسان منہ کے بل گرتا ہے۔ نادیہ احمد بھی ایک گم شدہ محبت کی کسک لیے نظر آئیں۔ نایاب جیلانی مجھے پسند ہیں تو ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا کہ ان کی کوئی کہانی مجھے پسند نہ آئے۔ ہاجرہ ریحان تو جب سے آئی ہیں مختصر پیرائے میں بہت بڑی، بڑی باتیں کر رہی ہیں وہ بھی خوب صورت پیرائے میں زبردست۔ اے عشق ترے ہیں کھیل عجب۔ سارہ کے عشق کی بازی تو بری طرح پٹ گئی۔ زارون اور عنایہ کے ساتھ بھی ایسا ہی لگ رہا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے۔ صدف آصف نے بہت اچھا لکھا کہ بدگمانی کی عینک سے کچھ بھی اچھا نظر نہیں آ سکتا۔ عقیلہ حق کا ناول اچھا تھا۔ اختر شجاعت نے اس بار پھر بے حد خوب صورت موضوع کا انتخاب کیا، نفس سے جہاد اگر ہم اپنی زندگی کا حصہ بنالیں تو آخرت ہی سنور جائے۔ شائستہ زریں بہت خوب صورت اور تیکھے سوالات ڈھونڈ کے لاتی ہیں۔ اس لیے سروے مزیدار سا لگتا ہے۔ باتیں بہار و خزاں کی ایک اچھا سلسلہ ہے پڑھ کر اچھا لگتا ہے کوشش کروں گی اس میں حصہ لینے کی۔ افسر سلطانہ سے ملاقات بے حد اچھی لگی اور مجھے تو بے حد اچھا لگتا ہے جب، جب اس بزم میں کوئی رائٹر مہمان بنتی ہیں۔'' (تبصرے کا شکریہ اور ان شاء اللہ رائٹرز کی بزم میں آپ بھی مہمان بنیں گی)

☆ مسز نزہت اشفاق، کراچی سے۔ ''انجم آپ سب کو پاکیزہ کی سالگرہ مبارک ہو۔ ہر شمارہ پہلے شمارے سے بہتر ہوتا ہے۔ بے حد مبارک باد آپ کے ناول ''گم شدہ محبت'' کی ماشاء اللہ خوب پزیرائی ہو رہی ہے۔ مجھے ہاجرہ ریحان اور شیریں حیدر کی تحریریں بے حد پسند آئیں۔ مبارک باد پہنچا دیں۔'' (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

☆ مسز ستارہ شیخ، سندھ سے۔ ''میں باقاعدگی سے تو نہیں ہاں بے قاعدگی سے شرکت کیا کرتی ہوں مگر پاکیزہ ہر ماہ پکا پڑھتی ہوں اور یہ بات میں بالکل سچی میں کہہ رہی ہوں کہ گم شدہ محبت مجھے، میرے ملنے والوں کو بہت، بہت پسند آ رہا

ہے۔اس کے ساتھ محبت سیما کا ناول بھی...... وہ آہستہ، آہستہ پردے کھول رہی ہیں۔نایاب اپنی اسپیڈ بڑھاؤ...... کہ اچھے موضوع پر اتنا رک رک کر کیوں لکھ رہی ہو...... رائٹرز کا انٹرویو ہمیشہ پسند آتا اور افسر سلطانہ کا تو بہت پسند آیا ہے، بہترین لگا۔" (بے حد نوازش۔ہاں نزہت اصغر شکریہ کہتی ہیں)

☆ ماہر تعلیم اور مصنفہ افتخار شوق، میاں چنوں سے۔"پاکیزہ میرے لیے کیا ہے اس کا اظہار میں الفاظ کے ذریعے نہیں کر سکتی، بس اتنا بتاؤں کہ کل جب میز پر رسالہ رکھا تھا اور کسی نے چائے کا کپ اس پر رکھ دیا تو میرے تو گویا تن بدن میں آگ لگ گئی کہ میں اپنے پیارے پاکیزہ کی شان میں اتنی سی گستاخی بھی برداشت نہیں کر سکتی چہ جائیکہ کوئی اس کی برائی کرے۔میرے شوہر صاحب نے اس شخص سے کہا (شکر کر اس نے تینوں مار نئیں دتا) بس اس سے میری محبت اور وابستگی کا اندازہ لگا لیں۔پاکیزہ سے وابستہ تمام اراکین، نگران اعلیٰ معراج رسول صاحب اور مدیرہ اعلیٰ عذرا رسول صاحبہ سے لے کر مدیرہ انجم انصار، آمنہ حماد اور نزہت اصغر سب میری فیملی کی طرح ہیں۔مجھ سے میرے ملنے جلنے والے پاکیزہ کا احوال اس طرح دریافت کرتے ہیں جیسے کہ میں اس فیملی کا لازمی جز ہوں۔آپ یقین کریں میرے سرہانے پچھلے چھ ماہ کے رسالے ہر وقت رہتے ہیں۔بس میرا اوڑھنا بچھونا ماہنامہ پاکیزہ ہی ہے۔میری تعلیمی اور ادبی مصروفیات بہت ہوتی ہیں پر میں پاکیزہ سے ہرگز غافل نہیں ہوں۔" (پیاری افتخار تم جیسی بہنیں ہمارا افتخار ہیں)

☆ شگفتہ ناصر، فیصل آباد سے۔"عظمیٰ آفاق کو ان کی کتاب ذرا سا گھوم لوں کی بے حد مبارک باد۔آپ نے عرصے کے بعد ناول لکھا اور بہت پسند آ رہا ہے۔دوسری قسط تو پہلے سے بھی بڑھ کر ہے۔شیریں حیدر کو ہماری طرف سے بہت بہت مبارکباد۔" (شکریہ)

☆ پروین وحید، پنجاب سے۔"بہت دنوں بعد اس محفل میں آئی ہوں۔سب سے پہلے انجم باجی آپ کو اور آپ کی پوری ٹیم کو سالگرہ کی مبارکباد دینے آئی ہوں۔(شکریہ) پاکیزہ بہت پڑھا جاتا ہے۔پنجاب میں لائبریری سسٹم بہت زیادہ ہے اور وہاں پاکیزہ بہت پڑھا جاتا ہے۔میں ہر ماہ دو پاکیزہ خریدتی ہوں اور مجھ سے لے کر میری بہنیں، نندیں غرض پورے خاندان میں گھومتا ہے۔آپ کا جلترنگ سرفہرست ہے پسندیدگی کے لحاظ سے۔بہنوں کی محفل کی تو ریٹنگ کی ہی نہیں جا سکتی۔سارے افسانے اور ناول بہت، بہت اچھے ہیں مگر گم شدہ محبت کا واقعی مزہ علیحدہ ہے۔آپ نے ایک اچھوتے انداز میں قلم اٹھایا جسے پڑھ کر بہت اچھا لگ رہا ہے۔" (شکریہ اور ہاں آپ کو بھی پاکیزہ کی سالگرہ مبارک ہو)



☆ سائرہ، صوابی سے۔"میری والدہ پاکیزہ صرف جلترنگ کی وجہ سے پڑھا کرتی تھیں۔اب وہ نہیں پڑھ پاتی ہیں مگر میں اسے باقاعدگی سے پڑھتی ہوں اور آج پہلی مرتبہ آپ کو رائے دینے کی وجہ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا ہے۔ہم سب ان کی یہ یادیں پڑھ کر بے حد متاثر ہوئے ہیں۔ان کا لکھا ہوا ہر لفظ بے حد قیمتی ہے۔کئی دفعہ میرے دل میں بھی یہ خیال آیا ہے کہ میں بھی قرآن پاک کو لکھوں...... مگر لکھنے کی ہمت نہیں ہو پاتی ہے۔آپ میری جانب سے ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کو ڈھیر ساری مبارک باد پہنچا دیں۔ہاں، آنٹی، ہم جلترنگ بے حد شوق سے پڑھتے ہیں اور پڑھ کر بہت مزہ آتا ہے۔" (پسندیدگی کا شکریہ۔ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی تک آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)



☆ عائشہ کرن، کراچی سے۔"انجم آنٹی...... مجھے پاکیزہ بہت اچھا لگتا ہے۔اپنی امی کی وجہ سے لکھنے کے جراثیم مجھ میں بھی موجود ہیں۔میری امی نجمہ ناز اصغر پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار بھی ہیں اور شاعرہ بھی۔میرا بھی دل چاہتا ہے کہ پاکیزہ کے لیے کہانیاں بھی لکھوں اور اس کے تمام سلسلوں میں حصہ بھی لوں۔کیا ایسا ہو سکتا ہے۔" (پیاری عائشہ اس محفل میں خوش آمدید۔پاکیزہ آپ کا اپنا پرچہ ہے۔آپ کی حوصلہ افزائی ضرور ہوگی آپ اس کے تمام سلسلوں میں حصہ لیں۔ہاں آپ اور دیگر بہنیں پاکیزہ کے لیے اپنا مختصر تعارف بھیجنا چاہیں تو ضرور بھیج سکتی ہیں)



☆ آسیہ، یوکے سے۔"آنٹی جب میں پاکستان میں آٹھویں جماعت میں پڑھتی تھی تو میری شادی ہوگئی اور میں یہاں آ گئی۔مجھے پاکستان میں رہنے والی لڑکیوں سے کہنا ہے کہ کبھی باہر کے خواب نہ دیکھیں۔شادی کر کے اپنے ملک میں رہیں، اپنے والدین اور اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ مل جل کر





محبت بھری زندگی گزاریں۔ مجھے جو بھی پرانے پاکیزہ مل جاتے ہیں وہ پڑھتی ہوں اور آنٹی کے ساتھ ٹیلی فونک رابطے میں رہتی ہوں۔ پاکیزہ سب لڑکیوں کی ایک اچھی تربیت بھی کر رہا ہے اور مجھے بہنوں کی محفل پڑھ کر بہت اچھا لگتا ہے اور میرا دل چاہتا ہے کہ انجم آنٹی کبھی مجھے بھی پیار سے جواب دیں۔'' (پیاری گڑیا...... تم تو ہو ہی بہت اچھی سی فرمانبردار قسم کی لڑکی۔ اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے اور تم اپنی دونوں بیٹیوں کی بہت اچھی تربیت کرو۔ ہاں تمہارا میسج...... پاکستانی بہنوں تک پہنچا رہی ہوں)

☙ عندلیب، ڈیفنس کراچی سے۔ ''میں پاکیزہ کی بہت پرانی قاری ہوں۔ 80 کی دہائی سے میرے پاس پاکیزہ محفوظ ہیں۔ کل رات 1992ء کا پرانا پاکیزہ دیکھ رہی تھی اور اس میں آپ کی دبلی پتلی سی تصویر اتنی اچھی لگ رہی تھی۔ میرے پاس دیگر رسالے بھی آتے ہیں مگر پاکیزہ سے مجھے خاص محبت ہے آپ کو شاید یاد نہ ہو۔ ریجنٹ پلازہ کی ایک تقریب میں آئی تھی اور آپ سے ملی تھی اور اب دوبارہ آپ سے اور عذرا رسول سے ملنا چاہتی ہوں۔'' (اب انشاء اللہ کوئی تقریب ہوگی تو آپ کو ضرور بلائیں گے)

☙ صائمہ سجاد جنگش، کوہاٹ سے۔ '' عظمیٰ آفاق سعید کو ذرا سا گھوم لوں منظر عام پر آنے کی بہت بہت مبارک باد ہو۔ ذکیہ بلگرامی کی روحانی سفر کی روداد اچھی لگ رہی ہے۔ شوق کا کوئی مول نہیں ہوتا اللہ ان کو ہمت دے، طاقت دے، صحت دے کہ وہ اپنے روحانی سفر کو جاری رکھیں۔ شیریں حیدر نے ''کمال اللہ دتہ'' اچھے موضوع پر لکھا، اکثر دیہات کی خواتین کے ساتھ اس طرح کے واقعات ہو جاتے ہیں اور وہ ساری عمر منہ نہیں کھول سکتیں اور مجبوریوں میں جکڑی رہتی ہیں۔ سحرش فاطمہ نے غیبت کے موضوع کو اچھے طریقے سے اجاگر کیا۔ گم شدہ محبت اچھے موضوع پر شروع ہوئی ہے۔ آج کل واقعی ٹی وی چینل والے اچھے خاصے ڈرامے چھانٹی کر کے برباد کر دیتے ہیں۔ اسٹوری سرے سے ہی چینج ہو جاتی ہے۔ اعتبار وفا بہت اچھا جا رہا ہے۔ نگہت سیما آہستہ آہستہ کرداروں سے پردے اٹھا رہی ہیں۔ اب مزہ آ رہا ہے، ناول میں۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

☙ فہمی فردوس احمد، گوجرانوالہ سے۔ ''انجم باجی آپ کا نیا ناول بھی دلچسپی سے بھرپور ہے۔ آگے چل کر یقیناً کامیابی کے جھنڈے گاڑے گا۔ انجم آپی آپ نے رائٹرز سے انٹرویو لینے کا سلسلہ بند کیوں کر دیا۔ ہر لکھنے والی کو جاننا ان کی زندگی کے پوشیدہ گوشے عیاں ہوتے ہوئے دیکھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ میں رائٹرز کے متعلق شائع ہونے والا مواد بڑے شوق سے پڑھتی ہوں کیونکہ میں خود ایک لکھاری ہوں...... ابھی معروف نہیں ہوئی مگر ہو جاؤں گی۔ اس بات کا پورا یقین ہے۔ میرے دو ناول مارکیٹ میں آ چکے ہیں۔ تیسرا آنے کے لیے بے تاب ہے۔ انجم باجی آپ میری پسندیدہ رائٹر ہیں۔ آپ کی تحریر میں جو بے ساختگی ہے اور جملوں کی ادائیگی میں جو برجستگی ہے وہ آپ کو دوسرے رائٹرز میں نمایاں کرتی ہے۔ مجھے بھی لکھنے کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ لکھنے سے میری ذات کو تسکین ملتی ہے۔ انجم باجی میں چاہتی ہوں کہ آپ میرے ناول پڑھیں اور میری اصلاح کریں۔ آپ جیسی کہنہ مشق رائٹر کی اصلاح میرے لیے مشعل راہ ثابت ہوگی۔ میں پچھلے پندرہ سال سے ماہنامہ پاکیزہ کی خاموش قاری ہوں۔ چند سال پہلے پاکیزہ میں تبصرے بھیجتی رہی ہوں۔ انجم باجی پلیز آپ سے التماس ہے کہ پاکیزہ میں میری پیاری بہنوں کو میرے ناولز کے متعلق بریف کریں تاکہ پاکیزہ کی قاری بہنیں اور رائٹرز بہنیں میری تحریر پڑھ کر اپنی رائے دیں۔'' (فہمی فردوس آپ اپنے ناولوں کی ایک، ایک کاپی ہمیں ارسال کر دیں ہم آپ کے ناولوں کے بارے میں رائے ضرور دیں گے)

☙ کوثر خالد، جڑانوالہ سے۔ ''پاکیزہ کی شاعری زبردست ہوتی ہے مگر سب کو ڈائری میں نوٹ کرنا ممکن نہیں۔ رسالے بار بار ڈھونڈ کر پڑھنا بھی ممکن نہیں تو بس رسالے جمع رکھنے کے لیے پیٹی کی ضرورت پڑ رہی ہے اور انہیں بیچنے کو بھی دل نہیں کرتا۔ لگتا ہے کسی دن پسندیدہ نگارشات سنبل ملک کی طرح الگ کر کے رسالے فری میں بانٹ دوں گی کسی قاری کو...... آگے اللہ جانے۔ دعاؤں کے تحفے بھیج رہی ہوں، اپنا حصہ لے لیجیے۔'' (دعاؤں کے لیے جزاک اللہ)

☙ سائرہ ارم ڈوگر، کمالیہ سے۔ پاکیزہ کا مارچ کا شمارہ ''بہار نمبر'' کی صورت میں ملا۔ آپ کی شبانہ روز محنت اور لگن کا منہ بولتا ثبوت ہے جس کے لیے آپ مبارک باد کی مستحق ہیں۔ انعامی سلسلہ قابل تعریف ہے۔ بزم پاکیزہ

میں اب بہت دلچسپ اور مزے دار سوال پڑھنے کو ملتے ہیں۔ براہِ مہربانی پاکیزہ ڈائری اور میں اکثر گنگناتی ہوں میں بھی انعامات دے کر حوصلہ افزائی کی جائے۔'' (انشاء اللہ تمام مستقل سلسلوں میں انعام دیے جائیں گے۔ اور جن کے انعامات ابھی پہنچ نہیں سکے ہیں ان کو بھی ضرور ملیں گے)

منیزہ نعیم، راول پنڈی سے۔ ''پاکیزہ ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ پسندیدہ نبیؐ کے اسم مبارک ہیں دوسرا آپا ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت دے، آمین۔ اس دفعہ اکثر گنگناتی ہوں کا پہلا شعر دل پر لگا تمام اشعار اچھے تھے۔ روحانی سلسلہ بھی بہت اچھا جا رہا ہے۔ تمام مصنفات کو میری طرف سے اچھا لکھنے پر مبارک باد اور عذرا آپا، انجم آپا آپ کو پاکیزہ کی سالگرہ مبارک۔ آپا آپ کا آسٹریلیا کا ٹور کیسا رہا، ہمیں پتا ہوتا تو ہم بھی اپنے پیارے بھانجے بشارالحق اسدی اور بہو عائشہ بشار اور پوتے شاہ ایمان پوتی دعا کو کوئی سندیسے بھجواتے۔'' (دعائیں تو بغیر سفر کیے پہنچ جاتی ہیں۔ بھانجے، بہو اور پوتا، پوتی کے لیے گفٹس بھجوانے ہوں تو بھیج دیجیے گا۔ جب اللہ کا حکم ہوا اور میں دوبارہ گئی تو لے جاؤں گی)

ارم کمال، فیصل آباد۔ بہار نمبر کا پُربہار ٹائٹل اتنا زبردست اور دلکش تھا کہ نظریں ہٹنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ اداریہ بہت ہی متاثر کن تھا۔ یادوں کی مالا پُرفکر دل و روح میں ایمان اور نور کی پُرنور روشنی سرایت کر جاتی ہے۔ بلاشبہ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی صاحبہ ڈھیروں مبارکباد کی حق دار ہیں۔ سلسلے وار ناول اعتبار وفا اس دفعہ قدرے سست روی کا شکار رہا جبکہ ''اے عشق ترے ہیں کھیل عجب بہت ہی پاورفل جا رہا ہے۔ امجد کی مکاری و عیاری کے سبب سارہ کا نقصان غمگین کر گیا مگر یہ تو ہونا ہی تھا۔ سارہ کی عاقبت نااندیشی اسے لے ڈوبی۔ پیاری باجی کا ناول گم شدہ محبت نئی نئی جہتوں سے روشناس کروا رہا ہے۔ اگلی قسط کا بے صبری سے انتظار ہے۔ کھوئے کھوئے لمحے میں سبرینہ پر اتنا ظلم و ستم دہشت زدہ کر گیا۔ دیگر تحریروں میں اب وہ رعنائی خیال کہاں اور بدگمانی پُراثر تحریریں تھیں۔ منی ناول دیار صبح کے اجالوں میں اسما اپنی معاملہ فہمی سے سچویشن کو نبھانے کی کوشش کر رہی ہے مگر اب تک یہ گتھی سلجھی نہیں۔ یہ سارا کیا دھرا کس کا ہے؟ شیریں حیدر کی تحریر کمال اللہ دتہ ڈبا پیروں کی یاد دلا گئی۔ سود و زیاں شمارے کی اے ون تحریر تھی جس نے دماغ کی الجھی ہوئی گتھیاں سلجھائیں۔ شائستہ زریں کا سروے کمال کا تھا۔ افسر سلطانہ سے ملاقات یونیک رہی۔ باتیں بہار و خزاں کی نور آمنہ درانی کے خیالات دل میں گھر کر گئے۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

نویدہ تبسم، آسٹریلیا سے۔ ''اس ماہ پاکیزہ بے حد مشکلوں سے پڑھا۔ نیٹ سے پڑھنے میں دقت ہوتی ہے کتاب ہاتھ میں لے کر پڑھنے کا مزہ ہی علیحدہ ہوتا ہے مگر میری خوشی کی سب سے بڑی وجہ کہ اس میں آپ کا ناول شروع ہو چکا ہے اور کہانی خوب مزے کی ہے اور نئے انداز کی ہے...... ہاں شیریں حیدر کا نئے انداز کا افسانہ بہت پسند آیا اور بے حد ہنسی بھی آئی۔'' (شیریں حیدر شکریہ کہہ رہی ہیں)



ہانیہ، راول پنڈی سے۔ ''ہم نے ابھی اپنا گھر چینج کیا ہے...... اس لیے باقاعدگی سے نہیں پڑھ پا رہے ہیں مگر انجم باجی آپ کی کہانی ہمیں بہت اچھی لگی ہے۔'' (شکریہ)

✉ بہن الفت، کراچی۔ آپ کے بتائے ہوئے قلمی نام پر جواب دے رہی ہوں آپ کے سسرال اور آپ کے آفس کے ماحول میں کم از کم ایک بات میں مماثلت ضرور ہے کہ خود کو بڑا، اچھا، نیک اور اصول پرست ثابت کرنے کے لیے دوسروں کو چھوٹا اور بے اصول قرار دیتے ہیں...... مگر آپ خود کو ان جیسا ہرگز نہ بنائیں۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہونے میں اب شاید کامیابی مشکل سے ہی ہوتی ہے بلکہ نہیں بھی ہوتی مگر اس سے کم از کم اپنا دل تو مطمئن رہتا ہے اور میں دل کی بے سکونی کو سب سے بڑی پریشانی سمجھا کرتی ہوں۔

✉ ایمان چوہدری، پنجاب۔ آپ کا تفصیلی خط پڑھا آپ تو ماشاء اللہ ٹیلینٹڈ لڑکی ہیں اور ہمیں بہت اچھے مراسلات بھیجا کرتی ہیں۔ آپ کی حوصلہ افزائی انشاء اللہ ضرور ہوگی۔ ہمارے تمام سلسلوں میں حصہ لیجیے اور دیگر باتوں کے لیے آپ مجھے صبح گیارہ سے شام پانچ بجے تک اس نمبر پر فون کر سکتی ہیں۔(021.36964779)

✉ افشا سحر، ضلع سرگودھا۔ خوش آمدید...... آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں ہے۔ میں آپ کی حتی







الامکان حوصلہ افزائی کروں گی۔ آپ فون پر لکھنے کے حوالے سے مجھ سے کوئی مشورہ کرنا چاہیں تو وہ بھی کرسکتی ہیں۔

✉ سائرہ، راول پنڈی۔ آپ اپنا موبائل نمبر مجھے بھیج دیں۔ میں آپ کی راول پنڈی میں کوئی سہیلی بنوادوں گی...... جس سے آپ خوب باتیں کیجیے گا...... تنہا رہتے ہوئے آپ بہت سی پریشانیوں کا شکار ہوگئی ہیں...... جب کسی دوست سے باتیں کریں گی تو دل پر چھائے ہوئے مایوسیوں کے بادل بھی یقیناً چھٹ جائیں گے۔

✉ سبین ش، م، سندھ سے۔ آپ کا خط اشاعت کے قابل نہیں ہے۔ آپ سے صرف اتنا ہی کہنا چاہتی ہوں کہ آپ کسی بہت بڑے یا کسی انوکھے مسئلے کا شکار نہیں ہوئی ہیں۔ ہمارے اس معاشرے میں بہت ساری ایسی خواتین موجود ہیں جو اپنے سے بڑی (چاہے وہ کسی بھی حوالے سے بڑی ہوں) خواتین کو نیچا دکھانے کے لیے ایسی باتیں کیا کرتی ہیں جس سے انہیں ذلیل کیا جائے اور ان کی خوشی ہی ایسی ہوا کرتی ہے کہ وہ لوگوں کو گرائیں...... مگر ایسے لوگ ہمیشہ منہ کے بل گرا کرتے ہیں...... اس لیے آپ کچھ نہ کہیں اور خاموش رہیں، اللہ کرم کرے گا...... انشاءاللہ...... اور ہاں ان تمام باتوں کا ذکر اپنے میکے میں ہرگز نہ کریں۔

✉ نور افشاں شیخ، شکار پور سے۔ ”میری طرف سے آپ سب کو پاکیزہ کی سالگرہ مبارک ہو، ٹائٹل بہت اچھا لگا۔ بہنوں کی محفل ہمیشہ کی طرح سجی ہوئی تھی۔ پاکیزہ بلاشبہ ایک بہترین اور زبردست ڈائجسٹ ہے جس میں زندگی کا ہر رنگ شامل ہے...... مارچ کے شمارے کا اداریہ تو زبردست لکھا ہے آپ نے باجی اگر ہم سب اس بات پر عمل کریں تو یقیناً آدھی جنت تو اپنی زندگی میں ہی ہمیں نظر آجائے۔ اس کے ساتھ، ساتھ ذکیہ آپا اور آپی اختر شجاعت کی خاص اور قیمتی باتیں بھئی واہ...... تعریف کے لیے الفاظ نہیں مل رہے...... باجی آپ کے ناول گم شدہ محبت کی دوسری قسط پہلی قسط سے بھی زیادہ نمبر لے گئی اتنی واضح، صاف اور سمجھ میں آنے والی بیچ، بیچ میں کچھ مذاق والی سطریں بھی جسے پڑھ کر مسکراہٹ آپ ہی آپ چہرے پر آگئی تھی اور کچھ کچھ سنجیدہ اور زندگی کو سیکھنے اور سمجھنے والی باتیں، محنت سے ہر چیز اوپر جاسکتی ہے اور محنت نہ کرنے سے کوئی بڑی سے بڑی چیز بھی نیچ آسکتی ہے...... یہ اتنی اچھی بات تو سیدھی میرے دل میں اتر گئی اور اپنے دل و دماغ میں سیو بھی کرلی۔ اس کے علاوہ اخبار کے دفتر، اسکرپٹ رائٹنگ کے بارے میں بھی کافی نالج مل رہی ہے۔ صبا کو جس کا انتظار ہے آپ وہ اسے ضرور دینا کیونکہ میں جانتی ہوں آپ بہت رحم دل ہیں، تیسری قسط کا انتظار دوسری قسط پڑھ کے شروع...... نگہت سیما اور درشن کے ناول بھی اچھے جارہے ہیں مگر مجھے ایشال اور عنایہ کی کام چوری، سستی بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہی۔ بالکل ہی ڈفر لڑکیاں ہیں بس زویا ہی ایک اچھی لڑکی ہے ہر لحاظ سے۔ نفیسہ سعید باجی کا افسانہ اس طرح تو ہوتا ہے آج کے دور کی عکاسی ہے پرفیکٹ خاص کر کے افسانے کا انجام بہت درست لگا۔ بھئی اس طرح تو ہوتا ہے جیسا کرو گے، ویسا بھرو گے۔ نوشین ساجد باجی آپ کو عمرے کی سعادت بہت، بہت مبارک ہو...... امینہ باجی آپ کی بڑی مہربانی نوازش آپ کو میرے شہر شکار پور کی سیر اچھی لگی کبھی آؤ شکار پور تو پورے شہر کی سیر کراؤں۔ اللہ امینہ باجی کو کلی صحت و زندگی دے۔“ (تبصرے کا شکریہ...... آپ کو بھی پاکیزہ کی سالگرہ مبارک ہو)

✉ فریدہ جاوید فری، لاہور سے۔ ”آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے اپنی بہن یعنی مجھے انمول خزانے کی کتاب بھیجی۔ اور عظمیٰ میری بھانجی نے اپنی خالہ کو ذرا سا گھوم لوں میں بھیجی۔ اس مرتبہ بھی افسانے اور ناول ایک سے بڑھ کر ایک لگے پڑھ کر مزہ آگیا۔ دل جوئی، قانتہ رابعہ، مکافات عمل، کھلتے گلاب پھیکے رنگ...... ام ایمان کا افسانہ نفیس لوگ، انکشاف، بہشتی، بے بسی سب ہی بہترین تحریریں لگیں۔ مجھے کچھ کہنا ہے پڑھ کر بے حد اچھا لگا۔“ (پیاری بہن فریدہ ان دنوں تم بیمار ہو...... اپنا خیال رکھو...... یہ کتب اس لیے بھیجی ہیں کہ تم بستر پر لیٹے، لیٹے مطالعہ بھی کرتی رہو)

✉ نائلہ بلیغ الرحمن، مقام نامعلوم سے۔ ”مارچ کا بہار نمبر سامنے ہے، کافی عرصے بعد شمولیت کی ہے امید ہے کہ جگہ ملے گی۔ مجھے کچھ کہنا ہے میں آپ نے بہت اچھی باتیں کیں۔ خدا سب کو ایسا سوچنے سمجھنے کی توفیق دے (آمین) ابھی ڈائجسٹ

مکمل نہیں پڑھا ہے مگر خط اس لیے لکھنا پڑ گیا ہے کہ محترمہ شبانہ شوکت کا افسانہ زندگی دھوپ تم گھنا سایہ، میں شبانہ نے صفحہ نمبر 91 پر لکھا ہے کہ ماہم بھابی کی تو کہیں بھی شادی ہو جائے گی پر مشعل کے لیے وہ شخص ہمیشہ نامحرم رہے گا، میں تو اس کا سگا چچا ہوں اس کے باپ کا بھائی سگا بھائی اس کا محرم۔ گزارش ہے کہ سوتیلا باپ بھی محرم رشتوں میں آتا ہے۔ پلیز شبانہ صاحبہ ناراض بھی مت ہونا دراصل مذہبی مسائل کے بارے میں جب ہم کچھ لکھتے ہیں تو ہمارے مضامین اور افسانے پڑھنے والے انہی معلومات کی روشنی میں بات پر عمل کرنے کی کوشش بھی کر ہی دیتے ہیں تو قلم کا جہاد ہے اگر ہم نے اچھی بات پھیلائی تو اچھا اجر غلط بات کی تو ہمارا اپنا نقصان ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں افسانہ بہترین تھا۔ اللہ تعالیٰ قلم میں اور طاقت دے (آمین) میں نے پہلے بھی خط لکھا تھا مگر جگہ نہیں ملی۔ کیا وجہ ہے؟ کوئی ناراضی تو نہیں؟ آپ کا سفر بخیر گزرا مبارک ہو۔" (تبصرہ اگلے ماہ انشاءاللہ)

لاریب، ماہ زیب، چونیاں سے۔ "ذکیہ آپا کی یادوں کی مالا تو شمارے کی جان ہوتی ہے جیسے سب سے پہلے میں وہی پڑھتی ہوں پھر کچھ اور...... ماشاءاللہ ہر بات قیمتی جیسے ہیروں کی مالا ہو۔ اعتبار وفا بہت اچھا ناول ہے، نگہت سیماجی کا ٹیپیکل اسٹائل ہر بات دھیرے، دھیرے کھل رہی ہے۔ پروفیسر صاحب ہی مدثر ہیں ایمل کے سابق شوہر لیکن بچے تو پیدا ہوتے ہی بیٹا مر گیا تھا تو پروفیسر صاحب کے رواحہ صاحب کس کے صاحبزادے ہیں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ خیر درثمن صاحبہ کا ناول ابھی شروع ہوا ہے لیکن ساری کہانی سمجھ میں آرہی ہے کوئی ٹینشن نہیں جیسا کہ قسط وار ناولوں میں ہوتا ہے۔ اس لیے اسے جلدی ختم کروا دیجیے گا۔ اور اس کی جگہ ناہید سلطانہ اختر سے ناول شروع کروائیں۔ ان کا ناول زندگی بہت اعلیٰ پائے کا ناول تھا۔ تجربوں کا نچوڑ...... سمجھ و دانش سے بھرپور...... افسانوں میں ام ایمان، فرحین عثمان، فاطمہ خان اور رفاقت جاوید کے افسانے بہترین تھے۔ (شکریہ) صائمہ قریشی کی کاوش اچھی تھی پر عنوان بالکل بونگا اور بے تکا سا تھا اکثر رائٹرز کہانی کو عنوان دینے میں مار کھا جاتی ہیں۔ پلیز انجم آپا آپ ایڈٹ کر دیا کریں ناں...... (اکثر میں عنوان تبدیل کر دیا کرتی ہوں) نایاب جیلانی کے ناول میں اسما کے ساتھ بہت برا ہوا۔ یقیناً یہ ساری کارستانی اسمارہ کی ہے۔ اسی نے ہادی کو اپنے حسن کا جھانسا دے کر خواب دکھائے ہیں۔ اسما بیچاری تو بے قصور ماری گئی۔ انجم آنٹی آپ نے پاکیزہ میں ناول شروع کر کے رسالے کو چار چاند لگا دیے۔ ایسی کہانی بہت اچھی لگتی ہیں جن میں مڈل کلاس دکھائی جاتی ہے۔ ان کے مسئلے مسائل ریت و رواج سب کچھ اپنا، اپنا سا لگتا ہے۔ آپ ماشاءاللہ بہت ایکٹو خاتون ہیں اپنی چستی کا کوئی راز ہمیں بھی بتا دیجیے۔ (میں خوش رہتی ہوں اور کسی سے کوئی توقع نہیں باندھتی) روحانی مشورے، جلترنگ، خطوں کی محفل، اداریہ وغیرہ یہ سب سلسلے آپ سے ہی تو ہیں۔ خدا پاک آپ کو سلامت رکھے۔ عظمیٰ آفاق نے دبئی کا سفرنامہ ادھورا کیوں چھوڑ دیا تھا پلیز اسے دوبارہ سے جاری کیجیے بہت اچھا لگتا تھا بہت سی معلومات ملتی تھیں اور پڑھتے ہوئے کبھی کبھی تو یہ گمان گزرتا تھا کہ جلترنگ پڑھ رہے ہیں۔ جتنی سادگی سے آپ یہ بات کر لیتی ہیں یہ بہت مشکل ہے ہر کوئی نہیں کر سکتا۔" (دبئی کا سفرنامہ مکمل ان کی کتاب میں موجود ہے)



صبا نور، لیہ سے۔ "آپی میں یہ سوچ کے اداس تھی کہ فروری کے ڈائجسٹ میں آپ نہیں ہوں گی لیکن جب پاکیزہ لیا تو میری خوشی کی انتہا نہیں رہی ایک تو آپ پاکیزہ سے غائب نہیں تھیں دوسرا آپ کا ناول گم شدہ محبت کی پہلی قسط اسٹارٹ ہو چکی تھی آپی مجھے بے حد خوشی ہے کہ آپ نے میری وش کو پورا کیا ہیروین کا نام میرے نام پر رکھا، اب میں خود کو گم شدہ محبت کی ہیروئن ہی سمجھتی ہوں، صبا کی اسٹوری بھی میرے حالات سے ملتی جلتی ہے۔ فرح خالہ کا کردار مجھے کسی ولن ٹائپ کا لگ رہا ہے بہر حال ناول بہت اچھا دلچسپ اور سسپنس سے بھرپور ہے اور اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے اور ہاں آپی آپ کا بے حد شکریہ...... ناہید سلطانہ اختر کا ناولٹ مکافات بھی زبردست تھا کسی کے ساتھ برا کرتے ہوئے یہ سوچ لینا چاہیے کہ کل کو ہمارے ساتھ ایسا ہو سکتا ہے بس دعا ہے کہ رب تعالیٰ ہر کسی کو مکافات عمل سے بچائے اور ہمیں اچھائی، سچائی اور نیکی کے راستے پر ہمیشہ چلائے، آمین۔ دل جوئی، برا آپا، اصل زندگی، جگمگاتا ستارہ اور دیگر تحریریں بھی بہت اچھی تھیں۔ اختر شجاعت کی شمع ہدایت بار، بار پڑھنے کو دل کرتا ہے ان کی ایک، ایک بات دل پر اثر کرتی ہے اختر باجی سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں وہ یہ کہ جو لوگ حقوق اللہ تو پورا کرتے ہیں لیکن حقوق العباد بھلا دیتے ہیں ہر وقت دوسروں کو تکلیف دیتے ہیں دوسروں کی ٹوہ میں رہتے ہیں اس کے برعکس جو لوگ بے شک حقوق اللہ پورے نہیں کرتے لیکن حقوق العباد کا پورا خیال رکھتے ہیں تو ان میں سے کون سے لوگ







بہتر ہیں؟ انجم آپی بہنوں کی محفل میں آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہمیں واقعی اپنی پریشانیوں کا تذکرہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس سے دشمن خوش ہوتے ہیں اور نہ ہی خوشیوں اور کارناموں کا کرنا چاہیے۔" (آپ خوش ہیں اور خوش رہیں...... دیکھیے آپ کی فرمائش ہم نے پوری کردی ناں ہاں اختر شجاعت شکریہ کہتی ہیں)

☆ شمیم فضل خالق، پشاور سے۔ "آپ سڈنی سے بخیر وعافیت واپس آگئی ہیں۔ بہت زیادہ خوشی ہوئی اچانک ہی اپنا ملک بھرا بھرا لگنے لگا۔ آپ نہیں تھیں پاکیزہ پر آپ کا سایہ ضرور تھا پھر بھی پچھلا پاکیزہ پڑھتے ہوئے تشنگی کا احساس ہو رہا تھا حالانکہ سارا عملہ بے حد محنتی ہے اور اب تو فاصلے اتنے سمٹ گئے ہیں کہ دوری کا احساس کہاں ہوتا ہے...... لیکن مجھے ہو رہا تھا۔ اچھا اب پاکیزہ پر تبصرہ ہو جائے اس بار جلدی، جلدی پڑھ لیا کہ گل رخ میری بھتیجی کے جھپٹنے سے پہلے پاکیزہ ختم کر کے تبصرہ بھجوا دوں...... مجھے کچھ کہنا ہے میں حسب معمول ایک اچھی بات بتائی گئی تھی، دین کی باتیں ہمیشہ کی طرح ایمان تازہ کر دیتی ہیں، یادوں کی مالا کے کیا کہنے...... ذکیہ بلگرامی کو خدا زندگی دے کہ وہ اپنے اس خوب صورت سفر کی روداد جاری رکھ سکیں۔ (آمین) نگہت سیما کی اعتبار وفا کی یہ قسط بھی بھرپور تھی۔ تابندہ نعیم کی کھوئے کھوئے لمحے، کی اس قسط نے لطف دیا۔ شبانہ شوکت کی تحریر زندگی دھوپ تم گھنا سایہ نے بھی لطف دیا۔ حمیرا نوشین کی درد بے کراں...... کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ انجم ڈیئر گم شدہ محبت کی دوسری قسط بھی بہت زبردست تھی۔ ایک نیا موضوع اور انداز بیان کی خوب صورتی سے اس ناول میں چار چاند لگا دیے۔ نفیسہ سعید کے افسانے اس طرح تو ہوتا ہے، میں آج کل کی نسل کو ایک اچھا سبق دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ نادیہ احمد کا افسانہ اب وہ رعنائی خیال کہاں...... بھی اچھا دلچسپ افسانہ تھا۔ نایاب جیلانی کا دیار صبح کے اجالوں میں ناموں کی ہیر پھیر کے ساتھ اچھا ناولٹ ہے پڑھ کر مزہ آیا۔ شیریں حیدر کا کمال اللہ دتہ بے حد دلچسپ افسانہ تھا۔ شیریں حیدر کا کمال یہ ہے کہ اس کی تحریر شروع کر دو تو اٹھنے کو دل نہیں چاہتا بس ایک بات کی مجھے سمجھ نہیں آئی کہ مریم کو ایک اچھے کردار کی شریف لڑکی دکھایا گیا تھا پھر اتنی آسانی سے وہ کسی کے ہاتھوں کیسے کھلونا بن گئی؟ نبیلہ نازش راؤ کا ناولٹ محبت کے گلاب مجھے بور لگا۔ ہاجرہ ریحان کے نیگ کی تو خاص سمجھ ہی نہیں آئی۔ درشمن بلال کی اے عشق ترے ہیں کھیل عجب...... اچھا دلچسپ ناول ہے، بدگمانی، صدف آصف کی آج کل کے حالات کے عین موافق ہے لوگ خواہ مخواہ کی بدگمانی دل میں پال لیتے ہیں عقیلہ حق کی سود و زیاں زبردست تحریر ہے اس شمارے کی...... خدا پر یقین پختہ ہو جاتا ہے...... ایسی تحریریں پڑھ کر بہت اچھی جا رہی ہو۔" (پسندیدگی کا شکریہ)

☆ اسما جمشید، ڈیرہ اسماعیل خان سے۔ "پہلی بار بہنوں کی محفل میں حاضر ہو رہی ہوں۔ اس ماہ مارچ کا شمارہ 24.2.16 کو میرے گھر میں اپنا پیارا قدم رکھ چکا تھا۔ بہار نمبر کا ٹائٹل پسند آیا۔ مجھے کچھ کہنا ہے پڑھنے کے بعد دین کی باتیں پڑھ کر سکون مل گیا۔ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا سے بہت کچھ سیکھا سلسلے وار ناول اور مکمل ناول بہت پسند آئے۔ ناولٹ میں محبت کے گلاب، افسانے درد بے کراں، کمال اللہ دتہ، نیگ، بدگمانی بہت پسند آئے۔ خصوصی مضامین میں شمع ہدایت، وہ آئے بزم میں بیاد رفتگاں اے وِن رہے۔" (پیاری اسما خوش آمدید مختصر تبصرے کا شکریہ)

☆ زرین زبیر کوٹھاری، کراچی سے۔ "پاکیزہ کا بہار نمبر واقعی میں بہار نمبر ہے اس ماہ بہترین افسانوں کا مجموعہ ہے، آپ کا مجھے کچھ کہنا ہے، واقعی وقت کی پکار ہے۔ شیریں حیدر کا افسانہ کمال اللہ دتہ لاجواب رہا۔ صدف آصف کا افسانہ بدگمانی ایک بہترین تحریر تھی جبکہ افسانہ بھروسا جو سحرش فاطمہ نے لکھا خوب تھا۔ آپ کے ناول گم شدہ محبت کی اچھی اٹھان ہے۔ شہلا کا کردار اچھا ہے اور اس سے کافی امیدیں وابستہ ہیں۔ آپ کا ناول ویسے کافی دلچسپی اور نشیب و فراز والی کہانی لگتی ہے دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا اے وِن ہے۔ ایسی ہستیاں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔" (جی ہاں، پسندیدگی کا شکریہ)

☆ حلیمہ شیزہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ سے۔ "آنٹی جی بہنوں کی محفل میں اگر آپ بہنوں کے آزمودہ وظیفہ لگا دیں تو پتا نہیں کتنوں کی دنیا سنور جائے اور یہ بجلی سے بھی لوگوں کی جان چھوٹ جائے۔ گم شدہ محبت بہت مختلف ٹاپک پر ہے، آغاز اچھا لگا۔ شکریہ آنٹی آپ نے بھی سلسلے وار ناول شروع کیا۔ ہاں فرحین عثمان کا افسانہ بھی بہت پسند آیا۔ (شکریہ) آپ کو پہلی بار خط لکھا ہے مجھے امید ہے آپ ضرور شائع کریں گی اور مجھے ویلکم بولیں گی۔ پورا رسالہ ہی ہر طرح سے سپرہٹ ہے۔" (خوش آمدید، آپ پاکیزہ

باقاعدگی سے پڑھیے اور ہمیں تبصرہ بھیجیے)

٭ ثمینہ طاہرہ، لاہور سے۔ ''ام ایمان، نفیس لوگ کے ساتھ آئیں، ہچ ہارون کی ڈبل پرسنلٹی اور دہرے معیار پر دل بہت برا ہوا۔ پتا نہیں ایسے مردوں کو خود کو اپنی بیویوں کو دھوکا دے کر کون سا سکون ملتا ہے شیریں حیدر کی انکشاف مزے کی تحریر، ساحر کی نقلی بتیسی کے انکشاف نے اس کے سسر سمیت ان سب لوگوں کی آنکھیں تو ضرور کھول دیں ہوں گی جو خود کو ہی عقل کل سمجھتے ہیں۔ فرحین عثمان کی ایک نئی روشنی ایک اچھی سبق آموز تحریر۔ واقعی بعض اوقات آنکھ جو دیکھتی ہے وہ ہوتا نہیں۔ ہاجرہ ریحان کی بہشتی بھی اچھی کاوش تھی۔ فرح طاہر کی بے بسی، کرے کوئی بھرے کوئی والی سچویشن...... ملیحہ کے باپ نے اس کی بے جوڑ شادی کر کے بیٹی کی زندگی تو خراب ہی کی۔ قانتہ رابعہ کی ہر تحریر اپنے اندر ایک بہت اعلیٰ پیغام رکھتی ہے۔ مجھے ان کا اندازِ تحریر بہت پسند ہے ان کی ہر کہانی سیدھی دل کو چھوتی ہے اور ان کی ہر تحریر میں کسی نہ کسی حدیث یا قرآنی آیات کے حوالے سے دیا گیا سبق بہت اچھا لگتا ہے۔ رفاقت جاوید، سانحہ پشاور کے حوالے سے جگمگاتا ستارہ لائیں اور بے ساختہ دل کو چھو گئیں۔ بہت دل گداز اور پراثر تحریر...... فاطمہ خان کی سمجھوتا مختصر اور اچھی تحریر...... عورت کے کمپرومائز کی کہانی کبھی اپنے گھر والوں کے لیے تو کبھی خود اپنی عزت کے لیے سمجھوتا تو عورت کو کرنا ہی پڑتا ہے۔ جزاک اللہ...... سیما راجپوت کی مرہم سے آگ لگ جائے اور ثریا انجم کی برا آپا بھی اپنی اپنی جگہ اچھی کاوش رہی، جزاک اللہ۔ نایاب جیلانی کا منی ناول دیار صبح کے اجالوں میں کی دوسری قسط بھی شاندار تھی۔ ناہید سلطانہ اختر کی مکافات بھی مرد کی ازلی بے وفائی پر لکھی گئی گداز تحریر...... اور سب سے اچھا لگا فرحین اظفر کا ایک وعدہ ایک پیغام، عورت ہی عورت کی اصل دشمن ہے اور دانیال کی ماں جیسی ساسیں تو بس...... اللہ ہی بچائے۔ تابندہ نعیم کی کھوئے کھوئے لمحے ابھی تکمیل کے مراحل میں ہے مکمل تبصرہ ناولٹ مکمل ہونے کے بعد انشاء اللہ، انجم آپا کا گم شدہ محبت اپنے پہلے پڑاؤ پر ہی اچھا نقش چھوڑ گیا۔ ماشاء اللہ دوسری قسط کا ابھی سے انتظار شروع ہو گیا۔ درثمن بلال کا اے عشق ترے کھیل عجب اور نگہت سیما کی اعتبار وفا اپنے مخصوص انداز سے سفر طے کر رہے ہیں۔ دونوں ناولز بہت زبردست طریقے سے آگے بڑھ رہے ہیں اور روز اول کی طرح قارئین کو اپنی گرفت میں جکڑے ہوئے ہیں۔ جزاک اللہ خیر...... پاکیزہ کے مہمان شیف گلزار، شیف روبینہ گلزار اور ان کی بیٹی ایمانہ گلزار تھے۔ ان سے مل کر بہت اچھا لگا۔ میرا شہر میں نورافشاں اپنے خوب صورت شہر شکار پور سیر کروانے لے گئی۔ کوئی شک نہیں کہ ہمارا پیارا پاکستان پورے کا پورا بے پناہ خوب صورت اور جاذب نظر ہے۔ باتیں بہار دخزاں کی سب کے دل کی باتیں جان کر بہت اچھا لگا، جزاک اللہ۔ جلترنگ احتیاط پڑھ کر تو مزہ ہی آ گیا ہاہاہا...... کیا احتیاطی تدبیر اپنائی صاحب بہادر نے...... پیاری باجی...... آپ کا بھائی جان...... واہ کیا بات ہے انجم آپا آپ کی، سبحان اللہ...... شمع ہدایت ہمیشہ کی طرح بے مثال اور بابرکت ماشاء اللہ...... سبحان اللہ...... روحانی مشورے میں سورہ فاتحہ کے فضائل اور مجرب دعا کے بارے میں بتا کر آپ نے بہت سے دکھی دلوں پر مرہم لگانے کا نیک فعل سرانجام دیا ہے۔ ماشاء اللہ، جزاک اللہ خیر...... اور آخر میں آپا آپ کی محفل کا تو جواب ہی نہیں ہوتا ماشاء اللہ...... سب بہنوں سے اتنی اچھی ملاقات ہو جاتی ہے دل خوش ہو جاتا ہے۔'' (تفصیلی تبصرے کا شکریہ) آخر میں آپا آپ سے دو باتیں پوچھنا چاہتی ہوں۔ پلیز جواب ضرور دیجیے گا۔ پہلی یہ کہ کیا میں باتیں بہار دخزاں کی، کے سوالوں کے جواب ای میل کے ذریعے دے سکتی ہوں؟ اور دوسری کہ کیا میں اپنی کہانیاں میل کر سکتی ہوں۔'' (جی بالکل)



٭ سنبل ملک اعوان، لاہور سے۔ ''پاکیزہ خوب صورت سرورق کے ساتھ حاضر تھا۔ مجھے کچھ کہنا ہے...... میں ہر بار کچھ نہ کچھ نیا اور انوکھا ہی ہوتا ہے۔ جس سے ہمیں زندگی کی مشکلات پر قابو پانے میں آسانی ملتی ہے۔ یادوں کی مالا زبردست پر عقیدت، روحانی سفر سلام...... اعتبار وفا، آنٹی نگہت سیما چکوال سے لے کر حاضر ہیں۔ عظام اور رواحہ کے والد ابھی تک اپنے اپنے ماضی کو سوچ کر ہلکان ہو رہے ہیں۔ وہ ماضی جس نے ان کی زندگیوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ یار غار، شمیم فضل خالق کا ہلکا پھلکا افسانہ تھا۔ گم شدہ محبت، آنٹی انجم انصار صاحبہ، بہت دلچسپ اور یونیک سا ناول...... اب دیکھیں ندیم خان، صبا کی زندگی میں کیا رنگ لائے گا۔ اس طرح تو ہوتا ہے نفیسہ سعید کا FB کے حوالے سے جیسا کو تیسا! اجاگر کرتی تحریر...... نادیہ احمد جی نے اس حقیقت کو بیان کیا جو اکثر ہمارے معاشرے میں ہوتا ہے کہ چھوٹی عمر میں بچوں کو منسوب کر دیا جاتا ہے۔ کمال اللہ دتہ، آنٹی شیریں حیدر کی معاشرے کی تلخی کو اجاگر کرتی تحریر...... لاعلمی اور جہالت کس قدر







افسوس ناک صورت حال ہے۔نایاب جیلانی کا منی ناول ہادی نے والد کے کہنے پر شادی کرلی اسماء سے...... جبلہ ہادی کی والدہ نے اپنا صحیح کردار ادا کیا اور صبح بہورانی کو تسلی بھی دی۔ جو سمجھدار عقل والے ہوتے ہیں وہ خوب صورتی کے بجائے خوب سیرتی کو ترجیح دیتے ہیں۔ محبت کے گلاب نبیلہ صاحبہ کا بھی اچھا اور ہر افسانہ ایک سے بڑھ کر ایک تیگ...... ہاجرہ ریحان میں ضمیر کو جگانے کی کوشش کی۔ اے عشق ترے ہیں کھیل عجب...... درثمن جی آپ تو بازی لے گئیں۔ بھروسا، بحرش فاطمہ نے بڑے ہی اچھے طریقے سے غیبت کرنے والے کو احساس دلایا۔ بہنوں کی محفل زبردست تھی۔ آپ نے سڈنی میں اچھا وقت گزارا ہے۔" (تبصرے کا شکریہ)

☙ عطیہ عمر، کراچی سے۔ "فروری کے شمارہ میں رفیعہ ابدالی کا خط اور انجم باجی کا جواب پڑھا۔ بہت صائب جواب ہے انجم باجی کا کہ مذکورہ بہن کو کسی مفتی صاحب سے بات کرنی چاہیے۔ یہ خط ہی میرے اس کا خط کا باعث بنا۔ نکاح دراصل دو اجنبی، نامحرم مرد و زن کو ایک مقدس رشتے میں اس طرح جوڑتا ہے کہ خونی اور پیدائشی رشتوں سے زیادہ مضبوط بھی ہے اور انتہائی نازک بھی ہے۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکامات کی تعمیل کرتے ہوئے انہیں گواہ بنا کر بنایا گیا ہے یہ رشتہ معاشرے کی تکمیل کی بنیادی اکائی ہے۔ خدارا اسے مذاق یا جھگڑے میں ہتھیار کے طور پر استعمال نہ کریں۔ صد افسوس کہ تھوک کے حساب سے آنے والے ٹی وی چینلز نے مارننگ شوز میں شادی بیاہ کی رسومات ملبوسات بناؤ سنگھار ایسے انداز سے دکھائے جاتے ہیں کہ خواتین اور لڑکیاں شادی بیاہ کو خصوصاً اور روزمرہ زندگی کو عموماً یونہی چمکتا دمکتا دیکھنا چاہتی ہیں...... کھانا پکانے کے پروگرام بھی اس دوڑ میں شامل ہیں۔ خواتین فون کر کے ایک جوڑے کی خاطر جس طرح منت سماجت کرتی ہیں، میں سوچتی ہوں کیا ان میں خودی نام کی چیز بالکل ہی نہیں؟ عزیز بہنو! یہ چند روزہ زندگی، ڈیزائنر ملبوسات، بیگز، جیولری، میک اپ شاید بہت کم عرصے کے لیے آپ کو خوش کر دے لیکن سوچیں تو قدیم تاریخ کی ملکائیں، قلوپطرہ نور جہاں وغیرہ ہوں یا ماضی قریب کی ڈیانا اور ہماری سیاست داں خوب صورتی دولت، طاقت سب ہی کچھ تھا، ان کے پاس لیکن اب کہاں ہیں؟ ہم مسلمان ہیں یہ بات یاد رکھیں۔ دائمی زندگی کو مدنظر رکھیں۔ ہماری آئیڈیل خاتون جنت سیدہ فاطمۃ الزہرہؓ امہات المومنینؓ حضور پاک کی دیگر صاحبزادیاں ہونی چاہئیں۔ وہ کیا کھاتی تھیں، کیا پہنتی تھیں، یہ جاننے کی کوشش کریں۔ اس پر عمل کریں تو آپ کا رب آپ کو ہمیشہ کی عیش و عشرت کی زندگی دنیاوی ملبوسات و زیورات سے بدرجہا بہتر اشیا اور انتہائی محبت کرنے والے شوہروں کی جنت کی خوب صورت ترین حور سے زیادہ حسن کی مالک ایسی بیوی بنا دے گا جہاں آپ کے دل حقیقی سکون سے مالا مال ہوں گے۔ ایک بار مزید آپ سب بہنوں سے التماس ہے بلکہ جہاں تک ممکن ہو اپنے اردگرد کے لوگوں کو بھی بتائیں کہ خدارا شادی، طلاق کو مذاق یا جھگڑے میں بطور ہتھیار استعمال نہ کریں۔ پچھلے دنوں ایک شعلہ بیان نو آموز سیاستدان اپنے کسی عمل کی صفائی پیش کرتے ہوئے بار، بار کہہ رہے تھے اگر ایسا ہو تو میری دونوں بیویوں کو طلاق، استغفراللہ بیچاری بیویوں کا کیا قصور، آپ کے بچوں کا کیا گناہ، جو بھی مسئلہ ہے، اسے حل کرنے کا اور کوئی طریقہ نہیں رہ گیا تھا۔ پچھلے دنوں ہی پڑھ رہی تھی کہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰؓ نے کہا میں نے اس مسجد نبویؐ میں حضرت محمدؐ کے ایک سو بیس صحابہ کرامؓ کو دیکھا...... ان میں سے جس سے بھی کوئی حدیث یا فتویٰ پوچھا جاتا اس کا دل یہی چاہتا کہ دوسرا بھائی جواب دے دے لیکن اب معاملہ ان لوگوں کی جرأت تک آپہنچا ہے جو ایسے مسائل میں جری ہو جاتے ہیں۔ اگر وہی مسائل عمر بن خطابؓ کو پیش آئے تو اہلِ بدر کو اکٹھا کر کے ان سے مشورہ لیتے۔" یہ پڑھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ہماری قوم کے مرد و زن کا شعار کیا ہے؟ جسمانی بیماری ہو گی تو کسی ماہر ڈاکٹر کے پاس جائیں گے، قانونی مشورہ بہترین وکیل سے کریں گے لیکن دین کو سمجھنے جاننے کی کوشش ہی نہیں کریں گے۔ جس کو دیکھیں وہی فتویٰ دینے کو تیار بیٹھا ہے اور یہ غلطی پوچھنے والے کی ہے جو ایک ٹی وی اینکر یا کسی بھی عام فرد سے پوچھتا ہے، اول تو پوچھنے کی بھی زحمت نہیں کی جاتی...... پیدائشی مسلمان ہیں تو اپنی ہی مرضی کا اسلام چاہتے ہیں۔ اللہ کریم آپ سب کا حامی و ناصر ہو والسلام......" (عطیہ بہن، آپ کی رائے سے میں سو فی صد متفق ہوں)

☙ اختر شجاعت، کراچی سے۔ "کسی بھی میگزین یا ڈائجسٹ کا سب سے اہم اس کا اداریہ ہوتا ہے میں سب سے پہلے

ادار یہ ہی پڑھتی ہوں بلاشبہ تمہارا اداریہ ہمیشہ اپنے اندر بے حد مثبت نصیحتیں لیے ہوتا ہے کہ سادگی سے کہی ہوئی باتیں دل میں اتر جاتی ہیں...... آج کل فیملی ہی میں ایک دوسرے کے لیے وقت نہیں یہ بھی آج کا ایک المیہ ہے، ذکیہ آپا کی یادوں کی مالا پڑھ کر دل و دماغ روحانی دنیا میں کھو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت و تندرستی عطا فرمائے...... آمین۔ عظمیٰ آفاق لکھنے کی دنیا میں ایک بے حد خوب صورت اضافہ ہے۔ اس کے شوخ و برجستہ جملے اس کی خوب صورت شخصیت کا خاصہ ہیں...... ماشاء اللہ! تمہاری بیٹی تمہارا فخر ہے...... اللہ ہمیشہ خوش رکھے...... آمین۔ شائستہ زریں کے...... سروے ہمیشہ ہی بہترین ہوتے ہیں...... اپنی پسندیدہ رائٹر زرخ چوہدری، یسما یاسمین مجتبیٰ اور افسر سلطانہ کے انٹرویوز پڑھ کر دل خوش ہو گیا...... نزہت بہترین بزم سجا رہی ہیں۔'' (شکریہ) اب آتی ہوں اپنے پسندیدہ ترین سلسلے یعنی بہنوں کی محفل کی طرف جو بالکل ایک فیملی ڈسکشن ہے۔ جہاں ایک دوسرے کے دکھ سکھ معلوم ہوتے ہیں۔ بے حد لکی ہو اتنی ڈھیروں بہنوں کی محبتیں تمہیں حاصل ہیں (ہاں یہ اللہ کا کرم ہے) اپنے لیے بہنوں کے تبصرے پڑھ کر دل خوش ہونے کے ساتھ بوجھل بھی ہو جاتا ہے۔ اللہ مجھے اچھا بنا دے۔ بہر حال ان کے تبصروں سے بہت حوصلہ ملتا ہے باقی روحانی مشورے، دین کی باتیں، جلترنگ اور دوسرے سلسلے بھی بہت اچھے ہیں۔'' (شکریہ اور اختر تم حقیقت میں بے حد نفیس قسم کی لڑکی ہو میں تم کو اس وقت سے جانتی ہوں جب تمہاری شادی بھی نہیں ہوئی تھی)

☆ مہناز عارف، آزاد کشمیر سے۔ ''میں پہلی مرتبہ کسی ماہنامے کے لیے ہدیۂ سلام لکھ کر بھیج رہی ہوں۔ میں قوتِ سماعت سے محروم ہوں سنائی نہیں دیتا ہے مجھے...... میری یہ خواہش ہے کہ آپ اپنے ماہنامہ پاکیزہ میں میرا یہ ہدیۂ سلام بھی چھاپ دیں آپ کی عین نوازش ہوگی، میں کراچی کے ایک کالج میں بی اے پارٹ ون کی اسٹوڈنٹ تھی جب میری سماعت چلی گئی۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ماہنامہ کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے، آمین۔ اگر آپ اس کو چھاپیں تو مجھے ضرور جواب لکھ دیجیے گا۔'' (پیاری مہناز خوش آمدید...... تمہاری حوصلہ افزائی ضرور ہوگی اور ہر ماہ ہوا کرے گی۔ اب تم ہماری اس محفل کا حصہ ہو)

☆ نازیہ نزی، نوشہرہ کینٹ سے۔ ''میرا ایک مطالبہ ہے اگر آپ پورا کر سکیں تو وہ یہ ذکیہ بلگرامی کی روداد سے متاثر ہونے کے ساتھ، ساتھ ان کے لکھے قرآن کو دیکھنے کی چاہت ہے۔ کیا آپ قریب سے تصاویر لے کر شائع کر سکتے ہیں۔ (آخری قسط کے ساتھ لگا دیں گے) اور دوسرا عظمیٰ سے ملنے کو اور بات کرنے کو دل چاہتا ہے۔ یقیناً آپ لوگوں کے مداح بہت سے لوگ ہوں گے لیکن ان سے کیسے رابطہ کروں۔ (ارے بیٹا میں اور عظمیٰ بے حد عام سی خواتین ہیں تم کسی دن مجھے فون کر لو، میں عظمیٰ سے تمہاری بات کروا دوں گی اور کوئی حکم......)



☆ مسز خدیجہ جمیل، نیو کیمپس لاہور سے۔ ''چند ماہ قبل آپ نے پاکیزہ کے مستقل سلسلوں میں انعامات دینے کا اعلان کیا تھا۔ اور دیکھا یہ گیا ہے کہ انعامات کی وجہ سے مستقل سلسلوں کا معیار بلند ہوا ہے مگر آپ نے انعامات دینے کا وعدہ وفا نہیں کیا۔ بزم پاکیزہ میں تو انعامی سلسلہ موجود ہے مگر پاکیزہ ڈائری اور اشعار پر انعامات دینے میں قدرے کنجوسی کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے براہ کرم ادھر بھی یہ سلسلے بحال کر لیں۔'' (آپ بے فکر رہیں...... بہت جلد تمام مستقل سلسلوں میں انعامات ملیں گے اور بہت اچھے، اچھے انعامات ہوں گے)



☆ فرخندہ جعفری، گجرات سے۔ ''آپ کی تحریر گم شدہ محبت کی پہلی قسط پڑھی ماشاء اللہ بہت عمدہ تحریر ہے۔ اس میں آپ نے مختلف خاندانوں کی الگ، الگ عکاسی کی ہے۔ سب کی اپنی اپنی مشکلات، ماحول، امیری، غریبی، بے بسی، لالچ، غرض ہر چیز کو ساتھ، ساتھ لے کر چلی ہیں۔ دفتری ماحول میں کن، کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خاص کر ایک نوجوان لڑکی کو۔ ناہید سلطانہ اختر کا ناولٹ مکافات پڑھ کر دل بہت پریشان ہوا۔ ایک ہنستے بستے گھر کو ایک عورت نے اجاڑ دیا۔ ڈاکٹر کی مت ماری گئی تھی۔ اتنی محنت اور غربت کا سامنا کیا جب پرسکون گھر میسر ہوا پیارے، پیارے بچے ہوئے تو کسی کی پروا نہ کی آخر اپنے انجام کو تو پہنچنا تھا ناں...... فرحین اظفر کی ایک وعدہ ایک پیغام بہت اچھی تحریر ہے ساس، بہو کا جھگڑا اول دن سے ہے اگر ساس اچھی ہو تو بہو کو بھی اچھا ہونا پڑتا ہے اگر بہو اچھی ہو تو ساس کو بھی اچھا ہونا چاہیے۔ تمام کہانیاں، ناولٹ بہت ہی عمدہ طریقے سے ترتیب دیے گئے اچھی تحریریں دل پر حکومت کرتی ہیں......









میری طرف سے سب لکھنے والوں کو مبارک ہو۔'' (نوازش کرم، شکریہ، مہربانی)

✿ ماریہ جہانگیر، کبیر والہ سے۔''میں نے اس ماہ پہلی مرتبہ پاکیزہ ڈائجسٹ خریدا ہے اور مجھے اس کے سبھی سلسلے بہت اچھے لگے ہیں۔ اب باقاعدگی سے خریدا کروں گی۔ ویسے پاکیزہ ڈائجسٹ کس تاریخ کو مارکیٹ میں آتا ہے؟ مجھے اس میں شاعری کا سلسلہ بہت پسند آیا کیونکہ مجھے شاعری سے خصوصی لگاؤ ہے۔'' (خوش آمدید...... آپ کی حوصلہ افزائی ضرور ہوگی...... پاکیزہ کراچی میں تو ہر ماہ کی 20 تاریخ تک آجاتا ہے۔ کبیر والا پہنچنے میں دو تین دن اور لگ جاتے ہوں گے)

✿ ساجدہ ظفر، کمالیہ سے۔''فروری کا پاکیزہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ سرورق کی حسینہ تو شاید کسی پُرفضا صحت افزا سرد مقام پر برفباری کے منظر کو دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ یہ بھی غنیمت ہے ورنہ اب تو اتنی ٹینشن ہیں کہ لوگ مسکراہٹوں کو ترس گئے ہیں۔ مجھے کچھ کہنا ہے میں آپ کی مفید اور کارآمد باتوں سے استفادہ کر کے اگلے حصے میں پہنچی...... تو بہنوں کے خوب صورت افسانے نظر آئے۔ فی الحال فاطمہ خان کا سمجھوتا، فرح طاہر قریشی کی بے بسی اور ہاجرہ ریحان کی بہشتی افسانے پڑھ سکی ہوں جو ہر لحاظ سے بہترین نظر آئے۔ شمع ہدایت میں اختر شجاعت صاحبہ ہر ماہ نہایت عرق ریزی سے اسلامی معلومات پر مشتمل مضمون پیش کرتی ہیں۔ موجودہ شمارے میں نماز کے متعلق ان کا مضمون نہایت ہی معلوماتی اور ایمان افروز تھا۔ البتہ ایک بات کی کچھ تصحیح کرنا چاہوں گی کہ انہوں نے قرآن حکیم کے حوالے سے سو سے زائد مقامات پر نماز کے حکم کا تحریر کیا ہے جبکہ میری ناقص معلومات کے مطابق قرآن مجید میں سات سو بار نماز کا حکم آیا ہے۔ باتیں بہار خزاں کی...... میں رائٹر بہنوں کے خیالات بے حد پسند آئے۔ شکار پور کے متعلق نور افشاں کا اپنے شہر سے متعلق تعارف پسند آیا۔ مگر انہوں نے اس نام کی وجہ تسمیہ کے بارے میں وضاحت نہیں کی۔ آپ سے گزارش ہے کہ اس سلسلے کو جاری رکھیں اور اگر میں اپنے شہر کمالیہ کا تعارف لکھ کر ارسال کروں تو کیا شائع ہو سکتا ہے۔ ہمارے شہر میں کوئی قدیم تاریخی عمارت نہیں ہے۔ (جی ہاں کوئی بات نہیں) جلترنگ میں سرخرو میں ٹیچر بہنوں کا اسکول کا شیڈول بہت دلچسپ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ البتہ محتاط میں رشید بھائی تو بہت ہی بھولے میاں ثابت ہوتے۔ ہاں آپی! یہ آپ کو آسٹریلیا ان دنوں جانے کی کیوں سوجھی جبکہ پاکستان میں موسم سرد ہے اور آسٹریلیا میں موسم گرم ہے۔ گرمی کیا پاکستان میں کم پڑتی ہے کہ گرمی کا مزہ لینے آسٹریلیا کو سدھاریں اب باقی دیگر بہنوں کے ساتھ میں بھی ضرور فرمائش کروں گی کہ آپ آسٹریلیا کا تفصیلی سفرنامہ پاکیزہ کی زینت ضرور بنائیے گا۔'' (گڑیا میں نے وہاں گرمی میں بھی سردی اور برسات کے مزے لیے ہاں تبصرے کا شکریہ)

✿ امینہ عندلیب، سلانوالی سے۔''نزہت اصغر نے اس سال بہت سے انٹرویوز کیے بہت اچھے انٹرویوز رہے۔ تفصیل کے ساتھ کہیں بھی تشنگی نہ رہی۔ اور شائستہ زریں کے سروے بھی یادگار رہے۔ باجی انجم انصاری کیا بات ہے! جلترنگ ہنستی مسکراتی تحریروں میں اصلاحی پیغام دیتی ہیں۔ ہر شعبہ پر بڑی کڑی نظر رکھتی ہیں۔ ماشاء اللہ جب بھی لکھتی ہیں اتنا چ کھرا، مجھے ہنسی آتی ہے باجی قلم ہولا رکھیں ہاہاہا...... پاکیزہ شمارہ میں آنٹی ذکیہ بلگرامی، آپی اختر شجاعت کا ذکر نہ ہو یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ آنٹی ذکیہ بلگرامی کے روحانی سفر سے میں نے بہت، بہت کچھ سیکھا۔ اور مجھے بہت کچھ ملا۔ پڑھتے، پڑھتے آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ ویری گڈ آنٹی ان کی زندگی میں ہر موڑ پر ان تھک محنت، اعلیٰ کارکردگی، گھریلو ذمے داریاں، یہ سب کچھ کیسے نبھایا ماشاء اللہ قرآن پاک لکھے۔ ان کی باتوں میں نہ کہیں غرور و تکبر، نہ کوئی گلہ، شکوہ کتنی صابر...... اللہ پر بھروسا کرنے والی محترم آنٹی کو دلی سلام، صحت یابی کے لیے میرے لبوں پر دعائیں ہیں۔ باجی اختر شجاعت نے ہر موضوع پر اتنی پیاری معلومات ہمیں دی اپنی خامیوں کا احساس ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔ میں جو کچھ بھی پڑھتی ہوں تو میں دوسرے لوگوں تک ضرور پہنچاتی ہوں۔'' (گڑیا باجی کا ذکر چھوڑو...... ہاں اتنا تفصیلی خط لکھنے پر تھکن تو نہیں ہوئی)

✿ ظل شاہین، ڈی جی خان سے۔''مستقل سلسلے پاکیزہ کو بلندیوں کے مقام پر پہنچانے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ شمع ہدایت، محترمہ اختر شجاعت بہت اچھا ترتیب دے رہی ہیں۔ اور اس بار نماز کے بارے میں بہت اچھا اور معلوماتی مضمون ہے۔ نماز کی قضا اور دیر سے نماز ادا کرنے پر جو گناہ ہے پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے مجھ سے ظہر کی نماز میں کبھی

کبھار دیر ہو جاتی تھی مگر اب میں فوراً ادا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، آمین۔ شائستہ زریں نے شیف گلزار کا انٹرویو اچھا لیا ہے۔ پاکیزہ ڈائری عظمیٰ آفاق بہت محنت سے سجاتی ہیں اس بار میری نظم بھی شامل تھی جس کے لیے آپ کا اور عظمیٰ کا بہت، بہت شکریہ...... ذکیہ آنٹی کی نعت اینہ عندلیب کے مراسلات اچھے تھے۔ بزم پاکیزہ میں انعام یافتہ سوال کے جواب پڑھ کر میں سوچتی ہوں کہ آپ کے جوابات کو انعام یافتہ ہونا چاہیے۔ عام سے سوال کا جواب آپ اس قدر خوب صورت، دلچسپ دیتی ہیں کہ لبوں پر خود بخود مسکراہٹ آجاتی ہے۔ اور میں اپنی امی اور چھوٹی بہن کو بھی پھر پڑھواتی ہوں جو آپ کے ذہن کی داد دیتی ہیں (ماشاء اللہ) اللہ آپ کو سلامت رکھے، آمین۔ روحانی مشوروں میں سورہ فاتحہ کے فضائل بہترین ہیں۔ جلترنگ کا دوسرا خاکہ محتاط، دلچسپ لگا۔'' (بے حد شکریہ آپ کا بھی اور آپ کی امی کا بھی)

☜ سلمیٰ غزل، کراچی سے۔ ''اس مرتبہ غیر معمولی طور پر ہاکر نے مارچ کا پاکیزہ 20 فروری کو لان میں ڈال کر حیران بھی کیا اور خوش بھی مگر گونا گوں مصروفیات کی وجہ سے میں پورا پڑھ نہیں سکی البتہ اپنے پسندیدہ کالم ضرور پڑھے اور پڑھے بغیر تبصرہ کیا کروں حالانکہ دل بہت چاہتا ہے۔ ذکیہ بلگرامی صاحبہ کی یادوں کی مالا کے بارے میں تعریف کرنے کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ ان کی انکساری، عاجزی، بصیرت اور قابلیت کس، کس چیز کی تعریف کی جائے بس دعا کرتی ہوں کہ خدا مجھ میں بھی ان جیسا عزم، حوصلہ اور ہمت دے دے اور اتنی زیادہ عبادت کرنے کی توفیق بھی کہ وہ دین اور دنیا دونوں کو ساتھ لے کر چل رہی ہیں۔ بہنوں کی محفل پڑھ کر بے حد مزہ آتا ہے میں صرف اپنا نہیں بلکہ تمام بہنوں کے خطوط پڑھتی ہوں اور آپ کا جواب بھی لاجواب...... پھر نمبر آتا ہے گم شدہ محبت کا سادہ پلاٹ، سیدھے سادے روزمرہ استعمال میں ہونے والے جملے اور محاورے شہلا کو اس کے غرور پر سبق ملنے والا ہے۔ شمع ہدایت بھی ایمان افروز اور دل کو چھو لینے والا کالم ہے۔ اختر شجاعت کا جواب نہیں...... افسر سلطانہ کا انٹرویو بھی زبردست، خوشی ہوتی ہے کہ ہماری خواتین بھی کسی سے کم نہیں۔'' (بالکل)

پیاری بہنو! پاکیزہ کا مئی کا شمارہ سالگرہ نمبر 02 ہوگا...... اس ماہ سالگرہ کے حوالے سے جو تحریریں بچ گئی ہیں وہ آئندہ شمارے میں شامل ہو جائیں گی۔ اس سے قبل کہ میں آپ کو اللہ حافظ کہوں...... آیئے ہمیشہ کی طرح پہلے دعا مانگتے ہیں یا اللہ، یا رحمٰن، یا رحیم، یا کریم، یا اول و آخر، یا ظاہر و باطن، یا حی یا قیوم، یا رب العالمین، یا وحدہ لاشریک میرے جسم کو شفا اور دل کو اپنی ذات کا یقین کامل اور آنکھوں کو نور بصیرت عطا فرما اور جب تک میں زندہ رہوں اپنے ذکر کو صبح شام میری زبان پر جاری فرما دے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ ملتا ہی رہے...... اے پاک پروردگار مجھ سے میری اولاد سے اور میرے تمام عزیز و اقارب سے ہمیشہ ہمیشہ راضی رہنا...... اور ہر گناہ، ہر غلطی اور ہر کوتاہی کو معاف کرنا اور ہمارے عیبوں کی پردہ پوشی کرنا، اپنی نظر میں چھوٹا مگر دوسروں کی نظر میں بڑا بنا دینا اور دونوں جہاں میں مجھے خیر عطا کرنا...... بے شک تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے اور تیری ثنا سب سے بڑی اور تیری پناہ عزت والی ہے اس لیے صرف اپنا محتاج کرنا اور ہمیشہ ہمیشہ اپنی شان کے حساب سے ہم سب پر اپنا رحم، کرم اور فضل عطا کرنا اور ازل سے ابد تک سب کو معاف کرنا کہ بے شک میرا رب ہر چیز پر قادر ہے اور میرا رب برکت و بلندی والا ہے۔

یا مجیبُ یا مجیبُ یا مجیب

نوٹ: ایک بار آخر میں درودِ ابراہیمی پڑھ لیں۔

آپ کی اپنی باجی
انجم انصار



پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.c فیز III ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500
فون نمبر 021-35802552 ,021-35386783 , 021-35804200
EXT 107,118



حمد باری تعالیٰ

الٰہی تیری چوکھٹ پر بھکارن بن کے آئی ہوں
نہ جھولی ہے نہ پیالہ ہے میں خالی ہاتھ آئی ہوں
بہت ہیں چھید جھولی میں اسے میں لا کے کیا کرتی
تمناؤں کی اِک دنیا بسا کر ساتھ لائی ہوں
مری حالت ہے کیا تو دیکھتا ہے جانتا ہے سب
مری آنکھوں میں آنسو ہیں، میں ننگے پاؤں آئی ہوں
مرے دل میں فقط تو ہے مری نظروں میں تو ہی تو
نہیں حاجت ہے دنیا کی میں سب سے چھپ کے آئی ہوں
تیری رحمت ملے مجھ کو یہ دل آباد ہوجائے
یہی دل میں تمنا لے کے تیرے پاس آئی ہوں
تجھے میں یاد کرتی ہوں، تیرا میں ذکر کرتی ہوں
مجھے تیری ضرورت ہے میں تیرے پاس آئی ہوں
فقیری کی جو دولت تو نے بخشی سب سے اعلیٰ ہے
میں شکرانے کے آنسو اور سجدے لے کے آئی ہوں
مجھے تو بخش دے یارب یہی ہے آرزو میری
یقیں کی رہگزر پر چل کے تیرے پاس آئی ہوں

کلام......ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی، کراچی

نعتِ رسول مقبولؐ

جا زندگی مدینے سے جھونکے ہوا کے لا
شاید حضورؐ ہم سے خفا ہیں منا کے لا
کچھ ہم بھی اپنا چہرۂ باطن سنوار لیں
ابوبکر صدیقؓ سے کچھ آئینے عشق و وفا کے لا
دنیا بہت ہی تنگ مسلماں پہ ہوگئی
عمر فاروقؓ کے زمانے کے نقشے اٹھا کے لا
محروم کردیا ہمیں جس نگاہ نے
عثمان غنیؓ سے وہ زاویے حیا کے لا
مغرب میں مارا، مارا نہ پھر اے گدائے علم
دروازۂ علیؓ سے یہ خیرات جا کے لا
باطل سے ڈر رہی ہے پھر امت رسولؐ کی
منظر ذرا حسینؓ سے کچھ کربلا کے لا
درکار ہے دعا میں اگر تجھ کو عاجزی
تو زین العابدینؒ سے کچھ فقرے دعا کے لا
کرنا ہے اپنے آپ کو تو آراستہ اگر
کردار اپنے سامنے سب اولیاؒ کے لا

مرسلہ: نوشین ساجد، سرگودھا

فرمانِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

☆حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”جب آدمی اپنے (مسلمان) بھائی کو ”اے کافر“ کہے تو وہ دو باتوں میں سے کسی ایک طرف لوٹتا ہے اگر وہ (واقعی) ایسا ہوا جیسا کہ اس نے کہا تو (درست) ورنہ وہ کفر اس کی طرف لوٹ کر آئے گا۔“ (بخاری مسلم)

نوٹ: اس حدیث میں بلاوجہ کسی مسلمان کو کافر کہنے کی سخت ممانعت کی گئی ہے کیونکہ اس میں جو کفر میں نہ پائے گئے تو کہنے والا کافر کہلائے گا۔

مرسلہ: سنبل اعوان ملک، لاہور

پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا

سیدنا ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے کہا۔ ”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے کچھ رشتے دار ہیں۔ میں ان پر احسان کرتا ہوں اور وہ برائی کرتے ہیں۔ میں ناتا ملاتا ہوں اور وہ توڑ دیتے ہیں جو میں صلہ رحمی کرتا ہوں اور وہ جہالت کرتے ہیں۔“ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”اگر حقیقت میں تو ایسا ہی کرتا ہے تو ان کے منہ پر

جلتی راکھ ڈالتا ہے اور ہمیشہ اللہ کی طرف سے تیرے ساتھ ایک فرشتہ رہے گا جو تجھے ان پر غالب رکھے گا، جب تک تو اس حالت میں رہے گا۔" (صحیح مسلم)

مرسلہ: صبا نور، لیہ

سنہری بات

ایک مسجد کے دروازے پر ایک خوب صورت جملہ لکھا ہوا تھا کہ "اللہ کے پاس آپ کو دینے کے لیے بہت کچھ ہے۔"

"کیا آپ کے پاس مانگنے کے لیے کچھ وقت ہے۔"

از: ایمان چوہدری، پنجاب

سالگرہ کا تحفہ

تحفہ بھیجا ہے میری سالگرہ پر اس نے
ایک کنگن جو کلائی میں کھنکتا ہی نہیں
میرے اندر کی خاموشی کا اثر ہے اس پر
اس کی آواز کہیں کھو گئی ہے
مجھ سے لگ کر
اس سے پہلے بہتر تھا کہ پہلے مجھے زندہ کرتا
پھر وہ احساس میری سالگرہ کا کرتا
اس میں ہیرے ہیں مگر تاب و تواں سے خالی
یہ زبانیں ہیں مگر حسنِ بیاں سے خالی
یہ ستارے ہیں مگر راہ بتاتے ہی نہیں
یہ سفینے ہیں مگر پار لگاتے ہی نہیں
اس کو پہنوں تو یہ لگتا ہے کلائی بھی گئی
اتنی چپ ہوں کہ میری تلخ نوائی بھی گئی
اس نے کنگن کا یہ تحفہ مجھے کیونکر بھیجا
ایک پتھر کی طرف دوسرا پتھر بھیجا
میں بھی کہہ سکتی کہ بدلا ہے مقدر اس نے
تحفہ بھیجا ہے میری سالگرہ پر اس نے

شاعرہ: ریحانہ قمر

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

کامیاب لوگ

سب انسان مردہ ہیں، زندہ وہ ہیں جو علم والے ہیں۔ سب علم والے سوئے ہوئے ہیں، جاگ وہ رہے ہیں جو عمل والے ہیں، سب عمل والے نقصان میں ہیں، فائدے میں وہ ہیں جو پُرخلوص ہیں، سب خلوص والے خطرے میں ہیں، کامیاب وہ ہیں جو تکبر سے پاک ہیں۔

از: ساجدہ ظفر، کمالیہ

سالگرہ اور تم

زندگی اپنی کہا کرتے ہو تم
مجھ سے ملنے کی دعا کرتے ہو تم
سب کرتے ہیں گلہ مجھ سے یہی
میری باتیں ہی کیا کرتے ہو تم
دل دھڑک جاتا ہے میرا زور سے
راستے میں جب ملا کرتے ہو تم
تیرا میٹھا لہجہ مجھ کو یاد ہے
دل کے ایواں میں رہا کرتے ہو تم
مجھ سے ہی الفت رہے گی تاحیات
یہ اشاروں میں کہا کرتے ہو تم
اس لگن کو جان نہ پائے کوئی
دل جلاتے ہو، خفا کرتے ہو تم
یہ حقیقت بھی تمہاری خوب ہے
دوسروں سے بھی ملا کرتے ہو تم
تم کس پر مہرباں ہو آج کل
سالگرہ کس کی کیا کرتے ہو تم
شگفتہ ہنستی ہے تب دل کھول کر
جھوٹ جب اس کو لکھا کرتے ہو تم

شاعرہ: شگفتہ شفیق، کراچی

غزل اہلِ پاکیزہ کے نام

پاکیزہ کے کچھ لوگ ہوتے ہیں خاص بہت
دل میں ہوتے ہیں ان کے جذبات بہت
اکثر چھوٹی سی بات پر روٹھ جاتے ہیں
یہ لوگ ہوتے ہیں نازک مزاج بہت
ان کے اندر بھی کچھ دکھ سر اٹھاتے ہیں
یہ خود کو کرتے ہیں ظاہر خوش باش بہت

مانا کہ سیرت و صورت کے اچھے ہیں
ان کو باتوں میں بھی حاصل ہے کمال بہت
مری دعا ہے خدا پاکیزہ والوں کے مقدر ہر نعمت کردے
یہ ربِ پاک کا ہوگا مجھ پر احسان بہت
از: لائبہ کائنات، لاہور

بجلی

سائنس دانوں نے کڑی محنت کے بعد یہ پتا کیا ہے اگر عورت کی چلتی ہوئی زبان سے بجلی پیدا کرنے کا کوئی طریقہ نکل آئے تو دنیا میں 24 گھنٹے بجلی سپلائی ہوسکتی ہے اور جب بھی کبھی وولٹیج کم ہوجائے تو میکے والوں کی تھوڑی سی برائی کردی جائے۔ مطلب کبھی اے سی، فریج وغیرہ چلانا ہو تو......

از: نور افشاں شیخ، شکار پور

جنم دن مبارک ہو

آج تمہارا جنم دن ہے
تمہیں یہ حسین و خوب صورت دن مبارک ہو
تم مجھ سے قریب ہو اتنے قریب کہ میں تم کو چھو سکتی ہوں
میرے تصورات کی حسین وادی میں
میرے تخیلات کی خوب صورت پگڈنڈی پر
صرف اور صرف تم ہی ہو
دیکھو جاناں!
تمہیں تو خبر ہے میں تمہیں تمہارے جنم دن پر
ہمیشہ دعائیں دیتی ہوں
کیونکہ میرے پاس قیمتی حسین تحفے نہیں ہیں
شاعرہ: مسز نگہت غفار، کراچی

میرا محبوب

جس کے تصور سے دل دھڑکے
جس کی جدائی سے آنکھوں میں آنسو آئیں
جو دعا بن کے ہتھیلیوں میں آجائے
جس کی جدائی سہی نہ جائے
جس کے دم سے زندگی میں امنگیں ہوں
جو زندگی میں بہار بن کے آجائے

وہی تو ہے جو دل کا مہمان ہے
میری جند ہے، میری جان ہے
ہاں پاکیزہ ہی تو میری آن ہے
شاعرہ: رعنا جبین ورجینا، امریکا

پیار کرنا ہے

بس اب گلہ نہیں کرنا پیار کرنا ہے
کسی گلاب بدن کا سنگھار کرنا ہے
ہزار بار اٹھائیں تیرے سامنے سر
جو تو نے کہہ دیا بس انتظار کرنا ہے
وہ آئے یا نہ آئے سرِ شام فریؔ
دیے جلائے ہیں بس انتظار کرنا ہے
شاعرہ: فریدہ جاوید فریؔ، لاہور

حب الوطنی

ایتھنز کے لوگوں اور حکمرانوں کو سقراط کی باتیں اور اس کا وتیرہ پسند نہیں آیا تو انہوں نے سقراط کے لیے جلا وطنی یا موت کا حکم دے دیا۔ سقراط کے شاگرد اس کے سامنے دوزانو ہوئے اور کہنے لگے۔ ”ہمیں یہ جلا وطنی منظور ہے، آپ بھی اس کے لیے آمادہ ہوجائیں۔“

مگر سقراط ہنسا اور کہنے لگا۔ ”میرے بیٹو! موت ہر جگہ تعاقب میں رہے گی اور کوئی نہ کوئی دن زندگی کے لیے آخری ٹھہرے گا لیکن ہر جگہ اپنا وطن نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح اپنے وطن کی زمین پر ایڑیاں رگڑ، رگڑ کر مرجاؤ جس طرح ضدی بچے ماؤں کی گود میں چھپے رہتے ہیں اور پھر تھک کر سوجاتے ہیں۔“

از: لاریب، ماہ زیب، چونیاں

قصۂ عشق

قصہ عشق میرا عام نہ ہونے پائے
وہ بھرے شہر میں بد نام نہ ہونے پائے
اِک میرا دل کہ تیرا ذکر صبح شام کرے
اِک تیرا دل کہ میرے نام نہ ہونے پائے
ہم چراغوں کی طرح شب بھر ہیں سلگتے لیکن
پھر بھی کہتے ہیں ختم شام نہ ہونے پائے

تم ملے ہوتو عجب خواہش ہے اٹھتی دل میں
زندگی کا کبھی انجام نہ ہونے پائے
مجھ کو چھوڑو بڑے شوق سے لیکن دیکھو
تذکرہ اس کا سرِعام نہ ہونے پائے
وہ تو ہیں ساری خطاؤں سے مبرا لیکن
میرے سر بھی کوئی الزام نہ ہونے پائے

از: ماریہ جہانگیر، مرالی، کبیروالہ

اس ماہ کی انعام یافتہ تحریر

توشہ خاص

اکٹھے ہوکر کھاؤ
الگ الگ نہ کھاؤ، کیوں...
کہ برکت جماعت کے ساتھ ہے۔

مرسلہ: فردوس شاہی، لاڑکانہ

ہیپی برتھ ڈے

کیسے گزرتے ہیں یہ
جدائیوں کے موسم
نہ پوچھ دل بے قراں سے
آج پھر 6 اپریل ہے
دل چاہتا ہے کہ اس بار
کچھ الگ سا ہو جائے
وہ آئے اور
اک سرخ گلاب دے کر کہے
ہیپی برتھ ڈے
مگر انجان راہوں کے مسافر
کب لوٹتے ہیں
وہ جو ایک بار گئے تو
پھر لوٹ کر نہ آئے
اپنے دل کو خود ہی تسلی دیتے ہیں
اور خود ہی کہتے ہیں
ہیپی برتھ ڈے ٹومی

شاعرہ: گلشاد نذیر، مری

خوشی

زندگی کا مقصد خوش رہنا نہیں بلکہ دوسروں کے کام آنا ہے دوسروں کے ساتھ اخلاق کے ساتھ پیش آنا ہے اور ان کے دکھ درد کو محسوس کرنا ہے۔ اگر آپ ایسا نہیں کر رہے تو پھر آپ کی خوشی مصنوعی ہے۔

از: مسز خدیجہ جمیل، نیو کیمپس لاہور

غزل

یہ صحرا میں کوئی شجر مانگتی ہے
محبت تو ایسا ہنر مانگتی ہے
رہے دور تیرہ شبی سے ہمیشہ
میری زندگی وہ سحر مانگتی ہے
یہ دنیا ہے دنیا جو مجھ سے ہمیشہ
تروتازہ کوئی خبر مانگتی ہے
بدل جاتی ہے دل کی دنیا دعا سے
جو آئے نظر وہ اثر مانگتی ہے
سکوں جس سے قلب و نظر کو ملے کچھ
میری زندگی ایسا گھر مانگتی ہے
سلیقے طریقے نہ آئے کنول کو
دعائیں ہمیشہ مگر مانگتی ہے

شاعرہ: یاسمین کنول، پسرور

ہائیکو

گہری اداسی چھائی ہے
اور مجھے بھی، سالوں بعد
پھر یاد تمہاری آئی ہے

شاعرہ: رابعہ عمران چوہدری، رحیم یار خان

خاموشی

اگر ہم زبان کی پھیلائی ہوئی مصیبتوں کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ خاموشی میں کتنی راحت ہے، زیادہ بولنے والا انسان مجبور ہو جاتا ہے کہ سچ اور جھوٹ کو ملا کر بولے۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ سوچ سکے کہ کیا کہنا ہے اور کیا نہیں......

از، ایمن رانی، ٹوبہ ٹیک سنگھ

☆☆☆



پاگل کون نہیں

پرانی فلموں میں ایک خوبی یہ ہوتی تھی کہ آخری سین میں لائن سے کھڑے فنکاروں کی شادیاں ہوا کرتی تھیں کوئی فلمی نانا، نانی یا دادا، دادی اپنے دبنگ لہجے میں ہیرو کی ہیروئن سے، ہیرو کے دوست کی ہیروئن کی سہیلی سے اور نوکر کی نوکرانی سے شادی کا فیصلہ کر دیتے تھے (پرانی بلیک اینڈ وائٹ فلموں میں دوست اور سہیلی کا کردار لازمی ہوا کرتا تھا جسے ہیرو، ہیروئن کے دل کی ہر بات کی خبر پہلے سے ہی ہوا کرتی تھی) ان شادیوں کی ایک وجہ یہ ہوتی تھی کہ فلم بین دل میں بوجھ لے کر نہ اٹھیں اور جس طرح ہنستے ہوئے آئے تھے اسی طرح اپنے گھر جائیں۔ (آج کل تو فلم بینوں کا کوئی خیال ہی نہیں رکھتا آہ)

اسی طرح ان فلموں میں پاگل خانے کا ایک سین ضرور ہوتا تھا۔ آج کی نئی فلموں میں یہ سین نہیں ہوتا تو شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اب لوگ اپنے، اپنے پاگلوں کو اپنے گھر میں رکھنا زیادہ پسند کرتے ہوں یا اب پاگل خانے اتنے ایڈوانس ہونے لگے ہوں کہ انہوں نے اپنے مریضوں کو آزاد چھوڑ رکھا ہو۔

ہاں بات ہو رہی تھی پاگلوں کے فلمی سین کی...... یہ لوگ اپنے، اپنے بال نوچتے ہوئے ہی ہی، ہاہا کرتے نظر آتے تھے۔ ذرا سی بات بھی اُن کی مرضی کے خلاف ہو جاتی تو مرنے مارنے پر تل جایا کرتے خیر آج بھی کسی کے مزاج کے خلاف بات ہو جائے تو اس کا اقدام بھی اسی نوعیت کا ہوتا ہے۔ پاگل باس کو پاگل کہنا بے حد مشکل ہوتا ہے اگر وہ کسی گرلز اسکول کی ہیڈ مسٹریس یا گرلز کالج کی پرنسپل ہوں تو اس سے زیادہ مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ ایسے اداروں میں اسٹاف ممبرز دو دھڑوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں ایک چمچی گروپ، دوسرا ناہنجار گروپ دوئم الذکر کا نام پرنسپل اور ان کی چمچیاں رکھتی ہیں۔

یہ خیر قطعی دوسری بات ہے کہ پاگل کسی بھی محاذ پر ہو انہیں پاگل کہنا انتہائی مشکل اور ناممکن ہوتا ہے۔ آج بھی کتنی دکھیاری عورتیں اپنے غم اپنے سینوں میں پال کر جوان کرتی ہیں مگر اُن کے لبوں پر ان کے شوہر، ان کے سسرال والوں کا نام نہیں آتا...... (ہمارا خیال ہے کہ پچھتر فیصد خواتین کا نام صابرہ ہونا چاہیے)

وقت جوں، جوں بیتا لفظ پاگل خانے نے خاطر خواہ ترقی کی فلموں میں جب ہیروئن اپنے ہیرو کی محبت پر ایمان لے آتی تھی سر شاری سے اس طرح اعتراف کرتی...... تم بھی بس پاگل ہو۔ وہ لفظ پاگل کو جس طرح محبت اور حیا آمیز لہجے میں ادا کرتی دیکھنے والے اپنے پاگل نہ ہونے پر تاسف محسوس کرتے۔

جوں، جوں وقت کی نزاکتیں اور قدریں بدلیں تو زیادہ محنت کرنے والوں کو پاگل کا خطاب دیا جانے لگا۔

نہیں بھئی اس دفتر میں کسی صورت نہ جانا وہاں کا باس تو پاگلوں کی طرح کام کرتا ہے اور کرواتا ہے۔

بے وقوف عورتیں ہر دور میں ان رہی ہیں۔ ذہین عورتیں کو مکار اور سفاک اور ان کی باتوں پر یقین کرنے والوں کو بھوندو (باؤلے) کا خطاب تو خیر عرصہ دراز سے دیا جا رہا ہے جن میاں بیوی میں ذہنی ہم آہنگی نظر آتی ہے اس گھرانے کے شوہر کو دبو، بے وقوف، زن مرید آخر میں پاگل بھی کہہ دیا جاتا ہے (دل کے پھپھولے اسی طرح پھوڑے جاتے ہیں ایسی باتیں کرنے سے اکثر لوگوں کے مزاج میں شگفتگی آ جاتی ہے) شگفتگی تو خیر انڈیا کی ان بڑی عمر کی اداکاراؤں کے چہرے پر بالکل بھی نظر نہیں آتی جو بچے گود لے کر اپنی مامتا کو تسکین بھی دے رہی ہیں اور بعض اپنے کرتوتوں پر ڈھکن رکھنے کی بھی کوشش کر رہی ہیں...... پاکستانی فلم انڈسٹری میں شادی کو ظاہر کرنا بدنامی کے پلڑے میں بیٹھنے کے برابر سمجھا جاتا ہے آج بھی کئی

اداکارائیں ایسی ہیں جو بچوں والیاں ہیں مگر وہ اپنے آپ کو لڑکی سمجھ کر ایسی خوش ہیں جیسے انہیں کوئی جھوٹا سمجھے گا ہی نہیں..... (صائمہ اور سید نور نے اپنی شادی چھپانے کے لیے ہزاروں نہیں تو سیکڑوں جھوٹ تو ضرور بولے ہوں گے) بچوں والی اداکارائیں یہ بھی سمجھتی ہیں کہ انہیں دیکھنے والے نہ صرف اندھے ہیں بلکہ وہ پاگل بھی ہیں اور ایسے پاگل جب پرانی فلموں میں شبنم مراد نہ بھیس بدل کر ہیرو اور اس کے گھر والوں کو بے وقوف بناتی ہیں تو تماش بین بچے بچے سے باجی پکار اٹھتا تھا مگر ہیرو قرآت بھرے لہجے میں انہیں خان صاحب کہہ کر مخاطب ہوتے تھے۔

ایک اخباری رپورٹ کے مطابق انڈیا میں اسکول کے کورس میں فلمی مکالمے شامل کیے جائیں گے اور رفتہ رفتہ فلمی گیت بھی نصاب کا حصہ بنیں گے اگر یہ پاگل پن نقالی کی صورت میں پاکستان میں بھی آگیا تو کیا یہ گیت کسی نصاب میں شامل ہو سکتے ہیں۔

کنڈی نہ کھڑکا سوہنیا سیدھا اندر آ

مینوں نوٹ وکھا میرا موڈ بنے (لاحول ولاقوۃ)

ہماری یہ تحقیق قطعی ذاتی ہے (جس سے آپ کا متفق ہونا ضروری ہے) جون، جولائی کے مہینے میں پاگلوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو پہلے پاگل نہیں ہوتے اس مہینے میں وہ بھی کوچہ پاگلاں میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اس کی پہلی وجہ تو بجٹ کی آمد ہوتی ہے جو کبھی عوام دوست نہیں ہوتا بلکہ عوام دشمن ہوتا ہے کسی شاعر نے یہ بالکل غلط کہا تھا۔

کیسی یہ جوانی آئی ہے، آگ لگے گی کہیں نہ کہیں

حالانکہ شاعر کو یہ کہنا چاہیے تھا۔

کیسا بجٹ آیا ہے، آگ لگے گی کہیں نہ کہیں

مہنگائی کی آگ نے لوگوں کا کیا حال کر دیا ہے۔ اس کا احساس ڈرائنگ رومز کے اے سی زدہ ماحول میں بیٹھنے والے سیاست دان نہیں کر سکتے۔ کراچی میں اگر دہی اڑتالیس روپے کلو مل رہا ہے تو ان کے ٹھینگے سے ان کے لیے تو اب بھی یہ بہت سستا ہے۔ ایک ڈالر سے بھی کم کا ہے اس سے زیادہ وہ عوام کو کیا ریلیف دیں گے یوں بھی موبائل کو غذا، پانی اور بجلی سے سستا کر کے عوام کو... بے وقوف تو بنا ہی دیا گیا ہے۔ اگر وہ پاگل بھی ہو رہے ہیں تو ہوتے رہیں ویسے بھی پاگلوں کی کمی تو نہیں ہوتی، ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔

گھریلو ماحول میں لفظ پاگل بڑی شان اور آب و تاب کے ساتھ ماضی میں بھی موجود تھا، حال میں بھی ہے اور مستقبل میں بھی رہے گا مختصر یہ کہ اس طرح کی باتیں کانوں میں ہمیشہ کسی کے لیے رس اور کسی کے لیے زہر گھولتی رہیں گی۔

ارے بھئی یہ سلمیٰ بیگم میں بڑا گر ہے پتا نہیں اپنے میاں کو کیا گھول کر پلایا ہے، وہ ان کے پیچھے پاگل بنے پھرتے ہیں۔

وہ جو بات بھی کہہ دیں اچھا جی بالکل' ارے واقعی یا تم نے تو میرے منہ کی بات چھین لی ہے۔ جیسے جملے بولتے ہیں۔ ایک ہمارے میاں ہیں مجال ہے کہ کبھی ہماری صحیح بات پر بھی ہنکارا بھر دیں۔ اپنے آپ کو بے شک فنا کر دو مگر وہ ہونٹوں پر ایلفی لگا کر بیٹھے رہیں گے۔

پاگل شوہر تو قسمت والوں کو ملتے ہیں، ایک محفل میں ایک صاحب نے ایسی حسرت سے بلک کر کہا کہ ہمارا دل چاہا کہ اس بیچاری کے پڑھے لکھے، سلجھاؤ اور قرینے والے شوہر کے سر پر ایک ڈھیلا مار کر ثواب حاصل کر لیں۔

پھر میڈیا کا دور آگیا چینلوں کی بھرمار ہو گئی اور قیامت آنے کی ایک واضح نشانی نظر بھی آگئی اور سمجھ میں بھی آگئی کہ قیامت آنے سے پہلے گھر، گھر سے ناچ اور گانے کی آوازیں آئیں گی مگر ہم سب نے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیا کہ گھر میں بیٹھ کر ٹی وی سے بھی لطف اندوز نہ ہوں پاگل تھوڑی ناں ہیں؟

پہلے بچے بگڑے ایسے بگڑے کہ ماؤں کو پاگل بنا دیا، نہ ماں کی آنکھ پہچانتے ہیں نہ ڈانٹ، جوریں، ریں شروع ہوتی ہے تو ختم ہونے میں نہیں آتی۔ آج کے چھوٹے، چھوٹے بچے بھی اپنے والدین سے نہیں ڈرتے بلکہ اپنی چلاتے ہیں جو چیز انہیں چاہیے وہ تو ہر صورت میں چاہیے۔ یہی حال بڑے بچوں کا ہے انہیں پڑھنے کا کہو تو تنگ کرتے ہیں۔ امی میں آپ کے کہنے سے نہیں پڑھ سکتا اگر ہر وقت پڑھتا رہا تو پاگل ہو جاؤں گا۔

اررے یسی بیٹی، یہ تم کس قسم کا لباس پہن کر کالج جارہی ہو اگر کوئی ماں ہمت کرکے بیٹی کو ٹوک دے تو اسے منہ کی کھانی پڑتی ہے۔ امی اگر میں آپ کی پسند کا لباس پہننے لگوں تو کوئی مجھے نظر اٹھا کر نہ دیکھے...... پاگل سی لگوں گی بالکل خبطی سی ہاں۔

معاشرتی اقدار کی ٹوٹ پھوٹ نے شریف اور نیک آدمی کو پاگل کا نام دیا ہے اور چالاک، مکار اور فتنہ ساز کو ایکٹو کہا جاتا ہے۔ ایسے اشخاص چور دروازوں سے ترقی کا زینہ جلد طے کر لیتے ہیں۔

اس میڈیا کی یلغار نے جہاں نئی نسل کو حاظر جواب (جسے ہم بدتہذیب اور منہ پھٹ کہتے ہیں) بنایا ہے وہاں ٹی وی کے کمپیئر کی اضافی خوبی سامنے آئی ہے مہمان کی کسی بات سے اتفاق نہیں کرنا ہے۔ چاہے وہ کتنا ہی صاحب حیثیت اور ذی اقتدار ہو صرف دس سال پہلے کے ٹی وی انٹرویوز دیکھ لیجیے گھگی باندھے سوال کرتا تھا اور لفظ جی کی اس قدر تکرار کرتا تھا کہ پورا انٹرویو جی حضوری کی نذر ہو جاتا تھا اور اب تو بعض انٹرویوز دیکھ کر صحافیوں کی ہمت پر جہاں حیرت ہوتی ہے وہاں وہ پاگل سے بھی نظر آتے ہیں کہ کسی سے بھی نہیں ڈرتے، کسی سے بھی نہیں...... ناچ، گانے، بیہودگی اور عریانیت جیسے تیزی سے پھیلتی ہے اتنی ہی تیزی سے عشق کے جراثیم پھیلتے ہیں۔

پہلے ہم لندن، امریکا میں ہونے والی کم عمر لڑکوں کی شادیوں پر ہنسا کرتے تھے۔ اب پاکستان کے بڑے شہروں میں اٹھارہ، انیس، بیس اور اکیس سال کے لڑکے خوب دھڑلے سے کورٹ میرج کررہے ہیں۔ عشق نے ان کو کتنا پاگل کردیا ہے۔ اس کا انہیں احساس تک نہیں ہے۔ والدین بیچارے اپنی غلط تربیت کا احساس کرکے خواہ مخواہ روہانسے سے نظر آتے ہیں۔ ایسے کیسز میں عموماً لڑکی کے والدین اپنی لڑکی کو معاف کرکے اپنے گھر کا دروازہ کھول دیتے ہیں کہ فری میں اور آرام سے فرض تو پورا ہوا مگر لڑکے کے والدین کی ناراضی کا ٹیکر اتنا طویل ہوجاتا ہے کہ پھر لڑکا اپنے گھر کی دہلیز ہی بھول جاتا ہے۔ اس کی جدائی میں اس کے گھر والے پاگل ہوں یا مر جائیں اسے اس سے سروکار نہیں رہتا ہے۔

جس طرح چاند کی چودہ تاریخ کو چاند کی چاندنی اپنے پورے جوبن پر ہوتی ہے اسی طرح موسم گرما میں پاگل پن اپنے پورے عروج پر نظر آتا ہے۔

شدت کی گرمی، گھریلو مسائل، دفتری سیاستیں، سسرالی خباثتیں ایسے میں بجلی کے جانے بلکہ بار، بار جانے سے دماغ الگ بھنوٹ ہو جاتا ہے۔ اس پر پانی کی کمی مزاج کو مزید دو آتشہ کردیتی ہے۔ ایسے میں تو چلتی ہوا سے لڑنے کو دل چاہے تو اڑی تڑی کرنے والے تو منہ کی کھائیں گے ہی کسی ایک کا نام کیوں لیں۔ یہاں تو سب ہی ایک جیسے ہیں۔

سیاست داں جو آج بیان دے رہے ہیں اگلے دن اس کی نفی کررہے ہوتے ہیں۔ اسمبلیوں کا حال الگ برا ہے پہلے قومی اسمبلی کے اجلاس میں شریک خواتین سر پر دوپٹا منڈھے سوتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ اب چیختی چلاتی نظر آتی ہیں اور اللہ تعالیٰ معاف کرے بعض ٹی وی ڈسکشن پروگرام تو ایسے ہوتے ہیں جو پروگرام ختم ہونے کے بعد ڈھول دھپا اور مار پیٹ پر ختم ہوتے ہوں گے۔ (یہی اندازہ ہے ہمارا)

بات پاگل پن کی ہورہی تھی کہاں سے کہاں پہنچ گئی مگر یہ موضوع ہی اتنا وسیع ہے تو کیا کریں...... اب گالیاں دینے والے اور پتھر مارنے والے کو پاگل نہیں کہتے۔ اب تو جس کی بات سے آپ اتفاق نہ کریں وہ پاگل بن جاتا ہے یا پاگل کردیتا ہے۔ ہماری ہر بات بالکل سچ ہے آج یہ ہر گھر کا ہی مسئلہ نہیں پوری قوم کا مسئلہ ہے۔

تمام سیاسی پارٹیاں اپنے، اپنے موقف کو بالکل درست سمجھتی ہیں۔ کوئی بھی لیڈر کسی کی بھی بات سے اتفاق کرنے کا مطلب یہ سمجھتا ہے کہ جیسے اس کا بھاؤ گر گیا ہوں اور یہ پاگل پن ہر شعبے میں پہنچ گیا ہے۔

علاج کے لیے کسی ڈاکٹر کے پاس جائیں پہلے کسی پاگل کے پاس چلے گئے تھے بالکل غلط تشخیص کی ہے۔

میں جو فلم بنارہا ہوں اسے دیکھ کر ہمارے ناراض فلم بین واپس لوٹ آئیں گے (اسے دیکھ کر وہ مزید ناراض ہوجاتے ہیں) میری نئی سی ڈی دیکھ کر میرے فینز پاگل ہوجاتے ہیں۔ گاڑی میں تیز آواز میں میوزک سنتے

ہوئے گاڑی اوورٹیک کرتے ہوئے ڈینٹ مارتے ہوئے کہاں سے کہاں نکل جاتے ہیں۔ کچھ علاج اس کا بھی ہو...... یہ پاگل پن کہاں سے کہاں لے جارہا ہے، ٹھہریے، رکیے اور سوچیے کہیں آپ پاگل تو نہیں اور اگر ہیں تو کوئی بات نہیں آپ کے لیے نہیں ہیں۔

مطلب

فرحانہ کی ساس پہلی بار بیٹے بہو کے پاس رہنے کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ اور فرحانہ ان کی خوش خوراکی سے خاصی پریشان سی تھی۔ وہ لندن میں رضا کے ساتھ دو سال پڑھی تھی تو وہ اسے کھانے پینے کا رسیا نظر نہیں آیا تھا۔

پاکستان آکر شادی کے بعد بھی اس نے کھانے میں اپنی دلچسپی ایسی ظاہر نہیں کی تھی جیسے وہ کھاؤ قسم کی ہو۔

ناشتے میں وہ لوگ ڈبل روٹی کے دو سلائس لیتے تھے اور اگر بوائل انڈے لے لیتے تو سیب نہ لیتے اور اگر وہ دونوں ایک سیب کھالیتے تو انڈا نہیں کھاتے تھے۔

فرحانہ کی ساس جب پہلے دن آئی تھیں تو پوری ڈبل روٹی چائے کے ساتھ کھانے کے بعد آدھے گھنٹے بعد انہوں نے بہو سے بڑے شرمیلے لہجے میں پوچھا تھا کہ ناشتا کب ملے گا؟

''فرحانہ! اماں پراٹھے سے ناشتا کرتی ہیں۔ ان کے لیے پراٹھا بنادینا۔'' رضا دفتر جاتے ہوئے تاکید کر کے گیا تھا۔

مگر یہ نہیں کہہ گیا تھا کہ وہ کتنے پراٹھے کھائیں گی۔

''تمہارے ہاتھ کا پراٹھا تو دو نوالے کا ہے، اتنے چھوٹے پیڑے کا بناتی ہو۔'' چھ سات پراٹھے کھانے کے بعد بھی وہ تشنہ سی ٹیبل سے اٹھی تھیں۔

فرحانہ ساس کو ناشتا کرا کے بچوں کے لیے ساگودانہ .... بنا کر لائی تو یوں ہی رسمی طور پر ساس سے پوچھا۔ ''کیا آپ ساگودانہ کھائیں گی؟''

''میں تو بڑے شوق سے کھاتی ہوں۔'' بچوں نے بہ مشکل آدھا کپ نہیں کھایا ہوگا مگر ماشاءاللہ ساس صاحبہ چار پیالے لے کر کھا گئیں۔

بچوں کے لیے سوجی کا حریرہ بنتا تو وہ اس کو شوق سے کھاتیں۔ پتلی کھچڑی بنتی تھی وہ اس کو کھاتیں شکر ہے فیرنیکس اور سیریلیک کے لیے فرحانہ نے ان سے نہیں پوچھا تھا ورنہ وہ بھی اسے باقاعدگی سے کھاتیں۔

بعض شخصیات کی زندگی میں کھانا کتنا اہم ہوتا ہے یہ فرحانہ کو جان کر خاصی حیرت تھی۔

فرحانہ بیٹی آج کیا پکاؤ گی، کل کیا پکاؤ گی، فلاں کے گھر جائیں گے تو وہ لوگ ہمیں کیا کھلائیں گے، ہمارے گھر اگر کوئی آرہا ہے تو تم اس کو کیا کھلاؤ گی؟ جیسی باتیں وہ ہمہ وقت کرتی تھیں۔

''اماں جی آپ اپنا وزن کم کریں اور کم کھایا کریں۔ اس سے بیماری دور رہتی ہے۔''

''بیماری تو مجھ سے اب بھی دور ہے، میرے کم کھانے سے اگر تمہاری بچت ہوجائے گی تو مجھے بتادو، میں واپس گاؤں چلی جاتی ہوں، میرے گھر کا کھلا کھانا ہے باہر سے کوئی بھی آئے تو اس سے پوچھتے نہیں ہیں کہ روٹی کھانی ہے یا نہیں بلکہ سامنے رکھتے ہیں ایسی چھوٹی باتیں میں نے تم شہر والوں کے ہاں ہی دیکھی ہیں۔''

رضا سے جب انہوں نے گھر جانے کو کہا تو وہ بولا۔

''اماں جی آپ تو ناراض لگ رہی ہیں اور ایسی صورت میں تو میں ہرگز آپ کو چھوڑ کر نہیں آؤں گا۔''

''پتر! جب اپنے بیٹے کے گھر میں میرے کھانے پینے پر نظر رکھی جانے لگے تو میں کیسے زندہ رہ سکتی ہوں۔''

''کون رکھتا ہے ایسی نظر؟''

''تمہاری بیوی! جس کو میرا آنا ہی برا لگا ہے۔''

''نہیں اماں جی! ایسی تو کوئی بات نہیں......'' بہو نے قصداً حیرت اور دکھ بھرا لہجہ اپنا کر کہا۔

''تو پھر کل اپنی اماں کو فون پر کیا کہہ رہی تھیں۔ جب یہ مصیبت جائے گی تبھی آؤں گی آپ کے پاس۔ اس عورت نے تو کھا کھا کر مجھے پریشان کردیا ہے۔'' ساس نے جتلایا۔

''یہ جاہل لٹھ عورت میری انگریزی کے جملے کو کیسے سمجھ گئی۔'' فرحانہ نے سوچا۔

اور اماں جی یہ سوچ رہی تھیں کہ بے شک تم کوئی سی بھی زبان بولو مگر لہجے کا مطلب ہر زبان میں ایک جیسا ہوتا ہے جسے ہر عورت سمجھ سکتی ہے۔

☆☆☆



☆سیما گل......ملتان

تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

☆یاسمین اسرار......کمالیہ

راہ جو تاریک سہی پھر بھی ملے گی منزل
صرف ایک عزم کی قندیل جلا دی جائے

☆ارم کمال......فیصل آباد

اس دیس میں لگتا ہے عدالت نہیں ہوتی
جس دیس میں انساں کی حفاظت نہیں ہوتی
مخلوقِ خدا جب کسی مشکل میں پھنسی ہو
سجدے میں پڑے رہنا عبادت نہیں ہوتی

☆یاسمین کنول......پسرور

ٹوٹ کے بکھرے ہیں تو اس میں بھی ہے اپنا قصور
اوڑھ کر شیشے کی چادر پتھروں میں آگئے

☆سیما ممتاز عباسی......لاڑکانہ

ضدوں سمیت کبھی دل کو چھوڑنا ہوگا
یہ آئینہ کسی پتھر پہ توڑنا ہوگا
یہی نہیں کہ ہمیں توڑ کر گیا ہے وہ
اسے بھی خود کو بہت دیر جوڑنا ہوگا

☆خدیجہ جمیل......لاہور

برسوں بعد بھی اس کی ضدی عادت نہ بدلی محسنؔ
کاش میں دوست نہیں اس کی عادت ہوتا

☆نور افشاں......شکار پور

اخلاص کی جاگیر کو ہم اہلِ محبت
تقسیم تو کردیتے ہیں بیچا نہیں کرتے

☆سعیدہ خان......لوئر مال مری

بدن میں آگ لگی ہے اور آنکھ روتی ہے
کہیں ہے دھوپ کہیں بارش کا موسم ہے

☆کوثر خالد......جڑانوالہ

ہر سمت غم و ہجر کے طوفان ہیں محسنؔ
مت پوچھو کہ سب کتنے پریشان ہیں محسنؔ
کر ان کا ادب رکھ انہیں سینے سے لگا کر
یہ درد یہ تنہائیاں مہمان ہیں محسنؔ

☆ساجدہ ظفر......کمالیہ

بدلا یوں رنگ آپ نے حیرت زدہ ہوں میں
گرگٹ کو مات دے گئی فطرت جناب کی

☆زرینہ خان......بہارہ کہو

ملتی ہے برسوں میں بلندی
گرنے میں پل بھر لگتا ہے

☆غزالہ طارق......سرگودھا

بس یہ ہوا کہ اس نے تکلف سے بات کی
اور ہم نے رو، رو کے دوپٹے بھگو دیے
تیری برہنہ پائی کے دکھ بانٹتے ہوئے
ہم نے خود اپنے پاؤں میں کانٹے چبھو لیے

☆لاریب......چونیاں

دنیا جسے کہتے ہیں مٹی کا کھلونا ہے
مل جائے تو مٹی ہے کھو جائے تو سونا ہے

☆نیلوفر......کوئٹہ

ہنستے پھرتے تھے سرِ بزم انا کی خاطر
ورنہ حالات تو ایسے تھے کہ رویا کرتے

☆ ماہ زیب......چونیاں
فرصتیں ملیں جب بھی رنجشیں بھلا دینا
کون جانے سانسوں کی مہلتیں کہاں تک ہیں

☆ ماہ نور قیصر......راول پنڈی
کس طرح کا احساسِ زیاں ہے جو ہوا گم
کس طرح کا احساس ہے باقی جو بچا ہے
ملک آدھا گیا ہاتھ سے اور چپ سی لگی ہے
اِک لونگ گواچا ہے تو کیا شور مچا ہے

☆ ماہم شاہد......کراچی
کیسے کسی کی یاد کا چہرہ بناؤں میں
امجدؔ، وہ کوئی نقش مجھے بھولنے تو دے

☆ ناعمہ تحریم......بلیر ہالٹ کراچی
ہمارے واسطے کھولے گا کون دروازہ
ہم آہٹوں کی طرح ہیں نہ دستکوں کی طرح

☆ نغمانہ قیوم......راول پنڈی
سانپوں کے مقدر میں وہ زہر کہاں
جو عداوت میں اکثر انسان اگلتے ہیں

☆ ظفرانہ قیوم......راول پنڈی
سچائیوں کا جن کے سروں میں جنون تھا
ہر شہریارِ وقت نے وہ سر اڑا دیے
بارود کے خمار سے وحشت اُمڈ پڑی
اپنے ہی بھائیوں نے بھرے گھر اڑا دیے

☆ جبین نیاز......ملتان
اسے دیکھ لوں تو بھوک مٹ جاتی ہے یارو
میری آنکھوں کا رزق ہے میرے یار کا چہرہ

☆ ممتاز خانم......کراچی
مطلبی بنتا ہوں تو ضمیر جینے نہیں دیتا
مخلص بنتا ہوں تو لوگ جینے نہیں دیتے

☆ دیا آفرین......شاہدرہ
اس بادشاہِ وقت سے کیسی توقعات
بیٹھا ہے تخت پر وہ عنایات بیچ کے

☆ ایمان چوہدری......فیصل آباد
بے وفا وقت تھا، وہ تھے یا مقدر میرا
بات جو بھی تھی بہر حال انجام جدائی نکلا

☆ رابعہ عمران......ڈی.جی خان
چھوڑ دیا ہم نے ہمیشہ کے لیے اس کی آرزو کرنا
جس کو محبت کی قدر نہیں اسے دعاؤں میں کیا مانگنا

☆ شبانہ ملک......ڈی.جی خان
بہت تھے میرے بھی اس دنیا میں اپنے
پھر عشق ہوا اور ہم لاوارث ہوگئے

☆ سیدہ علیشاہ......بہاول نگر
امرت کی مہک تھی باتوں میں نفرت کے شرر تھے پلکوں پر
وہ ہونٹ نہایت میٹھے تھے، وہ آنکھ بہت زہریلی تھی
محسنؔ اس شہر میں مرنے کو اب اس کے سوا کچھ یاد نہیں
کچھ زہر تھا شہر کے پانی میں، کچھ خاک کی رنگت نیلی تھی

☆ جمیلہ لوہی......بلوچستان
عذابِ دید میں آنکھیں لہو لہو کر کے
میں شرمسار ہوا تیری جستجو کر کے
کھنڈر کی تہ میں بریدہ بدن سروں کے سوا
ملا نہ کچھ بھی خزانوں کی آرزو کر کے

☆ زارا میرانی......لیہ
بارش ہوئی تو گھر کے دریچے سے لگ کے ہم
چپ چاپ سوگوار اسے سوچتے رہے

☆ شہزادی کائنات...... کراچی
چلو بیٹھے رہو، الجھے رہو تم اپنے فرقوں میں
میں چلتا ہوں مجھے دو وقت کی روٹی کمانی ہے

☆ نکہت شہناز......بھلوال
درد اب بے لگام ہوگیا ہے
صورتِ اشک بہہ نکلتا ہے

☆ نازیہ نزی......نوشہرہ کینٹ
ہماری یاد کو دل میں سنبھال کر رکھنا
ہم نہ ہوں گے تو دل آباد رہے گا تیرا



کباب کری

اشیا: برائے کباب: گائے یا مٹن کا قیمہ، ایک کلو (باریک پسا ہوا)۔ سونف پاؤڈر، تین چائے کے چمچ۔ ادرک پاؤڈر، ڈیڑھ چائے کا چمچ۔ سرخ مرچ، نمک، حسب ذائقہ۔ بڑی الائچی، چھ عدد۔ تیل، ایک کھانے کا چمچ۔ انڈا، ایک عدد۔

برائے گریوی: سادہ دہی، پانچ کھانے کے چمچ۔ تیل، چھ کھانے کے چمچ۔ لونگ، آٹھ عدد۔ دار چینی، دو انچ کا ٹکڑا۔ ٹماٹر چھوٹے (کاٹ لیں) چار عدد۔ ٹماٹر پیسٹ، ایک کھانے کا چمچ۔ لال مرچ پاؤڈر اور نمک، حسب ضرورت۔

ترکیب: کباب بنانے کے لیے قیمہ کو ایک بار اور پیس لیں تاکہ مزید باریک ہوجائے، سونف اور ادرک پاؤڈر کو مکس کرلیں۔ بڑی الائچی میں سے دانے نکال کر کوٹ لیں اور اسے قیمہ کے ساتھ ایک پیالے میں مکس کرلیں۔ اس میں سرخ مرچ پاؤڈر، تیل، نمک اور انڈا ڈال کر اچھی طرح مکس کرلیں۔ گرم پانی کا ایک پیالہ تیار رکھیں تاکہ کباب بناتے وقت اپنے ہاتھ اس میں آسانی سے ڈبو سکیں۔ مٹھی بھر قیمہ لیں (لگ بھگ ایک بڑے لیموں کے برابر) اور اسے رول کر کے لمبائی میں تین انچ کی شکل دیں۔ کباب بنا کر کچھ دیر فریج میں رکھ دیں۔ گریوی تیار کرنے کے لیے دہی کو پھینٹ لیں۔ ایک سیدھے پیندے والا سوس پین لیں کہ (جس میں کباب ٹوٹے بغیر آسانی سے فٹ ہوجائیں) اس میں ہلکی آنچ پر تیل کو گرم کریں۔ پہلے لونگ اور دار چینی ڈالیں اور ایک منٹ کے بعد کٹے ہوئے ٹماٹر ملا دیں۔ اس وقت تک فرائی کریں کہ ٹماٹروں کا پانی تقریباً خشک ہوجائے، چمچہ چلاتے ہوئے ٹماٹروں کا پیسٹ ملا دیں۔ لال مرچ پاؤڈر ملا دیں اور ایک منٹ فرائی کریں پھر دہی ڈال دیں۔ مسلسل چلاتی رہیں تاکہ دہی جمنے نہ پائے۔ سونف اور ادرک کا پاؤڈر ملا دیں۔ نمک ڈالیں اور پانچ منٹ تک پکائیں اور مسلسل چمچہ چلاتی رہیں۔ پانچ کپ گرم پانی ڈال کر ابال لے آئیں۔ ساس پین میں نہایت ہی احتیاط سے ایک، ایک کر کے کباب رکھتی جائیں۔ ہلکی آنچ پر لگ بھگ 20 منٹ تک پکنے کے لیے چھوڑ دیں۔ پتیلی میں کباب رکھنے کے بعد ایک بار بھی نہ چلائیں۔ اگر گریوی کو چلانے کی ضرورت محسوس ہو تو پتیلی کو دونوں کناروں سے پکڑ کر آہستگی اور نرمی کے ساتھ ہلائیں۔ جب ڈش مکمل تیار ہوجائے گی تو آپ کو تیل گریوی کی اوپری سطح پر تیرنے سے اس کا علم ہوجائے گا۔ (یہ ڈش چاول یا روٹی دونوں کے ساتھ سرو کی جاسکتی ہے)

مرسلہ: نفیسہ آرا، راس الخیمہ

اورنج موئسٹ کیک

اشیا: میدہ ایک پیالی، انڈے دو عدد، چینی ڈیڑھ پیالی، بیکنگ پاؤڈر ڈیڑھ چائے کا چمچ، کوکنگ آئل تین چوتھائی پیالی۔ اورنج جوس، آدھی پیالی۔ کینو کے چھلکے، ایک کھانے کا چمچ۔ مارجرین یا مکھن، ایک کھانے کا چمچ۔

ترکیب: میدے میں بیکنگ پاؤڈر ڈال کر چھان لیں، انڈوں کو صاف خشک پیالے میں ڈال کر اس میں ایک چوتھائی پیالی اورنج جوس ڈالیں اور الیکٹرک بیٹر کی مدد سے پھینٹ لیں۔ چینی کو باریک پیس لیں اور تین چوتھائی پیالی چینی کو کوکنگ آئل میں ملا کر پھینٹیں، اس میں انڈے اور میدہ تھوڑا تھوڑا کر کے شامل کریں اور بیٹر کو ہلکی اسپیڈ پر چلاتے ہوئے آمیزہ تیار کرلیں۔ اس میں چورا کیے ہوئے کینو کے چھلکے ملا لیں۔ اوون کو 200 سینٹی گریڈ پر پندرہ سے بیس منٹ گرم کریں اور تیار کیے ہوئے آمیزے کو کیک پین میں ڈال کر بیس سے پچیس منٹ کے لیے بیک کرلیں۔ اوون سے نکال کر ٹھنڈا کرتے رکھ دیں

اور اس دوران پین میں مارجرین یا مکھن میں چینی اور اورنج جوس ڈال کر ابلتے ہوئے پانی پر رکھ دیں۔ جب چینی پگھلنے پر آجائے تو اسے کیک پر گرم، گرم ڈال دیں۔

مرسلہ: روبینہ حنیف، کراچی

آلمنڈ پیولووا

اشیا: انڈے کی سفیدی، چھ عدد۔ آئسنگ شوگر، چار سے پانچ کھانے کے چمچ۔ کارن فلور، چار کھانے کے چمچ۔ پسے ہوئے بادام، چار سے چھ کھانے کے چمچ۔ سفید سرکہ، ایک چائے کا چمچ۔ فریش کریم، دو پیالی۔ چینی، دو کھانے کے چمچ۔ خشک میوہ، آدھی پیالی۔ مکس فروٹ، ایک پیالی۔ کوکنگ آئل، حسب ضرورت۔

ترکیب: انڈے کی سفیدیوں کو صاف خشک پیالے میں ڈال کر الیکٹرک بیٹر کی مدد سے اچھی طرح پھینٹیں، جب سخت ہونے لگے تو ایک، ایک چمچ کر کے آئسنگ شوگر شامل کریں۔ پھر اس میں ایک، ایک چمچ کارن فلور ڈالتے ہوئے پھینٹیں، آخر میں سرکہ اور بادام ڈال کر ہلکا سا ملا لیں۔ بٹر پیپر پر برش کی مدد سے ہلکا کوکنگ آئل لگا کر اس مکسچر کو رنگ کی طرح یعنی گول، گول دائرے کر کے ڈالیں اور پہلے سے گرم کیے ہوئے اوون میں 150 سینٹی گریڈ پر رکھ دیں۔ اس کو مکمل بیک کرنے کے لیے ایک سے ڈیڑھ گھنٹا اوون میں رکھیں۔ پھر اوون کو بند کر کے پیولووا کو مکمل ٹھنڈا ہونے تک اس میں رہنے دیں تاکہ سخت ہو جائے۔ کریم کو صاف خشک پیالے میں نکال کر چینی ڈال کر فریزر میں ٹھنڈا کرنے رکھ دیں۔ دس سے بارہ منٹ بعد نکال کر الیکٹرک بیٹر سے اچھی طرح گاڑھی ہونے تک پھینٹیں۔ کریم میں موٹا کٹا ہوا خشک میوہ اور باریک کٹے ہوئے پھل ملا کر ٹھنڈا کرنے رکھ دیں۔ ٹھنڈا ہوئے پیولووا کو اوون سے نکال کر اس میں ٹھنڈا کیا ہوا کریم کا مکسچر ڈال کر پیش کریں۔

مرسلہ: بنین، کراچی

شاہی گوشت

اشیا: گوشت، بکرا یا مرغی، آدھا کلو۔ نمک، حسب ذائقہ۔ ادرک، لہسن پیسٹ، 1/2 ,1/2 چائے کا چمچ۔ (گوشت میں نمک، لہسن، ادرک ڈال کر ابال لیں) ثابت سفید زیرہ، ایک چائے کا چمچ۔ (بھون کر پیس لیں۔) گرم مسالا پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔ کھوپرا، (پسا ہوا) ایک چائے کا چمچ۔ ہری مرچ، چھ سے آٹھ عدد۔ تیل، 1/4 کپ۔ لیموں کا رس، دو سے تین کھانے کے چمچ۔ ہری مرچ سجاوٹ کے لیے۔ پیاز (گارنشنگ کے لیے) حسب ضرورت۔

ترکیب: سفید زیرہ، گرم مسالا پاؤڈر، پسا کھوپرا اور ہری مرچ کو بلینڈر میں پیس لیں۔ تیل گرم کریں۔ گوشت اور پسا ہوا مسالا ڈال کر بھون لیں گوشت گل جائے تو لیموں کا رس ڈال کر چولھے سے اتار لیں اوپر پیاز اور ہری مرچ ڈال کر پیش کریں۔

مرسلہ: سنبل ملک، شاہدرہ

قیمہ چاول

اشیا: قیمہ، آدھا کلو۔ پیاز، چار عدد۔ لہسن، (پیسٹ) ایک چائے کا چمچ۔ ادرک (پیسٹ) ایک چائے کا چمچ۔ گرم مسالا، ایک چائے کا چمچ۔ نمک اور سرخ مرچ، حسب ذائقہ۔ ہرا دھنیا، پودینہ، آدھی گڈی۔ تیل، ایک کپ۔ ٹماٹر، چار عدد۔ (بڑے) ہری مرچ، چار عدد۔ چاول، آدھا کلو۔ تیز پات، ایک عدد۔ دار چینی، ایک انچ کا ٹکڑا۔ لونگ، چار عدد۔ کالی مرچ، چھ عدد۔ کالا زیرہ، آدھا چائے کا چمچ۔

ترکیب: تیل میں پیاز لال کر کے آدھی پیاز اور آدھا تیل نکال لیں۔ آدھے تیل اور پیاز میں مسالا ڈال کر فرائی کر لیں۔ پھر قیمہ ڈال کر بھونیں، جب پانی خشک ہو جائے تو ٹماٹر اور ایک کپ پانی ڈال کر سوکھنے تک پکائیں پھر بھون لیں اور کٹا ہرا مسالا ڈال کر بند کر دیں۔ چاول پانی میں پندرہ سے بیس منٹ بھگو کر ثابت گرم مسالا اور نمک ڈال کر آدھے کچے ابال کر چھان لیں۔ دیگچے میں آدھے چاول ڈال کر سارا قیمہ ڈال دیں پھر چاول ڈالیں۔ آدھی پیاز اور تیل اوپر ڈال دیں اور ہلکی آنچ پر بیس سے پچیس منٹ کے لیے دم پر لگائیں تاکہ چاول گل جائیں۔ پیلا رنگ اور کیوڑا اوپر سے چھڑکیں، لذیذ بریانی تیار ہے۔

مرسلہ: ثمینہ غفور، تربیلا



حسن نکھاریے
مہ جبین

انسانی جلد کیا ہے؟

جلد، انسان کا سب سے بڑا organ یا عضو ہے۔ جلد نہ صرف ظاہری طور پر آپ کی خوب صورتی اور خوشنمائی کا باعث ہوتی ہے بلکہ یہ آپ کو بہت سارے بیرونی خطرات اور بیکٹریا کے حملوں سے بھی بچاتی ہے۔

جلد کی اقسام: ویسے تو جلد کی بہت ساری اقسام ہوتی ہے مگر عام طور سے جلد کو دو بڑی اقسام یعنی چکنی اور خشک میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ انہی اقسام کی وجہ سے جلد پر مختلف بیماریاں بھی ہوجاتی ہیں اور ان کا علاج بھی اسی مناسبت سے کیا جاتا ہے۔

عام جلدی بیماریاں: یوں تو جلد کی ہزار ہا بیماریاں اور عارضے ہیں مگر یہاں پر ہم چند بہت ہی اہم اور عام بیماریوں کا ذکر کریں گے جو خواتین و حضرات دونوں میں ہی یکساں طور پر موجود ہوتی ہیں اور ان سے ذرا سی بھی غفلت آپ کی جلد اور صحت کو بالکل تباہ و برباد کر کے رکھ سکتی ہے۔ جلد کی وہ بیماریاں یا کاسمیٹک مسائل جو ہر گھر اور ہر عمر اور ہر طبقے کے لوگوں میں نظر آتے ہیں وہ یہ ہیں۔

(1) کیل مہاسے یا pimples (2) چھائیاں (3) ایگزیما (4) داد (5) ناخن کے داد، سفید اور بھر بھرے ناخن (6) بالچھڑ (7) گنجا پن (8) دو منھے بال (9) قبل از وقت بالوں کا سفید ہونا (10) خشکی سکری (11) سورائسز (12) خارش (13) الرجی (14) پھٹے ہوئے پاؤں اور ایڑیاں (15) کالے اور بے رنگ ہونٹ (16) ڈھلکی ہوئی چہرے کی جلد (17) مسّے اور موکے (18) جذام (19) پھلبہری (20) آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پلکوں اور بھوؤں کا غیر ضروری طور پر جھڑنا اور وقت سے پہلے سفید ہونا وغیرہ، وغیرہ......

جلد کی نگہداشت کیسے کی جائے؟

جلد کی حفاظت اور نگہداشت بہت ضروری ہے۔ سب سے پہلے کسی ماہر جلد یعنی ڈرماٹالوجسٹ سے اپنی جلد کا معائنہ کروائیں ان سے پوچھیں کہ آپ کی جلد کی قسم کیا ہے پھر اسی حساب سے آپ کی جلد کی کریمیں، لوشن یا کھانے کی ادویات اور وٹامنز تجویز کیے جاتے ہیں اگر آپ بغیر کسی مشورے اور بغیر صحیح معائنے کے اپنی جلد کو خود ہی ٹھیک کرنے کی کوشش کریں گے تو وہ الٹا آپ کی جلد کو نقصان پہنچانے کا باعث ہوگا۔

عام طور پر دواؤں، کریموں اور لوشنوں کے استعمال کے علاوہ اگر آپ سادہ اور اچھی غذا جیسے تازہ ہری سبزیاں، پالک، سلاد، اور موسمی پھل وغیرہ لیں اور ہفتے میں کم از کم ایک دفعہ مچھلی کا استعمال ضرور کریں۔ دس سے بارہ گلاس تازہ پانی، دن میں دودھ کا کم از کم ایک گلاس...... ہلکی پھلکی ورزش ...... اور بھرپور نیند سے فائدہ اٹھائیں اور بے جا ٹینشن سے بچ جائیں تو آپ اپنی جلد کو خوب صورت اور لچک دار اور چمکدار رکھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ دھوپ ہماری جلد اور ہڈیوں کے لیے بہت ضروری ہے مگر آپ کو اس بات کا بھی خیال رکھنا ہوگا کہ دھوپ صرف شام کے وقت کی یا صبح سویرے کی ہو یعنی کہ آپ کو صبح دس سے لے کر دوپہر تین بجے تک دھوپ سے دور رہنا ہے اور اگر آپ کو کافی دیر کے لیے دھوپ میں جانا ہو تو آپ سن اسکرین اپنے ڈاکٹر کے مشورے سے استعمال کریں اور باہر جانے سے کم از کم پندرہ منٹ قبل ضرور اپنے چہرے اور ہاتھوں پر لگالیں۔

اس کے علاوہ خواتین دوپٹے، سن گلاسز یا سن شیڈ سے چہرے کو بچائیں اور مرد حضرات کیپ، سن شیڈ اور سن گلاسز سے چہرہ دھوپ سے بچائیں...... ویسے بھی اب موسم گرما کا آغاز ہونے والا ہے تو احتیاطی تدابیر لازمی ہیں۔ اس کے لیے اگر آپ روزانہ ہلکی پھلکی ورزش کریں جیسے کہ صبح سویرے چہل قدمی کرنا، سائیکل چلانا، رسی کودنا، جوگنگ کرنا، باغبانی کرنا، گھر کے کام کرنا یعنی وہ کام جن سے آپ کا پورا جسم حرکت میں آجائے اور آپ کو اچھی طرح سے پسینہ بھی آئے تو آپ کی جلد کے بند خلیے کھل جاتے ہیں اور مسام اچھی طرح سے کام کرتے ہیں۔ آپ کے خون کا دوران بڑھ جاتا ہے اور زہریلے مواد آپ کے جسم سے پسینے کے ذریعے خارج ہوجاتے ہیں آپ نہ صرف خود کو تروتازہ محسوس کرتے ہیں بلکہ رات کو سوتے وقت آپ کی جلد اور آپ ایک پرسکون اور بھرپور نیند کا لطف لے سکتے ہیں تو جلد بھی تروتازگی برقرار رکھتی ہے اور کھلی ہوئی بے جان محسوس نہیں ہوتی۔



بزم پاکیزہ پاکیزہ بہنیں

پہلا انعام یافتہ سوال

☆ گلشاد نذیر......کوہ مری

سوال۔ عشق و عاشقی کے جراثیم پھیلانے کا ذمے دار سوشل میڈیا ہے، موبائل فون، انٹرنیٹ یا فلمیں......؟

جواب۔ ان سب کے ساتھ نویں، دسویں نصاب اردو کی غزلوں کے نئے مطالب اور نئی تشریح بھی ہے...... جیسے ایک شعر کی ایسی بھی دیکھی گئی......اس شعر میں عمران ہاشمی کے جذبات بیان کیے گئے ہیں۔ (لاحول ولاقوۃ)

دوسرا انعام یافتہ سوال

☆ پروین افضل شاہین...... بہاول نگر

سوال۔ دیکھا ہے پہلی بار......کیا؟

جواب۔ ساجن کی آنکھوں میں خار۔

☆ عرشیہ جنید......کراچی

سوال۔ ڈفلی والے...... ڈفلی بجا......اس کا کیا مطلب ہے؟

جواب۔ اپنے کام سے کام رکھو۔

☆ صبا نور......لیہ

سوال۔ اس سالگرہ پر میں کتنے سال کی ہو جاؤں گی؟

جواب۔ پھر سولہ سال کی۔

☆ نازیہ نزی......نوشہرہ کینٹ

سوال۔ زندگی مصنوعی سی کب لگتی ہے؟

جواب۔ جب کبھی غیر ارادی طور پر ہم سچ بول دیں تو خود پر بھی حیرت ہوتی ہے۔

☆ تہمینہ واجد......حیدر آباد

سوال۔ میرے وہ میری سالگرہ پر گھٹیا تحائف کیوں دیتے ہیں؟

جواب۔ مہنگائی نے بھی تو ان کی کمر توڑ کے رکھی ہوئی ہے۔

☆ حمنہ قندیل......کمالیہ

سوال۔ پرندہ، مہمان اور سیاست داں میں کیا عام سی صفت پائی جاتی ہے؟

جواب۔ یہی کہ پرندے پالنے کا رواج کم ہو گیا ہے......مہنگائی کے اس دور میں اب مہمانوں کو اپنے گھر ٹھہرانے سے حتی الامکان گریز کیا جاتا ہے......اور سیاست داں آجائیں تو جاتے ہی نہیں ہیں۔

☆ پنکی......پنجاب

سوال۔ لوگ مجھے جھک کر سلام کرتے ہیں، بتائیں میں کیا ہوں آخر......؟

جواب۔ بھرم باز۔

☆ انیسہ حامد......کراچی

سوال۔ جب میری سہیلیاں مجھے برے اور گھٹیا سے تحائف دیتی ہیں تو کیا میں اُن کے منہ پر نہ دے ماروں؟

جواب۔ نہیں، اس سے انہیں دکھ ہوگا، آپ انہیں ایسے لوگوں کو دے دیں جو آپ کے منہ پر مارنے کی ہمت نہ کرسکیں۔

☆ انعم......کراچی

سوال۔ باجی! آپ کھانا پکانے میں کتنی طاق ہیں؟

جواب۔ طاق تو کبھی نہیں رہی......اب تو سب کچھ بھول گئی ہوں، کچھ نہیں آتا مجھے......اس لیے میں طاق نہیں بلکہ منفرد ہوں۔

☆مسز منورہ......سندھ

سوال۔ شوہر سے ذہنی ہم آہنگی کا ہونا...... کس طرح سے ہوتا ہے؟

جواب۔ شوہر کی ہر بات کے جواب میں یس باس کہنا ہوتا ہے بس......

☆تبسم بانو......لاہور

سوال۔ سانوں نہر والے پل تے بلا کے......خبرے ماہی کتھے رہ گیا؟

جواب۔ آپ کو میک اپ میں لت پت دیکھ کر ہی وہ نہر میں کود گیا تھا۔

☆فرحانہ پروین......راول پنڈی

سوال۔ کہتے ہیں کہ بے وقوف شوہر قسمت والیوں کو ملا کرتے ہیں؟

جواب۔ غلط کہتے ہیں، بے وقوف شوہر تو اپنی بے وقوفانہ باتوں سے بور کردے گا بھئی۔

☆منور شہزادی......گوجرانوالہ

سوال۔ زمین چلنے لگی......کیا یہی پہلا، پہلا پیار ہے؟

جواب۔ بے وقوف لڑکی، زلزلہ آرہا ہے۔

☆نگینہ ضیا بنگش......کراچی

سوال۔ بدتمیز بچوں کا دماغ کیسے درست کیا جائے؟

جواب۔ انہیں یہ باور کرایا جائے کہ وہ بہت اچھے بچے ہیں اور ان سے سب بہت خوش رہتے ہیں۔

☆مہرین......کراچی

سوال۔ پریشانی کی لمبی رات کے بعد صبح کب ہوتی ہے؟

جواب۔ پانچ بجے کے قریب صبح ہوتی ہے۔

☆نجمہ آسیہ......پنجاب

سوال۔ آخر وہ کب آئے گا؟

جواب۔ جب اس کی جاب لگ جائے گی اور اس کی ماں آئے گی تب۔

☆اے۔ ذکیہ......سندھ

سوال۔ میں بے حد پریشان ہوں، سنا ہے جس سے میرا رشتہ طے ہوا ہے وہ توتلا ہے؟

جواب۔ پریشانی کی کیا بات ہے، ایک تو وہ تمہارے سامنے کم بولے گا اور اگر بولا بھی تم اس کی بات ہنس، ہنس کر سننا اور ہنسی میں اڑا دینا۔

☆نور افشاں......شکار پور

سوال۔ منہ پھٹ کسے کہتے ہیں؟ کیا یہ صرف خواتین ہی ہوتی ہیں؟

جواب۔ جو اپنی زبان سے چابک کا استعمال کرے......دونوں ہو سکتے ہیں۔

☆امینہ عندلیب......سلانوالی

سوال۔ ان خواتین کو کیا کہا جائے جو ہر محفل میں آکر اپنی بڑائیاں خود ہی بیان کیا کرتی ہیں کہ میں یہ......میں وہ......؟

جواب۔ احساسِ کمتری کا شکار، بیچاریاں......

☆نوشین......سرگودھا

سوال۔ باجی آپ کے کتنے بچے ہیں؟

جواب۔ ماشاء اللہ بہت سارے ہیں، چار بچے اور بائیس کتابیں۔

☆ذکیہ خان......راول پنڈی

سوال۔ کیا محبت کے لیے اظہار کرنا ضروری ہوتا ہے؟

جواب۔ بالکل ہوتا ہے کیونکہ چہرے پڑھنے اور اندازے لگانے کی کسی کے پاس اب فرصت نہیں رہی ہے۔

☆تاج بانو......کراچی

سوال۔ میں کیا کروں، میری سسرال والے میری بات سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے؟

جواب۔ تو آپ اُن کے رنگ میں اپنے آپ کو ڈھال لیں۔

☆ارم کمال......فیصل آباد

سوال۔ دل بدتمیز کو تمیز دار کیسے بنایا جائے؟

جواب۔ تہذیب و تمیز کی اچھی سی ٹیوشن دلوا دیں۔

☆سیما ممتاز عباسی......لاڑکانہ

سوال۔ رقیب کی اصل پہچان کیا ہے؟

جواب۔ وہ دوسروں کو گرانے کی فکر میں رہا کرتا ہے۔

☆☆☆



روحانی مشورے

ادارہ

خوب صورتی کے لیے رنگ سے علاج

ہر لڑکی، ہر عورت کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ خوب صورت نظر آئے تو آئیں آج ہم آپ کو بلکہ ہر ایک کو... خوب صورت بناتے ہیں، بے شک آپ کی عمر کچھ بھی ہو۔ سب سے پہلے...تو آپ غصے سے ہمیشہ دور رہیں اور اپنے دل میں نفرت کے جذبات نہیں آنے دیں۔

جی ہاں پہلی بات یہی تو ہے کہ جس کا اخلاق اچھا ہو وہ ہمیں خوب صورت نظر آتا ہے، اس کی شکل صورت خواہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو وہ ہمیں اچھا لگتا ہے۔ وہ خواتین ہمیں بے حد بری لگتی ہیں جو حسین ترین ہونے کے باوجود برے اخلاق کی حامل ہوتی ہیں۔ سمجھدار مائیں اپنی بہو ڈھونڈتے وقت لڑکی کے اخلاق کو ضرور دیکھتی ہیں۔

بہر حال! اس کے باوجود ہر لڑکی یہ چاہتی ہے کہ وہ پری سی نظر آئے۔ آج ہم آپ کو ایک بہت آسان اور بہنوں کا بے حد آزمودہ علاج بتا رہے ہیں کہ ہر لڑکی خوب صورت نظر آئے گی مگر اس کے ساتھ، ساتھ اچھے اخلاق کو اپنی شخصیت کا لازمی جز ضرور بنائے رکھیے گا۔ اس علاج کی مدت کم از کم تین ماہ اور زیادہ سے زیادہ ایک سال ہے۔

اپنے گھر میں استعمال کی زیادہ سے زیادہ اشیا گلابی رنگ کی کرائیں۔ خاص طور اپنا بیڈ روم تو گلابی رنگ کا لازمی کرائیں۔ دیواروں پر گلابی پینٹ کروالیں حتیٰ کہ پردے، قالین، بیڈ شیٹ، استعمال کے برتن، گلاس، کپ، پلیٹ، زیرِ جامہ تک گلابی رکھیں۔ واش روم میں گلابی پلاسٹک کی بالٹی، ڈونگا، گلابی لوٹا کرلیں ٹاول بھی گلابی ہو حتیٰ کے ٹوتھ برش اور صابن دانی بھی...... غرض آپ کے آس پاس اور آپ کے استعمال میں جتنی چیزیں گلابی ہوں گی اتنی ہی جلد حیرت انگیز تبدیلی محسوس کریں گی۔

آپ کسٹرڈ بھی پنک کلر کا بنائیں، یہ بات میں اس وجہ سے بتا رہی ہوں کہ آپ چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی گلابی رنگ کی استعمال کریں۔ اگر آپ روزانہ لکھنے کی عادی ہیں تو آپ کے پین کا کلر اور کاپی یا فائل کور بھی گلابی ہی ہو۔

اس کے ساتھ، ساتھ آپ کو مراقبہ بھی کرنا ہوگا۔ یہ مراقبہ گلابی رنگ کی روشنی کا ہوگا۔ آپ کو آنکھیں بند کر کے یہ محسوس کرنا ہوگا کہ آپ گلابی روشنی میں نہائی ہوئی ہیں، یعنی سر سے پیر تک گلابی روشنی میں ہیں۔ اس مراقبے سے آپ کے خیالات و احساسات کے ساتھ آپ کی روح تک خوب صورتی کے اثرات یقیناً پہنچیں گے۔

مراقبہ اس طریقے سے کرنا ہوگا۔

وضو کر کے اپنے گلابی کمرے میں آجائیں اور آلتی پالتی مار کر اس طرح بیٹھیں کہ کمر کے مہرے سیدھے رہیں اور جسم اور چہرے پر تناؤ کسی طرح کا بھی نہ ہو۔ مکمل پُرسکون رہیں۔

آپ کا چہرہ شمال کی جانب ہو۔ اب ناک سے آہستگی سے سانس اندر کی طرف کھینچیں...... اس دوران درودِ ابراہیمیؑ پڑھیں اور سانس اندر روکے بغیر منہ کے راستے خارج کردیں۔ خارج کرنے کے دوران بھی درودِ ابراہیمیؑ (جو نماز میں پڑھا جاتا ہے) پڑھتے رہیں۔ یہ عمل ۳۳ بار دُہرائیں۔ اس کے بعد سانس کو معمول کے مطابق جاری رکھیں۔ یعنی بہت آہستگی اور پُرسکون انداز میں۔ اس دوران آپ یہ محسوس کریں گی کہ گلابی رنگ کی روشنی نتھنوں کی مدد سے پورے جسم میں داخل ہو کر جذب ہو رہی ہے۔ اب آپ یا حیُّ یا قیوم کا ورد شروع کردیں۔ اندازاً پانچ منٹ یہ عمل کرنے کے بعد بالکل پُرسکون ہو کر آنکھیں بند کرلیں اور اب آپ یہ محسوس کریں کہ گلابی رنگ کی بارش آپ کے پورے جسم پر پڑ رہی ہے اور آپ کا جسم اسے جذب کر رہا ہے۔ یہ عمل کم از کم آدھے گھنٹے تک کریں۔ اس کے بعد پہلے دونوں عمل دُہرا کر اپنے گلابی بستر پر لیٹ جائیں اور ہلکا پھلکا محسوس کرتے ہوئے

سوجائیں۔ یہ عمل دن میں دوبار کریں، رات کو سوتے وقت لازمی کریں۔ اس مراقبے کا کوئی نقصان نہیں ہے۔ ہاں فائدہ یقینی ہے جو کسی کو جلد ہی حاصل ہو جاتا ہے مگر یہ سب آپ پر منحصر ہے کہ کتنی رغبت اور محبت سے یہ عمل کرتی ہیں۔ فارغ اوقات میں گھر میں کام کرتے ہوئے درودِ ابراہیمیؑ پڑھنا اپنی عادت کا حصہ بنالیں کہ درودِ پاک پڑھنے والوں کے چہروں پر ایک نور سا آجاتا ہے...... اور چہرہ عام سے خدوخال کے باوجود پیارا سا لگا کرتا ہے۔

ایذا پسند شوہر

ہر بیوی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کا شوہر اس سے محبت کرے اور زندگی کے مسائل وہ اس کے ساتھ خوش اسلوبی سے حل کرے۔ مگر اکثر شوہر اپنی بیوی سے نہ محبت کرتے ہیں نہ عزت بلکہ اس کی قدر کرنے کے بجائے اس پر طنزو تشنیع کے تیر برساتے رہتے ہیں۔ انہیں برے القابات سے نوازتے ہیں اور آئے گئے کے سامنے بھی بیوی کو ذلیل کر کے خوش ہو جاتے ہیں۔ یہ حالات صرف جوان بیویوں کے نہیں ہیں۔ یعنی بیچاری بیویاں یہ بے عزتی پیرانہ سالی میں بھی برداشت کررہی ہوتی ہیں۔

ایسی تمام بیویاں جو ان حالات سے گزر رہی ہیں، سب کاموں سے فارغ ہونے کے بعد رات کو سونے سے پہلے اکتالیس مرتبہ سورۂ نحل کی آیت نمبر 119 اول و آخر گیارہ، گیارہ مرتبہ درود شریف کے ساتھ پڑھ کر اپنے شوہر، اپنے والد یا اپنے بھائی (جو بھی اذیت پسند ہو) کا تصور کر کے دم کردیں اور دعا کریں کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آئیں اور ان کی عزت کریں، ان سے محبت کریں۔ یہ عمل چالیس روز جاری رکھیں۔ ناغے کے دن نکال کر دن پورے کریں...... وہ شوہر جو بے بات جھگڑتے ہیں، ان کی بیویوں کو چاہیے کہ وہ جھگڑے کے دوران خاموش رہیں اور دل میں درود شریف یا سورۂ اخلاص پڑھنا شروع کردیں۔ اس طرح لڑائی بڑھے گی نہیں...... اور شوہر کا غصہ بھی جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا۔ غصہ آگ کی طرح ہوتا ہے، اس کو ٹھنڈا کرنے کے لیے آپ غصہ کرنے والے شخص کو پانی بھی پلاسکتی ہیں۔ وہ بیویاں جو ترکی بہ ترکی جواب دیتی ہیں اور کوشش کرتی ہیں کہ میاں کا دماغ اپنے ہاتھوں سے ٹھکانے لگادیں۔ وہ لڑائی جھگڑے کو طول دیتی ہیں۔ یاد رکھیے تالی کبھی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی...... جب آپ کچھ بولیں گی ہی نہیں تو غصہ کرنے والا شخص کہاں تک الٹا سیدھا بولے۔

خاندان میں نا اتفاقی

آج کل یہ مرض کسی وائرس کی طرح ہر طرف پھیلا ہوا ہے کہ بہن بھائیوں میں ذرا سی بات پر ناراضیاں اتنی بڑھ جاتی ہیں کہ وہ سالوں ایک دوسرے کی شکل نہیں دیکھتے۔ تقریبات میں سامنا ہوتا ہے تو ایک دوسرے کو اجنبی نظروں سے دیکھتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ گھروں میں چھوٹے بچے ہیں تو وہ لڑ رہے ہیں، جن گھروں میں بڑے بچے ہیں تو وہ آپس میں لڑ رہے ہیں۔ سسرال والوں کی تو بات ہی علیحدہ ہے۔ زیادہ تر بہوئیں اپنی سسرال کو ظالم اور ہر بات میں غلط ثابت کرنے پر تلی رہتی ہیں۔ اس لیے وہ ہرگز نہیں چاہتیں کہ ان کے بچے سسرالی کزنز میں گھل مل کر رہیں۔ یہ ساری نفسا نفسی خاندانوں میں نا اتفاقی پیدا کررہی ہے جو کہ بہت بری بات ہے۔ وہ گھر جہاں محبت کے درس دیے جاتے تھے وہاں نفرت کے سبق پڑھائے جاتے ہیں...... خبردار جو فلاں سے بات کی، خبردار جو اس کا کام کیا، جو اس کا رشتہ کروایا۔ خبردار جو اس کو جاب دلوائی وغیرہ قسم کی باتیں اب ہر دوسرے گھر میں ہونے لگی ہیں۔ ایسے حالات جہاں ہوں وہاں پہلے بڑے اپنے آپ کو سدھاریں اور پھر جب آپ کے بچے سوجائیں تو ان کے سرہانے بیٹھ کر گیارہ مرتبہ سورۂ شوریٰ کی آیت نمبر 28 اول و آخر تین تین مرتبہ درود شریف کے ساتھ پڑھ کر دم کردیا کریں۔

یہ عمل کم از کم ایک ماہ تک جاری رکھیں۔

وہ گھرانے جن کے چھوٹے یا بڑے بچے بلاوجہ ایک دوسرے سے لڑتے ہیں، بار بار سمجھانے پر کسی صورت باز نہیں آتے تو سورۂ فاتحہ 41 بار پڑھ کر اول آخر درود ابراہیمیؑ (تین بار) کے ساتھ پانی کی بوتلوں یا کولر میں دم کر کے یہ پانی اپنے بچوں کو پلائیں۔

اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں۔ ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔ (اپنے علاقے میں دوا نہ ملنے کی صورت میں ہم سے رجوع کریں)

ہیموفیلیا

رابعہ احسان۔ ڈیرہ غازی خان

جناب! میں بہت امید کے ساتھ اپنے بچے کا مسئلہ لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ میرا بیٹا جس کی عمر چھ ماہ ہے اچانک ایک روز اس کے جسم پر کالے رنگ کے دھبے نمودار ہوئے۔ (صرف دو جگہوں پر) ان دھبوں کے اندر گلٹی محسوس ہو رہی تھی۔ اس سے قبل میری والدہ کے ماموں، میری والدہ کے خالہ زاد بھائی اور اب گزشتہ دس سال سے میری خالہ کا بچہ ہیموفیلیا جیسے مہلک مرض کا شکار ہے۔ ڈاکٹرز کے مطابق زیادہ تر یہ بیماری ان لوگوں کے بچوں میں ٹرانسفر ہوتی ہے جن کی کزن میرج ہو جبکہ میرا ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میرے خاوند ہمارے دور کے رشتے دار تو ہیں لیکن فرسٹ کزن ہرگز نہیں ہیں۔ بچے کے جسم پر ویسے ہی داغ دیکھ کر جیسے میری خالہ کے بیٹے کے جسم پر کبھی کبھار نمودار ہوتے ہیں۔ میں نے اپنے علاقہ ڈیرہ غازی خان کی ایک لیبارٹری سے بچے کا بلڈ ٹیسٹ کروایا ہے۔ پانچ دن کے بعد بچے کی جو رپورٹ ملی ہے۔ اس میں فیکٹر۔ ۸

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

مئی 2016ء

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ____________

پتا: ____________

____

کی شدید کمی ہے۔ اب میں بے حد پریشان ہوں۔ انسان کے ساتھ مسئلے مسائل تو تمام عمر چلتے ہیں، بچے کو کھیلتے کودتے چوٹ بھی لگ جاتی ہے۔ آپ کے پاس بہت سے ایسے مریضوں کو دیکھا ہے جو مہلک امراض سے شفایاب ہوئے ہیں۔ رپورٹ بھیج رہی ہوں۔ اگر ہومیو پیتھک میں اس بیماری کا علاج ممکن ہے تو خدارا رہنمائی فرمائیں۔

جواب: اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ اس بیماری کا ہومیو پیتھی میں علاج موجود ہے۔ ابتدائی طور پر آپ اپنے بچے کو ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Arnica Montana-30 اور Ferr. Phos-30 کے 5، 5 قطرے ایک کھانے کا چمچ برابر پانی میں دن میں 3 مرتبہ دیں۔ اس کے بعد ایک ماہ بعد پھر حال بتائیں۔

بچیوں میں لیکوریا اور جلد پر رُواں

فردوس ملک۔ کینیڈا

ڈاکٹر صاحب میری بیٹی کو لیکوریا کی شکایت ہوگئی ہے۔ جب پیشاب کرتی ہے تو جلن اور خارش بھی ہوتی ہے آج کل وہ چڑچڑی بھی ہوگئی ہے۔ بات بات پر روتی ہے۔ رنگ پیلا ہوگیا ہے اور دوسرا مسئلہ اس کے جسم پر رواں ہے، کندھوں اور گردن پر پیدائش کے وقت ہی بال تھے۔ اب ٹانگوں اور بازو پر بھی بال لمبے ہورہے ہیں۔ پلیز کوئی اچھی سی دوا بتائیں اور کتنے عرصے تک دینی ہے۔ شکریہ!

جواب۔ بچی کو متوازن غذا دیں۔ چھ گلاس پانی روزانہ پلائیں، ٹائٹ کپڑے زیادہ نہ پہنائیں۔ ٹی وی، کمپیوٹر، موبائل وغیرہ سے دور رکھیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کرائیں۔ Sepia-30, Merc.sol-30, Calc. Carb-30 کے 5،5 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں تین مرتبہ پلائیں۔ دو ماہ بعد حال بتائیں۔

بریسٹ و لیکوریا

گوشی ملک۔ کینیڈا

ڈاکٹر صاحب، مجھے لیکوریا کی شکایت ہے اور کافی عرصے سے ہے۔ پیریڈ سے پہلے اور بعد میں زیادہ ہوتی ہے اور جلن بھی ہوتی ہے۔ اور دوسرا مسئلہ میرے نسوانی حُسن میں کمی کا ہے۔

جواب: آپ کا وزن تھوڑا زیادہ ہے اس کو کم کریں، میٹھی چیزیں، کولڈ ڈرنکس، آئس کریم، مرغن چیزیں، برگر، پیزا وغیرہ نہ کھائیں۔ ایک گھنٹے کی ورزش کریں۔ متوازن غذا کھایا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ استعمال کریں۔ اس کے بعد حال بتائیں۔ Sepia-30, Bovista30,Sabal Serr-30, Cal.Carb-30 کے 7، 7 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں تین مرتبہ استعمال کریں۔ دو ماہ بعد حال بتائیں۔

بداثرات

عامر نواز۔ لیّہ

محترم ڈاکٹر صاحب! میں اندرونی طور پر کافی کمزور ہوگیا ہوں۔ آج تک کسی ڈاکٹر کو چیک اَپ نہیں کرایا۔ مہربانی فرما کر میرے لیے کوئی علاج تجویز فرمائیں۔ جس سے میں بہتر زندگی گزار سکوں۔ تازیست دعا گو ہوں گا۔

جواب: اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کریں۔ دینی کتب کا مطالعہ کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی

مندرجہ ذیل ادویات دو ماہ تک استعمال کریں پھر حال بتائیں۔ Staphisegria-200 کے پانچ قطرے آدھا گلاس پانی میں ہفتہ میں ایک مرتبہ جبکہ Damiana Pentarkan-40 کے 15 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ کھانے کے بعد لیں۔

مٹاپا

مسز آفتاب۔ خانیوال

میری بھتیجی مٹاپے کا شکار ہے۔ ٹانگیں بھی بہت موٹی ہیں۔ اسے بھوک بھی بہت لگتی ہے۔ کمر سے نیچے بہت پھیلی ہوئی لگتی ہے۔

جواب: آپ کی بھتیجی کو بھوک بہت لگتی ہے لیکن یہ نہیں لکھا کہ وہ کھاتی کیا ہیں اور کتنا کھاتی ہیں۔ بھوک لگنے کی بہت ساری وجوہات ہوتی ہیں۔ (۱) تھائرائیڈ غدود کی خرابی، (۲) ڈپریشن (۳) پیٹ کے کیڑے (۴) ایک وقت میں پیٹ بھر کر کھانا نہ کھانے کی عادت (۵) ہر وقت تھوڑا تھوڑا کھاتے رہنا (۶) تیزابیت (۷) شوگر وغیرہ۔ کھانا ایک وقت میں مکمل پیٹ بھر کر کھلائیں۔ خصوصاً صبح کا ناشتا بھرپور ہو اور دوپہر کا کھانا اچھا ہو لیکن رات میں کھانا ہلکا پھلکا ہو۔ ورزش کرائیں، کھانے میں میٹھا اور چکنائی نہ ہو، تلی ہوئی اور بھنی ہوئی چیزوں سے پرہیز کرائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کرائیں۔ Calc-Carb-200 ہر ہفتہ ایک خوراک 5 قطرے آدھے کپ پانی میں، اس کے بعد دوسرے دن Thyroidinum30, Amonium Mur-30 اور Fucus vers کے 7، 7 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ دیں۔

جھائیاں اور سماعت

نائلہ ملک۔ ملتان

پاکیزہ تو ہم شروع ہی سے لے رہے ہیں اور ہم سب بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ لیکن لکھنے کی ہمت آج پہلی بار کر رہی ہوں۔ آپ کے کلینک میں اپنا مسئلہ لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ میری عمر 28 سال ہے۔ میرا مسئلہ جھائیوں کا ہے۔ کچھ سال پہلے میری جلد بالکل صاف تھی، کوئی داغ اور جھائیاں نہیں تھیں۔ کسی کے کہنے پر میں نے کریمیں استعمال کیں تقریباً 16 کریمیں تھیں جو کہ مکس کر کے لگائی تھیں۔ جب استعمال کرنا بند کیں تو آہستہ آہستہ میرے چہرے پر جھائیاں نمودار ہونا شروع ہو گئیں۔ میں ان جھائیوں کے خاتمے کے لیے بہت علاج کر چکی ہوں لیکن کوئی فرق نہیں پڑتا، جھائیوں کو ختم کرنے والی کریم بھی لگا چکی ہوں، اس سے وقتی طور پر ختم ہو جاتی ہیں اور اگر کریم لگانا چھوڑ دوں تو پھر ظاہر ہو جاتی ہیں۔ دیسی ٹوٹکے بھی کر چکی ہوں لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔ جھائیاں ناک پر بھی ہیں۔ اب یہ جھائیاں داغ چھوڑ چکی ہیں۔ دوسرا مسئلہ میرے کان کا ہے۔ بچپن میں مجھے ٹائی فائیڈ ہو گیا تھا جس سے میرے کان کی رگ متاثر ہوئی تھی۔ دونوں کان کے پردے ٹھیک ہیں۔ میں مکمل بہری نہیں ہوں۔ بس یہ ہے کہ مجھے دور کی آواز سنائی نہیں دیتی، موبائل پر کال آ رہی ہو تو میں نہیں سن سکتی۔

جواب: ہمارے یہاں ایک عام رواج ہے کہ کسی کو ایک دوا سے فائدہ ہوا اور اس نے وہ دوا اپنے دوستوں، عزیزوں کو بتانا شروع کر دی۔ خصوصاً خواتین کہ جب میں نے یہ دوا استعمال کی تو مجھے بہت فائدہ ہوا، تم بھی کرو۔ کسی بھی دوا یا نسخے

کے بارے میں کسی معالج سے مشورہ کرنا بہتر ہے۔اس لیے نوجوانوں کے اپنے مفاد میں ہے کہ وہ اپنے ماں باپ سے کچھ نہ چھپائیں ان سے مشورہ کریں۔کوئی بھی کام کرنے سے پہلے اس طرح خود بھی پریشانی اور نقصان سے بچیں گے اور اپنے بڑوں کو بھی بچائیں گے۔اس لیے یاد رکھیں (۱) گھر والوں سے کچھ چھپائیں نہیں۔(۲) ہر ایک کے مشورے پر فوراً عمل نہ کیا کریں (۳) بڑے بزرگوں یا معالج سے ضرور مشورہ کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 45 دن استعمال کریں اور دوبارہ حال بتائیں۔ Calendula-30, Graphites-30, Belladona-30 کے 7،7 قطرے آدھے کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ ڈال کر پئیں جبکہ Mullen Oil کے ایک یا دو قطرے دونوں کانوں میں دن میں تین مرتبہ ڈالیں۔

بال گرنا اور کمزوری

رابعہ انعم۔ملتان

ڈاکٹر صاحب، میں اسٹوڈنٹ ہوں۔میں نے پہلے بھی آپ کو ایک خط لکھا تھا کہ میں بیماریوں کا ڈھیر بن گئی ہوں۔ جسم اندرونی طور پر بہت کمزور ہو گیا ہے۔ میری آنکھیں بھی پیلی ہو گئی ہیں۔لیکوریا کی بھی زیادہ شکایت ہے۔جس کی وجہ سے مجھے بہت زیادہ کمزوری محسوس ہوتی ہے۔ ٹانگوں میں درد رہنے لگا ہے۔بھوک بہت لگتی ہے۔ سردی اور گرمی بھی بہت لگتی ہے۔دل تیز تیز دھڑکتا ہے۔سانس پھولتا ہے۔کندھے کے پٹھے کمزور ہو گئے ہیں، ذرا سا بھی وزن نہیں اٹھا سکتی۔ پیٹ باہر نکل آیا ہے۔روز بروز موٹی ہوتی جا رہی ہوں۔ معدہ بھی خراب رہتا ہے۔سر ایک دم چکرا جاتا ہے۔بہت چکر آتے ہیں، کمر میں درد رہتا ہے۔سر کے بال جڑوں سے نکلتے ہیں اور اب بہت کم رہ گئے ہیں۔ بلڈ پریشر لو رہتا ہے۔کپڑوں سے بدبو آتی ہے۔ مجھے ایسی دوا بتائیں جس سے میرے مسئلے مسائل حل ہو جائیں کیونکہ میں ہر وقت پریشان رہتی ہوں اپنی صحت کے بارے میں۔

جواب: آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات فوراً استعمال کریں۔ Calc. Carb-200 ہر ہفتہ ایک خوراک پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر لیں۔ Kali Phos-30, Gelsemium-30, Nat. Mur-30 Sepia30, Ferr. Phos-30 کے 7،7 قطرے دن میں 3 مرتبہ آدھا گلاس پانی میں ڈال کر لیں۔ایک ماہ بعد حال بتائیں۔

منہ کے چھالے

ملک اللہ نواز۔ ضلع لیہ، پنجاب

میرے منہ میں ہر وقت چھالے رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے منہ میں بہت تکلیف رہتی ہے۔ کھانا بھی نہیں کھا سکتا۔ معدہ خراب رہتا ہے۔ گھٹنوں میں درد رہتا ہے جس کے لیے روزانہ دو گولی پونسٹان (فورٹ) کھاتا ہوں، میں نسوار رکھتا ہوں اور حقہ بھی پیتا ہوں۔ براہ مہربانی میرے لیے کوئی علاج تجویز فرمائیں، تازیست دعا گو رہوں گا۔

جواب: یاد رکھیں نسوار، تمباکو پینا مضرِ صحت ہے۔اس کا استعمال فوراً ترک کر دیں۔متوازن غذا کھائیں۔ دودھ دہی کا استعمال کریں۔کھانا آہستہ آہستہ چبا کر کھائیں۔کھانے کے دوران اور فوراً بعد پانی نہ پئیں۔ Borax30, Calc.Carb 30, Merc.sol30, Rhustox30 ڈاکٹر ولمار شوابے

جرمنی کی ہر شیشی سے 5، 5 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد پھر کیفیت سے مطلع کریں۔

نسوانی حسن، لیکوریا

مسز عرفان۔ تونسہ شریف

میں پاکیزہ کی ایک سال سے قاری ہوں۔ جس طرح آپ لوگوں کے مسئلے حل کر رہے ہیں اس کا اجر آپ کو اللہ دے گا۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں پانچ سال سے لیکوریا کی بیماری میں مبتلا ہوں۔ جب تک علاج جاری رکھوں ٹھیک رہتی ہوں ورنہ پھر بیمار ہو جاتی ہوں۔ اس بیماری کی وجہ سے میں کمزور ہو گئی ہوں میرا نسوانی حسن نہ ہونے کے برابر ہے۔ براہِ مہربانی مجھے دوائیں تجویز کر دیں۔

جواب: آپ نے لیکوریا کے بارے میں تفصیل نہیں لکھی اور نسوانی حسن میں کمی شادی سے پہلے سے ہے یا بعد میں ہوئی، تفصیلاً لکھیں پھر آپ کو صحیح دوا تجویز کی جائے گی۔

رحم کی رسولی

نصرت مفتی.........خوشاب

ڈاکٹر صاحب! میں نے آپ کی بہت تعریف سنی ہے، آپ کو آخری امید کے طور پر خط لکھ رہی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب میری شادی کو اڑھائی سال ہو گئے ہیں اس دوران میرا دو بار حمل ابتدائی ماہ میں ہی ضائع ہو گیا۔ رپورٹ میں حمل Positive ہوتا تھا اور ماہواری سے چند دن اوپر ہو کر ضائع ہو جاتا تھا۔

میری فیملی ڈاکٹر نے میری بلڈ رپورٹ لاہور بھیجی جس کی کاپی آپ کو بھی روانہ کر رہی ہوں اس میں Cylomegalovirus, Rubella, Toxoplasam اور Herpes Simplex Virus پوزیٹیو آئے ہیں۔ ڈاکٹر نے ہر ماہ کا ایک انجکشن دیا ہے جو چھ ماہ تک لگوانے ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ میرے خون میں زہر اور جرمن خسرہ (سرخ بخار) کے جراثیم موجود ہیں اس سے بچے پیدائشی معذور ہوتے ہیں سو پہلے میں علاج مکمل کروں۔

ڈاکٹر صاحب! میری آپ سے گزارش ہے کہ آپ میری رپورٹ کی روشنی میں مجھے دوا بتائیں۔ نیز کیا میں انجکشن Benzebiotic جو کہ تین لگوا چکی ہوں وہ بھی ساتھ لگوالوں تو کوئی نقصان تو نہیں ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب آپ ان امراض پر پاکیزہ میں تفصیلاً لکھیں، مجھ جیسی بہت سی بہنوں کا بھلا ہوگا۔

جواب:۔ ان امراض پر ضرور لکھیں گے فی الحال اس مسئلے سے آپ کا ٹھیک ہونا ضروری ہے۔ سب سے پہلے ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی Pulsatilla 1M کی ایک خوراک لینے کے ایک دن بعد Kali Iod 30 کے 5,5 قطرے 1/2 کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔ 2 ماہ استعمال کے بعد U/S کی..... Virology رپورٹ کے ہمراہ اپنا احوال بتائیں۔ جب انجکشن لگوانے شروع کر دیئے ہیں تو ان کو پورا کریں۔

☆☆☆



اسماء الحسنیٰ۔ کامیابی کا راستہ

دینِ اسلام کی روشنی میں آپ کے مسائل کا مکمل حل

پیر شاہ محمد قادری

پیر شاہ محمد قادری تاجی ہاشمی گزشتہ 25 برسوں سے اسماء الحسنیٰ کے حوالے سے زندگی میں درپیش تمام مسائل اور پریشانیوں کے حل کے لئے اسماء الحسنیٰ کی تلقین کرتے ہیں اور آیات قرآنی کے ذریعے روحانی علاج کے حوالے سے دنیا بھر میں شہرت یافتہ ہیں۔ آپ کے پروگرام اسماء الحسنیٰ۔ کامیابی کا راستہ کروڑوں ناظرین دیکھتے رہتے ہیں۔ آپ اپنے مسائل اور پریشانیوں میں براہ راست ان سے بذریعۂ خط اور ملاقات راہ نمائی لے سکتے ہیں۔

اولادِ نرینہ کی۔ طلب

O میرے دونوں بیٹے پیدا ہونے کے تین ماہ زندہ رہے اور فوت ہو گئے۔ اللہ کی رحمت تین بیٹیاں ہیں وہ بالکل صحیح سلامت ہیں اللہ ان کی حیاتی رکھے لیکن اولادِ نرینہ کی بڑی خواہش ہے۔ آپ کے روحانی علاج کی بہت شہرت ہے آپ پر سرکار داتا حضور اور سیدنا غوث الاعظمؒ کی بڑی عنایت ہے آپ اسماء الحسنیٰ بھی تلقین کیجئے اور روحانی علاج بھی تجویز کر دیجیے مجھے آپ سے ملنے کا بھی بے حد اشتیاق ہے۔ فیس بک پر آپ کی زیارت ہوتی رہتی ہے۔ آپ کا تابعدار۔ غائبانہ مرید۔ نسیم اختر شیخوپورہ

☆ اللہ تعالیٰ کے ہاں دیر ہے لیکن ناممکن کچھ بھی نہیں، اللہ تعالیٰ ہر دعا کو پورا کرنے پر قادر ہے۔ جب وہ ابراہیم علیہ السلام کو بچانوے برس میں اولاد عطا کر سکتے ہیں تو آپ کو عطا کرنا اس کے لیے کیا ناممکن ہے۔ اپنا ایمان قائم رکھیے۔ ہر نماز کے بعد 101 مرتبہ درود شریف ابراہیمی پڑھ کر دعا کیجئے۔ آپ کی فرمائش پر علاج دردِ عقیم اولادِ نرینہ کے لیے ارسال کیا جا رہا ہے۔ آپ بروز اتوار محفل درود شریف میں آیئے دعا کے بعد ملاقات ہو جائے گی۔ انشاءاللہ

ڈپریشن۔ والدہ کی بے بسی

O رات رات بھر جاگتی ہوں لیکن نیند نہیں آتی ہے۔ بظاہر کوئی پریشانی نہیں ہے لیکن سکونِ قلب میسر نہیں ہے۔ مال و اولاد سب حاصل ہے لیکن دل بالکل مردہ ہے۔ ڈپریشن، غصہ، ناکامی، اداسی جیسی کیفیات طاری رہتی ہیں۔ کئی حکیموں، ماہر نفسیات کو دکھا چکی ہوں لیکن کوئی فائدہ نا ہوا بلکہ دوائیں کھا کھا کر السر کی مریض ہو چکی ہوں کیا میری اس بے کسی کا علاج ہے؟ نصرت آرا۔ کراچی

☆ بہن! آپ کی بیماری جسمانی نہیں روحانی ہے آپ کے حوالے سے جو چیز استخارے کے ذریعے سامنے آئی اس نے میرا دل دہلا دیا اور آنکھوں کو آنسوؤں سے بھر دیا، آپ نے اپنی والدہ کا دل بہت دکھایا ہے، وہ آپ کو آخری لمحوں تک یاد کرتے کرتے، آپ کا انتظار کرتے کرتے اس جہاں سے گزر گئی تھیں لیکن آپ نے ان کی کوئی خبر نہیں لی، آپ کی والدہ نے، مجھے سو فیصد یقین ہے کوئی بددعا نہیں دی ہو گی لیکن ان کے صبر اور بے بسی نے آپ کو جکڑ لیا ہے، آپ ان کے لیے ایصال ثواب کریں، ممکن ہو تو ان کی قبر پر جا کر باقاعدہ معافی مانگیں۔ ''سورۂ ملک'' پڑھ کر ان کو ہدیہ کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے والدین کی اطاعت اور ان کی دعائیں سمیٹنے والا بنائے۔ (آمین)

ہر بار۔ مزید قرضدار

O گزشتہ کئی برسوں سے جو کاروبار بھی کرتا ہوں وہ شروع میں تو اچھا چلتا ہے لیکن پھر آہستہ آہستہ کم ہوتے ہوئے نقصان میں آ کر ختم ہو جاتا ہے اور میں مزید قرض دار ہو جاتا ہوں، پہلے بیگم کا زیور، پھر پلاٹ، آخر میں گھر اور گاڑی بھی بک گئی اور ہم ڈھائی سو گز سے 64 گز کے معمولی سے کرائے کے گھر میں آ گئے ہیں، ہزارہا کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوتا، بہت عمدہ پلاننگ ہوتی ہے جو دوسروں کو بتاتا ہوں وہ ہٹ ہو جاتا ہے جو خود کرتا ہوں پٹ جاتا ہے، کوئی کہتا ہے جادو ہے تعویز ہے، کیا کروں۔ آپ کے متعلق بہت سنا ہے، اللہ کے واسطے میرا مسئلہ حل کر دیجئے۔ دعاگو رہوں گا۔ نصیر احمد۔ کراچی

☆ بھیا! دو باتیں ہیں آپ بہت اچھے منتظم اور اچھے پلانر ہیں لیکن آپ کا جو اسکل ہے وہ بڑے پیمانے پر کام کرنے کا ہے۔ آپ اپنے کاروبار کے بجائے کسی بڑے ادارے میں جاب کے لیے اپلائی کیجیے، دوسرے آپ کی ناکامی کی وجہ یہ بھی ہے کہ آپ ۱۷ برس پہلے بیمار ہوئے تھے۔ اس کا جسمانی علاج نہیں ہوا تھا بلکہ آپ کا روحانی علاج ہوا تھا لیکن اس کے بعد آپ جسمانی طور پر تو صحت مند ہو گئے لیکن بد اثرات کے دائرے سے نہیں نکل پائے۔ آپ ''سورۂ یٰسین'' سات مبین والی بعد نماز عشاء پڑھنی شروع کر دیں معاملات اچھے ہو جائیں گے۔ آپ کی خصوصی فرمائش پر لوح مشتری برائے کامیابی

اور روپے پیسے میں برکت کے لئے ارسال کی جارہی ہے۔

حالات اچھے تھے۔ تو بھول گیا

O میں آپ کا ایک مرید ہوں اور معافی کا خواہش گار ہوں کہ جب حالات اچھے تھے تو بھول گیا اب برے ہوئے ہیں تو پھر آپ کے پاس حاضر ہوں، میں نے اپنے ایک دوست کے ہمراہ کاروبار شروع کیا۔ اس نے سارا لین دین عملاً اپنے ہاتھ میں رکھا مگر ساری بینک ٹرانزیکشن میں کرتا تھا۔ چار سال کاروبار بہت اچھا چلا ہم لوگوں نے خوب پیسے کمائے۔ ہمارے کاروبار کی بہتری کو دیکھ کر میرے پارٹنر نے مجھے کچھ لوگوں سے ملوایا کہ یہ ہمارے کاروبار میں سرمایہ کاری کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں اپنے ایک کام کے لئے چودہ لاکھ کی ضرورت تھی۔ انہوں نے ہم سے معاہدہ کر کے ہمیں 20 لاکھ ادا کر دیئے جو میں نے بینک میں جمع کروا دیے، چند دنوں میں کام کی پے منٹس کے سلسلے میں پارٹنر نے تمام رقم نکال لی اور مجھے معلوم ہی نہ ہوا اس میں 6-6 ماہ کے 8 لاکھ کے بارہ تیرہ چیک بھی تھے۔ پھر اچانک۔ تھوڑے ہی عرصے میں جن لوگوں نے رقم دی تھی انہوں نے تقاضا شروع کر دیا اور جنہوں نے مال ہمیں بھیجا تھا ان کے چیکس واپس ہونا شروع ہو گئے، گھربار ہر چیز بک گئی مگر میرے اوپر قرض کا پہاڑ کھڑا ہے۔ کبھی ایک چیک کی ضمانت کرواتا ہوں، کبھی حوالات کی سیر کرتا ہوں۔ عزیز رشتے دار منہ موڑ چکے ہیں بیوی ساتھ دیتی ہے۔ بچے بری طرح سہم گئے ہیں کیا کروں سمجھ نہیں آتا۔ وہ پارٹنر ایسا غائب ہوا ہے کہ جیسے زمین کھا گئی ہو یا آسمان نگل گیا ہو۔ کیا کروں، کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے خودکشی کر لوں۔ کیا ایک بار پھر نظرِ کرم نہیں کریں گے۔ دعا کا طالب۔ محمد طالب حسین۔ حیدرآباد

☆ اچھے میاں! ہمارا ناراضی یا غصے سے کیا علاقہ، محبت اور مروت ہمارا مشرب ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام معاملات کو بہتر کرنے والا ہے۔ میرے رب کی رحمت سے پہاڑ جیسا قرض بھی ہو تو ادا ہو جائے گا۔ ”سبحان اللہ وبحمدہ، سبحان اللہ العظیم“ کثرت سے پڑھا کرو۔ بروز جمعرات ایک روٹی کا صدقہ کیا کرو اور اتوار کے دن ٹھیک 2 بجے تا 4 بجے گھر والوں کے ساتھ درود شریف پڑھا کرو اور پیر خانے کی دعا جو پونے چار بجے شروع ہوتی ہے اس وقت دعا شروع کرو پیر خانے میں بھی دعا ہوگی۔ تمام بہن بھائی جو کسی وجہ سے نہ آ سکیں یا بیرونِ ملک اشہر ہوں ان کو بھی تاکید ہے کہ 2 بجے تا 4 بجے محفل درود شریف منعقد کیا کریں۔ تمہارے کاروباری مسائل کو دیکھتے ہوئے لوحِ تسخیر خاص ارسال کی جارہی ہے۔

معاملہ ختم۔ صحت بحال

O میری بچی ماشاء اللہ خوبصورت قدبُت کی ہے، ماسٹرز کیا ہے۔ مگر جب بھی اس کے رشتے کی بات فائنل ہونے لگتی ہے وہ بیمار پڑ جاتی ہے۔ چہرے کی رنگت نچڑ جاتی ہے سانس پھولنے لگتا ہے، ہاتھ پیروں میں ٹھنڈے پسینے آنے لگتے ہیں۔ چہرے پر پانی والے دانے نکلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اسکن اسپیشلسٹ، ماہرِ نفسیات سب کو دکھایا لیکن افاقہ نہیں ہوتا۔ مگر جونہی شادی کا معاملہ ختم ہو جاتا ہے صحت بحال ہونا شروع ہو جاتی ہے، لوگ کہتے ہیں جادو تعویز کا اثر ہے۔ اگر ایسا ہے تو علاج عنایت کیجیے تاکہ شادی کا مسئلہ حل ہو جائے۔ آپ کی بہن دعا گو

☆ اچھی بہن! معاملہ تو واقعی تشویشناک ہے۔ آپ کی صاحبزادی آسیبی کیفیت کا شکار ہیں۔ شریعت قطعی برہنہ ہو کر نہانے سے منع کرتی ہے۔ اسی لیے شریعت نے قضائے حاجات کے لیے مسنون دعائیں تلقین کی ہیں لیکن بدقسمتی سے ہم احتیاط نہیں کرتے، جس کا نتیجہ ہمیں بھگتنا پڑتا ہے۔ آپ کو نظرِ بد، جن اور آسیبی معاملات کے لیے ایک ورد، پینے کے، غسل کے، جلانے کے تعویز بذریعہ ڈاک بھیجے جارہے ہیں۔ اس پر پابندی سے عمل کیجیے۔ انشاء اللہ بچی کے معاملات 90 روز میں بہتر ہو جائیں گے۔

مطلبی مرید۔ نامیاں نا

O بیرونِ ملک جانے کی بڑی خواہش ہے مگر کئی برسوں کی کوشش کے باوجود بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ ہزاروں روپے ایجنٹوں کے چکر میں برباد کر چکا ہوں، ایک بار بڑی مشکل سے یونان پہنچا مگر ڈی پورٹ کر دیا گیا۔ والد صاحب کا کہنا ہے کہ یہیں کوئی کام کر لو مگر میری بھی یہی ضد ہے کہ کام باہر ہی کروں گا۔ اس وجہ سے ابا بھی ناراض رہتے ہیں۔ کیا اس کا کوئی حل ہے آپ کے روحانی اور قرآنی اعمال کا بہت سنا ہے آپ میرا کام کر دیں تو میں آپ کا مرید ہو جاؤں گا۔ رضوان محمود۔ نواب شاہ

☆ نامیاں نا! ہمیں مطلبی مریدوں کی ضرورت نہیں۔ اللہ پاک آپ کے معاملات حل فرمائے۔ ترکیب ہم بتا دیتے ہیں۔ ایجنٹوں کا چکر چھوڑیں جو ابا کہتے ہیں مان لیں اور کاروبار شروع کر دیں جب ابا خوش ہو جائیں تو ان کی مرضی سے بیرونِ ملک کے لیے اپلائی کر دیں، کامیاب ہو جائیں گے، یاد رکھیں والد کا غضب اللہ کا غضب اور والد کی اطاعت اللہ کی خوشنودی ہے۔ آپ کی بے حد فرمائش پر لوحِ تسخیر خاص ارسال کی جارہی ہے۔

شادی۔ ورنہ خودکشی

O کئی دنوں سے ایک ایسی پریشانی میں پھنس گئی ہوں کہ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں، میرا بیٹا میری بہو کی بہن کو پسند کرتا ہے مگر وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے آپس میں رشتے داری کی وجہ سے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ شادی طے ہے۔ مگر میرے بیٹے کی ضد یہی ہے کہ وہ روزینہ ہی سے شادی کرے گا۔ دو مرتبہ خودکشی کی کوشش کی مگر اللہ کے فضل نے اسے بچالیا۔ میرے دو بیٹے اور ایک ہی بیٹی ہے، بہو اور بیٹے کا رویہ بدل گیا ہے، بیٹا کہتا ہے کہ اس بے عزتی سے بہتر ہے کہ میں علیحدہ

ہو جاؤں، دوسری طرف وہ لوگ بھی ہم سے ناراض ہو رہے ہیں کہ ہم اپنے بیٹے کو سمجھاتے نہیں ہیں مگر ہم کیا کریں، سچی بات تو یہ ہے بھائی صاحب کہ اگر میرے بیٹے کو محبت کا حق حاصل ہے تو ان دونوں کو بھی یہی حق حاصل ہے پھر یکطرفہ محبت سے فائدہ کیا؟ اذیت کے علاوہ کیا ملتا ہے۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ اس کے لئے کوئی ایسا روحانی حل تجویز کریں کہ یہ سب خوش رہیں۔ سلمیٰ پروین۔ راولپنڈی

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ تمام والدین کو اولاد کے دکھ سے محفوظ و مامون رکھے۔ آپ ہر نماز کے بعد 140 مرتبہ "یا کریم یا سلام یا ھادی یا مانع" پڑھ کر دعا کیا کریں اول آخر 9 مرتبہ درود شریف۔ بیٹے کی اصلاح کے لئے لوح تسخیر خاص ارسال کی جا رہی ہے۔ بیٹی کے امتحانات میں کامیابی کے لئے لوح عطارد ارسال ہے۔

آیا امتحان۔ ہوگئی چڑچڑاہٹ

O میری بیٹی اور بیٹا نویں، دسویں کے طالب علم ہیں ٹیسٹ میں ان کے نمبر بہت اچھے آتے ہیں مگر امتحان کے دنوں میں طبیعت سست، بے چین ہو جاتی ہے چڑچڑے ہو جاتے ہیں نیند بہت آنے لگتی ہے جو یاد کرتے ہیں وہ بھول جاتے ہیں پتا نہیں کہ بچوں کو نظر لگ گئی ہے یا کوئی جادو ہے۔ آپ کوئی روحانی علاج تجویز کر دیجئے۔ عذرا آفتاب۔ فیصل آباد

☆ بہن! ہر نماز کے بعد 13 مرتبہ "سورۃ الم نشرح" پانی پر دم کر کے پلائیں، بے وجہ نصیحتوں اور دباؤ سے گریز کریں۔ دونوں کو 7 باداموں پر "یا علیم یا قوی" 100 مرتبہ دم کر کے دے دیا کریں آپ کی فرمائش پر لوح عطارد ارسال کی جا رہی ہے۔ گیارہویں شریف کے لئے آپ کے ہدیے کا شکریہ

میاں۔ اڑیل مزاج

O میری شادی کو 9 برس ہو گئے ہیں مگر کوئی سکھ نصیب نہیں ہوا۔ میاں عجیب سے اڑیل مزاج ہیں جو بات منہ سے نکل جائے بس وہی ہونا ہے۔ چاہے غلط ہو یا صحیح ہر معاملے میں ٹانگ اڑانا اپنا فرض سمجھتے ہیں پہلے رشتے دار ناراض تھے اب سگے بہن بھائی بھی ملنا چھوڑ رہے ہیں۔ دوسروں کی بیویوں کو ٹوکنا لازمی سمجھتے ہیں سب میرے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ تم سمجھاتی کیوں نہیں ہو اپنے میاں کو مگر میری کوئی اوقات ہو تو میں سمجھاؤں، بس ایک نوکرانی ہی ہوں، ضرورت کے تحت میرے پاس آتے ہیں اور اس میں بھی رویہ ایسا ہوتا ہے کہ ذہن اور بدن احساسِ ذلت سے سلگ جاتا ہے، نہ نماز نہ روزہ اوپر سے دین کی من مانی تشریح جو صرف اپنے مفاد کے مطابق ہو۔ جاہل نہیں ہیں اپنے مضمون کے پی ایچ ڈی ہیں دنیا ان کے علم و فضل کی دیوانی اور گھریلو معاملات میں صفر، کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ خودکشی کر لوں مگر پھر سوچتی ہوں میرے بچوں کا کیا قصور اگر باپ کی شفقت نہیں ملتی تو ماں کی ممتا سے کیوں محروم کروں۔ کیا اس کا علاج ہے آپ کے پاس میں تو دعائیں کر کر کے تھک گئی ہوں ایک بزرگ کی طرح میری مدد فرمائیں۔ شاہین اسلم۔ کراچی

☆ بیٹی جیتی رہو! تم جیسی بچیوں سے معاشرہ سلامت ہے تمہارے میاں اصل میں احساسِ کمتری کے مریض ہیں، اوپر سے اللہ تعالیٰ نے انہیں اعلیٰ تعلیم اور نوکری سے نواز دیا۔ چنانچہ ان کا خیال ہے کہ ہر شخص خصوصاً خاندان والے چونکہ ان کی خامیاں کمزوریاں ان کے علم میں ہیں لہٰذا ان کا فائدہ اٹھا کر تضحیک کرنا اپنا شعار بنا لیا ہے۔ ہرگز خودکشی کی نہ سوچنا اللہ میاں بہت غفور الرحیم ہے۔ ہر نماز کے بعد صرف 14 مرتبہ "درود شریف تاج" پڑھ کر ان کا تصور کر کے دم کر دیا کرو خصوصاً جب "دافع البلاء والوباء والقحط والمرض والالم" تک پہنچو تو تین بار تکرار کرو اصلاح کے لئے لوح تسخیر خاص اور نقوشِ زعفران ارسال کئے جا رہے ہیں۔ یقین رکھو اللہ پاک اچھا اجر دیں گے۔

اسکول کی لڑکی۔ خواب میں آئے

o میرے ساتھ کچھ عرصے سے عجیب سا واقعہ ہونا شروع ہو گیا ہے۔ جس کی وجہ سے میرا سکھ چین غارت ہو گیا ہے، میں اپنے گھر، بیوی، بچوں سے بے حد خوش ہوں، مگر گزشتہ ڈیڑھ سالوں سے میرا ہر پل عذاب ہو گیا ہے ہم میرپور خاص میں رہتے تھے، پھر والد صاحب کے تبادلے کے ساتھ یہاں آگئے، تعلیم وغیرہ سب یہیں حاصل کی، شادی ہوگئی۔ ایک دن اچانک بازار میں پرانے شہر کے ایک واقف مل گئے بچپن میں ہم سب ایک ہی گلی میں رہتے تھے، وہ میرے گھر آئے میں ان کے گھر گیا تو معلوم ہوا ان کی شادی ہماری ہی ایک سکول فیلو سے ہو گئی تھی، سچی بات تو یہ کہ مجھے اس کی شکل تک یاد نہیں تھی، مگر جب انہوں نے ملوایا تو ایک عجیب سا احساس ہوا، مجھے یاد آیا کہ وہ کالی سی سوکھی سی مریل سی لڑکی ہوا کرتی تھی مگر اب وہ ایک بھرپور خاتون تھی، ملاقات چائے، کھانے کے بعد ہم گھر واپس آگئے مگر وہ میرے ذہن سے چپک

ضروری نوٹ

اپنا مختصر مسئلہ اپنے مکمل نام معہ والدین اور تاریخ پیدائش کے ساتھ ارسال کریں۔ اس کالم میں جواب باری آنے پر دیا جاتا ہے۔ براہ راست جواب کے لیے اپنا پتا لکھا ہوا جوابی لفافہ بھیجیے۔ فون پر مسئلہ نہیں سنا جاتا ہے، خط لکھیں یا ملاقات کریں۔ بیرون شہر سے آنے والے وقت لے کر تشریف لائیں۔ بیرون ملک مقیم خواتین و حضرات اپنا مکمل پتا ارسال کریں۔

پیر شاہ محمد قادری A/2-382، جوہر ٹاؤن،
نزد محمد علی چوک، کالج روڈ۔ لاہور۔ تعطیل بروز جمعۃ المبارک
0302-5555967

گئی، اب ہر رات خوابوں میں آتی ہے، میں اندر ہی اندر گھٹتا جا رہا ہوں وہ میرے دوست کی بیوی ہے، پھر میرا اس کا تعلق ہی کیا مگر جس قدر بھی نظر انداز کروں اس کے خیال کو کچلوں وہ میرے اعصاب پر سوار ہے، خدا کے لئے میرا گھر تباہ ہونے سے بچا لیجئے۔ محمد جنید۔ کراچی

☆ عزیزم! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں یہ ایک ذہنی صدمے کا ردعمل ہے بقول آپ کے وہ کالی سوکھی مریل سی لڑکی کو آپ اس روپ میں دیکھنے کو تیار ہی نہیں تھے مگر جب آپ نے اس کو اچانک دیکھا اس کی جاذبیت نے آپ کو اپنی گرفت میں لے لیا یہ تو ہے آپ کے مسئلے کی توجیح روحانی حل یہ ہے آپ رات سونے سے قبل بکثرت "ایاک نعبدو ایاک نستعین اھدنا الصراط المستقیم" پڑھا کریں۔ آپ کے لیے لوح زہرہ ارسال ہے۔

ٹیچر کی محبت۔ گرفتار

بات اچھی تو نہیں ہے مگر جب مشورہ لیا جائے تو سچ کہے بغیر چارہ نہیں اور آپ سے تو ویسے بھی میں جھوٹ بولنا گناہ سمجھتی ہوں، آپ کی فیس بک اور ویب سائٹ بہت پسند ہے میں غائبانہ آپ کی مرید ہوں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے اپنے ٹیچر سے محبت ہوگئی ہے وہ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں حالانکہ وہ شادی شدہ ہیں اور دو بچوں کے باپ ہیں۔ ہمارے اور ان کے درمیان بہت فاصلہ ہے، وہ پانچ مرلے کے کرائے کے پورشن میں رہتے ہیں اور ہمارا گھر دو کنال پر ہے، اس سے آپ اندازہ لگالیں مگر دل کا کیا کروں کہ وہ میرے قابو میں نہیں ہے، ان کی نرمی، محبت اور توجہ نے مجھے ان کی محبت میں گرفتار کرلیا ہے۔ مگر وہ میری طرف توجہ ہی نہیں دیتے، ایک بار میں نے ان سے کہنے کی کوشش کی تو انہوں نے صرف اتنا کہا کہ جو چیز میں افورڈ نہیں کرسکتا اس پر نہ توجہ دیتا ہوں اور نہ ہی اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں، ان کی اس بے نیازی نے مجھے اور بھی ان پر مائل کردیا ہے، میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ دن رات ان کے فراق میں تڑپتی رہتی ہوں، آپ مدد کریں۔ نوشابہ۔ شہر نا معلوم

☆ کریم آقا حضرت محمد ﷺ کی حدیث مبارک کا مفہوم ہے، آدمی کے تین باپ ہیں، ایک وہ جس کے صلب سے وہ پیدا ہوتا ہے ایک وہ جو اسے تعلیم دیتا ہے اور ایک وہ جو اس کو بیٹی دیتا ہے، آپ کی محبت درست ہے مگر زاویہ درست نہیں، اپنا نقطہ نظر بدل لیجیے، زندگی آسان ہو جائے گی، آپ کے لیے لوح زحل ارسال کی جا رہی ہے، آپ ہماری بیٹی ہیں اور بیٹیوں سے ناراض نہیں ہوتے، مرید ہونے کے لیے اپنے والدین کے ہمراہ آئیں۔

بے بسی، بدشکلی۔ موت مقدر

O برسوں سے بیمار ہوں، بدن بے جان ذائقہ خراب، کھال جیسے جلتی ہوئی، معدے میں گرہیں پڑتی رہتی ہیں، پانی بے تحاشہ پیتی ہوں، پیٹ بے ڈول ہوگیا ہے، آنکھیں اندر کو دھنس گئی ہیں، بدن پھول ہوگیا ہے، کوئی کہتا ہے جادو ہے، کوئی کہتا ہے کالا علم کیا ہوا ہے، شادی نہیں ہوئی ہے جو آتا ہے مسترد کر جاتا ہے، زندگی عذاب بن گئی ہے، ایک محبت ہوئی تھی سترہ برس کی عمر میں مگر اماں، ابا کی ضد نے رشتہ نا ہونے دیا، ان دنوں میں بے حد خوبصورت، دلکش، خوش مزاج تھی مگر اب ناکام، مایوس، اور بدشکل ہوں، کیا میرا کوئی علاج ہے یا بے بسی اور بد شکلی میں مرجانا ہی میرا مقدر ہے یا پھر جادو اتنا طاقتور ہے کہ اس پر کوئی روحانی عملیات اثر انداز ہی نہیں ہوتے ہیں؟ صدف۔ شکار پور

☆ بیٹی! از روئے استخارہ یہ بات سامنے آئی ہے کہ آپ کا یہ سارا مسئلہ آپ کا رشتہ مطلوبہ جگہ نہ ہونے کے باعث ہے آپ اپنا آسیب خود ہیں پانی کی غیر ضروری مقدار کم کریں، سبزیاں استعمال کریں ایک دن چھوڑ کر روزہ رکھیں۔ ہر نماز کے بعد "یا سلام یا قوی" 172 مرتبہ پڑھیں۔ شادی کے معاملے میں بہتری کے لیے لوح تسخیر خاص ارسال کی جا رہی ہے۔ آپ چند ہفتوں میں ایک پیاری اور خوش شکل بیٹی بن جائیں گی، جس کی سب آرزو کریں گے۔

ایسا تبرک۔ ایسی زیارت

O میری عمر تیس سال ہوگئی ہے، شکل وصورت خاندان سب ٹھیک ہے لیکن اس کے باوجود رشتے آتے ہیں اور مسترد کر کے چلے جاتے ہیں ایک بار بات منگنی تک پہنچی تھی مگر پھر لڑکے نے انکار کر دیا، وجہ یہ بتائی کہ استخارہ ٹھیک نہیں آرہا ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں، دونوں چھوٹی بہنوں کی شادی ہو چکی ہے، بھائی اٹھائیس برس کا ہو رہا ہے۔ اس کا نکاح کیے ہوئے 2 سال ہوگئے ہیں۔ اب لڑکی والے رخصتی کا تقاضا کر رہے ہیں مگر کیا کریں؟ والدہ کا کہنا ہے کہ دونوں، بہن بھائیوں کی شادی ایک ساتھ کرنا ہے مگر میں جنم جلی کیا کروں؟ میری وجہ سے میری اکلوتی بھاوج مجھ سے بدظن ہو رہی ہے، بھائی بھی چپ چپ رہتا ہے کیا اس کا کوئی روحانی علاج ہے؟ میں بہت پریشان ہوں آپ سے التجا ہے اس کا حل بتائیے سنا ہے کہ آپ کی گیارہویں شریف کی برکت سے رشتے ہوتے ہیں فیس بک سے معلوم ہوا کہ آپ کے ہاں کوئی ایسا تبرک کوئی ایسی زیارت ہے جو کہیں اور نہیں ہے۔ آپ کی بیٹی۔ ستارہ۔ لاہور کینٹ

☆ بیٹی! پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ "......" نامرادی کو اپنے ذہن سے قطعی نکال دیں۔ از روئے استخارہ آپ کے معاملات میں ستاروں کی نحوست اور نظر بد کے باعث شادی میں تاخیر ہے لیکن آپ ہرگز پریشان نہ ہوں۔ آپ کی شادی کے معاملات کے لئے لوح اور نقوش ارسال کیے جا رہے ہیں، ہمارے آستانے شریف میں سیدنا آدم علیہ السلام کے نقش پا کی شبیہ مبارک اللہ کے فضل سے موجود ہے جس کی زیارت کا آغاز 12 ربیع الاول کے دن پیران عظام، مشائخ کرام، جید علماء کرام کی محبتوں سے ہوا۔ اب بروز اتوار بعد محفل درود شریف اور دعا تمام حاضرین زیارت بھی کرتے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کے وسیلے سے منت بھی مانتے ہیں آپ تو لاہور میں ہیں تشریف لا کر زیارت کر سکتی ہیں۔

دبئی۔ ہر ماہ یا دو ماہ؟

O میرا مسئلہ کچھ ایسا ہے کہ جس کے باعث میں بڑی الجھن میں ہوں ہم اپنی تمام جمع پونجی اٹھا کر یہاں دبئی آگئے، یہاں آکر ایک عربی کفیل کے ساتھ کام شروع کیا، دن رات محنت کی ہمارا ایک چھوٹا سا بقالہ ایک بڑے سپر سٹور میں تبدیل ہوگیا، جب آمدنی اچھی ہوئی تو اس کی نیت بدل گئی اب وہ ہمیں مختلف حیلے بہانوں سے تنگ کرتا ہے، پچھلے ماہ تو اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہم اس کے ہاتھ یہ سٹور فروخت کر دیں لیکن ہم ایسا کرنا نہیں چاہتے ہیں۔ ہم اپنی برسوں کی محنت ضائع نہیں کر سکتے ہیں اس کا کوئی روحانی علاج فرمائیں کیا آپ دبئی ہر ماہ آتے ہیں یا دو ماہ کے بعد ہمیں ضرور مطلع فرما دیں۔ ہم آپ کے منتظر ہیں۔ رقیہ شہناز۔ دبئی

☆ عزیز بہن! یہ ساری پریشانی عارضی ہے اللہ تعالیٰ فضل فرمائیں گے "یا رافع یا فتاح" ہر نماز کے بعد 140 مرتبہ پڑھ کر دعا کر لیں آپ کے لئے لوح تسخیر خاص ارسال ہے۔ دبئی ہر دو ماہ کے بعد آنا ہوتا ہے دوبئی میں البرشا اور عجمان، ابوظہبی میں تین تین دن کا قیام ہوتا ہے۔ آپ کا نمبر ہمارے پاس محفوظ ہے جب دوبئی آئیں گے آپ کو مطلع کر دیا جائے گا۔

جادو کیا ہے؟

O میں نے فجیرہ میں ایک دوکان لی ہے ہیئر کٹنگ کی، اس کی لانڈری بھی بنائی ہوئی ہے دو تین سال کام اچھا رہا بھائی سہیل نے آپ سے تعارف کروایا تھا، آپ کی دعاؤں سے اللہ پاک نے بہت نوازا لیکن جب سے جون 2015 ختم ہوا ہے میرے کاموں کو جیسے بریک لگ گئے ہیں سیل اتنی گھٹ گئی ہے، بعض اوقات تو خرچہ نکالنا بھی مشکل ہو جاتا ہے، ایک دن مکان کی صفائی کے دوران بیسن کے نیچے ایک کپڑے کا گڈا پڑا ہوا ملا تھا، جس میں سے عجیب سی بدبو آرہی تھی۔ مجھے لگتا ہے کہ کسی نے مجھ پر جادو کیا ہے، آپ مہربانی فرما کر جلدی سے اس کا علاج کر دیجیے، پیر صاحب میں بہت پریشان ہوں، آپ کی دعاؤں کا منتظر۔ محمد فیاض۔ الفجیرہ

☆ فیاض میاں! اللہ تعالیٰ آپ کو حاسدوں کے شر سے بچائے، آپ روزانہ "سورہ بقرہ کا آخری رکوع" دوکان کھول کر پڑھا کریں اور چینی اور دار چینی سوا کلو، سوا پاؤ، بروز جمعرات صدقہ کیا کریں، آپ کے لیے

روحانی عمل تجویز کر دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔ سہیل میاں کو ہماری دعائیں۔

ہزاروں۔ لائیکس

O پیر صاحب! ہم نے بڑی مشکلوں سے خود کو یہاں سیٹل کیا ہے۔ پیسا پیسا جوڑ کر ایک گھر اور ایک موٹیل بنایا ہے، لیکن ہمارا پارٹنر بے ایمان ہو گیا ہے ابتدائی چند قانونی مجبوریوں کے باعث سارے کاغذات اس کے نام سے بنوائے اور اب یہی چیز ہمارے گلے پڑ گئی ہے، پچھلے دنوں فیس بک پر آپ سے تعارف ہوا۔ داتا سرکار کے مرقد منور پر آپ کی حاضری کی تصویر نے دل کو چھو لیا، دیکھا تو معلوم ہوا کہ آپ کے چاہنے والے آپ کی تصویروں کو ہزاروں کی تعداد میں لائک کرتے ہیں، یقیناً آپ پر داتا سرکار کا خصوصی کرم ہے، آپ میرے لیے بھی کچھ کریں تاکہ میرا مسئلہ حل ہو جائے۔ نوازش علی۔ شکاگو، امریکا

☆ نوازش میاں! اللہ تعالیٰ آپ پر ہمیشہ نوازشوں اور رحمتوں کی بارش رکھے، یہ سب بزرگانِ دین کا فیضان ہے، میرے رب کی، میرے والدین کی دعاؤں کے طفیل ہے، کہ لوگوں سے محبت ملتی ہے، آپ ہرگز پریشان نہ ہوں، ہر نماز کے بعد 13 مرتبہ "سورۂ لہب" پڑھ کر دعا کر لیا کریں، آپ کی فرمائش پر لوح سبع ستارگان ارسال کی جا رہی ہے۔ بہن کے رشتے کے سلسلے میں کوائف نوٹ کر لیے ہیں۔

روحانی توجہ کیجیے۔

O پیر صاحب! آپ سے کافی عرصہ قبل گیارھویں شریف میں ملاقات ہوئی تھی، پھر نانا جان سیدنا تاج الدین اولیاء ناگپوریؒ کے عرسِ مبارک میں آپ سے ملاقات ہوئی تھی، سیکڑوں افراد کے باوجود آپ نے سب سے ملاقات کی بہت عمدہ انتظام تھا۔ مجھے آپ کے مرید بھائی محمود رشید صاحب نے ۱۲ ربیع الاول کا نقش محمد معہ ۱۲ روپے عطا کیا، واقعی اس کو پرس میں رکھنے سے میرا پرس کبھی خالی نہیں رہا، لیکن پیسوں کے علاوہ ایک مسئلہ اور ہے۔ میری بیگم ایک معمولی سی بات پر ناراض ہو کر میکے چلی گئی ہیں اور واپسی سے انکاری ہیں کہتی ہیں پہلے سب شرطیں پوری کروں پھر آؤں گی، حالانکہ ہماری ازدواجی زندگی کے بارہ سال بہت عمدہ گزرے ہیں، مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے کسی نے ہمارے درمیان کوئی عمل کروایا ہے، آپ اپنی روحانی توجہ سے ہمارے گھر کو بچا لیجیے اور کوئی اسم الٰہی اور نقش عطا کیجیے۔ حمید اللہ۔ ڈگری سندھ

☆ پیارے حمید! آپ کا یہ سارا مسئلہ حسد کے باعث ہوا ہے، اور آپ دونوں میاں بیوی کے درمیان آپ کے ہی کسی جاننے والے نے جادو کروایا ہے، یہاں یہ بات عرض کروں دنیا کا پہلا جادو ہاروت و ماروت نے لوگوں کو بتایا تھا۔ وہ میاں بیوی کے درمیان نفرت و عداوت پیدا کرنے کا تھا، یہاں ایک بات اور بھی عرض کروں کہ کبھی کسی کی دل آزاری نہ کیجیے اس سے غصے اور حسد کے جذبات پیدا ہوتے ہیں جو فرد کو انتقامی راستہ اپنانے پر مجبور کر دیتے ہیں، آپ ہر نماز کے بعد 140 مرتبہ "یا جامع یا عزیز" پڑھیں آپ کے لیے جادو اور معاملات کی بہتری کے لئے لوح ارسال کی جا رہی ہے۔ نقش محمد کا نقش صرف ۱۲ ربیع الاول کے دن ہی آستانہ شریف سے تقسیم کیا جاتا ہے۔ یہ ڈاک سے ارسال نہیں کیا جاتا ہے۔

منگنی۔ ٹوٹ جائے گی

O میری منگنی کو 5 سال ہو گئے ہیں، شروع میں تو بڑی محبت اور اخلاص کا مظاہرہ ہوتا تھا، لیکن گزشتہ 2 برسوں سے یوں لگتا ہے کہ جیسے بالکل خاموشی ہو گئی ہے، اب اگر ہم لوگ رابطہ کرتے ہیں تو بات ہوتی ہے وہ بھی چند منٹ کی، دو تین مرتبہ والد صاحب نے پوچھا بھی کہ اگر منگنی قائم رکھنے کی ضرورت نہیں ہے تو بتا دیجیے مگر وہ ٹال جاتے ہیں۔ میری شادی کے لئے محفل درود شریف میں دعا بھی کر دیجیے گا، اگر کسی روحانی علاج کی ضرورت ہے تو وہ بھی دے دیجیے گا۔ رضیہ کوثر۔ کوٹری سندھ

☆ عزیز بیٹی! موجودہ جگہ منگنی ٹوٹ جائے گی، مگر آپ کی شادی کا مسئلہ اللہ کے کرم سے ضرور حل ہوگا۔ ہر نماز کے بعد 140 مرتبہ "یا لطیف یا فتاح" پڑھ کر دعا کر لیں، آپ اپنے ماموں کے گھر رشتے کی بات چلائیں۔ انشاء اللہ بہتر ہوگا، روحانی علاج کے لیے آپ کو لوح، نقوش اور تعویزات ارسال کیے جا رہے ہیں ان کو حسبِ ہدایت استعمال کیجیے گا۔

آسیبی امراض میں مبتلا

O میرے سارے جسم میں سوجن ہو گئی ہے، ڈاکٹر کہتے ہیں کہ جگر خراب ہو گیا ہے مگر تین سال سے علاج ہو رہا ہے، کوئی افاقہ نہیں ہوتا بلکہ اب تو جگر کے ساتھ ساتھ گردے بھی متاثر ہونے لگے ہیں، جوڑوں میں مسلسل تکلیف رہتی ہے، دو بچے ہیں 5 برس اور 11 برس کے آپ کو اندازہ ہی ہوگا کہ کس قدر بھاگ دوڑ ہوتی ہے۔ میاں صبح 7 بجے فیکٹری کے لیے نکلتے ہیں تو رات گئے آتے ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں والدہ اور ساس کہتی ہیں کہ روحانی علاج کراؤ پھر ہی فائدہ ہوگا۔ میرا تو کوئی رشتے دار لاہور میں نہیں ہے۔ آپ کے متعلق عائشہ تالے والی نے بتایا تھا انہوں نے لاہور میں ہی پانچ دن رہ کر آپ سے علاج کروایا تھا، کیا آپ کراچی نہیں آتے؟ ہمیں بھی آپ کی بہت ضرورت ہے، جواب ضرور دیجیے گا۔ ثوبیہ اکرام۔ اورنگی ٹاؤن کراچی

☆ اچھی بیٹی! اللہ تعالیٰ آپ کو صحتِ کاملہ کی دولت سے نوازے (آمین) آپ ہرگز مایوس نہ ہوں اللہ پاک آپ کو صحت والی طویل زندگی عطا فرمائیں گے۔ انشاء اللہ لہسن کی چٹنی دانہ میتھی سے بگھار کر ہمراہ بیسن کی روٹی جس میں سبز مرچیں اور ہری پیاز مع پتے ڈالی گئی ہو اس کو

بطور غذا استعمال کریں، چالیس روز کچھ اور نہ کھائیں، پانی حسبِ ضرورت پئیں، رات سوتے وقت 2 چمچ اسپغول کھائیں، "یا قوی یا مقیت" ہر نماز کے بعد 140 مرتبہ پڑھیں، آپ کی بیماری کی وجہ یہ ہے کہ آپ کسی ایسی چیز سے گزر گئی تھیں جو کہ کسی نے اپنی بیماری کے اتار کے لیے راستے میں پھینکی تھی، لوح شفاء، نقوش زعفران ارسال ہیں حسبِ ہدایت استعمال کریں، جو خواتین و حضرات بیمار ہیں یا آسیبی امراض میں مبتلا ہیں وہ ضرور آستانے پر آتے ہیں اس کا علاج تین سے پانچ روز ہوتا ہے، جو نہیں آپاتے انہیں نقوش ارسال کردیے جاتے ہیں۔

ائیر ہوسٹس کا شوق

O پیر صاحب! میرا مسئلہ ذرا عجیب ہے، اللہ تعالیٰ نے مجھے خوب صورتی اور سلیقے سے نوازا ہے، میری تعلیم بی اے ہے، مجھے ائیر ہوسٹس بننے کا شوق ہے، میری سہیلیاں کہتی ہیں کہ تمہیں ضرور اپلائی کرنا چاہیے تم تو ہماری پری ہو، میری منگنی ہوگئی ہے، لیکن جہیز کے لیے کچھ نہیں، اماں نے بھی یہ سوچ کر اجازت دے دی ہے کہ چلو جہیز کے لیے چار پیسے جمع ہوجائیں گے۔ آپ ضرور میری مدد فرمائیں۔ شمع۔ جام شورو سندھ

☆ آپ ہر نماز کے بعد 140 مرتبہ "یا کریم یا رافع" پڑھ کر دعا کیا کریں اول آخر گیارہ مرتبہ درود شریف، لوح تسخیر خاص ارسال ہے۔ جب گھر کے اجالے کو شمع محفل بننے کا شوق ہو تو کیا کیا جاسکتا ہے۔

پاسپورٹ مل گئے

O میرے شوہر امریکا میں رہتے ہیں گزشتہ دس برسوں سے ہمارے لیے مسلسل کوشش کر رہے ہیں مگر ہر بار کوئی نا کوئی رکاوٹ کھڑی ہوجاتی ہے ایک بار انٹرویو بھی ہوچکا ہے مگر اس کے باوجود کال نہیں آئی، تین ہفتوں کے بعد پاسپورٹ واپس مل گئے۔ امریکا میں جو وکیل ہے اس کا کہنا ہے کہ ہوجائے گا۔ آپ پریشان نا ہوں، ہزاروں کیس ہوتے ہیں بات ٹھیک ہے لیکن اب تب کے چکر میں بچوں کی پڑھائی کا بہت ہرج ہو رہا ہے، اس لیے کوئی ایسا روحانی علاج فرمائیں کہ جس سے ہماری امیگریشن کا مسئلہ حل ہوجائے اور ہم لوگ امریکا پہنچ جائیں، پچھلے دنوں کوہ نور ٹی وی پر آپ کا پروگرام۔ اسماء الحسنیٰ کامیابی کا راستہ دیکھا تھا تب سے آپ کا فون اور پتا محفوظ کرلیا تھا، امید ہے کہ آپ ضرور توجہ فرمائیں گے۔ نور جہاں۔ سکھر

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ جملہ معاملات کو آسان فرمائے۔ ہر نماز کے بعد 170 مرتبہ "درود شریف ابراہیمیؑ" پڑھ کر دعا کریں، آپ کو لوح سبع ستارگان ارسال کی جارہی ہے، دعاؤں کا شکریہ

O میرا بیٹا یکم دسمبر کو پیدا ہوا ہے، میں اس کا نام ستارے کے حوالے سے رکھنا چاہ رہی ہوں، آپ کی کتاب بچوں کے خوب صورت نام میرے پاس موجود ہے اگر آپ کوئی نام تجویز فرمادیں تو اس میں زیادہ برکت ہوگی۔ آپ کی بہن۔ خدیجہ بیگم۔ راولپنڈی

☆ اللہ تعالیٰ آپ کے بیٹے کو صحت اور سلامتی والی طویل زندگی عطا فرمائے، ستارے سے زیادہ خوشنودی رب مقصود ہونی چاہیے۔ اللہ پاک کا پسندیدہ نام رکھ لیجیے "محمد عبداللہ" اللہ پاک مبارک فرمائے۔ دعاؤں اور گیارھویں شریف کے ہدیے کا شکریہ

محبت خفا ہوگئی

O سچی بات کہوں گا۔ غلطی میری تھی ہم دونوں بچپن کے محلے دار تھے، دیوار سے دیوار ملی ہوئی تھی، لوگ محبت کی کامیابی کے لیے بڑے جتن کرتے ہیں مگر میری محبت اتنی کامیاب ہوئی ثابت ہوئی کہ والدین نے شرط لگائی جب تک Msc نہیں کرلو گے، نوکری نہیں مل جائے گی تب تک کچھ نہیں ہوگا، اچھے نمبروں سے کامیاب ہوگیا، اس نے بھی اپنی گریجویشن مکمل کرلی، مجھے ایک معروف فرم میں جاب مل گئی گھر والوں نے ہماری منگنی کردی، ہماری محبت اتنی آسانی سے مل جائے گی ہم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا، منگنی کے تین ماہ کے بعد عید کی سات تاریخ کو ہماری شادی بھی طے ہوگئی تھی، گھر والوں نے ہمارے ملنے جلنے پر کوئی پابندی نہیں لگائی تھی، اس لیے ہم بہت خوشی اور سرشاری سے ملتے تھے، پھر ایک دن اسی خوشی اور سرشاری سے مجھ سے ایک ایسی غلطی ہوگئی کہ جس کی وجہ سے اس نے مجھ سے ناتا توڑ لیا، منگنی کی انگوٹھی میرے منہ پر دے ماری میری نازک سی چھوٹی موٹی سی محبت نے اس قیامت کا روپ لیا کہ میرے رونے دھونے معافی تلافی کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا، اس نے مجھ سے صرف ایک جملہ کہا کہ میں جیتے جی مرگیا، جو مردنیت کا روزہ نہیں رکھ سکتا میں اس کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی، تم میری نظروں سے گر گئے ہو، جو مرد عورت کی نگاہ سے گر جائے اسے نہ کوئی معافی اٹھا سکتی ہے اور نہ ہی کوئی سفارش، دور ہوجاؤ میری نظروں سے، آج اس بات کو 9 برس ہوچکے ہیں، مسلسل آگ میں جل رہا ہوں، کوئی توبہ، کوئی معافی میرے لیے ہے؟ دن رات اذیت میں ہوں اس دوران والدین کا انتقال ہوگیا، کوئی نہیں جانتا کہ اس نے انکار کیوں کیا، وہ ایک پہیلی بن گئی ہے، پانچ سال قبل انہوں نے مکان بھی تبدیل کرلیا مگر ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے، میں مسلسل جل رہا ہوں کیا مجھے اس اذیت سے نجات مل جائے گی۔ ن۔ ح۔ شہر نا معلوم

☆ میاں! آگ لگاؤ گے تو تپش تو ہوگی کبھی ہاتھوں کو کبھی سارے بدن جلا دیتی ہے، مرد کا ٹھہراؤ، ضبط و تحمل ہی اس کا زیور ہوتا ہے، آپ کی ندامت اللہ غفور الرحیم قبول فرمائیں، ہر نماز کے بعد یہی اسم مبارک 325 مرتبہ پڑھا کریں۔ اللہ تعالیٰ کا عفو و کرم بہت وسیع ہے۔

لگا تار بیٹیاں

O کراچی آپ سے کئی سال قبل ان ہی سطور کے ذریعے رابطہ ہوا تھا تب آپ کا باقاعدہ کراچی کا وزٹ بھی ہوا کرتا تھا، پھر آپ سے چند سال بذریعہ خط و کتابت ملاقات رہی، پھر میری مصروفیات کے باعث سلسلہ تعلق منقطع ہو گیا لیکن آپ کی محبت اور شفقت شامل حال رہی، آج پھر آپ کی ضرورت پڑ رہی ہے میری بیٹی کی لگا تار تین بیٹیاں ہوئی ہیں جس پر سسرال والے بہت خفا ہیں ان کو بیٹے کی آس ہے۔ شوہر یعنی ہمارے داماد پہلے تو ٹھیک رہے لیکن اب وہ بھی پریشان ہیں ان کی والدہ دوسری شادی کے لیے زور دے رہی ہیں، میری بیٹی اب مزید اولاد پیدا نہیں کرنا چاہتی، وہ خوفزدہ ہے پھر بیٹی ہو گئی پہلے ہی ان کی کون سی قدر ہو رہی ہے جو اب چوتھی کی ہو گی، بیٹی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے ان حالات کی وجہ سے وہ ذہنی طور پر نہایت پریشان ہے اور اب اس نے سوچا ہے کہ وہ ملازمت کر لے اور بچیوں کو پال لے مگر میں تو یہ چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اسے ایک بیٹا عطا ہو جائے مجھے آپ کے عملیات اور دعا پر بہت بھروسا ہے، زندگی میں جب بھی کوئی پریشانی آتی ہے آپ ہی سے رجوع کیا ہے، اللہ پاک نے فضل فرمایا ہے، آپ اولاد نرینہ اور بیٹی کے ذہنی سکون کے لیے دعا اور روحانی حل تجویز فرما دیں۔ سید فراست علی نقوی۔

☆ اللہ تعالیٰ ہم سب کے حسن ظن کو قائم رکھے، تمام دعاؤں اور عملیات کو قبولیت کی سند دینے والا مالک حقیقی ہے وہی کریم پنجتن پاک کے طفیل معاملات کو آسان کرتا ہے، ہماری بیٹی سے کہیں کہ ہرگز پریشان نہ ہوں۔ اللہ پاک ضرور فضل فرمائیں گے۔ انشاء اللہ۔ علاج در تقسیم برائے اولاد نرینہ اور سسرال کے دیگر معاملات کے لیے لوح تسخیر خاص ارسال کی جا رہی ہے، بروز جمعرات کھیر پر حضرت عباسؑ کی نذر دیں اور معصوم بچوں میں تقسیم کیا کریں کرم ہو گا۔ انشاء اللہ

رشتے سے الرجک

O کافی وظائف کئے مختلف لوگوں سے مشورے لیے مگر مسئلہ حل نہیں ہوا۔ میرے بیٹے کی عمر 33 سال ہو گئی خوش شکل اچھا قد بت ہے لیکن اس کے رشتے کی بات چلتی ہے پھر نامعلوم وجوہات کی بنا پر ختم ہو جاتی ہے یہ مسئلہ 25 سال کی عمر سے شروع ہوا پہلے خالہ کے گھر پھر ماموں کے ہاں پھر چچا کے گھر پھر دور کے رشتے داروں کے گھر رشتہ ہوا مگر ہر جگہ معمولی وجوہات کی بنا پر رشتہ ختم ہو گیا۔ بات چیت ہوتی ہے مگر رشتہ نہیں ہوتا، ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک طرف تو رشتوں کا کال پڑا ہے اور دوسری طرف اچھا خاصا رشتہ رد کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں کہ معاملات کیا ہیں، ان کی دادی پوتے کا سہرا دیکھنے کی آرزو میں چل بسیں، خود ہمارے صاحبزادے آہستہ آہستہ شادی کے نام سے ہی الرجک ہوتے جا رہے ہیں، کوئی روحانی حل تجویز کیجئے۔ عابد نقی۔ حیدرآباد

☆ اللہ تعالیٰ فضل و کرم فرمائے، آپ کے صاحبزادے اصل میں جادو کی وجہ سے بندش کا شکار ہیں اس بندش کو توڑنے کے لیے صبح اور شام 41 مرتبہ حروف مقطعات کو پانی پر دم کر کے پلائیں روحانی علاج کے لئے لوح تسخیر خاص اور زعفرانی نقوش ارسال کئے جا رہے ہیں۔ انشاء اللہ ... رشتے کی بندش کھل جائے گی اب منگنی وغیرہ نہ کیجیے گا بلکہ سیدھے نکاح کی تاریخ مقرر کر کے رخصتی کرا لیجیے گا۔

تعلیمی ترقی کے لیے

O بچوں کی تعلیم کے لیے از حد پریشان ہوں دل لگا کر پڑھتے ہیں مگر اس کے باوجود نتیجہ اچھا نہیں آتا اللہ کا شکر ہے کہ کبھی فیل نہیں ہوتے مگر اس کے باوجود صرف پاس ہو جانا تو تعلیم نہیں ہے اچھے نمبر نہ ہوں تو اچھی یونیورسٹیاں بھی گھاس نہیں ڈالتی ہیں آپ میرے تینوں بچوں کی تعلیمی ترقی اور نظر بد سے حفاظت کے لئے لوح اور تعویزات ارسال فرما دیجیے۔ آپ کے لیے بے حد دعا گو رہوں گی۔ گوہر فاطمہ۔ سکھر سندھ

☆ اچھی بہن! پریشان نہیں ہوتے اللہ تعالیٰ محنتوں کو قبول کرنے والے ہیں ہر نماز کے بعد 41 مرتبہ "سورۃ الم نشرح" پانی پر دم کیا کریں اور صبح شام بچوں کو پلایا کریں آپ کی فرمائش پر تعلیمی ترقی کے لیے لوح اور نظر بد سے حفاظت کے لئے نقوش ارسال کر دیئے گئے ہیں دعاؤں کا شکریہ۔

ہڈحرام مشہور ہوں

O میری ملازمت کا مسئلہ ہی حل نہیں ہوتا جگہ جگہ درخواستیں دے کر تھک چکا ہوں مگر اس کے باوجود کوئی نتیجہ نہیں آتا، سرکاری ملازمت کے لیے کئی لوگوں کو پیسے بھی دیئے مگر کوئی بات بنتی ہی نہیں ہے، خاندان میں نکھٹو مشہور ہو چکا ہوں، ماں تو سیدھا سیدھا ہڈحرام ہی بلاتی ہے، اس دوران چھوٹی چھوٹی دو چار نوکریاں بھی ملیں مگر وہ بھی چار چھ مہینے سے زیادہ نہ چل سکیں، کیا میری قسمت میں سرکاری ملازمت نہیں ہے، میری ناکامی کی وجوہات کیا ہیں کیا کوئی جادو کوئی بندش ہے؟ سنا ہے کہ آپ کے نظر بد کے تعویزات سے مسئلہ حل ہو جاتا ہے اگر میرے ساتھ کوئی ایسا مسئلہ ہے تو پھر میرا روحانی علاج کر دیجیے۔ اشفاق احمد۔ پشاور

☆ آپ ہر نماز کے بعد سورۂ قریش 13 مرتبہ پڑھ کر دعا کیا کریں۔ آپ ملازمت کی فکر چھوڑیں تھوڑے پیسوں سے کھانے پینے کا بزنس شروع کریں میری دعا ہے کہ آپ لاکھوں میں کھیلیں آپ کی فرمائش پر نظر بد کے علاج اور حصول کامیابی کے لیے لوح اور تعویزات ارسال ہیں۔

نوٹ

براہ راست جواب کے لیے اپنا نام معہ والدین اپنا پتا لکھا ہوا جوابی لفافہ ضرور ارسال کریں۔ تعطیل بروز جمعۃ المبارک